ISSN 0970-180X

بسرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

رات کا آنا روشن صبح کے آنے کی تمہید ہے
خزاں کا موسم بہار کے موسم کی خبر دیتا ہے
یہ قدرت کا قانون ہے
مادی دنیا کے لیے بھی
اور اسی طرح انسانوں کی دنیا کے لیے بھی

شمارہ ۱۷۰ جنوری ۱۹۹۱

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

فہرست

مطبوعات اسلامی مرکز

ناشر: مکتبہ الرسالہ
سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ،
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون : ۶۱۱۱۲۸
اشاعت اول ۱۹۹۱
مطبوعہ: نائس پرنٹنگ پریس ، دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (البقرۃ ۲۴۹)

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی گروہ کا تعداد میں کم ہونا یا طاقت ور گروہ کی طرف سے زیادتیوں کا شکار ہونا اس کے لیے کوئی محرومی یا مایوسی کی بات نہیں۔ کیوں کہ اس دنیا کے خالق نے دنیا کے اندر جو مواقع رکھے ہیں وہ اس بات کو ممکن بناتے ہیں کہ کمزور گروہ خود طاقت ور گروہ پر غالب آجائے۔

ایسا کیونکر ہوتا ہے۔ اس کا راز، آیت کے مطابق، صبر ہے۔ جو لوگ صبر کے مراحل سے گزرتے ہیں، جو چیلنج سے دوچار ہوتے ہیں، جن کو زندہ رہنے کے لیے زیادہ محنت اور جوکسی کی ضرورت پیش آتی ہے وہ اس عمل کے دوران اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ زیادہ تعداد اور زیادہ قوت والے گروہ کو مغلوب کر کے ان کے اوپر فتح حاصل کر لیں۔

کسی انسان یا کسی انسانی گروہ کے لیے صبر کا مرحلہ پیش آنا ایسا ہی ہے جیسے پانی کا حرارت سے سابقہ پیش آنا۔ پانی کو جب گرمی پہنچائی جاتی ہے تو ۱۰۰ درجہ سنٹی گریڈ پر پہنچ کر وہ ابلنے لگتا ہے۔ اس کے مالیکیول ٹوٹ کر منتشر ہونے لگتے ہیں جس کو بھاپ کہا جاتا ہے۔ اس طرح حرارت پانی کے ذخیرہ کو پانی کے بجائے گیس میں تبدیل کر دیتی ہے۔ گیس کی صورت اختیار کرنے کے بعد پانی اتنا طاقتور ہو جاتا ہے کہ وہ بڑی بڑی مشینوں کو متحرک کر دیتا ہے۔ پانی گیس بننے کے بعد وہ کارنامہ انجام دیتا ہے جو عام پانی کبھی انجام نہیں دے سکتا تھا۔

اسی طرح جب کسی فرد یا گروہ کے ساتھ صبر آزما حالات پیش آئیں، اس کے وجود کو چیلنج کیا جانے لگے تو اس کی شخصیت میں ایک انفجار پیدا ہوتا ہے، اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھرنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ "پانی" کے درجہ سے اٹھ کر "بھاپ" کے درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کسی گروہ کو صبر والے حالات سے سابقہ پیش آیا تو اس کے امکانات جاگ اٹھے۔ وہ ایک ناقابل تسخیر طاقت بن کر ابھر آیا۔ صبر نے اس کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان بنا دیا۔ صبر نے اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے سے زیادہ اور اپنے سے طاقت ور لوگوں پر بھی غلبہ حاصل کر لے۔

خدا کی حفاظت میں

اسلام دینِ محفوظ ہے۔ مسلمان اس دینِ محفوظ کے حامل ہیں۔ مسلمانوں کی اس حیثیت نے ان کو بھی ایک محفوظ گروہ بنا دیا ہے۔ جس طرح اسلام کو مٹانا ممکن نہیں، اسی طرح مسلمانوں کو مٹانا بھی ممکن نہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے خدا کی یہ حفاظت جاری رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

مسلم امت کے ساتھ خدا کے اس معاملہ کا اظہار بار بار ہوا ہے۔ دور اول میں مکہ میں مسلمانوں کے قیام کو ناممکن بنا دیا گیا۔ عین اس وقت مدینہ کی صورت میں اللہ تعالی نے مسلمانوں کے لئے ایک طاقت ور مرکز فراہم کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب قبائل میں عمومی بغاوت پیدا ہو گئی جس کو تاریخ میں فتنۂ ارتداد کہا جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالی نے اپنی خصوصی مدد سے فتنہ کے پیدا ہوتے ہی اس کو کچل دیا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں رومی شہنشاہیت اور ایرانی شہنشاہیت نے مسلمانوں کو ختم کرنا چاہا مگر اللہ کی مدد سے مسلمان خود ان شہنشاہیتوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد یورپ کی مسیحی سلطنتوں نے متحدہ طور پر مسلم دنیا پر حملہ کر دیا تاکہ شام و فلسطین پر قبضہ کر لیں۔ مگر دو سو سالہ جنگ کے باوجود ان کو مکمل شکست ہوئی۔ آخری عباسی خلیفہ کے زمانہ میں تاتاری قبائل نے مسلم سلطنت کو تاراج کر دیا۔ سمرقند سے لے کر بغداد تک تمام مسجدوں کو ڈھا دیا۔ مگر صرف پچاس سال کے اندر تاریخ بدل گئی۔ تاتاریوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے ڈھائی ہوئی مساجد کو دوبارہ تعمیر کیا اور ان مسجدوں میں سجدہ کر کے خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اقرار کیا۔

انیسویں صدی کے وسط میں مغل سلطنت ختم ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عثمانی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ اب مسلمانوں کے لئے دنیا میں کوئی مستقبل نہیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ دنیا کے نقشہ پر پچاس سے زیادہ کی تعداد میں آزاد مسلم ممالک وجود میں آگئے ہیں اور تمام اسلامی سرگرمیاں از سر نو نئی قوت و وسعت کے ساتھ جاری ہو گئی ہیں۔

مسلمانوں کو امت مرحومہ کہا جاتا ہے، یہ بات صحیح نہیں۔ البتہ مسلمان امت محفوظہ ہیں۔ یعنی ان کے اندر بگاڑ کے باوجود ان پر عذاب مستاصل نہیں آئے گا، اور کوئی قوم ان پر اتنا قابو نہ پا سکے گی کہ وہ ان کو بالکل مٹا دے۔ اس کا سبب کوئی فضیلت نہیں ہے۔ یہ دنیوی حفاظت مسلمانوں کو تمام تر ختم نبوت کے

طفیل میں حاصل ہوئی ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس سنت الٰہی کا ظہور بہت بڑے پیمانہ پر ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، انھوں نے اپنی غلط رہنمائی سے مسلمانوں کا یہ حال کر دیا کہ وہ اپنے اندر کسی بھی قسم کی بنیاد (base) فراہم نہ کر سکے۔ بے شمار ہنگامہ خیز تحریکیں صرف ان کی قوتوں کو ضائع کرتی رہیں۔ کوئی بھی تحریک انھیں وقت کی چیزوں میں سے کوئی چیز نہ دے سکی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے برتر انتظام کے تحت انھیں ہر چیز فراہم کر دی۔

لیڈروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں مسلمان جدید اقتصادیات میں اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ قریب تھا کہ وہ زمانہ جدید کے ہریجن بن کر رہ جائیں۔ مگر عین وقت پر تیل کا خزانہ ظاہر ہوا۔ مسلم ملکوں کی زمین کے نیچے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تیل کے ذخائر کا ۵۰ فی صد سے بھی زیادہ حصہ رکھ دیا۔ اس قدرتی خزانہ نے مسلمانوں کے اقتصادی پچھڑے پن کی تلافی کر دی۔

کائنات میں ایسے حقائق چھپے ہوئے تھے جو قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرنے والے تھے۔ مگر مسلم قائدین اپنے جھوٹے مشغلوں کی وجہ سے حقائق کائنات کی دریافت کے عمل میں نہ لگ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام مغربی قوموں سے لیا۔ انھوں نے حقائق فطرت کو دریافت کر کے اس بات کی عملی تفسیر فراہم کر دی کہ ہم ان کو آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ حق ہے (حم السجدہ)

اللہ تعالیٰ کو اس دین کی آواز سارے کرۂ ارض کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں پہنچانی تھی۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے عالم فطرت کے اندر وسائل اعلام کے نہایت اعلیٰ ذرائع چھپا رکھے تھے۔ مگر مسلم رہنما یہاں بھی ان چیزوں کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری قوموں کو اس تحقیق پر لگا دیا۔ یہاں تک کہ وہ تمام اشاعتی ذرائع وجود میں آگئے جن کو پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کہا جاتا ہے۔ ان ذرائع کے ظہور میں آنے کے بعد اب یہ نہایت آسان ہو گیا کہ ان کو استعمال کر کے اسلام کی آواز تمام کرۂ ارض میں پھیلا دی جائے۔

اس طرح کے بہت سے پہلو ہیں جو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنی مدد سے مسلمانوں کی کوتاہیوں کی تلافی کی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خدا کے اس معاملہ کو جانیں اور ان کو استعمال کرتے ہوئے اس خدمت اسلام میں لگ جائیں جس کے لئے ان کے رب نے ان کے ساتھ حفاظت و نصرت کا یہ خصوصی معاملہ فرمایا ہے۔

روشن مستقبل

مسلمان ایک ایسے پیغمبر کی امت ہیں جس کی بابت عالمی مؤرخین نے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ پوری تاریخ کے سب سے زیادہ کامیاب (supremely successful) انسان تھے۔ قرآن کے مطابق، آپ دنیا میں اس لیے آئے تاکہ تمام انسانوں کے لیے بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) قائم کریں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ نہ صرف خود سب سے زیادہ کامیاب انسان تھے بلکہ آپ نے اپنی زندگی کے نمونہ سے سب سے بڑی کامیابی کا راز بتایا ہے۔ آپ نے خود کامیاب ہو کر کامیابی کا نمونہ قائم کیا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ترین مشکلیں پیش آئیں۔ آپ نے خود فرمایا کہ جتنا مجھے ستایا گیا اتنا کسی کو نہیں ستایا گیا۔ آپ نے ان مشکلوں اور ایذاؤں کے باوجود عظیم ترین کامیابی حاصل کی۔ ایک مستشرق نے بجا طور پر آپ کی بابت لکھا ہے کہ آپ کو اگرچہ مشکلات پیش آئیں۔ مگر آپ نے مشکلات کا مقابلہ اس عزم سے کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑ لیں:

He faced adversity with the determination
to wring success out of failure.

یہی وہ بات ہے جس کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ عسر کے ساتھ یسر ہے (الانشراح) اس قرآنی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے نمونہ کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کے لیے کسی بھی حال میں مایوسی کی ضرورت نہیں۔ جب خود خالق کائنات نے یہ ابدی اعلان فرما دیا ہے کہ اس دنیا میں عسر (مشکل) کے ساتھ یسر (آسانی) ہے۔ بالفاظ دیگر، یہاں ہر ڈس ایڈوانٹج کے ساتھ ایڈوانٹج بھی لازمی طور پر موجود رہتا ہے تو ایسی حالت میں ہم کو اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

قرآن کی اس خبر کی صحت کو پیغمبر اسلام نے اس اعلیٰ درجہ پر ثابت کیا کہ آپ نے ناکامی سے کامیابی کو نچوڑ لیا اور ہر قسم کی مشکلوں کے باوجود تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ ایسی حالت میں مسلمان کو ہمیشہ پُر امید رہنا چاہیے، اس کو کسی بھی حال میں مایوسی کو اپنے دل میں جگہ نہیں دینا چاہیے۔

مسلمان ایک روشن مستقبل کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں ــــــــ ان کا پیغمبر ان کو ابدی طور پر یہ پیغام دے رہا ہے۔

ہندستان میں

۱۹۶۷ میں راقم الحروف کی ادارت میں الجمعیۃ ویکلی نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کے پہلے شمارہ یکم ستمبر ۱۹۶۷ء کے اداریہ میں میں نے لکھا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے اندر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر (realistic approach) پیدا کیا جائے۔

راقم الحروف کا خیال تھا اور ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ہر قسم کی ترقی کے مواقع پوری طرح موجود ہیں۔ یہاں مکمل طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ وہ باعزت اور خوش حال اور ترقی یافتہ گروہ بن کر رہ سکیں۔ مگر صرف ایک چیز کی کمی نے یہاں ان کے لیے غیر ضروری قسم کے مسائل پیدا کر رکھے ہیں، اور یہ کمی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کی ہے۔ مسلمانوں کے اندر اگر حقیقت پسندی آجائے تو کوئی بھی چیز ان کی ترقی کو روکنے والی نہیں بن سکتی۔

"۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰" کو پیش آنے والے حالات نے ملک میں جو نیا رخ اختیار کیا ہے، وہ بظاہر تشویشناک ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ عَسٰىٓ اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ ۲۱۶) کا مصداق ہے۔ اس بظاہر ناپسندیدہ صورت حال میں ان کے لیے عظیم خیر چھپا ہوا ہے۔

وہ خیر کیا ہے۔ وہ خیر یہی حقیقت پسندی ہے۔ موجودہ دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز حقیقت پسندانہ مزاج ہے۔ آدمی کی فطرت خود بخود اس کو حقیقت پسندی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر اپنی سطحی اور جذباتی باتوں سے مسلمانوں کو بہکائے ہوئے تھے۔ اب حالات نے ان نااہل لیڈروں کی نااہلی کو دو اور دو چار کی طرح ثابت کر دیا ہے۔ قوی امید ہے کہ اب مسلمان ان لیڈروں کو چھوڑ دیں گے۔ اب وہ فطرت اور قرآن اور اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں اپنی راہ عمل بنائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے سب سے زیادہ حقیقت پسند انسان تھے۔ اسی لیے آپ نے تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ موجودہ حالات اب مسلمانوں کو ایسے مقام پر لے آئے ہیں جہاں وہ خود بخود حقیقت پسند بن جائیں گے۔ اور ان کی زندگی کا یہ نیا موڑ بلاشبہ ان کی کامیابی اور ترقی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

زمین و آسمان کا پورا نظام حقائق کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ انسان بھی اس دنیا میں حقائق کی رعایت کر کے کامیاب ہو سکتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں نے اب اس راز کو پالیا ہے۔ اور اس راز کو پالینے ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

قدرت کا پیغام

مسلمانوں سے میں قدرت کی زبان میں کہوں گا کہ زمین و آسمان کے اشاروں کو سمجھو، اور کائنات میں نشر ہونے والے پیغام کو سنو۔ کیوں کہ یہ دنیا ہر آن تمہارے لیے امید کی خبریں نشر کر رہی ہے۔

یاد رکھو، تاریک رات کا آنا روشن صبح کے آنے کی تمہید ہے۔ خزاں کا موسم یہ خبر دیتا ہے کہ جلد ہی بہار کا موسم آنے والا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ یہ قانون جس طرح مادی دنیا کے لیے ہے اسی طرح وہ انسانی دنیا کے لیے ہے، اور یقینی طور پر خود تمہارے لیے بھی۔

بظاہر اس وقت مسلمانوں کو صبر آزما حالات کا سامنا ہے۔ مگر یہ حالات عین خدا کی رحمت ہیں۔ یہ مسلمانوں کے مس خام کو کندن بنانے کا خدائی انتظام ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ صبر مومن کا ہتھیار ہے (الصبر معول المومن) صبر ایک قسم کا تربیتی کورس ہے جو آدمی کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ صبر آدمی کے اندر پختگی کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ صبر آدمی کو بلند انسانی اوصاف کا حامل بناتا ہے۔ صبر آدمی کو یہ طاقت دیتا ہے کہ وہ اعلیٰ اسلامی اخلاقیات پر قائم ہو سکے۔ صبر آدمی کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔ صبر کسی فرد یا قوم کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

صبر مایوسی کی بات نہیں، صبر خوش خبری کا لمحہ ہے۔ صبر اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی مدد قریب آگئی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اللہ صبر کا ثبوت دینے والوں کو دنیا کا امام بنا دیتا ہے۔

صبر کی طاقت

حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کے درمیانی زمانہ میں بنی اسرائیل کے یہاں جنگ کا ایک واقعہ ہوا۔ اس وقت بنی اسرائیل کے جوانوں کی تعداد کم تھی اور دشمن کی فوج تعداد اور اسباب میں بہت زیادہ تھی۔ اس فرق کو دیکھ کر بنی اسرائیل کے لوگ ڈر گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو دشمن سے لڑنے کی طاقت نہیں (البقرہ ۲۴۹)

بائبل کے بیان کے مطابق، اس وقت بنی اسرائیل کے سردار (یونتن) نے اپنے ساتھی سے کہا کہ آ ہم اُدھر ان نامختونوں کی چوکی کو چلیں۔ ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے۔ کیوں کہ خداوند کے لئے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعہ سے بچانے کی قید نہیں (۱۔ سموئیل ۱۴ : ۶)۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے :

قال الذین یظنون انھم ملاقو اللہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین (البقرۃ ۲۴۹)

جو لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں، انھوں نے کہا کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں قلیل اور کثیر کا لفظ صرف عددی معنوں میں اقلیت اور اکثریت کے لئے نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ وہ کمزور اور طاقت ور کے معنی میں بھی ہے۔ عربی زبان میں قلیل اور کثیر کا لفظ اس توسیعی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جاہلی دور کے عرب شاعر کا یہ شعر اس کی ایک مثال ہے :

فان الٔف فی شرارکم قلیل   فانی فی خیارکم کثیر

قرآن کی اس آیت میں دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ کسی گروہ کا قلیل التعداد یا کمزور ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ کثیر التعداد یا طاقت ور فریق کے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام رہے۔ اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کمزور بھی طاقت ور پر غالب آسکتا ہے۔ یہاں اقلیت بھی اکثریت کو مفتوح کر سکتی ہے۔

اس فتح و کامرانی کا راز آیت میں صبر بتایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کوئی

انفعالی کیفیت یا بزدلی کی چیز نہیں۔ صبر ایک فعال صفت ہے۔ وہ ایک بہادرانہ خصوصیت ہے۔ صبر اتنی عظیم چیز ہے کہ جو لوگ اس کا ثبوت دیں وہ خدا کی خصوصی نصرت کے مستحق بن جاتے ہیں۔ حتی کہ اس کا نتیجہ اس صورت میں نکلتا ہے کہ ایک بظاہر کمزور گروہ ایک بظاہر طاقت ور گروہ کے اوپر غلبہ حاصل کر لیتا ہے

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان ہمیشہ مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس مقابلہ میں کبھی ایک گروہ غالب آجاتا ہے اور دوسرا گروہ اس کے مقابلہ میں بظاہر مغلوب اور کمزور ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب کوئی گروہ دوسرے کے مقابلہ میں کمزور پڑ جائے اور اس کو نقصان اٹھانا پڑے تو اس کے بعد کمزور گروہ کے ردعمل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک غیر صابرانہ ردعمل، دوسرا صابرانہ ردعمل۔

غیر صابرانہ ردعمل یہ ہے کہ آدمی مایوسی اور احساس شکست کا شکار ہو کر رہ جائے۔ وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ سمجھ لے کہ اب میرے لئے یہاں کچھ نہیں ہے۔ وہ دوسرے گروہ کو اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف فریاد اور احتجاج کرنے لگے۔ یہ تباہی کی صورت ہے۔ دوسروں نے اگر اس کو ابتدائی نقصان پہنچایا تھا تو اس کے بعد وہ خود اپنے آپ کو نقصان پہنچا کر اپنی تباہی کی تکمیل کر لیتا ہے۔

دوسرا ردعمل صابرانہ ردعمل ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو چوٹ لگنے کے بعد اپنے آپ کو سنبھالتا ہے۔ اس کا ذہن شکایت کرنے کے بجائے تدبیر کے رخ پر چلنے لگتا ہے۔ وہ مایوسی میں پڑنے کے بجائے امید کے پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ وہ کھوئے ہوئے کا غم کرنے کے بجائے یہ چاہتا ہے کہ ملے ہوئے کو استعمال کرے۔

جو لوگ زک اٹھانے کے بعد اس طرح صبر کے طریقہ کو اختیار کریں وہ گویا اپنے آپ کو حالات سے اوپر اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس حالت کی طرف لے جاتے ہیں جہاں ان کے اندر چھپے ہوئے امکانات جاگیں۔ ان کی شخصیت مزید طاقت کے ساتھ ابھر آئے۔

غیر صابر آدمی نقصان کو نقصان کے روپ میں دیکھتا ہے۔ صابر آدمی نقصان کو اپنے لئے چیلنج سمجھتا ہے۔ وہ حالات کا مقابلہ کر کے اپنے آپ کو آگے لے جانا چاہتا ہے۔ اور جو لوگ نقصان کا اس

طرح استقبال کریں، وہ ہمیشہ آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اپنی ناکامی کو دوبارہ عظیم تر کامیابی میں تبدیل کر لیتے ہیں۔

جب ایسا ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے اوپر ظلم کرے، اور مظلوم گروہ بھی اس کے جواب میں ظالمانہ کارروائی کرنے لگے تو دونوں گروہ اخلاقی اعتبار سے برابر ہو گئے۔ ایسے دونوں گروہوں کو اللہ ان کی اپنی ذات کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی اللہ کی مدد حاصل نہیں ہوتی۔

لیکن اگر ایسا ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کو اپنے ظلم اور سرکشی کا نشانہ بنائے۔ مگر مظلوم گروہ جوابی کارروائی کرنے کے بجائے اس پر صبر کر لے، تو خدا صابر گروہ کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ مظلوم گروہ کی مدد کر کے اس کو ظالم گروہ کے اوپر فاتح بنا دیتا ہے۔

مظلوم گروہ کو یہ فائدہ تمام تر صبر کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ صبر کوئی بے عملی کی حالت نہیں، صبر سب سے بڑا عمل ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر اٹھتے ہوئے جذبات کو منفی رخ سے ہٹا کر مثبت رخ کی طرف پھیر دے۔

صبر کی صفت اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہے۔ جو شخص صبر کرے وہ بے پناہ شخصیت کا مالک بن جاتا ہے۔ تمام قوانین فطرت اس کے حق میں متحرک ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد کے تحت وہ ایک ناقابل تسخیر ہستی بن جاتا ہے۔

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھائے۔ وہ ظالم کی بدخواہی کے جواب میں اس کے ساتھ خیر خواہی کرنا سکھاتا ہے۔ وہ برے عمل کا جواب بھلے عمل سے دینے کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ صابر آدمی ظالم کے ظلم پر اس کے خلاف بد دعا نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی ہدایت کی دعا مانگتا ہے۔

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ایسا نہ کرے کہ وہ اشتعال انگیزی کے وقت مشتعل ہو جائے اور عاجلانہ کارروائی میں اپنی طاقت کو ضائع کرے۔ صبر آدمی کو بے پناہ حد تک طاقتور بنا دیتا ہے۔ وہ آدمی کی خفیہ صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ وہ آدمی کے چھپے ہوئے امکانات کو بیدار کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر منصوبہ بند کام کرنے کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ صبر آدمی کو معمولی انسان کے درجے سے اٹھا کر غیر معمولی انسان کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔

فتح باب

۱۲ نومبر ۱۹۹۰ کا واقعہ ہے۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ کچھ ہندو بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک مسلمان ان سے اسلام کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ ہندوؤں کا کہنا تھا کہ تمہارا مذہب مار کاٹ کا مذہب ہے۔ مسلمان نے پوچھا کہ کیسے تم ایسا کہتے ہو۔ ہندو نے کہا کہ تم لوگ صبح ہی صبح اٹھ کر اپنی مسجدوں سے اللہ اکبر، اللہ اکبر کی پکار بلند کرتے ہو۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ اللہ کے نام پر کافروں کو مارو۔ اللہ کے لیے لوگوں کو قتل کرو۔

مسلمان نے کہا کہ یہ آپ بالکل الٹی بات کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ اللہ اکبر کہنے کے بعد مسلمان اپنی مسجدوں میں کیا کرتے ہیں۔ مسلمان اس کے بعد وہ کام کرتے ہیں جس کو رکوع اور سجدہ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ جھکتے ہیں اور اپنا سر زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ پھر جب وہ نماز ختم کرتے ہیں تو کہتے ہیں: السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یعنی تمام لوگوں پر سلامتی اور رحمت ہو۔

یہ مسلمان بظاہر کوئی عالم نہ تھا۔ اور نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے۔ یہ بات اس نے فطرت کے زور پر کہی نہ کہ علم کے زور پر۔ یہ بات دراصل "معلم فطرت" نے اس کو بتائی تھی۔ جھوٹے رہنما جہاں گمراہ کرنے کے لیے موجود نہ ہوں، وہاں فطرت خداوندی انسان کی رہنما بن جاتی ہے۔ اور بلاشبہ فطرت خداوندی سے زیادہ بہتر کوئی معلم انسان کے لیے نہیں۔

میں نے مسلمان کی مذکورہ باتیں سنیں تو ایسا محسوس ہوا گویا میں اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آگیا ہوں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ موجودہ حالات نے ملت اسلام کے لیے تاریخ کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ موجودہ حالات خود اپنی اندرونی منطق کے تحت مسلمانوں کو اسلام کا سچا مبلغ بنا رہے ہیں۔ یہ حالات خود بخود مسلمانوں کو بتا رہے ہیں کہ وہ اس اسلام کو لوگوں کے سامنے پیش کریں جو سچا اسلام ہے اور اسی کے ساتھ وہ موجودہ حالات میں ان کے لیے ایک ڈھال کا کام کرتا ہے۔

یعنی وہ اسلام جو دین فطرت ہے۔ جو انسان کے روحانی تقاضوں کا جواب ہے۔ جس میں محبت اور تواضع کی تعلیم ہے۔ جس کے اندر امن اور رحمت کا پیغام ہے۔ جو انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارے۔ وہ سورج کی طرح دنیا میں رہے جو ہر ایک کو اپنی روشنی پہنچاتا ہے، وہ پھول کی طرح معاملہ کرے جو اپنے دشمن کو بھی رنگ اور خوشبو کا تحفہ دیتا ہے۔

موجودہ صدی کے نصف اول تک دنیا میں مغربی استعمار کا دور تھا۔ اس زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے لڑائی کا راستہ اختیار کیا۔ ان کو جنگ و جدال والا اسلام اپنے حق میں زیادہ مفید نظر آیا۔ چنانچہ ہندستان میں اور ساری دنیا میں ایک خود ساختہ اسلام کی دھوم مچا دی گئی۔ حتی کہ یہی اسلام لوگوں کی نظر میں اصل اسلام بن گیا۔ اس زمانہ کے تمام مسلم رہنما ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو کر قولی یا عملی لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ یہی زمانہ ہے جبکہ اقبال نے کہا:

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں　　خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

اس زمانہ میں مسلم اداروں نے تلوار کو اپنا شعار بنایا۔ ابوالکلام آزاد نے امام حسینؓ کو شہید اعظم اور تاریخ کا سب سے بڑا ہیرو بنا کر پیش کیا۔ ابوالاعلیٰ مودودی نے الجہاد فی الاسلام لکھی۔ وغیرہ۔ اس قسم کی تحریروں اور تقریروں نے اسلام کو لوگوں کی نظر میں جنگ اور ٹکراؤ کا مذہب بنا دیا۔ مسلمان اس بات کو بھول گئے کہ ان کے رسولؐ کو خدا نے ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔ اور اسلام کے جس سبق کو مسلمان بھلا دیں، اس کو غیر مسلم بدرجۂ اولیٰ فراموش کر دیں گے۔

مگر اب نئے حالات کا دباؤ اس غلط ذہن کی تصحیح کر رہا ہے۔ اب مسلمان عین حالات کے تقاضے کے تحت، اس اسلام کی طرف لوٹ رہے ہیں جو اصلی اور حقیقی اسلام ہے۔ اب نہ صرف یہ ہوگا کہ مسلمان اسلام کی صبر و اعراض اور نصح و امانت والی تعلیمات کی اہمیت کو از سر نو دریافت کریں گے، بلکہ خود اپنی فکری مدافعت کے لیے اس کو ضروری سمجھیں گے کہ اسلام کے رحمت والے پیغام کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کریں۔ تاکہ دوسروں کی نظر میں ان کی صحیح تصویر بنے۔ دوسروں کی نظر میں ان کا وقار پیدا ہو۔ وہ عزت اور امن کے ساتھ اس ملک میں رہ سکیں۔ وہ ایسے دین کے حامل قرار پائیں جو آدمی کو لوگوں کی نظر میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے۔

اب تک مسلمانوں کے لیڈر انھیں خود ساختہ اسلام کا نمائندہ بنائے ہوئے تھے۔ اب نئے حالات انھیں اس طرف لے جا رہے ہیں کہ وہ خدا کے سچے دین کے نمائندہ بنیں یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے مستقبل کی تعمیر ہے۔ وہ اسلامی دعوت کے لیے فتح باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان حالات پر جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے تاریخ دوبارہ وہاں جاتی ہوئی نظر آتی ہے جہاں وہ تاتاری حملہ کے بعد عالم اسلام میں پہنچی تھی۔ عباسی دور میں مسلمانوں کے درمیان اسلام کا جو ڈھانچہ موجود تھا، وہ ایک ایسا ڈھانچہ تھا جس میں انسان کے لیے بہت کم کشش باقی رہ گئی تھی۔ اسلام کا توسیعی سیلاب رک گیا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس مصنوعی ڈھانچہ کو توڑ دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان وہ اسلام آ گیا جو سچا

اسلام تھا، جو انسانی فطرت کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام دوبارہ سیلاب کی طرح پھیلنے لگا۔ قومیں کی قومیں اسلام میں داخل ہوگئیں۔ نئے خون کی اس آمیزش کے بعد مسلمانوں نے دوبارہ اسلام کی ایک طاقت ور تاریخ بنائی جو صدیوں تک جاری رہی۔

عباسی دور کے اسلام کی ایک فکری مثال لیجئے۔ ہماری موجودہ فقہ زیادہ تر اسی عباسی دور میں بنی ہے۔ عباسی دور مسلمانوں کے لیے فتح و غلبہ کا دور تھا۔ اس کے زیر اثر مسلمانوں میں حاکمانہ نفسیات پیدا ہوگئی۔ مسلمان اپنے آپ کو "داعی" کے بجائے "فاتح" سمجھنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ میں کئی ایسے مسائل داخل ہوگئے جو محض اس وقت کے سیاسی حالات کا نتیجہ تھے نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی تعلیم کا نتیجہ۔

مثلاً ہمارے فقہاء نے پوری دنیا کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصہ کو انھوں نے دار الاسلام کہا اور دوسرے حصہ کو دار الحرب۔ یہ تقسیم یقینی طور پر زمانی حالات کا نتیجہ تھی۔ یہ فقہ اگر عہد نبوت میں بنتی جبکہ ایک طرف دعوت الی اللہ کا کام جاری تھا۔ دوسری طرف مدینہ میں اسلام کا با اختیار مرکز قائم ہو رہا تھا۔ تیسری طرف جارح اور حملہ آور قبائل سے اسلام کی دفاعی جنگ ہو رہی تھی۔ تو نقشہ مختلف ہوتا۔

ان حالات میں فقہاء اگر عالم انسانی کی تقسیم کرتے تو وہ اس کو دو کے بجائے تین حصوں میں بانٹتے ـــــ دار الدعوۃ، دار الاسلام، دار الحرب (دار الحرب فقہاء کے معروف معنی میں نہیں، بلکہ اس معنی میں کہ وہ ملک جس سے جارحیت کی بنا پر مسلمانوں کو دفاعی جنگ لڑنی پڑے اور اس طرح مسلمان ان سے برسر جنگ ہوگئے ہوں) مگر زمانی حالات کی بنا پر فقہاء کی تقسیم میں دار الدعوۃ حذف ہوگیا، حالانکہ وہ اسلام کا اہم ترین حصہ تھا۔

حقیقی اسلام جس کا نمونہ رسولؐ اور اصحاب رسول نے قائم کیا ہے، اس کے مطابق مسلمانوں کا مزاج بنے تو وہ یہ ہوگا کہ مسلمان دنیا کی قوموں کو اسلام کے پیغام رحمت کا مخاطب بنائیں۔ جہاں مسلمانوں کو فیصلہ کن اکثریت حاصل ہو وہاں کی عملی زندگی کا نقشہ اسلامی احکام کی بنیاد پر قائم کریں۔ اور اگر کوئی قوم ان کے خلاف جارحیت کرے تو اس سے مقابلہ کر کے اسلام کا دفاع کریں۔ مگر مذکورہ فقہی تقسیم میں دعوت کا پہلو سرے سے حذف ہوگیا۔ اس میں صرف دوسرا اور تیسرا پہلو باقی رہا، اور وہ بھی ناتمام صورت میں۔

فقہاء کی تقسیم کے مطابق، اُس وقت کے مسلمانوں میں جو ذہن بنا وہ حاکمانہ ذہن تھا نہ کہ داعیانہ

ذہن۔ دار الاسلام اور دار الحرب کی عالمی تقسیم کے بعد عملی طور پر مسلمانوں کے اندر یہی فکر ابھر سکتا تھا اور یہی فکر ابھرا ۔ مسلمانوں کے لیے کرنے کا کام صرف دو ہے ــــــــ حاصل شدہ حصۂ زمین پر حکومت کرنا۔ اور زمین کا جو حصہ ابھی حاصل نہیں ہوا اس کو لڑکر اپنے قبضہ میں لانا تاکہ اس پر حکومت کی جا سکے۔

مسلمانوں کا یہی غیر صحیح ذہن تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے تاتاری قبائل کو مدعو سمجھنے کے بجائے انھیں اپنا حریف سمجھا۔ چنگیز خاں کے وفد کا احترام کرنے کے بجائے انھوں نے ان کی تحقیر کی۔ خوارزم شاہ کے حکم کے تحت تاتاری وفد کے اموال چھین لیے گئے اور انھیں قتل کر دیا گیا (البدایہ والنہایہ ۱۳/۸۳)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور تاتاریوں کے درمیان داعی۔ مدعو کا رشتہ قائم نہ ہو سکا۔ اس کے بجائے ان کے درمیان حریف اور دشمن کا رشتہ قائم ہو گیا۔ چنگیز خاں کے دل میں ابتداءً مسلمانوں کے لیے نرم گوشہ تھا۔ مگر مذکورہ واقعہ کے بعد اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف غصہ اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ تاتاری لشکر اپنی تمام وحشت و بربریت کے ساتھ عالم اسلام پر ٹوٹ پڑا۔ ان کا غصہ صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ انھوں نے عالم اسلام کو اپنے قدموں کے نیچے پامال کر دیا۔

اس دور میں جو عملی خرابی پیدا ہوئی، اس کو میں ایک مثال کے ذریعہ واضح کروں گا۔ ساتویں صدی ہجری میں تاتاری جب عباسی خلافت کو زیروزبر کر چکے اور نتیجۃً تاتاری احساسِ غلبہ اور مسلمان احساسِ مغلوبیت سے دوچار ہو گئے، اس زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک تاتاری نوجوان تغلق تیمور ایرانی علاقہ میں شکار کھیل رہا تھا۔ اس کی ملاقات ایک ایرانی مسلمان سے ہوئی۔

تاتاری نوجوان گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے احساسِ برتری کے تحت اپنے کتے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ تم مسلمانوں سے تو میرا یہ کتا اچھا ہے۔ اگر یہ مسلمانوں کے غلبہ اور حکمرانی کا دور ہوتا تو مذکورہ مسلمان اس بات کو سن کر فوراً اپنی تلوار نکالتا اور تاتاری نوجوان کی گردن مار کر کہتا کہ اب بتاؤ میں اچھا ہوں یا تمہارا کتا اچھا ہے۔

مگر اس وقت مسلمان احساسِ مغلوبیت سے دوچار تھے۔ حالات نے انھیں شکستگی کے مقام پر پہنچا دیا تھا۔ ان کے دلوں میں کبر اور سرکشی کے بجائے تواضع اور دردمندی کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ تاتاری نوجوان کا جملہ سن کر مسلمان کی زبان سے نکلا: "اگر ہم کو سچا دین نہ ملتا تو یقیناً ہم کتے سے زیادہ برے ہوتے۔" مسلمان کے اس پرسوز جملہ نے تاتاری نوجوان کو تڑپا دیا۔ اس کے بعد وہ سچے دین کی تحقیق میں لگ گیا۔

یہاں تک کہ آخر کار اس نے اسلام قبول کر لیا (ایمانی طاقت ۲۶-۲۷)

مسلمانوں پر جو مصیبت آتی ہے، وہ قرآن کے مطابق، مصیبت نہیں ہوتی بلکہ آزمائش ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں کو پاک کرے اور ان کی فکر کی تصحیح کرے (آل عمران ۱۵۴) موجودہ حالات مجھے ٹھیک اسی نوعیت کے نظر آرہے ہیں۔

عباسی دور کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تاتاریوں کے ذریعہ جھنجھوڑا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی حاکمانہ فکر دوبارہ دعوتی فکر میں تبدیل ہوئی۔ ان کا احساس برتری ٹوٹا اور اس کی جگہ تواضع، پرسوزی اور حقیقت پسندی کا احساس ابھر آیا۔ ان چیزوں نے مسلمانوں میں دوبارہ وہ اوصاف پیدا کیے جو داعی کے اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ تاتاریوں کے درمیان اس سیدھے اور سچے اسلام کے نمائندہ بن گئے جو انسان کو خود بخود اپنی طرف کھینچتا ہے۔

اس طرح مسلم دنیا میں ایک نیا عمل جاری ہوا جس کو دعوتی عمل کہا جا سکتا ہے۔ اس نے تاتاریوں کے دلوں کو مسخر کرنا شروع کر دیا۔ تاتاری قبائل اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ پچاس سال کے اندر بیشتر تاتاریوں نے اور خود ان کے شاہی خاندان نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ لوگ جو اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا نعرہ لے کر اٹھے تھے، وہ اسلام کے خادم اور سپاہی بن گئے۔

حالات بتاتے ہیں کہ یہی تاریخ دوبارہ دہرائی جانے والی ہے۔ اور یہ سب کچھ خود اللہ کی طرف سے کیا جا رہا ہے، اور اللہ بلاشبہ سب سے بڑا کارساز ہے۔

تاریخ کا سبق

۴ نومبر ۱۹۹۰ کو نئی دہلی میں کارسیوکوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہوئی۔ اس موقع پر اگرچہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر لال کرشن اڈوانی شریک نہ ہو سکے۔ تاہم دوسرے کئی ہندو لیڈروں نے پرجوش تقریریں کیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۸ نومبر ۱۹۹۰) نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری مسٹر اشوک سنگھل نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو وارننگ دی کہ وہ اجودھیا مندر بنانے کی مخالفت نہ کریں۔ ورنہ ان کی پارٹی ملک میں اسی قسم کی تین ہزار متنازعہ جگہوں پر مندر بنانے کی تحریک شروع کر دے گی :

The Vishwa Hindu Parishad general secretary, Mr Ashok Singhal, warned Muslims not to oppose the Ayodhya temple's construction. Otherwise, he said, his party would start an agitation for building temples at 3,000 similarly disputed sites all over the country.

اس قسم کے الفاظ مسلمانوں کے خلاف چیلنج نہیں ہیں، وہ خود خدا کے خلاف چیلنج ہیں۔ کیوں کہ مسجد خدا کا گھر ہے، اس بنا پر وہ خدا کا معاملہ ہے۔ جو لوگ اس قسم کا چیلنج دیں، وہ گویا براہ راست خدا سے لڑنا چاہتے ہیں۔ اور کون ہے جو خدا سے لڑکر کامیاب ہو۔

یمن کے حاکم ابرھہ نے ۵۷۰ء میں اسی قسم کا چیلنج دیا تھا جب کہ وہ ۶۰ ہزار کا لشکر اور ایک درجن ہاتھی لے کر مکہ روانہ ہوا تاکہ کعبہ کو ڈھادے۔ مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ "چڑیوں کا جھنڈ" خدائی فوج کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس نے پتھروں کی بارش سے پورے لشکر کو بھس بنا دیا۔

یہی واقعہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو دوبارہ اجودھیا میں پیش آیا ہے۔ ہندو انتہا پسند جماعتوں نے اعلان کیا تھا کہ اس تاریخ کو لاکھوں ہندو اجودھیا پہنچیں گے اور وہ بابری مسجد کو ڈھاکر اس کی جگہ رام مندر تعمیر کریں گے۔ مگر، جیسا کہ معلوم ہے، ہندستان کی مرکزی حکومت اور یوپی کی ریاستی حکومت اس کے خلاف اپنی پوری طاقت کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ مذکورہ تاریخ کو اجودھیا جانے کے تمام راستے بند کر دیے گئے۔ ہوائی جہاز گراؤنڈ کر دیے گئے۔ ریلیں اور بسیں روک دی گئیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ فوج اور پولیس اجودھیا میں اور اس کے آس پاس کھڑی کر دی گئی۔ اس پوری مہم میں حکومت نے جو خرچ کیا اور اس کا جو نقصان ہوا، اس کی مقدار تقریباً چالیس کروڑ روپیہ بتائی جاتی ہے۔

انڈیا ٹوڈے (۱۵ نومبر ۱۹۹۰) نے اپنی باتصویر مفصل رپورٹ میں بتایا ہے کہ اس موقع پر بہار اور یوپی میں تقریباً دو لاکھ (200,000) آدمی گرفتار کر لیے گئے، جب کہ ایمرجنسی کے زمانہ میں ڈیڑھ لاکھ اور کوئٹ انڈیا تحریک کے زمانہ میں صرف ساٹھ ہزار آدمی پکڑے گئے تھے۔ اس طرح کی غیر معمولی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۰ اکتوبر کو بابری مسجد ڈھانے کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ ساری کوششوں کے باوجود مسجد نہیں گری، اگرچہ وی پی سنگھ کی حکومت گر گئی۔

یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسا ہی ایک واقعہ ہے جو ۱۴۲۰ سال پہلے مکہ میں ابرہہ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ خدا نے اجودھیا میں مداخلت کی۔ دوبارہ "چڑیوں کا جھنڈ" ظاہر ہوا اور اس نے مخالفین کے سارے منصوبہ کو تہس نہس کر دیا۔

مزید یہ کہ مسجد محض در و دیوار کا نام نہیں۔ مسجد عالم اسلام کی چوکیدار ہے۔ آپ دنیا کا سفر کریں تو آپ دیکھیں گے کہ دوسری قوموں نے اپنی حفاظت کے لیے شہروں کے گرد حصار بنائے اور بڑے بڑے قلعے کھڑے کیے۔ مگر مسلمان جہاں بھی گئے وہاں انھوں نے مسجدیں بنائیں اور اس کے میناروں پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کی حقیقت کا اعلان کیا۔

تاریخ تصدیق کرتی ہے کہ مسجد نے بار بار اپنی اس حارسانہ حیثیت کو ثابت کیا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں منگول (تاتاری) وحشی طوفان کی طرح ابھرے۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر حلب اور بغداد تک تمام مسجدوں کو ڈھا دیا۔ مگر پچاس سال میں پورا نقشہ بدل گیا۔ چنگیز خاں اور ہلاکو کے بعد ان کے بیٹوں اور پوتوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے اپنے باپ دادا کی ڈھائی ہوئی مسجدوں کو دوبارہ اپنے ہاتھوں سے بنایا اور ان کے اندر عاجزانہ سجدہ کر کے اللہ کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کیا۔

اسلام کی اس فاتحانہ تاریخ کی موجودگی میں مسلمانوں کو اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔ اگر کچھ لوگ شیطان کے بہکاوے میں آکر ہلاکو کی تاریخ دہرانا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کو دوبارہ اس خدائی معجزہ کا انتظار کرنا چاہیے جب کہ اسلام کی طاقت ظاہر ہو اور وہ ان کی نسلوں کو مسخر کر کے دوبارہ انھیں خدا کے دین کا معمار بنا دے۔

تخریب کے چیمپین تعمیر کے ہیرو بن جائیں، اور بلاشبہ خدائے ذوالجلال کے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں۔

بے بنیاد خوف

متحدہ عرب امارات سے ایک عربی مجلہ منار الاسلام کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اس نے مارچ ۱۹۸۶ میں ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ایک خصوصی رپورٹ چھاپی تھی۔ اس کا عنوان تھا: القضاء علی المسلمین فی الهند (ہندستان میں مسلمانوں کا خاتمہ) اس رپورٹ میں ہندستان کی بعض انتہا پسند ہندو تنظیموں کی خفیہ سازشوں کا "انکشاف" کیا گیا تھا جو رپورٹ کے مطابق ہندستان سے مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ۱۹۳۹ سے سرگرم ہیں۔

رپورٹ میں دکھایا گیا تھا کہ ایک ہندو فرقہ پرست تنظیم نے موجودہ صدی کی چوتھی دہائی میں اپنے کارکنوں پر مشتمل ایک خفیہ وفد اسپین روانہ کیا تھا۔ تاکہ وہاں جاکر وہ گہرائی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے کہ وہاں کے عیسائیوں نے کس طرح اسپین کی سرزمین سے مسلمانوں کا خاتمہ کیا۔ اور پھر ہندستان میں بھی اسپین کی اسی قدیم تاریخ کو دہرایا جاسکے۔

حیدرآباد کے ماہنامہ رہگذر (مئی ۱۹۸۷) میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا: ہندستان میں مسلمانوں کا صفایا کس طرح کیا جائے گا، ہندو نازی ہسپانیہ کے نقش قدم پر۔ صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ:

"ہندستان کے ہندو نازیوں نے اس صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں اس مضمون کا گہرا مطالعہ کیا کہ کس طرح اسلام کو ہسپانیہ سے نکال باہر کیا گیا۔ انھوں نے اس کا مطالعہ خاص طور پر کیا تاکہ اس کی نقل ہندستان میں بھی کی جائے۔ آج ہندو نازی حکومت کے اندر اور باہر ہر جگہ باقاعدگی سے ہسپانوی طریقے اختیار کر رہے ہیں"۔

مضمون میں دکھایا گیا تھا کہ ہسپانیہ کی منظم عیسائی جماعتوں اور فرڈیننڈ کی حکومت نے وہاں سے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے نو طریقے اختیار کئے تھے۔ اب یہی نو طریقے ہندستان میں بھی مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جارہے ہیں۔

یہ بات پچھلی نصف صدی سے مختلف شکلوں میں کہی جارہی ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کے دینی اور علمی حلقوں میں اس کا بار بار چرچا کیا گیا ہے۔ مسلم خطیبوں نے اپنی تقریروں میں اور اصحاب

قلم نے اپنی تحریروں میں مسلمانوں کو اس مفروضہ خطرہ سے ہوشیار کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ ملی تشخص کی حفاظت اور نئی نسل کے مستقبل کے تحفظ کی تحریکیں زیادہ تر اسی مخصوص ذہن کی پیداوار ہیں۔

یہ سراسر بے بنیاد خوف ہے جو لغویت کی حد تک بے معنی ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کسی دیہاتی سے ایک شخص نے کہا کہ تمہارا کان کوا لے گیا۔ وہ دیہاتی آدمی کوے کے پیچھے دوڑنے لگا۔ اس نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر یہ دیکھنے کی کوشش نہ کی کہ اس کا کان بدستور اس کے سر پر موجود ہے۔

اسپین کا مذکورہ واقعہ اب سے پانچ سو سال پہلے پیش آیا۔ وہ زمانہ آج کے دور سے سراسر مختلف تھا۔ اس زمانہ میں بادشاہ کی زبان قانون ہوا کرتی تھی۔ اخبارات اور ریڈیو موجود نہ تھے جو کسی مقامی خبر کو عالمی سطح پر پھیلا سکیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل اور اقوام متحدہ جیسے ادارے موجود نہ تھے جو ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج کریں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت عالمی حالات کا وہ دباؤ موجود نہ تھا جو آج ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے پانچ سو سال کے اندر دنیا کے حالات اتنے زیادہ بدل چکے ہیں کہ اب یہ بالکل ناممکن ہو گیا ہے کہ کوئی بھی طاقت، خواہ وہ سپر پاور ہی کیوں نہ ہو، کسی انسانی مجموعہ کے خلاف اسپین جیسی تاریخ کو دہرا سکے۔

تاہم تھوڑی دیر کے لئے ان تمام ناممکنات کو ممکن فرض کر لیجئے۔ اور متعلقہ اعداد و شمار کی روشنی میں یہ حساب لگائیے کہ بالفرض اگر موجودہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ وہ المناک تاریخ دہرائی جائے جو اسپین میں قدیم مسیحی حکمرانوں نے دہرائی تھی تو اس تاریخی عمل کو اپنی آخری حد تک پہنچانے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اسپین میں مسلمان ۷۱۲ء میں داخل ہوئے۔ وہاں ان کی حکومت ۸۰۰ سال تک باقی رہی۔ زوال کا شکار ہونے کے بعد، اسپینی مسلمانوں کی سیاسی قوت کا آخری مرکز غرناطہ تھا۔ جو ۱۴۹۲ء میں ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

۱۴۹۲ء میں جب آخری مسلم سلطان نے مسیحی حکمراں کے حق میں دست برداری لکھ دی اور غرناطہ سے روتا ہوا رخصت ہوا، اس کے بعد چرچ اور حکومت کے منصوبہ کے تحت اسپین سے مسلمانوں کو

ختم کرنے کی مہم شروع کر دی گئی۔ مگر ظلم اور سفاکی کے تمام طریقوں کو اختیار رکھنے کے باوجود، اس مہم کی تکمیل میں ۱۲۰ سال لگ گئے۔ مسلمانوں کا آخری قافلہ ۱۶۱۲ء میں اسپین سے نکل سکا۔

اب فرض کیجئے کہ ہندستان میں قدیم اسپین کی تاریخ دہرائی جاتی ہے، اور یہ بھی فرض کر لیجئے کہ یہ عمل کسی بھی اندرونی یا بیرونی مداخلت کے بغیر بلا روک ٹوک مسلسل جاری رہتا ہے۔ تمام خلاف قیاس باتوں کو فرض کرنے کے بعد جو صورت حال پیش آئے گی، وہ تاریخی معلومات کے مطابق یہ ہوگی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اپنے آرٹیکل اسپین کی تاریخ (History of Spain) میں بتایا ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے وقت اسپین کے باشندوں کی کل تعداد تخمیناً چالیس لاکھ تھی۔ جو عرب مسلمان اسپین میں داخل ہوئے، ان کی تعداد تقریباً پچاس ہزار تھی۔ اس تعداد میں دو طریقے سے اضافہ ہوا۔ ایک، توالد و تناسل کے ذریعہ۔ اور دوسرا، ان عیسائیوں کی شکل میں جو اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہوگئے۔ اس طرح آخری دور میں اسپین کے پانچ بڑے شہروں میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تین لاکھ ستاسی ہزار (387,000) تھی۔ (EB-17/419)

حساب کی آسانی کے لئے اسپین سے مسلمانوں کے خاتمہ کی مدت کو ایک سو سال مان لیجئے۔ اور اسپینی مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کر کے اس کو پانچ لاکھ فرض کر لیجئے۔ اب دیکھئے کہ اسپین کی آزمودہ تدبیر کو اگر ہندستان میں اختیار کیا جائے تو یہاں کے ۲۰ کروڑ مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لئے کتنی زیادہ مدت درکار ہوگی۔

علم الحساب بتاتا ہے کہ خاتمۂ نسل کے اس عمل کے پورا ہونے میں چالیس ہزار سال لگ جائیں گے۔ ایک سو سال میں پانچ لاکھ انسانوں کو ھلاک کرنے کی رفتار سے جو مدت قرار پاتی ہے وہ یہی ہے۔

واضح ہو کہ خاتمۂ نسل کے لئے ۴۰ ہزار سال کی یہ مدت بھی اس وقت ہے جب کہ اس دنیا میں کوئی بھی ناموافق صورت حال پیش نہ آئے۔ مثلاً توالد و تناسل کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ ہندوا اپنی موجودہ طاقت کو مسلسل چالیس ہزار سال تک برقرار رکھیں کوئی عالمی واقعہ اس رفتار میں خلل نہ ڈالے۔ ہندوؤں کے ساتھ وہ واقعہ نہ ہو جو تاتاری ظالموں

کے ساتھ ہوا جنھوں نے پچاس برس کے اندر اسلام قبول کر لیا۔ حتی کہ چالیس ہزار سال تک قیامت کی آمد بھی رکی رہے۔ وغیرہ۔

اس طویل مدت کے دوران اگر کوئی بھی ناموافق صورت حال پیش آجائے تو مذکورہ عمل کی تکمیل کی مدت دگنا یا اس سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ کیا کوئی شخص بقید ہوش و حواس اس قسم کے ایک عمل پر یقین کر سکتا ہے۔ کیا تاریخ میں کسی بھی ایسے انسانی ظلم کی مثال موجود ہے جو چالیس ہزار سال تو درکنار، چار سو سال بھی مسلسل جاری رہا ہو۔ پھر اس قسم کے بے بنیاد مفروضے سے اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

"دوسرا اسپین" نحوی اعتبار سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے سراسر غلط ہے۔ بہت سے فیصلہ کن پہلو ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ کو قدیم زمانہ سے بالکل مختلف بنا دیا ہے۔ وہ مذہبی تشدد کا زمانہ تھا، آج مذہبی رواداری کا زمانہ ہے۔ وہ بادشاہت کا دور تھا، اب جمہوریت کا دور ہے۔ وہ واقعہ پریس کے دور سے پہلے پیش آیا۔ اب پریس اور ریڈیو کے دور نے صورت حال کو یکسر بدل دیا ہے۔ اُس وقت کوئی "اقوام متحدہ" نہ تھا، آج اقوام متحدہ کی صورت میں انسانی حقوق کے تحفظ کا بین اقوامی ادارہ موجود ہے جس کا خود ہندستان بھی ایک رکن ہے اور جس کے چارٹر پر اس نے بھی دستخط کئے ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ

مزید یہ کہ اس قسم کے بھیانک واقعات کبھی بھی تاریخ میں دوسری بار دہرائے نہیں جاتے۔ اس قسم کا وحشیانہ واقعہ جب ایک بار پیش آکر مشہور عام ہو جائے تو پورا عالمی ضمیر اس کے خلاف متحرک ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایسے کسی واقعہ کا ایک بار پیش آنا بذات خود اس کے لئے مانع بن جاتا ہے کہ وہ دوبارہ پیش آئے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ امریکہ نے جاپان میں ۱۹۴۵ میں دو ایٹم بم گرائے۔ مگر اس کے بعد ویٹ نام کی جنگ پیش آئی تو ایٹم بم رکھتے ہوئے بھی وہ ان کو استعمال نہ کر سکا۔ امریکہ کے لئے یہ جنگ قومی ساکھ کی جنگ تھی۔ اس نے اس بارہ سالہ جنگ میں اپنی تمام طاقت لگا دی۔ حتی کہ امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک جنگ میں اس کے ۵۸۰۰۰ فوجی ھلاک ہو گئے۔ اس کے باوجود امریکہ کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ اس جنگ کا فیصلہ اپنے حق میں کرنے کے لئے ایٹم بم استعمال

کرے۔ آخر کار امریکہ جنوری ۱۹۷۳ میں یک طرفہ پر اس جنگ سے علیحدہ ہوگیا۔ بالفاظ دیگر امریکہ نے ویت نام میں پسپائی اختیار کرلی مگر وہ دوسری بار ایٹم بم گرانے کی ہمت نہ کرسکا۔

جو لوگ دوسرے اسپین کی باتیں کرتے ہیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ بولنا نہیں جانتے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے: من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت (جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ خیر کی بات بولے ورنہ خاموش رہے)

خلاصۂ کلام

جو لوگ "دوسرے اسپین" کی بات کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہندو نازی پچھلے پچاس سال سے خاتمۂ نسل کے اس منصوبہ کو زیر عمل لانے میں مصروف ہیں۔ مگر خود یہی واقعہ اس خطرے کو بے اصل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ خاتمۂ نسل کی اس منظم کوشش کے باوجود پچھلے پچاس سال کے اندر اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد دگنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

عقل کہتی ہے کہ تاریخ کے بارہ میں پیشگی اندازے اکثر غلط ثابت ہوئے ہیں۔ اسلام بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، فیصلۂ خداوندی کے تحت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل اور دین دونوں کا تقاضا ہے کہ اگر کوئی خطرہ فی الواقع عملاً پیش آجائے تو اس سے بچنے کی تدبیر ضرور کرنا چاہئے۔ مگر جو خطرہ پیش نہیں آیا، جو ابھی مستقبل کے مفروضہ خطرہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی بابت سوچ کر غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو پریشان نہ کیا جائے۔

دوسرے اسپین کا معاملہ تو اس سے بھی آگے کا ہے۔ اب تک کے تمام عقلی اور تاریخی اندازوں کے مطابق وہ سرے سے وقوع میں آنے والا ہی نہیں۔ پھر ایسے بے بنیاد خطرہ کا اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

ہندستان کدھر

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ایک ایسا دھماکہ خیز واقعہ ہوا جو غالباً ہندستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ وہ شہر جس کا نام ہندو بزرگوں نے ایودھیا رکھا تھا، یعنی وہ مقام جہاں تشدد نہ ہو۔ وہاں ہندو انتہا پسندوں کی ایک بھیڑ خلاف قانون طور پر جمع ہوئی۔ اس نے تشدد کا مظاہرہ کرتے ہوئے بابری مسجد کے اطراف کی پختہ چہار دیواری کو توڑ دیا۔ مسجد کے ایک گنبد کو نقصان پہنچایا پھر وہ اس کے اوپر چڑھ گئے اور اس کے تینوں گنبدوں پر اپنا بھگوا جھنڈا لہرا دیا۔ اس لاقانونیت کو روکنے کے لئے پولیس نے گولی چلائی جس میں ۲۵ سے زیادہ آدمی ہلاک ہو گئے۔

ایودھیا میں مجنونانہ تشدد کا یہ مظاہرہ اس وقت کیا گیا جب کہ بابری مسجد۔ رام جنم بھومی کا قضیہ ملکی عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اس بنا پر حکومت نے اور ملک کے تمام منصف مزاج لوگوں نے بار بار یہ اپیل کی تھی کہ ہندو انتہا پسند عدالت کا احترام کرتے ہوئے اس کے فیصلہ کا انتظار کریں۔ عدالتی فیصلہ آنے سے پہلے بطور خود کوئی کارروائی نہ کریں۔ مگر تمام اپیلوں کو نظر انداز کرکے وہ اپنے گھروں سے نکلے تاکہ ایودھیا میں داخل ہو کر یودھ کریں اور پھر پورے ملک میں نفرت اور تشدد کی لہر پھیلا دیں۔

یہ واقعہ ہندستان کی رواداری کے اس تصور کے سراسر خلاف ہے جو ہزاروں سال سے اس ملک میں چلی آرہی ہے اور جس کو اب تک ہندستان کا پرفخر سرمایہ سمجھا جا رہا تھا۔ یوپی اور مرکزی حکومت نے چالیس کروڑ روپیہ کے خرچ سے اس کا انتظام کیا تھا کہ وہ رواداری کی اس قدیم روایت کو بچا سکیں۔ مگر مجنونانہ سیلاب کے آگے قانون اور ایڈمنسٹریشن کے بند بھی ٹوٹ گئے۔ کارسیوکوں نے اپنی حد تک تخریب کاری میں کمی نہیں دکھائی۔ اس واقعہ کی رپورٹ کافی تفصیل کے ساتھ اخباروں میں آچکی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۳۱ اکتوبر) نے بالکل درست طور پر لکھا ہے کہ ہندو فرقہ کی زیادہ بڑی تعداد کبھی اس سے اتفاق نہیں کرے گی۔ بلکہ ہندوؤں کی نہایت عظیم اکثریت کے لئے یہ واقعہ سخت پریشانی حتی کہ شرم کا باعث ہوگا:

Their "achievement", such as it is, will generate feelings of acute embarrassment, not to speak of shame, among an overwhelming majority of Hindus.

نئی دہلی کے دوسرے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (یکم نومبر ۱۹۹۰) نے اس معاملہ
ایک کارٹون میں کامیاب طور پر دکھایا ہے جو اس کے صفحہ اول پر چھپا ہے۔ اس کارٹون میں کھیل
کا ایک میدان دکھایا گیا ہے۔ اس میدان میں ایک طرف ہندستان کے سابق وزیر اعظم وی
پی سنگھ کھڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر ایل کے اڈوانی پر جوش
طور پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دونوں اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی دو انگلیوں سے وکٹری
(V) کا نشان بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے ایک دبلا کمزور آدمی نہایت خستہ حالت
میں زمین پر گرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ہاری ہوئی لاش کے اوپر لکھا ہوا ہے : انڈیا۔

موجودہ ہندستانی لیڈر جس سیاسی پالیسی پر چل رہے ہیں، یہ کارٹون اس کی نہایت صحیح
تصویر ہے۔ یہ لوگ ملک کی بربادی کی قیمت پر اپنی سیاسی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نفرت اور تعصب اور تشدد
کو جگا کر اس کے ذریعہ سے ملک کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۰ کے آخر میں جو حالات
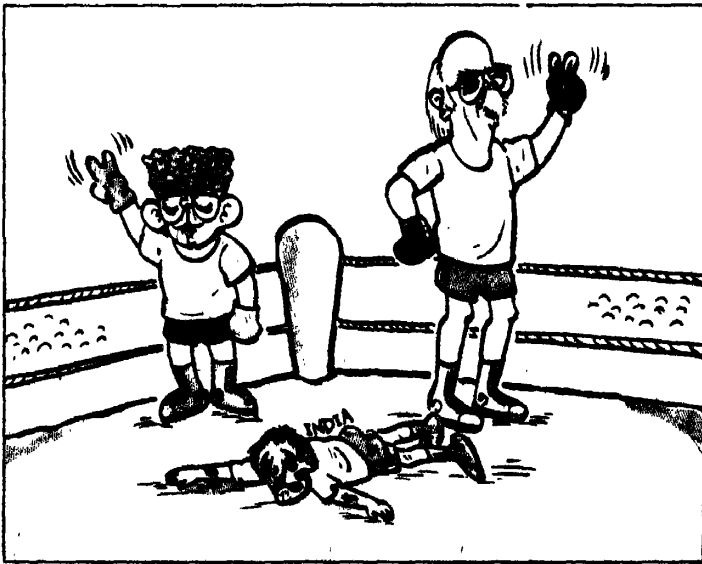
لیڈر کی جیت ملک کی ہار

سامنے آئے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ یہ لیڈر اپنی پالیسی میں کامیاب ہیں۔ ان کی تباہ کن پالیسی نے اگرچہ ملک اور قوم کو بربادی کے آخری کنارے پر پہنچا دیا ہے، تاہم یہ لیڈر خود اس قابل ضرور ہو گئے ہیں کہ وہ، کم از کم وقتی طور پر، اپنی سیاسی فتح کی خوشی کا جشن منا سکیں۔

پچھلے چند سالوں میں ہندستان میں مذہب کے نام پر سیاست کا جو تخریبی کھیل کھیلا گیا ہے، اس میں لیڈر لوگ جیت گئے مگر ملک ہار گیا۔ لیڈروں نے اپنا شاندار قلعہ ضرور کھڑا کر لیا ہے، مگر ان کا یہ سیاسی قلعہ صرف ملک کے کھنڈر پر بن کر کھڑا ہوا ہے۔

ہندستان کا ضمیر اس المناک حادثہ پر چیخ اٹھا ہے۔ بجا طور پر لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ متشددانہ حملہ "بابری مسجد" پر نہ تھا بلکہ خود ہندو دھرم کی اپنی مقدس روایات پر تھا۔ چنانچہ ملک کے بے شمار لوگوں نے تقریر اور تحریر کے ذریعہ اس کی مذمت کی اور اس کے بارہ میں اپنے درد وکرب کا اظہار کیا۔ ہندوؤں کی کم از کم ۵۰ فی صد تعداد نے اس کو برا بتایا۔

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۳۱ اکتوبر ۱۹۹۰) نے اپنے صفحہ اول پر ایک ایڈیٹوریل شائع کیا ہے۔ اس غیر معمولی اڈیٹوریل بعنوان مضطرب ہندستان (Anguished India) میں اس نے لکھا ہے کہ :

> The BJP and the VHP clearly failed to realise that whipping up atavistic passions for political gain would give them at best a pyrrhic victory (p.1)

بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد واضح طور پر یہ سمجھنے میں ناکام رہے ہیں کہ سیاسی مقصد کے لئے پشتینی جذبات کو بھڑکا کر وہ زیادہ سے زیادہ جو چیز پائیں گے وہ ان کے لئے صرف ایک تباہ وبرباد فتح ہو گی۔

تلخ حقیقت

ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈر کیا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مغل دور میں ہمارے اوپر ظلم کیا گیا ہے۔ اب ہم اس کا انتقام لیں گے۔ اس سے قطع نظر کہ ظلم کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ سوال یہ ہے کہ اگر مغل حکمرانوں نے ظلم کیا تو ان کو اپنے "ظلم" سے کیا ملا۔ اس کا نتیجہ جو ان کے حصہ میں آیا وہ صرف یہ تھا کہ ان کی

ومت کمزور ہوگئی۔ اور آخر کار ۱۸۵۷ میں وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

اسی طرح ہندوؤں کے انتہاپسند لیڈر کہتے ہیں کہ انگریزوں نے ہمارے اوپر ظلم کیا۔ اس سے لع نظر کہ ظلم کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ دوبارہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اپنے "ظلم" سے کیا ۔ ان کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ ملک کے اندر ان کے اقتدار کی جڑیں اکھڑ گئیں۔ اور ۱۹۴۷ میں آخری در پر ان کا اقتدار ختم ہوگیا۔

ہندوؤں کے انتہاپسند لیڈر کہتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے بعد کانگرس پارٹی کی جو حکومت نی، اس کی پالیسی اقلیت کو خوش کرنے (appeasement) کی تھی۔ چنانچہ وہ مسلسل ہندوؤں کے وپر ظلم کرتی رہی۔ اس سے قطع نظر کہ ظلم کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ سوال یہ ہے کہ کانگریس کو اس "ظلم" سے کیا ملا۔ اس کو صرف یہ ملا کہ وہ کمزور ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ۱۹۸۸ کے الکشن نے اس کے حق میں اقتدار سے بے دخلی کا فیصلہ کر دیا۔

ہندوؤں کے انتہاپسند لیڈروں نے دوبارہ ظلم کا طریقہ اختیار کیا ہے، وہ بھی اپنے پیش روؤں کی طرح ظلم کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ انتہاپسند لیڈر اپنے لئے کیا پسند کر رہے ہیں۔ کیا وہ دوبارہ اسی تباہی کی سیٹ پر بیٹھنا چاہتے ہیں جس کو ان کے کہنے کے مطابق مغلوں اور انگریزوں اور کانگریسیوں نے خالی کیا ہے۔ اگر انھوں نے اپنے لئے اسی راستہ کا انتخاب کیا ہے تو کیا انھیں معلوم نہیں کہ قدرت کا قانون سب کے لئے یکساں ہے۔ وہ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ جس ظلم نے پچھلے حکمرانوں کو پیچھے دھکیل دیا، وہی ظلم نئے حکمرانوں کے ساتھ کیا اس کے سوا کوئی اور سلوک کرے گا جو وہ پچھلے حکمرانوں کے ساتھ کرتا رہا ہے۔ پھر یہ انتہاپسند لوگ اپنے لئے کس انجام کا انتظار کر رہے ہیں۔

ہندوؤں کے انتہاپسند لیڈروں کو ممکن ہے کہ اپنی منفی سیاست کا یہ سیاسی فائدہ ملے کہ وہ ووٹروں کی ایک تعداد کی نظر میں ان کے قومی ہیرو بن جائیں۔ اس طرح ممکن ہے کہ وہ اگلا الکشن جیت لیں اور حکومت کی کرسیوں پر اپنے آپ کو پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں مگر جتنا امکان اس بات کا ہے، اس سے زیادہ امکان اس کا ہے کہ ان کی موجودہ مفسدانہ کارروائیوں کی بنا پر قدرت کا قانون ان کے خلاف حرکت میں آجائے۔ اس کے بعد وہ ظالموں کے خانہ میں لکھ دئے جائیں۔

اور آخر کار ذلت کے ساتھ انھیں اقتدار کی کرسیوں سے ہٹا دیا جائے جس طرح پچھلے لوگ ہٹا دئے گئے۔

موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو عمل کا موقع دیا جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ قدرت کا قانون یہ بھی ہے کہ جب ایک گروہ سماج کے اندر فساد اور بگاڑ پیدا کرنے لگے تو اس کو ہٹا کر دوسرے گروہ کو اس کی جگہ پر لایا جائے۔ تبدیلی قیادت کا یہ قانون ساری انسانی تاریخ میں برابر جاری رہا ہے۔ اور بلاشبہ ہندستان قدرت کے اس عمومی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

وقار کی لڑائی

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ یہ ہندستان کے وقار کے خلاف تھا کہ باہر کی ایک قوم آکر یہاں حکومت کرے۔ چنانچہ اس کے خلاف آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ زبردست قربانیوں کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان آزاد ہوگیا۔

اب یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہندستان کے لوگ ایک ہو کر ملک کو ترقی دینے میں لگ جاتے۔ مگر ایسا ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آزادی ملک کے بٹوارہ کے روپ میں آئی۔ ملک کے لوگ دو بڑے فرقوں کی صورت میں بٹ گئے۔ ایک نے مطالبہ کیا کہ "تقسیم ہند" دوسرے نے اس کو رد کرتے ہوئے کہا کہ "اتحاد ہند" اس حریفانہ سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی وقار کا مسئلہ ملک سے ختم نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی وہ "ہندو وقار" اور "مسلم وقار" کی صورت میں بدستور باقی رہا۔

۱۹۴۷ سے مسلسل یہ صورت حال جاری ہے کہ جب بھی کوئی نزاعی معاملہ پیدا ہوتا ہے تو موجودہ نفسیات کی بنا پر وہ فوراً دونوں فرقوں کے لئے وقار کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ مثلاً ہندوؤں کا ایک جلوس نعرہ لگاتا ہوا مسلم محلہ سے گزرتا ہے۔ اب وہاں کے مسلمان فوراً یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کا ملی وقار مجروح ہو رہا ہے۔ وہ مانگ کرتے ہیں کہ جلوس کی روٹ کو بدلا جائے۔ اس کے بعد ہندو وقار جاگ اٹھتا۔ ہندو سمجھتا ہے کہ اگر میں نے اپنے جلوس کا راستہ بدلا تو میرا قومی وقار ختم ہو جائے گا۔ اب دونوں طرف سے ضد بڑھتی ہے۔ دونوں اس منفی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کو قرآن میں حمیت جاہلیہ کہا گیا ہے (الفتح ۲۶)

یہی صورت بابری مسجد۔ رام جنم بھومی کے قضیہ میں پیش آئی۔ ۱۹۸۶ کے بعد جب یہ نزا

ڑھی تو مسلمانوں نے کہا کہ ہمارے لئے یہ صرف ایک مسجد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ملت کی موت وحیات کا مسئلہ ہے۔ اس لئے ہم اس معاملے میں کسی قیمت پر پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ ہندوؤں نے کہا کہ یہ ہمارے لئے صرف ایک مندر کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ ہمارے لئے دوسری شکست (second defeat) کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہم نے بٹوارہ کو مان کر پہلی بار شکست قبول کر لی تھی۔ اب ہماری حکومت ہے۔ اب ہم دوسری بار شکست کو قبول نہیں کریں گے۔ اس طرح ایک سادہ سا مسئلہ دو فرقوں کے لئے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ اور جب کوئی مسئلہ وقار کا مسئلہ بن جائے تو اس کی پیچیدگی ہزاروں گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

وقار کی یہ لڑائی پچھلے پچاس سال سے جاری ہے اور اس نے ہندستان کی ترقی کے سفر کو ایک بندگلی (impasse) کے سامنے لا کھڑا کر دیا ہے۔ جب تک وقار کا جھگڑا ختم نہ ہو، ملک کی ترقی کا سفر دوبارہ جاری ہونے والا نہیں۔

تاریخ کا تجربہ ہے کہ اس طرح کا مسئلہ کبھی دو طرفہ بنیاد (bilateral basis) پر ختم نہیں ہوتا۔ اس قسم کا پیچیدہ مسئلہ جب بھی ختم ہوتا ہے، وہ یک طرفہ بنیاد (unilateral basis) پر ختم ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ یک طرفہ اقدام کون کرے۔

حالات کا بے لاگ تجزیہ بتاتا ہے کہ ہندو، کم از کم موجودہ حالات میں، اس یک طرفہ اقدام کے لئے ہرگز تیار نہیں ہو سکتا۔ ہندو نفسیات کی پیچیدگی یہ ہے کہ ابھی تک وہ "فرسٹ ڈیفیٹ" کا صدمہ لئے ہوئے ہے۔ اور اب چوں کہ ملکی نظام میں اس کو بالادستی (upper hand) حاصل ہے، اس لئے وہ کسی بھی حال میں اس چیز کو قبول کرنے پر راضی نہیں جس کو وہ اپنی موجودہ نفسیات کے تحت اپنے لئے سکنڈ ڈیفیٹ کا مسئلہ سمجھتا ہے۔

ذہنی انتشار

آج ملک کے تمام ذہن اس معاملہ میں سخت سراسیمہ ہیں۔ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ ملک بدترین تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ مگر جب وہ مسئلہ کا حل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو عملی اعتبار سے انھیں کوئی بھی ممکن حل نظر نہیں آتا۔ مسٹر خوشونت سنگھ نے ہندستان ٹائمس (۳ نومبر ۱۹۹۰) میں قوم کی موجودہ حالت (state of the nation) پر ایک نوٹ شائع کیا ہے۔ اس میں وہ ملک کے موجودہ حالات اور اس پر اپنی گہری تشویش کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں کہ مجھے افسوس ہے کہ میں قارئین کو

مایوس کر رہا ہوں جو مجھ سے کوئی مثبت تجویز سننے کے امیدوار ہوں گے۔ مستقبل کے بارہ میں میرا ذہن بھی اتنا ہی منتشر ہے جتنا کسی دوسرے شخص کا:

I am sorry to disappoint readers who expect some positive suggestions from me. I am as confused about the future as everyone else.

حل کیا ہے

اس معاملہ میں سوچنے کا ایک طریقہ خالص فرقہ وارانہ ہے۔ یعنی ہندو مسلمانوں کو قصور وار ٹھہرائیں اور مسلمان ہندوؤں کا قصور ثابت کریں۔ یہ طریقہ صرف متعصبانہ ذہنوں کو اپیل کر سکتا ہے عام انسان اس کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتا۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو "منطقی انصاف" کہا جا سکتا ہے۔ یعنی معاملہ کو بالکل منطقی انداز میں دیکھ کر یہ طے کرنا کہ کس کی کتنی غلطی ہے اور کون کتنا قصوروار ہے۔ تمام سنجیدہ لوگ اسی انداز میں لکھ اور بول رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مسٹر موہن چراغی نے لکھا ہے:

"میری طرح کروڑوں ہندو اپنے ہم مذہب جنونی لوگوں کے دیوانہ پن سے گردن جھکانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کیا اتنے بڑے ملک میں جہاں لاکھوں مندر اور تیرتھ استھان ہیں، ایک اور مندر بننے سے ہندو دھرم کا ناش ہو جاتا۔ قصور صرف ہندو فرقہ پرستوں کا نہیں ہے، مجرم وہ مسلم لیڈر بھی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی غربت، افلاس، بیکاری اور مایوسی کا فائدہ اٹھا کر اپنے مفاد کے لئے بابری مسجد کو ہندستان میں اسلام کی علامت قرار دے کر ہندو فرقہ پرستی کو پنپنے کا موقع دیا کبھی یوم جمہوریہ کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کر کے، کبھی لانگ مارچ کا نعرہ بلند کر کے اور کبھی آدم فوج بنانے کا اعلان کر کے، وشو ہندو پریشد کے زندہ رہنے کا سامان کیا۔ مجرم تو وہ سیاست داں اور حاکم بھی ہیں جو رام جنم بھومی۔ بابری مسجد کے ڈھانچہ پر سیاسی محل کھڑے کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں" (قومی آواز ۲ نومبر ۱۹۹۰)

خالص منطقی اعتبار سے یہ بات صدفی صد درست ہے۔ مگر اپنی ساری درستگی کے باوجود یہ اصل مسئلہ کا حل نہیں۔ پیچیدہ اجتماعی مسائل میں اس قسم کا منطقی انصاف کبھی واقعہ نہیں بنتا۔ یہ انداز نظری اعتبار سے جتنا صحیح ہے، عملی اعتبار سے وہ اتنا ہی غیر مفید ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے پیچیدہ جھگڑوں کا عملی حل صرف یہ ہے کہ کوئی ایک فریق تنہا رسک
لینے پر آمادہ ہو جائے ، وہ تنہا ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے معاملہ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دے۔
جب دو طرفہ بنیاد پر مسئلہ کو حل نہ کیا جاسکتا ہو تو اس کے بعد مسئلہ کو حل کرنے کی ایک ہی قابل عمل
صورت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کو یک طرفہ بنیاد پر حل کیا جائے۔ ایسی حالت میں میں اپنے مسلمان
بھائیوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس قربانی کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ وہ ملک کی ترقی کے
لئے اور نتیجۃً خود اپنی ترقی کے لئے ، یہ قربانی دیں کہ وہ یک طرفہ طور پر اپنے اندر سے وقار کی مذکورہ نفسیات
کو ختم کر دیں۔ قرآن کے الفاظ میں وہ ، کلمۂ جاہلیت کے مقابلہ میں کلمۂ تقویٰ کا ثبوت دیں (الفتح ۲۶
موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا یہی واحد ممکن حل ہے۔
ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جب بھی کوئی نزاع پیدا ہو تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ا
کو یا تو نظر انداز کر دیں یا اسی محدود دائرہ میں رکھ کر اس کو حل کرنے کی کوشش کریں جس محدود
دائرہ میں وہ مسئلہ ابتداءً پیدا ہوا تھا۔ مسلمان کسی بھی حال میں ہرگز ایسا نہ کریں کہ اس کو پوری ملت
کے وقار کا سوال بنا دیں۔ یہ طریقہ مسلمانوں کے لئے یک طرفہ قربانی کے ہم معنی ہوگا۔ مگر جس
دن مسلمانوں نے یہ قربانی دے دی ، اسی دن ملک میں ترقی کا نیا سفر شروع ہو جائے گا۔ اور جو سفر
شروع ہو جائے وہ آخر کار اپنی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔
نزاعی مسئلہ کے حل کا یہی وہ یک طرفہ طریقہ ہے جس کا مظاہرہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم
نے حدیبیہ (۶۲۸ء) کے موقع پر کیا تھا۔ اس اصول کو ایک لفظ میں ——— حدیبیہ اصول
(Hudaibiya principle) کہا جاسکتا ہے۔ اس نازک موقع پر اگر مسلمان اس اصول کا مظاہرہ
کریں تو وہ نہ صرف ملک کو رہنمائی دیں گے ، نہ صرف اپنا ملی مسئلہ حل کریں گے بلکہ وہ دنیا کے سامنے
اسلام کے ایک قیمتی اصول کی شہادت دیں گے۔ اور بلاشبہ اسلام کی شہادت سے زیادہ بڑا ع
اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

دوطرفہ مشکل

دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے تحت ۱۵ اگست ۱۹۹۰ کو ایک سمپوزیم ہوا۔ اس میں اعلیٰ ہندو دانشوروں نے حصہ لیا۔ اس کی مکمل کارروائی انسٹی ٹیوٹ کے منتقل جرنل منتھن (Manthan) کے شمارہ ستمبر ۱۹۹۰ میں چھپی ہے۔

سمپوزیم کے ایک مقرر ٹائمس آف انڈیا کے سابق ایڈیٹر شری گری لال جین تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ عام تصور کے خلاف، ملک کے سامنے بنیادی مسئلہ، جیسا کہ میرا خیال ہے، ہندو مسلم مسئلہ نہیں ہے اور نہ کبھی تھا۔ بنیادی مسئلہ دراصل ہندو ہندو مسئلہ ہے۔ یہی پہلے بھی تھا، اور یہی مستقبل بعید تک باقی رہے گا۔ ہندو سماج، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، نہایت گہرائی کے ساتھ ذات کی بنیاد پر بٹا ہوا ہے۔ آزادی کے بعد سے ملک کے بااختیار طبقہ کی ہر کوشش جو اس کی اصلاح کے لئے کی گئی اس نے صرف اس کش مکش میں اضافہ کیا۔

اس کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ ہم وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی عظیم قیادت کے تحت ملک میں خانہ جنگی کے حالات دیکھ رہے ہیں۔ ہندستان کی آزادی خونی حالات میں آئی۔ آزادی بار بار خون میں نہلائی گئی ہے۔ میں یہ اندوہناک احساس رکھتا ہوں کہ جو کچھ ہم نے ماضی میں دیکھا ہے

Contrary to the popular perception, the central issue before the country, as I see it, is not, and has not been, the Hindu-Muslim problem. The central issue has been, and is going to remain for the foreseeable future, the Hindu-Hindu problem. The Hindu society, it is a commonplace, is deeply fragmented along caste lines, and since independence every 'care' has been taken by many of those in charge of the country's affairs to see to it that those conflicts get aggravated. Finally, under the 'great' leadership of Vishwanath Pratap Singh, we face conditions of near civil war.

I view the future of India — I am sorry to say on Independence Day with deep misgivings. Independence itself, you will recall, was born in bloodshed. Independence has since then been bathed in blood again and again. I have the terrible feeling that what we have seen in the past will pale into insignificance in comparsion with what awaits us in the future. I do not believe that anything like sensible political order is likely to emerge in this country in the near future, or indeed forseeable future. The Muslim problem is only one expression of this failure of the Hindus to create and sustain a political order which conforms to their genius and needs.

وہ اس کے مقابلہ میں بہت ہلکا ہے جو مستقبل میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ میرا یقین نہیں کہ ملک میں آئندہ کوئی ایسی چیز ظاہر ہونے والی ہے جس کو معقول سیاسی نظام کہا جا سکے۔ مسلم مسئلہ ہندوؤں کی اسی ناکامی کا صرف ایک اظہار ہے کہ وہ ملک میں ایسا سیاسی نظام قائم نہ کر سکے جو ان کی اہلیت اور ملکی ضرورتوں کے مطابق ہو (صفحہ ۲۶ - ۲۷)

مسٹر گری لال جین نے جو بات یہاں کہی وہ بے حد قابل غور ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو سماج کی بنیاد چار ورن (caste system) پر ہے۔ کاسٹ سسٹم ہندو ازم کا لازمی جزء ہے۔ ہندو ازم کی نفی کی قیمت پر ہی تقسیم انسانیت کے اس اصول کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہندو ازم کو مانتے ہوئے اس اصول کا انکار ممکن نہیں۔ کیوں کہ یہ اصول ہندو ازم کی مقدس کتابوں میں واضح طور پر درج ہے۔ مثال کے طور پر رگ وید میں سماج کو چار درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ ان کا نیچا اور اونچا ہونا ہے۔ اس کے مطابق برہمن، کشتری، ویشس اور شدر، بالترتیب خدا کے منہ، بازو، ران اور پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔

برہمن کا کام مذہبی رسوم ادا کرنا ہے، کشتری کا کام فوجی ذمہ داریوں کو سنبھالنا ہے۔ ویشس کا کام زراعت کرنا اور شدر کا کام خدمت کرنا ہے۔ (EB-X/361)

ہندو سماج میں یہ تصور کتنی گہرائی کے ساتھ جما ہوا ہے، اس کا ایک مظاہرہ ۱۹۹۰ میں منڈل کمیشن کے خلاف تحریک کی صورت میں ہوا۔ یہ تحریک اتنی شدید تھی کہ تقریباً ۱۰۰ ہندو نوجوانوں نے خود سوزی کا انتہائی اقدام کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منڈل کمیشن نے پست طبقہ کے لوگوں کے لئے سرکاری ملازمتوں میں ۲۷ فیصد رزرویشن دے دیا تھا۔ اوپر کا ہندو طبقہ اس کو دیکھ نہیں سکتا تھا کہ پست طبقہ کے افراد اس طرح سرکاری سروسوں میں ان کے برابر پہنچ جائیں۔ اونچے طبقہ کے ہندو نوجوانوں نے اس کے خلاف اتنی زبردست تحریک چلائی کہ سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ کی حکومت ہل گئی۔ یہاں تک کہ ۷ نومبر ۱۹۹۰ کو مسٹر سنگھ نے اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا جس نے منڈل کمیشن کی تجاویز کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کاسٹ سسٹم ہندو قوم کے اتحاد میں ایک ابدی رکاوٹ ہے۔ اس سسٹم کے ہوتے ہوئے ہندو قوم کبھی متحد نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں اتحاد نہ ہو وہاں طاقت کا وجود بھی نہیں۔

پھر ہندو قوم میں اتحاد لانے کا طریقہ کیا ہو۔ صف اول کے ایک ہندو جرنلسٹ (گر ی لال جین) نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندو قوم کے پاس متحد ہونے کی کوئی مثبت بنیاد موجود نہیں ۔ وہ صرف منفی جذبہ کی بنیاد پر متحد ہوسکتی ہے۔ اور یہ منفی جذبہ موجودہ حالات میں صرف مسلم دشمنی ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ ہم اینٹی مسلم احساس کو بھڑکا کر ہی ہندوؤں کو متحد کرسکتے ہیں۔ مگر منفی بنیاد پر پیدا کیا جانے والا اتحاد کبھی مثبت فائدہ کا سبب نہیں ہوسکتا۔ اس طرح کا اتحاد تخریبی نتیجہ دکھا سکتا ہے مگر وہ تعمیری کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔

مسٹر گری لال جین نے ہندو سماج کی اس مشکل کا ذکر (ٹائمس آف انڈیا ۴ جولائی ۱۹۸۷) کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس طرح ہم دو طرفہ مشکل میں مبتلا ہیں۔ کیوں کہ جو چیز ممکن ہے وہ مطلوب نہیں اور جو چیز مطلوب ہے وہ ممکن نہیں:

Thus what is possible is not desirable,
and what is desirable is not possible.

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو سماج کتنی زیادہ بے بسی کی حالت میں ہے۔ وہ خود اپنی بنیاد پر کھڑا نہیں ہوسکتا۔ اس کو کھڑا ہونے کے لئے لازمی طور پر ایک خارجی سہارا درکار ہے۔ اگر یہ خارجی سہارا موجود نہ ہو تو اس کی دیوار اپنے آپ گر پڑے گی، بغیر اس کے کہ کسی نے براہ راست طور پر اس کو گرانے کی کوشش کی ہو۔

مسلمانوں کے نادان لیڈر بابری مسجد تحریک کو حد تناسب سے باہر لے گئے۔ انھوں نے بابری مسجد کے نام پر دھواں دھار تحریک چلاکر ہندوؤں کو یہی سہارا فراہم کر دیا۔ ہندوؤں کے انتہاپسند لیڈروں نے مسلمانوں کے پرجوش قائدین کے لفظی طوفان کو بھرپور طور پر استعمال کیا۔ انھوں نے اس کے ذریعہ سے اپنی قوم میں اینٹی مسلم فیلنگ پیدا کر دی۔ وہ چیز جس کو ہندو لہر (Hindu wave) اور ہندو اتحاد کہا جاتا ہے، وہ تمام تر اسی اندھی اینٹی مسلم فیلنگ پر کھڑا ہوا ہے جس کا موقع خود ہمارے نادان لیڈروں نے ۱۹۸۶ اور ۱۹۹۰ کے درمیان اپنی سطحی کارروائیوں کے ذریعہ فراہم کیا۔

عبرت ناک

بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر مسٹر لال کرشن آڈوانی کی رتھ یاترا یکم اکتوبر ۱۹۹۰ کو سومناتھ سے شروع

و ٹی۔ اس کو دس ہزار کیلو میٹر کا سفر کرکے اجودھیا پہنچنا تھا۔ ۱۶ اکتوبر کو وہ دہلی میں داخل ہوئے۔
ہاں انھوں نے زبردست میٹنگ کی۔ اس میں انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارا "رام رتھ" ضرور اجودھیا
پہنچے گا اور ہم جنم بھومی پر رام مندر بنا کر رہیں گے۔ کوئی طاقت ہم کو اس سے روک نہیں سکتی۔

دہلی کے انگریزی اخبار اسٹیٹسمین (۱۸ اکتوبر ۱۹۹۰) میں اس میٹنگ کی پوری تفصیل چھپی ہے۔
سٹر آڈوانی نے جو کچھ کہا، اس میں سے ایک بات یہ تھی کہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے وشو ہندو پریشد کے ساتھ
بنا وزن صرف اس وقت ڈالا جب کہ ۱۹۸۶ میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنائی گئی اور اس کمیٹی نے اس
سئلہ کو ایک عوامی مسئلہ بنا دیا:

> BJP had thrown its weight behind the Vishwa Hindu Parishad only when the Babri Masjid Action Committee had been formed in 1986 and made it a public issue. (p.9)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ بابری مسجد کے نام پر آل انڈیا سطح کی ایکشن کمیٹی بنانا اور اس مسئلہ
وعوامی مسئلہ کی حیثیت سے چاروں طرف پھیلانا، یہ اصل مسئلہ کے حل میں صرف ایک رکاوٹ تھا۔
یوں کہ اس نے ہندوؤں میں جوابی تحریک پیدا کی اور ہندو زیادہ بڑی تعداد میں رام جنم بھومی
ی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو تو کچھ نہیں دیا۔ البتہ اس نے ہندو قوم
ے لئے اتحاد کی بنیاد فراہم کر دی۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ نفرت دو طرفہ بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے
بجتی ہے۔ فریقین میں سے ایک شخص اگر اپنا ہاتھ ہٹالے تو تالی کا بجنا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ موجودہ
ندو اتحاد نفرت کی زمین پر قائم ہے، اور یہ نفرت کی زمین اس کو مسلمانوں کی طرف سے مل رہی ہے۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ وہ اپنے "ہاتھ" کو یک طرفہ
ر پر سامنے سے ہٹا دیں۔ اس کے بعد تالی کا بجنا اپنے آپ بند ہو جائے گا۔ اس کے بعد نفرت کے غبارہ
ی ہوا خود بخود نکل جائے گی، اور پھر جو فضا بنے گی وہ عین اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہوگی۔

نادان دوست

نئی دہلی کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر کے شمارہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۰ میں مسٹر جے دوباشی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہندو لہر (The Hindu Wave) ہے۔ دو صفحہ کے اس مضمون میں انھوں نے پر فخر طور پر لکھا ہے کہ ہندو مستقبل کی لہر ہیں، اور اڈوانی کی رتھ یاترا اس لہر کی ایک علامت ہے:

The Hindus are the wave of the future. And Advani's Rath Yatra is a symbol of that wave.

یہ بات مختلف انداز سے ان ہندو صاحبان کی طرف سے کہی جارہی ہے جو بابری مسجد کو ڈھا کر اس کی جگہ رام مندر بنانے کی پر تشدد مہم چلا رہے ہیں۔ اس عنوان پر جذباتی تقریریں کر کے انھوں نے شمالی ہند کے کچھ ہندوؤں کو اپنے ساتھ جمع کر لیا ہے۔ اس کو وہ "ہندو لہر" سے تعبیر کرتے ہیں۔

شری اڈوانی کا رتھ جس کو دس ہزار کیلومیٹر کا سفر طے کر کے سومناتھ سے اجودھیا پہنچنا تھا، وہ رام رتھ نہیں بلکہ نفرت اور تشدد کا رتھ تھا۔ اس کا مقصد منفی بنیاد پر ہندوؤں کو متحد کرنا تھا۔ اس تحریک کے پیچھے جو ذہن کام کر رہا ہے، اس کا اندازہ وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری مسٹر اشوک سنگھل کے بیانات سے ہوتا ہے۔ مثلاً انھوں نے ۷ نومبر ۱۹۹۰ کو دہلی میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو وارننگ دی کہ وہ اجودھیا کی بابری مسجد کو ڈھا کر وہاں رام مندر بنانے کے منصوبہ کی مخالفت نہ کریں۔ ورنہ ہم ملک کی تین ہزار مسجدوں کو ڈھا کر وہاں مندر بنانے کی تحریک شروع کر دیں گے (ٹائمس آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۹۰)

اس قسم کی باتیں جو بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے لوگوں کی طرف سے کہی جارہی ہیں، اور اس کے نام پر عوام کی بھیڑ اکٹھا کی جارہی ہے، کیا اسی کا نام ہندو لہر ہے۔ کوئی بھی شخص جو ہندو دھرم کو جانتا ہو، وہ اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہ ہندو لہر نہیں ہے، زیادہ صحیح لفظ میں وہ اینٹی ہندو لہر ہے۔ اور برعکس طور پر اس کو ہندو لہر کہا جارہا ہے۔

ہندو دھرم کی تعلیمات میں دو چیزیں بے حد بنیادی ہیں۔ ایک رواداری، اور دوسرے عدم تشدد۔ آپ ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب کو اٹھائیں، اس میں آپ کو یہ دونوں باتیں لکھی ہوئی ملیں گی۔ یہ ہندو دھرم کی وہ خصوصیات ہیں جن کا ذکر اس کے تمام مفکرین اور مصلحین نے پرفخر طور پر کیا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) جلد ۸ میں ہندوازم (Hinduism) کے عنوان سے نہایت مفصل اور تحقیقی مقالہ ہے۔ اس میں درج ہے کہ ہندوازم، بطور اصول، عقیدہ اور عبادت کے تمام طریقوں کا احترام کرتا ہے۔ ایک ہندو ہر مذہب کو سچائی کا اظہار سمجھتا ہے۔ ہندوازم بطور اصول کے ہر مذہب کے حق میں روادار (tolerant) ہے، خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو (صفحہ ۸۸۸)

دوسری بات کے سلسلہ میں برٹانیکا میں بتایا گیا ہے کہ ہندوازم کا ایک نہایت اہم اصول اہمسا ہے۔ یعنی تشدد نہ کرنا۔ اسی لئے ہندوازم سختی کے ساتھ حیوان کے ذبیحہ کو منع کرتا ہے اور سبزی خوری پر زور دیتا ہے۔ ہندو مفکرین کے مطابق، اہمسا ہندو مذہب کی ایک بے حد بنیادی قدر ہے۔ اہمسا ہندو اخلاقیات کا ایک مرکزی اصول (keystone) ہے (صفحہ ۸۸۹)

اس اعتبار سے دیکھئے تو رام جنم بھومی تحریک، اپنی موجودہ شکل میں، واضح طور پر ہندو دھرم کے خلاف ہے۔ اس میں مذہبی رواداری کو کچلا جا رہا ہے۔ اس میں نفرت کا پرچار کیا جا رہا ہے۔ اس میں تشدد کا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اس تحریک نے جو لہر پیدا کی ہے، وہ اینٹی ہندو لہر ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں ہندو لہر۔

یہی وجہ ہے کہ ملک کے ہزاروں ہندوؤں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے۔ اور اس کو غیر ہندو تحریک بتایا ہے۔ مثال کے طور پر آنجہانی کملاپتی ترپاٹھی، ہندو دھرم کے ایک مسلّمہ عالم تھے۔ انھوں نے اپنی آخر عمر میں جون ۱۹۹۰ میں "سامپرادائک سمیا" کے نام سے ہندی میں ایک مقالہ لکھا تھا جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۲۰ اکتوبر ۱۹۹۰) میں اس کا انگریزی تعارف شائع ہوا ہے۔ اس میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے مسئلہ کا بھی ذکر ہے۔ مترجم کہتے ہیں:

> Lambasting the Vishwa Hindu Parishad and the Rashtriya Swayam Sevak Sangh, the elderly statesman said the very idea of demolishing a mosque was a negation of Hindu ethos. "It is a fascist idea and will break the country," he added.

وشو ہندو پریشد اور راشٹریہ سوم سیوک سنگھ کو سخت برا بتاتے ہوئے، بزرگ سیاست داں نے لکھا ہے کہ مسجد کو ڈھانے کا تصور بجائے خود ہندو خصوصیات کی نفی ہے۔ یہ فاشسٹ نظریہ ہے، یہ نظریہ ملک کو توڑ ڈالے گا۔

موجودہ لہر اگر حقیقی معنوں میں "ہندو لہر" ہوتی تو اس سے وہ نتائج نکلتے جو ہندو دھرم کے امتیازی اوصاف سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ملک سے اہنکار ختم ہوتا، کیوں کہ ہندو تعلیمات میں اہنکار کو بہت برا مانا گیا ہے۔ اس سے دوسروں کے اعتراف کا دریا امنڈتا، کیوں کہ ہندو فکر کی یہ امتیازی صفت ہے کہ وہ سچائی کے تعدد کا قائل ہے، ہر اختلاف کو وہ سچائی کا نیا روپ سمجھتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں چاروں طرف رواداری کی ہوائیں چلتیں، کیوں کہ ہندو فکر یہ کہتا ہے کہ اپنے کو برحق سمجھتے ہوئے دوسرے کے برسرحق ہونے کا بھی اعتراف کرو، خواہ بظاہر وہ تمہارے نظریہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس لہر کے بعد پورے ملک میں امن وشانتی اور جان کے احترام کا ماحول دکھائی دیتا، کیوں کہ ہندو دھرم جان مارنے کو آخری حد تک برا سمجھتا ہے۔ حتی کہ ایک ہندو مفکر نے کہا کہ احساس کو مارنے ہی کا نام گناہ ہے اور احساس کو نہ مارنے کا نام ثواب:

Killing of a sensation is sin, and vice versa.

مگر عملاً ہم اس کے بالکل مختلف صورت حال دیکھ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اس لہر کو ہندو لہر کیسے کہا جا سکتا ہے۔

"اگرواد" میں یقین کرنے والے کچھ لوگ اگر تشدد اور تخریب کی تحریک چلائیں اور اپنی تقریروں سے عوام کی ایک بھیڑ اکٹھا کرلیں، اس کے بعد اس کا نام گاندھی لہر رکھ دیں تو کیا یہ صحیح ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ صحیح نہ ہوگا۔ کیوں کہ ایسی لہر حقیقۃً اینٹی گاندھی لہر ہے نہ کہ گاندھی لہر۔

یہی معاملہ ان انتہا پسند ہندو بھائیوں کا ہے جن کو ٹائم میگزین (۵ انومبر ۱۹۹۰) نے جنگ جو (Militant Hindus) کہا ہے اور جو بابری مسجد کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں۔ وہ اپنی اس تحریک کو اس چیز کا حصہ سمجھتے ہیں جس کو وہ ہندتو کہتے ہیں۔ یہ تحریک باعتبار حقیقت مسلمانوں کے خلاف ہے۔ چنانچہ مسٹر ایل کے اڈوانی نے اس کی تشریح (minorityism versus nationalism) (اقلیت نوازی بمقابلہ قومیت) کے الفاظ میں کی ہے (انڈیا ٹوڈے، ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۰، صفحہ ۵۹)

اس موضوع پر ہمارے ہندو بھائی جو پرتشدد تحریک چلا رہے ہیں، وہ واضح طور پر رواداری، اہنسا اور ہر ایک کے احترام کے خلاف ہے جس کو ہندوازم کا بنیادی اصول بتایا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس تحریک کو بھی اینٹی ہندو لہر کا نام دیا جائے گا نہ کہ ہندو لہر کا۔

عقیدہ یا تاریخ

یہ حضرات کہتے ہیں کہ اجودھیا کی بابری مسجد عین رام جنم بھومی کے مقام پر بنی ہے، اس لئے ہم مسجد کو ڈھا کر دوبارہ وہاں رام مندر بنائیں گے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ کا دعویٰ تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر وہ اس پر دھیان دینے کے لئے تیار نہیں۔

مثال کے طور پر تاریخ بتاتی ہے کہ بابری مسجد ۱۵۲۸ میں بنائی گئی۔ اس کے تقریباً چالیس سال بعد تلسی داس (وفات، بنارس ۱۶۲۳) اجودھیا جاتے ہیں۔ وہ وہاں کے مندروں کو دیکھتے ہیں اور رام کی زندگی پر اودھی زبان میں اپنی کتاب رام چرت مانس (۷۶-۱۵۷۴) لکھتے ہیں۔ اس تفصیلی کتاب میں رام کے بارے میں ہر چیز موجود ہے۔ مگر اس میں رام جنم بھومی پر بنے ہوئے مندر کو توڑ کر مسجد بنانے کوئی ذکر نہیں۔

حالانکہ یہ شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) کا زمانہ تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، اکبر ایک ہندو نواز بادشاہ تھا۔ اس کی ملکہ بھی ایک ہندو خاتون تھی۔ اگر مندر توڑنے کا واقعہ صحیح ہوتا تو اکبر جیسے بادشاہ کے زمانہ میں تلسی داس اس کی بے خوف وخطر نشاندہی کرتے کہ بابر کے حاکم میر باقی نے رام مندر کو توڑ کر وہاں مسجد بنادی تھی۔ تلسی داس اگر اس کا اعلان کرتے تو اس کے بعد یا تو فوراً شاہی فرمان نافذ ہوتا کہ اس عمارت کو ہندوؤں کے حوالہ کر دیا جائے۔ یا کم از کم تلسی داس کی کتاب میں اس کا ریکارڈ ہمارے پڑھنے کے لئے موجود رہتا۔

اس طرح کے حقائق جب پیش کئے جاتے ہیں تو مذکورہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ ہمارے عقیدہ کا مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں ہم تاریخ کی کوئی بات نہیں سنیں گے اور نہ عدالت کا فیصلہ مانیں گے۔ کیونکہ مذہبی عقیدہ کا تعلق تاریخ اور عدالت سے نہیں ہوتا۔

یہ جواب سراسر غیر معقول ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مذہبی عقیدہ کا تعلق تاریخ یا عدالت سے نہیں ہوتا۔ مگر "مندر کو توڑ کر مسجد بنانے" کا مسئلہ مکمل طور پر ایک تاریخی مسئلہ ہے نہ کہ عقیدہ کا مسئلہ

اگر یہ کہا جائے کہ "رام وشنو کے اوتار تھے" تو یہ بلاشبہ عقیدہ کا ایک مسئلہ ہوگا۔ اس کو تاریخ اور قانون کے دائرہ میں زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔ مگر "فلاں مسجد مندر کو توڑ کر بنائی گئی" یہ بلاشبہ تاریخ کا مسئلہ ہے اور بصورت نزاع یقیناً اس کو تاریخ اور قانون کے دائرہ میں لاکر فیصلہ کیا جانا چاہئے۔

جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ ہندو سماج کی کوئی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔ وہ ہندو سماج کو اس کی اعلیٰ روایات سے ہٹا رہے ہیں۔ سوامی وویکانند کی امریکہ کے پارلیمنٹ آف ریلیجنز میں تقریر (۱۸۹۳) کے بعد سے اب تک ہزاروں ہندو پیشواؤں کو مغربی ملکوں میں زبردست استقبال ملتا رہا ہے۔ اس کی وجہ ہندو دھرم کی رواداری اور عدم تشدد کی روایات ہیں۔ اب کیا ہندوؤں کے انتہا پسند رہنما تاریخ کے اس پورے باب کو بند کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ ہندو دھرم کو اس کی اس کشش سے محروم کر دینا چاہتے ہیں جس نے مشرق و مغرب کے بہت سے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔

نیا دور

پچھلے پچاس برس سے تمام ملی لیڈر یہ کہہ رہے تھے کہ جب اشتعال انگیزی کی جائے گی تو مسلمان ضرور مشتعل ہوں گے۔ یہ اصول سراسر غیر معقول اور غیر اسلامی تھا۔ لیکن مسلمانوں نے لیڈروں کے پر فریب الفاظ میں آکر اسے اختیار کر رکھا تھا۔ مگر حالات بتاتے ہیں کہ اب وہ اس فریب سے باہر آچکے ہیں۔ اب انھوں نے جان لیا ہے کہ اشتعال انگیزی ہو تب بھی انھیں مشتعل نہیں ہونا ہے۔ ان کے جذبات کو چھیڑا جائے تب بھی انھیں اعراض کرکے اس سے گزر جانا ہے۔

اکتوبر ۱۹۹۰ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر کی ۱۰ ہزار کیلو میٹر کی رتھ یاترا جو سومناتھ سے شروع ہو کر اجودھیا میں ختم ہونے والی تھی، اس نے اپنے طویل سفر کے دوران بار بار اشتعال انگیزی کی صورت حال پیدا کی۔ مگر مسلمان برابر اعراض کے اصول پر قائم رہے۔ ۳۰ اکتوبر کو بابری مسجد کے گنبدوں پر بھگوا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ اس کو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا اور تمام اخبارات میں اس کی تصویریں چھپیں۔ اس دوران ملک کے مختلف حصوں میں درجنوں مقامات پر فسادات ہوئے۔

اس قسم کے مختلف اشتعال انگیز واقعات بار بار ہوتے رہے۔ مگر مسلمانوں نے ایک بار بھی کسی مقام پر ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہر موقع پر وہ کامل صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے رہے۔ وہ اپنے صابرانہ طریقہ سے فساد کی آگ کو بجھاتے رہے۔

یہ ایک عظیم الشان تبدیلی ہے جو ہندستانی مسلمانوں کی سیاست میں ۱۹۹۰ کے آخر میں ظہور میں آئی ہے۔ مسلمانوں نے پہلی بار اپنے نااہل لیڈروں کو رد کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسلامی اصول کے مطابق، وہ اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں صبر کی روش اختیار کریں گے، وہ برے سلوک کا جواب اچھے سلوک سے دیں گے۔

مسلمانوں نے اپنے اس نئے فیصلہ میں صرف ایک چیز کھوئی ہے، وہ ان کے نااہل لیڈر ہیں۔ اس کے سوا انھوں نے تمام چیزوں کو پالیا ہے۔ مسلمانوں کی یہ نئی دریافت انھیں مبارک ہو۔

نااہل لیڈروں کی غلط رہنمائی خود ان لیڈروں کو تو بہت کچھ دیتی رہی۔ مگر اس کے نتیجہ میں مسلمان پچھلی نصف صدی تک نہایت قیمتی چیزیں کھوتے رہے۔ اب ان شاء اللہ اپنے نئے فیصلہ کے تحت وہ مزید

اضافہ کے ساتھ یہ تمام چیزیں پالیں گے۔

۱۔ اس کا ایک المناک نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان ہندستان میں غیر ضروری طور پر مایوسی کا شکار رہے۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ ہندستان میں ان کے لئے زندگی اور عمل کے مواقع نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ، نا اہل لیڈروں کے بیان کے مطابق، یہ تھی کہ ملک میں انھیں بعض اوقات ناخوشگوار حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔

حالات بتاتے ہیں کہ اب مسلمانوں نے یہ دریافت کرلیا ہے کہ ناخوشگواری کسی خاص ملک کی صفت نہیں بلکہ وہ دنیا کی صفت ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر جگہ، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، اس قسم کے حالات لازماً پیش آتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ حکمت اور تدبیر کے ساتھ ان سے نپٹا جائے۔ یہ حالات دراصل چیلنج ہیں اور چیلنج، خود تخلیق خداوندی کے مطابق، زندگی کا حصہ ہے۔ چیلنج کے ذریعہ ہی انسانیت ترقی کرتی ہے۔ اگر چیلنج نہ ہو تو انسانیت کا قافلہ معطل ہو کر رہ جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اس دریافت کے بعد ہندستان کے مسلمان اس ملک میں نئے حوصلہ کے ساتھ زندگی کی تعمیر کریں گے۔

۲۔ لیڈروں کی غلط رہنمائی کا دوسرا نقصان جو پچھلے برسوں میں مسلمانوں کو اٹھانا پڑا وہ یہ تھا کہ وہ اسلام کی بتائی ہوئی ایک عظیم طاقت سے محروم ہو گئے۔ قرآن میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تو تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا دشمن بھی تمہارا دوست بن جائے گا۔ (۴۱ : ۳۴)

اسلام کی یہ تعلیم ایک ایسا اخلاقی ہتھیار ہے جس کے اندر تسخیر کی لامحدود صلاحیت ہے۔ دور اول کے مسلمانوں نے اس اخلاقی طاقت کو استعمال کرکے اپنے بدترین دشمنوں کو زیر کر لیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان بھی اس اسلامی تعلیم کا یہ فائدہ حاصل کر سکتے تھے مگر نااہل لیڈروں کی غلط رہنمائی نے انھیں اس نعمت سے محروم رکھا۔ اب مسلمانوں نے جو نیا سفر شروع کیا ہے اس میں ان شاء اللہ وہ اس اسلامی تعلیم کا بھرپور فائدہ حاصل کر سکیں گے۔

۳۔ نااہل لیڈروں کی غلط رہنمائی کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ مسلمان ملک کی ایک اہم حقیقت سے بے خبر رہ گئے جو سراسر ان کی موافقت میں تھی۔ کوئی شخص اگر اپنے ماحول کے بارہ میں منفی انداز سے سوچنے

لگے تو اس کا لازمی نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کو صرف "عسر" کا پہلو دکھائی دیتا ہے ، "یسر" کا پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔ اس معاملہ کے مختلف پہلو ہیں ۔ یہاں میں صرف ایک پہلو کا ذکر کروں گا۔

ٹائمس آف انڈیا (۹ نومبر ۱۹۹۰) کے آخری صفحہ پر ایک چھوٹی سی خبر چھپی ہے مگر وہ انتہائی اہم ہے۔ بمبئی کی ڈیٹ لائن کے ساتھ چھپنے والی اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ ٹائمس آف انڈیا اپنے سات ایڈیشنوں کے ساتھ اس وقت ملک کا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا اخبار ہے جس کی ہر روز چھ لاکھ انتیس ہزار (629,000) کاپی فروخت ہوتی ہے ۔ خبر کے مطابق اس سے پہلے انڈین ایکسپریس اپنے بارہ ایڈیشنوں کے ساتھ ملک میں سب سے زیادہ بکنے والا اخبار تھا۔ مگر آڈٹ بیورو آف سرکولیشن (ABC) کے تازہ اعلان کے مطابق ، ٹائمس آف انڈیا نے پہلی بار سب سے زیادہ چھپنے والے اخبار کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا اپنی موجودہ اشاعت کے ساتھ ملیالا منورما (Malayala Manorama) سے بھی آگے بڑھ گیا ہے جس کی موجودہ اشاعت چھ لاکھ سات ہزار ہے ۔

یہ خبر علامتی طور پر ملک کے ایک واقعہ کو بتاتی ہے۔ رام جنم بھومی تحریک کے سلسلہ میں ٹائمس آف انڈیا نے واضح طور پر اس کے مخالف رویہ اختیار کیا ۔ ایڈیٹوریل ، مضامین ، خطوط اور خبروں کی صورت میں وہ مسلسل یہ تاثر دیتا رہا ہے کہ یہ پوری تحریک دقیانوسیت پر مبنی ہے اور وہ ملک کی ترقی کے لئے تباہ کن ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ رام جنم بھومی تحریک کے لوگ ٹائمس آف انڈیا کو اپنا دشمن اخبار بتاتے ہیں۔

اس وقت ملک کے جو حالات ہیں ، ان میں ٹائمس آف انڈیا کی اشاعت کا بڑھنا علامتی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی سوچ وہی ہے جو ٹائمس آف انڈیا کی سوچ ہے۔ یہ طبقہ اس پوری تحریک کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے ۔

مذکورہ خبر اس واقعہ کی صرف ایک علامت ہے ۔ ورنہ مختلف صورتوں میں یہ بات بار بار سامنے آچکی ہے ۔ ہندستان کے تمام بڑے بڑے ہندو مورخین نے اس معاملہ میں رام جنم بھومی کے دعویٰ کو غیر تاریخی قرار دے کر اس کی مذمت کی ہے۔ ان کی یہ مذمت عالمی سطح پر مشتہر ہو چکی ہے ۔ حتی کہ امریکہ کے ٹائم میگزین نے بھی نمایاں طور پر اس کا اظہار کیا ہے۔

جو لوگ ہندی اور انگریزی اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں، انھیں یہ بات معلوم ہے کہ اس معاملہ میں ہندو تعلیم یافتہ لوگوں نے کثرت سے ایسے مضامین اور خطوط شائع کرائے ہیں جو حد درجہ حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر پر مبنی ہیں۔ جن لوگوں کو ہندی اور انگریزی اخبارات کے مطالعہ کا موقع نہ ملا ہو وہ مسلمانوں کے اردو اخبارات میں بھی ان کے اقتباسات دیکھ سکتے ہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہندو قوم واضح طور پر دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک عوام کا طبقہ اور دوسرے ان کے خواص کا طبقہ۔ یہ صحیح ہے کہ شمالی ہند کے ہندو عوام کی ایک تعداد رام جنم بھومی کے ساتھ ہے۔ مگر دوسرا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ ملک کے تعلیم یافتہ ہندو اور اسی کے ساتھ جنوبی ہند کے تقریباً تمام ہندو اس معاملہ میں حقیقت پسندانہ رائے رکھتے ہیں جو واضح طور پر مسلمانوں کی موافقت میں ہے۔

ماضی میں مسلمان اس حقیقت کا شعوری ادراک نہ کر سکے تھے۔ اب اپنے نئے ذہن کے تحت انشاء اللہ وہ اس حقیقت کا بھرپور ادراک کریں گے اور اس کے مطابق اپنے ملی منصوبوں کی تشکیل کریں گے۔

۴. وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری مسٹر اشوک سنگھل نے ۷ نومبر ۱۹۹۰ کو نئی دہلی میں ایک تقریر کی۔ انھوں نے اپنی اس تقریر میں جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک بات، ٹائمس آف انڈیا (۸ نومبر ۱۹۹۰) کی انگریزی رپورٹنگ میں ان الفاظ میں تھی:

He said Muslims should realise politicians cannot save them. If anybody can save them, it is the Hindu. They should learn to coexist with us and we will protect them, for every Hindu is secular.

مسٹر سنگھل نے ایک مناسب بات غیر مناسب الفاظ میں کہی ہے۔ اس بات کو کہنے کے زیادہ صحیح الفاظ یہ ہیں کہ مسلمانوں کا مسئلہ کوئی بھی حکمراں حل نہیں کرے گا۔ مسلمان اپنا مسئلہ صرف اپنی کوشش سے حل کر سکتے ہیں۔

آزادی کے بعد مسلمان غلط رہنمائی کے نتیجہ میں، ہمیشہ حکومت اور انتظامیہ کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ الکشن کے مواقع پر پارٹیوں کو ہرا کر یا جتا کر ان سے بڑی بڑی امیدیں باندھتے

رہے۔ یہ سب بلاشبہ بے فائدہ تھا۔ مسلمانوں کے لئے اس معاملہ میں مفید بات صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ برادران وطن سے اپنے تعلقات کو بہتر بنائیں۔ یہی ان کے لئے پہلے بھی درست طریقہ تھا اور آج بھی یہی ان کے لئے درست طریقہ ہے۔

مسلمان اور ہندو سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ دونوں کا ایک ہی مشترک وطن ہے دونوں کا مفاد ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہیں۔ اگر کسی معاملہ میں کوئی اختلافی بات پیدا ہو تو اس پر اسی طرح تحمل اور بردباری کا انداز اختیار کریں، جس طرح وہ اپنے گھر اور خاندان میں اس طرح کے معاملات میں ہمیشہ کرتے ہیں۔

مسلمانوں نے اگر ایسا کیا تو اسلام کے مطابق، وہ اپنے قومی اور وطنی پڑوسی کے حقوق ادا کریں گے اور اسی کے ساتھ یقینی طور پر وہ اس امن کو بھی حاصل کرلیں گے جو انھیں اس ملک میں اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے درکار ہے۔

پتھر کھسک گیا

بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے بیان کیا۔ سننے والوں میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان میں سے تین آدمی ایک سفر پر نکلے۔ چلتے چلتے رات ہوگئی تو رات گزارنے کے لئے وہ ایک غار میں داخل ہو گئے۔ پہاڑوں پر اکثر پتھر گرنے (land slide) کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت اوپر سے ایک بڑا پتھر لڑھک کر گرا اور اس کی وجہ سے غار کا منھ بند ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ اس چٹان سے نجات کی ہمارے پاس اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے کہ ہم اپنے نیک عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں۔

اب ایک شخص دعا کرنے بیٹھا۔ اس نے کہا: خدایا، میرے باپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ میرا معمول تھا کہ روزانہ شام کو جب میں اپنے جانور چرا کر لوٹتا تو جب تک میں ان دونوں کو دودھ نہ پلا لیتا نہ خود دودھ پیتا اور نہ کسی اور کو پلاتا۔ ایک دن میں چارہ کی تلاش میں دور نکل گیا۔ شام کو واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ میرے ماں باپ سو گئے۔ میں نے ان دونوں کے لئے دودھ نکال کر تیار کیا۔ جب ان کے پاس دودھ لے کر پہنچا تو دونوں کو سوتا ہوا پایا۔ مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ میں ان کو جگاؤں اور مجھ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ میں ان سے پہلے دودھ پیوں اور اپنے بچوں کو پلاؤں۔ میں ان کے پاس کھڑا ہوگیا۔ میرے ہاتھ میں پیالہ تھا اور میں اس انتظار میں تھا کہ جب وہ جاگیں تو میں ان کو دودھ پیش کروں۔ اسی حال میں صبح ہوگئی۔ بچے میرے پاؤں کے پاس بلبلاتے رہے۔ صبح کو وہ دونوں اٹھے اور انھوں نے دودھ پیا۔ اس کے بعد ہم سب لوگوں نے دودھ پیا۔ میرے اللہ یہ عمل اگر میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس چٹان کی مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔ چنانچہ چٹان تھوڑی سی کھسک گئی مگر اتنی زیادہ نہیں کہ وہ تینوں نکل سکیں۔

اب دوسرے آدمی نے دعا شروع کی۔ اس نے کہا: خدایا، میرے چچا کی ایک لڑکی تھی۔ وہ مجھ کو بہت محبوب تھی، اس سے مجھ کو اسی قسم کی شدید محبت تھی جو مردوں کو عورتوں سے ہوتی ہے۔ میں نے اس سے اپنے نفس کی خواہش پوری کرنی چاہی مگر وہ منع کرتی رہی۔ کچھ عرصہ بعد وہ قحط سالی کی مصیبت میں پریشان ہوئی۔ وہ مدد کے لئے میرے پاس آئی۔ میں نے اس کو ۱۲۰ دینار اس شرط پر دئے کہ وہ مجھ کو اپنے اوپر قابو دے دے۔ وہ اس کے لئے تیار ہوگئی۔ یہاں تک کہ جب میں اس کے اوپر پوری طرح قادر ہوگیا اور اس کے دونوں پیروں کے درمیان بیٹھ گیا تو اس نے کہا: خدا سے ڈر اور مہر کو اس کے حق کے بغیر نہ توڑ۔ میں اس سے باز آگیا حالاں کہ وہ مجھ کو

ام لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھی۔ اور جو دینار میں نے اس کو دئے تھے وہ بھی اس سے واپس نہیں
ئے۔ خدایا، اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے جس میں ہم اس
قت پھنسے ہوئے ہیں۔ چنانچہ چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی مگر اتنی نہیں کہ وہ نکل سکیں۔

اب تیسرے آدمی نے دعا کی۔ اس نے کہا۔ خدایا، میں نے کچھ مزدور اجرت پر رکھے۔ کام کے بعد میں نے سب کو اجرت دے دی۔ مگر ایک مزدور اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی چھوڑی ہوئی رقم کو کاروبار میں لگا دیا اس سے مجھ کو بہت زیادہ مالی فائدہ ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ آدمی واپس آیا اور کہا: اے اللہ کے بندے، میری اجرت مجھ کو دے دے۔ میں نے اس سے کہا: یہ اونٹ، یہ گائیں، یہ بکریاں اور یہ غلام جو تم دیکھ رہے ہو یہ سب تمھاری مزدوری ہے۔ اس نے کہا: اے خدا کے بندے، مجھ سے مذاق نہ کر۔ میں نے کہا کہ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سب تمھارا ہی ہے۔ اس کے بعد اس نے سب چیزیں لیں اور ان کو اس طرح ہنکالے گیا کہ ان میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ خدایا، اگر یہ میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔ اس کے بعد چٹان ہٹ گئی اور وہ تینوں باہر نکل کر روانہ ہو گئے (بخاری و مسلم)

یہ روایت صحیحین میں آئی ہے اور اس کے واقعہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دعا ایسی چیز ہے جو پتھر کی چٹان کو بھی اپنی جگہ سے کھسکا دیتی ہے۔ مگر یہ وہ دعا نہیں ہے جو زبان سے بس الفاظ کی صورت میں نکلتی ہے اور آدمی کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ دعا سے چٹان کھسکنے کا واقعہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے تابع کر دیں، جو اپنے اوپر خدا کو نگراں بنالیں۔ حتی کہ بھوک کی شدت اور بیوی بچوں کی محبت بھی ان کو خدا کی پسندیدہ راہ سے نہ ہٹا سکے۔ انتہائی نازک جذباتی مواقع پر بھی خدا کی یاد دلانا ان کو چونکا دینے کے لئے کافی ہو، ہیجان خیز لمحات میں بھی جب خدا کا نام لے لیا جائے تو ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں، اور ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ اپنی حرکت بند کر دیں۔ آخرت کے حساب کا اندیشہ ان پر اتنا زیادہ طاری ہو کہ ایک حق دار کا حق ادا کرنے کی خاطر اگر ان کو اپنا سارا اثاثہ دے دینا پڑے تو اس سے بھی وہ دریغ نہ کریں۔ ایک آدمی اگر اپنا مطالبہ لے کر ان کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ فوراً اس کو مان لیں خواہ مطالبہ کرنے والا کتنا ہی بے زور ہو اور اس کے مقابلہ میں ان کو کتنی ہی زیادہ قوت حاصل ہو۔

خدا کے بندے وہ ہیں جو اپنے نفس کو کچلنے اور اپنے فائدوں کو ذبح کرنے کی قیمت پر خدا کو اختیار کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اس طرح خدا کو اپنا لیں وہ اگر کہیں کہ خدایا تو اس پتھر کی چٹان کو کھسکا دے تو خدا پتھر کی چٹان کو بھی ان کے لئے کھسکا دیتا ہے۔

پیغمبر کا طریقہ

قَالَ مُسْلِم فِي صَحِيْحِهٖ حَدَّثَنَا اِبْنُ اَبِي عُمَر حَدَّثَنَا مَرْوَانُ الْفَزَارِيُّ عَنْ يَزِيْدَ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ اِبْنِ اَبِي حَازِم عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ۔ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُدْعُ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ قَالَ: اِنِّي لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا وَ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً۔

امام مسلم اپنی صحیح میں کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن ابی عمر نے کہا، ان سے مروان فزاری نے بیان کیا، ان سے یزید بن کیسان نے ان سے ابن ابی حازم نے اور ان سے ابو ہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ مشرکوں کے خلاف بد دعا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ مجھ کو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے اصحاب پر ان کے دشمنوں نے جو مصیبتیں ڈالیں اور جو ظلم کیا وہ آج کے ظلم اور مصیبت سے بہت زیادہ تھا۔ حتیٰ کہ مقدس صحابہ ان مظالم کو دیکھ کر کہہ اٹھے کہ ان کے خلاف بد دعا کی جائے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذہن کی تصحیح کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارا کام دنیا کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں داخل کرنا ہے نہ کہ ان کی ہلاکت اور بربادی کا سامان کرنا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ آپ کے خلاف لوگوں نے ظلم کیا، اس کے باوجود آپ نے ان کے ساتھ خیر خواہی کی۔ لوگوں نے آپ پر مصیبتیں ڈالیں، اس کے باوجود آپ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی اعلیٰ سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ کو دنیا میں اعلیٰ ترین کامیابی حاصل ہوئی۔ قومیں آپ کے آگے جھک گئیں۔ ظلم اور سرکشی کرنے والے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کے ساتھی اور معاون بن گئے۔

مسلمانوں کو بھی اپنے پیغمبر کے اسی نمونہ پر عمل کرنا ہے۔ ہم کو اقوام عالم کا خیر خواہ بننا ہے، خواہ بظاہر وہ ہمارے ساتھ بدخواہی کریں۔ ہمیں لوگوں کے حق میں ہدایت کی دعا کرنا ہے، خواہ وہ ہمارے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کریں۔ ہمیں دوسروں سے محبت کرنا ہے، خواہ ہمیں دوسروں کی طرف سے نفرت و عداوت کا تجربہ ہو رہا ہو۔

یہی پیغمبر کا طریقہ ہے، اور پیغمبر کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد ہی مسلمان خدا کی ان نصرتوں کے مستحق قرار پا سکتے ہیں جن کا وعدہ خدا نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ ان کے لیے کیا ہے۔

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

فروری ۱۹۹۱ شمارہ ۱۷۱

فہرست

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013, India
Telephone: 611128, 697333 Telex: 031-61758 FLSH IN ATT IC
Fax: 91-11 [illegible]
Annual Subscription: Inland Rs. 80 Abroad US $ 25 (Air Mail)

اسلامی جہاد

جہاد کے لفظی معنی کوشش (struggle) کے ہیں ۔ اس میں مبالغہ کا مفہوم شامل ہے۔
ملاً عربی میں کہتے ہیں جهدتُ رائ ۔ یعنی میں نے اس معاملہ میں بہت زیادہ غور و فکر کیا۔ قرآن
ں ہے کہ واقسموا باللہ جهد ایمانهم (المائدہ ۵۳) یعنی قسم کھانے میں شدت برتنا، مبالغہ کرنا۔

اسلام شروع سے آخر تک جہاد ہے ۔ آدمی جب اسلام میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایک مجاہدانہ
ندگی میں داخل ہوتا ہے جو برابر جاری رہتا ہے ، یہاں تک کہ اسی راہ میں آدمی کی موت آجائے ۔

اس جہاد کا پہلا محاذ آدمی کی خود اپنی ذات ہے ۔ جب آدمی اپنے آپ کو مومن و مسلم کہتا ہے
و وہ گویا یہ عہد کرتا ہے کہ وہ نفسیاتی محرکات کو دبائے گا اور شیطانی ترغیبوں سے لڑ کر خدا کی بتائی
ہوئی صراط مستقیم پر قائم رہے گا ۔ اس کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ
ی اطاعت کے لیے اپنی نفس سے جہاد کرے (المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة الله)

جہاد کا دوسرا محاذ دعوت ہے ۔ یعنی اللہ کے پیغام کو اللہ کے بندوں تک پہونچانے کے
لیے اپنی ساری ممکن کوشش صرف کرنا ۔ یہ اتنا بڑا عمل ہے کہ قرآن میں اس کو جہاد کبیر کہا گیا ہے
(وجاهدهم به جهاداً کبیراً) اللہ کے دین کا خطاب تمام انسانوں اور تمام قوموں سے ہے۔ اس
کو اس کے تمام آداب اور تقاضوں کے ساتھ سارے اہل عالم تک پہونچانا ہے ۔ اس لحاظ سے
بلاشبہ دعوت کا عمل عظیم ترین جہاد ہے ، اس سے بڑا جہاد اور کوئی نہیں ۔

جہاد کا تیسرا محاذ دفاع ہے ۔ یعنی اسلام کے دشمن اگر یک طرفہ طور پر اہل اسلام کے اوپر جارحانہ
حملہ کر دیں، اور ان کو حملہ سے باز رکھنے کی تمام ممکن تدبیریں غیر موثر ثابت ہوئی ہوں تو ایسی صورت
میں بشرط استطاعت ان سے مقابلہ کر کے انھیں پسپا کرنا اور ان کے حملہ کو ناکام بنا دینا، جہاد کی
یہی تیسری قسم ہے جس کو شریعت میں قتال فی سبیل اللہ کہا گیا ہے ۔

جہاد نفس اور جہاد دعوت ایک مستقل عمل ہے ، وہ مومن کی زندگی میں ہر روز اور ہر لمحہ کسی
نہ کسی صورت میں جاری رہتا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں جہاد اعداء ایک اتفاقی اور استثنائی عمل ہے۔
اس کا مقصد دفاع ہے اور دفاع اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی کی طرف سے جارحیت کا آغاز کر دیا جائے۔

شیر دیکھ رہا ہے

جم کاربٹ (Jim Corbett) ایک انگریز تھا۔ وہ ۱۹۰۷ میں ہندستان آیا۔ اس کو معلوم ہوا کہ کمایوں (یوپی) کے جنگلوں میں بہت سے مردم خور شیر ہیں، وہ اپنی رائفل لے کر کمایوں کے جنگل میں پہونچ گیا۔ ۱۹۰۷ میں اس نے پہلے مردم خور شیر کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا جو ۴۳۰ آدمیوں کو مار کر کھا چکا تھا۔

جم کاربٹ نے کمایوں کے جنگلوں میں ۳۲ سال گزارے۔ اس نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ایک درجن سے زیادہ مردم خور شیروں کو ہلاک کیا۔ اس جان جوکھم کام کا واحد انعام، جم کاربٹ کی یہ روحانی تسکین تھی کہ وہ زمین کے ایک چھوٹے سے حصہ کو اس قابل بنائے کہ ایک لڑکی محفوظ طور پر وہاں چل سکے:

Satisfaction at having made a small portion of the earth safe for a girl to walk on.

جم کاربٹ نے اپنی کتاب کمایوں کے مردم خور شیر (Man-eaters of Kumaon) میں اپنے ان تجربات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو مردم خور شیروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے پیش آئے۔ ایک موقع پر اس نے لکھا ہے کہ دن کی روشنی میں بھی شیر کی قربت، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ اس نے آپ کو دیکھا نہ ہو، خون کی گردش میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ پھر جب شیر ایک عام شیر نہ ہو، بلکہ وہ مردم خور شیر ہو، تاریک رات کے ۱۰ بجے ہوں، اور آپ جانتے ہوں کہ مردم خور شیر آپ کو دیکھ رہا ہے، اس وقت خون کی گردش ایک طوفان کی صورت اختیار کر لیتی ہے:

The near proximity of a tiger in daylight, even when it has not seen you, causes a disturbance in the bloodstream. When the tiger is not an ordinary one, however, but a man-eater and the time is ten o'clock on a dark night, and you know the man-eater is watching you, the disturbance in the blood becomes a storm.

یہ احساس کہ شیر میرے قریب ہے اور وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے، آدمی کے خون میں طوفان برپا کر دیتا ہے۔ پھر اس انسان کا کیا حال ہوگا جس کے اندر یہ یقین آجائے کہ وہ خدا جو تمام شیروں کا اور تمام زمین و آسمان کا خالق ہے، وہ میرے قریب ہے اور مجھ کو اس طرح دیکھ رہا ہے کہ میری کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔

نبیٔ رحمت کا طریقہ

فتح مکہ کے بعد مکہ کی بہت سی عورتوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اسلام قبول کیا۔ انھیں میں سے ایک ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ بن ربیعہ تھی۔ یہ وہی عورت ہے جس نے احد کی جنگ میں حضرت حمزہ کی لاش کی بے حرمتی کی تھی۔ وہ کئی عورتوں کے ساتھ آئی۔ اس نے کہا کہ اگر میں نے محمدؐ کے سامنے کلام کیا تو وہ پہچان لیں گے، اور اگر انھوں نے پہچان لیا تو وہ مجھے قتل کردیں گے (فقالت اِنّی اِن اتکلم یعرفنی وان عرفنی قتلنی)

چنانچہ بیعت کے وقت ہند نے نقاب سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ مگر وہ اونچے خاندان کی عورت تھی، اس لیے وہ اپنی بڑائی کے احساس سے چپ نہ رہ سکی۔ بیعت کے الفاظ اداکراتے ہوئے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے فرمایا کہ یوں کہو کہ ہم اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے (ولا نقتل اولادنا) تو ہند نے بے برداشت ہوکر گستاخی کے الفاظ کہے۔ اس کے الفاظ مختلف روایتوں میں اس طرح نقل کیے گیے ہیں:

قالت هند انت قتلتهم يوم بدر فانت وهم ابصر۔	ہند نے کہا کہ آپ نے ان کو بدر کے دن قتل کردیا اس لیے آپ جانیں اور وہ جانیں۔
ربيناهم صغاراً فقتلتموهم كباراً	ہم نے چھوٹے پر انھیں پالا اور بڑے پر آپ نے انھیں قتل کردیا۔
تقتل آباءهم وتوصينا باولادهم	آپ خود تو ان کے باپوں کو قتل کرتے ہیں اور ہم کو ان کی اولاد کے بارہ میں نصیحت کررہے ہیں۔

ہند نے اس سے پہلے بھی بار بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔ مذکورہ واقعہ میں تو اس نے رو در رو توہین رسالت کا ارتکاب کیا۔ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم رہنماؤں نے جو خودساختہ اسلام وضع کر رکھا ہے، یہی اسلام اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ہوتا تو آپ فوراً ہند کو قتل کرادیتے۔ مگر آپ نے بیعت لے کر ہند کو اسلام میں داخل کرلیا۔

آج مسلمانوں سے سب سے بڑی چیز جو کھوئی گئی ہے وہ نبی رحمت کا یہی طریقہ ہے۔

تنقید و اختلاف

ابن قیم الجوزیہ ۶۹۱ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ ۷۵۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی ایک مشہور کتاب اعلام الموقعین ہے۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے درمیان ۱۰۰ مسائل میں باہم اختلاف تھا۔ اسی طرح انھوں نے دوسرے صحابہ کے درمیان رایوں کے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :

ولم یستنکر احد هذا الخلاف۔ انما اعتبرہ الجمیع امرا طبیعیا لا یقطع وداً ولا یفرق صفاً۔

اور کسی نے بھی اس اختلاف کو برا نہیں مانا۔ تمام لوگوں نے اس کو ایک فطری معاملہ سمجھا۔ جس سے نہ باہمی محبت ختم ہوتی اور نہ مسلمانوں کی جماعت میں کوئی انتشار پیدا ہوتا۔

یہ اسلام کی وہ صورت حال ہے جو اصحاب رسولؐ کے زمانہ میں تھی۔ یعنی وہ زمانہ جس کو اسلام کی تاریخ میں معیاری دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ہر مسلمان آزادانہ طور پر اختلاف رائے کرتا تھا۔ یہ اختلاف رائے اکثر نہایت شدید الفاظ میں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اختلاف اور تنقید کرنے والے کو روکا جائے یا اس کو کوئی ناپسندیدہ کام سمجھا جائے۔

اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے تو صورت حال بالکل مختلف نظر آئے گی۔ آج اگر کسی مسلم شخصیت پر تنقید کر دی جائے تو مسلمان فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ وہ ناقد کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ دور صحابہ اور موجودہ زمانہ میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ صرف ایک اللہ کو بڑا بنائے ہوئے تھے۔ اللہ کے بعد تمام انسان ان کی نظر میں برابر تھے۔ اس لیے انسانوں پر تنقید سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان اللہ کے ساتھ دوسرے انسانوں کو بھی بڑا بنائے ہوئے ہیں۔ ان انسانی بڑوں کے لیے انھوں نے مبتدعانہ طور پر "اکابر" کا لفظ وضع کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنی محبوب شخصیتوں پر تنقید سے بھڑک اٹھتے ہیں۔

دین میں معیار بہر حال اصحاب رسول ہیں۔ مسلمان اگر اس کے سوا کوئی اور معیار بنائیں تو وہ بلاشبہ بدعت ہے، اور بدعت اسلام میں مقبول نہیں۔

ایک تاریخ

بائبل کے بیان کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت پر جب ان کا خاندان مصر گیا تو افراد خاندان کی کل تعداد ۷۰ تھی۔ (اس تعداد میں وہ لڑکیاں شمار نہیں کی گئی تھیں جو حضرت یعقوب کے گھرانے میں بیاہی ہوئی آئی تھیں) حضرت یوسف کی وفات کے تقریباً پانچ سو سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ ان کے ساتھ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ بائبل کے بیان کے مطابق خروج کے بعد دوسرے سال بیابان سینا میں حضرت موسیٰ نے جو مردم شماری کرائی تھی، اس کے مطابق صرف قابل جنگ مردوں کی تعداد ۶۰۳۵۵۰ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت، مرد، بچے، بوڑھے سب ملاکر وہ کم ازکم ۲۰ لاکھ ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ ۷۰ افراد کے ایک خاندان کی تعداد پانچ سو سال میں محض توالد وتناسل سے اتنی زیادہ نہیں ہوسکتی۔ تعداد میں اس غیر معمولی اضافہ کا سبب یقیناً بنی اسرائیل کی تبلیغ تھی۔ ان کی تبلیغ کے زیر اثر جن مصریوں نے اپنا دین بدلا، غالباً ان کا تمدن بھی بنی اسرائیل کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔ بائبل میں ان نومسلموں کے لیے "ملی جلی بھیڑ" جیسے الفاظ استعمال کیے گیے ہیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلے تو ان کے یہ دینی بھائی بھی ان کے ساتھ تھے۔

بنی اسرائیل کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مصر میں مکمل طور پر مغلوب اور محکوم حالت میں تھے۔ مصری ان کو غلام اور مزدور کے درجہ میں رکھ کر ان سے خدمت لیتے تھے۔ قبطی قوم کی حیثیت معزز قوم کی تھی۔ اور اس کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کی حیثیت حقیر اور ناقابل ذکر قوم کی۔ اس کے باوجود بنی اسرائیل کے دین نے بہت سے قبطیوں کو متاثر کیا۔ وہ فرعون کا مذہب چھوڑ کر موسیٰ کے مذہب میں داخل ہوگیے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین حق تمام طاقتوں سے زیادہ بڑی طاقت ہے۔ دین حق وہاں بھی لوگوں کو مسخر کرلیتا ہے جہاں بظاہر اس کا امکان دکھائی نہ دیتا ہو کہ وہ لوگوں کو مسخر کرسکتا ہے۔

خدا کے دین کی طلب خود انسانی فطرت کے اندر موجود ہے اور یہی اس کی اصل طاقت ہے۔ خدا کا دین خود اپنی طاقت کے زور پر لوگوں کے سینہ میں داخل ہوتا ہے نہ کہ اہل دین کی قومی یا مادی طاقت کے زور پر۔

ایک حدیث

حدیث کی کتابوں میں دور آخر کے بارہ میں بہت سی پیشین گوئیاں ہیں۔ انھیں میں سے ایک پیشین گوئی وہ ہے جس کو امام احمد اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے:

عن المقداد انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا يبقى على ظهر الارض بيتُ مَدَرٍ ولا وَبَرٍ الا ادخله الله كلمةَ الاسلام بعزّ عزيزٍ وذُلّ ذليلٍ إما يُعِزّهم اللهُ فيجعلهم من اهلها او يُذلّهم فيدينون لها

(مشکاة المصابیح، الجزء الاول، صفحہ ۲۰)

حضرت مقداد کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زمین کی سطح پر کوئی خیمہ یا گھر باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ اللہ اس میں اسلام کے کلمہ کو داخل کر دے گا، خواہ عزیز کی عزت کے ساتھ یا ذلیل کی ذلت کے ساتھ۔ اللہ یا تو انھیں عزت دے گا اور ان کو اہل اسلام میں سے بنا دے گا یا انھیں ذلیل کرے گا تو وہ اس کے دین کو اختیار کر لیں گے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ آخری زمانہ میں اسلام ہر گھر میں داخل ہو جائے گا۔ مگر حدیث کے الفاظ کے مطابق، جو چیز گھروں کے اندر داخل ہو گی وہ اسلام کا کلمہ ہو گا نہ کہ اسلام کا سیاسی اور حکومتی اقتدار۔ کچھ لوگوں نے اس پیشین گوئی کو سیاسی داخلہ کے معنی میں لے لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ساری دنیا میں اسلام کا سیاسی جھنڈا لہرانے کے نام پر مدعو اقوام سے سیاسی لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ اس بے معنی لڑائی کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اسلام سے بیزار ہو کر اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

اس پیشین گوئی کو واقعہ بنانے کے لیے مسلمانوں کو جو کام کرنا ہے وہ دعوت الی اللہ ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ توحید اور آخرت کے ربانی پیغام سے تمام قوموں کو باخبر کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں، وہ اسلام کو فکری حیثیت سے ایک معلوم اور مسلّم چیز بنا دیں، تاکہ جس کو ماننا ہے وہ مانے، اور جس کو نہیں ماننا ہے اس پر حجت قائم ہو جائے۔

عمل تبلیغ کی انتہا اتمام حجت ہے نہ کہ قیام حکومت۔

پیغمبر کی پیشین گوئی

عن مرداس الاسلمی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذھب الصالحون الاول فالاول وتبقی حثالة کحثالة الشعیر او التمر لا یبالیھم اللہ بالة (رواہ البخاری)

مرداس اسلمی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صالح لوگ چلے جائیں گے، ایک کے بعد ایک۔ اور پھر بھُس رہ جائے گا، جیسے جَو یا کھجور کا بھس ہوتا ہے۔ اللہ کو ان کی کچھ پروا نہ ہوگی۔

اس حدیث میں ذِہاب کا مطلب موت نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت کے صالح افراد مرجائیں گے اور غیر صالح افراد زندہ رکھے جائیں گے۔ کیوں کہ موت تو سب کے اوپر یکساں طور پر آتی ہے۔ وہ صالح اور غیر صالح کے درمیان فرق نہیں کرتی۔

اس حدیث میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ بعد کے زمانہ میں اسلامی اداروں اور اسلامی حلقوں کا یہ حال ہوجائے گا کہ وہاں عمومی طور پر وہ لوگ جمع ہوں گے جو پست ذوق اور معمولی صلاحیت والے ہیں۔ بلند صلاحیت والے اور اعلیٰ ذوق کے لوگ دینی شعبوں میں آنا کم ہوجائیں گے۔

خدا کا دین ایک ہی دین ہے۔ مگر نمائندگی کے اعتبار سے اس میں فرق ہوجاتا ہے۔ دین کی نمائندگی جب اعلیٰ سطح پر ہو تو اعلیٰ درجہ کے افراد اس کی طرف کھنچتے ہیں۔ اور جب دین کی نمائندگی پست سطح پر ہونے لگے تو پست درجہ کے لوگ ہی اس کی طرف آتے ہیں۔

اداروں اور تحریکوں میں اگر اعلیٰ معیار کی تقریر اور تحریر کے ذریعہ دین کو پیش کیا جارہا ہو تو اعلیٰ سطح کے افراد اس کی طرف کھچیں گے۔ ان سے جس کردار کا مظاہرہ ہوگا وہ بھی اعلیٰ اور ارفع کردار ہوگا۔ اور جب دین پیش کرنے والوں کے یہاں تقریر و تحریر اور اخلاق و کردار کا معیار پست ہوجائے تو اسی درجہ کے لوگ دینی حلقوں میں جمع ہوں گے جو دین کی نمائندگی کرنے والوں کا درجہ ہے۔

"اللہ کو ان کی پروا نہ ہوگی" کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ذریعہ دین کا کوئی بڑا کام نہیں انجام پاسکتا۔ بڑا کام کرنے کے لیے بڑا دل اور اعلیٰ صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اور یہ چیزیں ان کے یہاں موجود نہ ہوں گی۔ ایسی حالت میں اس قسم کے لوگ کوئی بڑا دینی کام کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔

بے ملک

علی زکریا الانصاری (۶۰ سال) ہندستان میں کویت کے سفیر ہیں۔ انھوں نے انگلش میں ماسٹر ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ کئی ملک میں کویت کے سفیر رہ چکے ہیں۔ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو اچانک انھوں نے یہ خبر سنی کہ عراق نے اپنی طاقتور فوج کویت میں داخل کردی اور کویت پر قبضہ کرکے اس کو عراق میں شامل کرلیا۔ ان کی بیوی اور دو بچے کویت میں ہیں اور وہ خود نئی دہلی میں۔ مواصلاتی سلسلہ منقطع ہونے کی بنا پر وہ اپنے گھر والوں کے بارہ میں بالکل بے خبر ہیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ اگست ۱۹۹۰) کا نمائندہ راج گھٹا (Chidanand Rajghatta) نے علی زکریا الانصاری سے نئی دہلی میں ان کی محل نما رہائش گاہ پر ان سے ملاقات کی۔ رپورٹر کے الفاظ میں مسٹر الانصاری سخت پریشانی کے عالم میں تھے، کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اب وہ ایک غیر موجود ملک کے سفیر (Envoy of a non-existent country) بن کر رہ گئے ہیں۔

ان کے ملک کے خلاف طاقت ور عراق کی اچانک جارحیت کے بعد، ۶۰ سالہ سفیر ابھی تک اس صدمہ سے باہر نہیں آسکے ہیں جو انھیں ایک رات کے اندر اپنے ملک کو کھو دینے کی بنا پر پہنچا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شام کو ان کا ملک موجود تھا اور اگلے دن وہ نہ رہا:

> More than a week after mighty Iraq's sudden aggression against his country, the 60-year old envoy is yet to overcome the shock and trauma of losing his country overnight. One evening it was there and on the morrow....gone (p.20).

موت سے پہلے اس دنیا کا ہر آدمی ملک والا بنا رہتا ہے، مگر موت کے بعد ہر آدمی بے ملک بن جاتا ہے۔ یہ تجربہ آخر کار ہر آدمی پر گزرنے والا ہے، کسی وقتی مدت کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیش کے لیے۔ عقل مند وہ ہے جو موت سے پہلے موت کے بعد والے حالات کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلے۔ جو دوسروں کو بے ملک ہوتے دیکھ کر یہ جان لے کہ اسی طرح ایک روز میرا ملک بھی مجھ سے چھین لیا جائے گا۔

آج کے بعد کل

بے نظیر بھٹو ۲۰ مہینے تک پاکستان کی وزیر اعظم رہیں۔ اس کے بعد ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو صدر غلام اسحاق خاں نے پاکستانی فوج کی مدد سے انھیں وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے زمانہ میں بدعنوانیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اخبارات میں اس سلسلہ میں بہت سے قصے نقل کیے گئے ہیں۔ ہندستان ٹائمس (۲۲ اگست ۱۹۹۰) نے اپنے لاہور کے نامہ نگار ایس وینکٹ نرائن کی ایک مفصل رپورٹ شائع کیا ہے۔ اس میں مختلف واقعات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے رشتہ داروں اور ان کی پارٹی کے ممبروں نے ان کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں مجموعی طور پر اربوں روپیہ نقد یا جائداد کی صورت میں حاصل کیا۔

نامہ نگار نے لکھا ہے کہ خاتون وزیر اعظم کے دوست اور رشتہ دار اور اسی کے ساتھ ان کے نزاعی شوہر آصف علی زرداری کے دوست اور رشتہ دار اپنے آپ کو دولت مند بنانے میں اس طرح مصروف تھے گویا کہ ان کے لیے کبھی کل نہیں آئے گا:

> Friends and relatives of the lady's and those of her controversial husband, Mr Asif Ali Zardari, were busy enriching themselves as though there would be no tomorrow (p. 12).

انگریزی اخبار کے نامہ نگار نے جو بات بے نظیر بھٹو کے بارہ میں لکھی، وہی آخرت کے اعتبار سے تمام دنیا کے انسانوں کا معاملہ ہے۔ موجودہ انسان کا یہ حال ہے کہ وہ صرف اپنے "آج" میں مشغول ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کا کوئی "کل" یا کوئی "۶ اگست" آنے والا نہیں۔

لوگ حق کا انکار کر رہے ہیں گویا کہ ان سے پوچھا جانے والا نہیں کہ انھوں نے کیوں حق کا انکار کیا۔ لوگ جھوٹے الفاظ بولنے میں مشغول ہیں گویا کہ ان کے بولے ہوئے الفاظ پر ان کی کوئی پکڑ ہونے والی نہیں۔ لوگوں نے دوسروں کے جان اور مال اور آبرو کو اپنے لیے حلال کر رکھا ہے گویا کہ ان سے اس کا حساب نہیں لیا جائے گا کہ انھوں نے کیوں خدا کے حرام کیے ہوئے کو اپنے لیے حلال کر لیا۔ لوگ اپنے فائدہ کے لیے اصولوں کو توڑ رہے ہیں گویا کہ ان پر وہ دن آنے والا نہیں جب انھیں یہ بتانا پڑے کہ انھوں نے اپنے وقتی فائدے کے لیے خدا کے ابدی اصولوں کو کیوں توڑ دیا۔

دھاندلی

عراق ایک بڑا ملک ہے اور کویت اس کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ملک۔ عراق کا رقبہ ۸ ، ۱۶۸۸ مربع میل ہے۔ جب کہ کویت کا رقبہ صرف ۶۸۸۰ مربع میل۔ عراق نے اپنی تیل کی دولت کے بڑے حصہ کو فوجی مدوں میں خرچ کر کے ۱۰ لاکھ کی طاقت ور فوج بنالی ہے، دوسری طرف کویت کے پاس عملاً کوئی فوج نہیں۔ اس فرق سے فائدہ اٹھا کر عراق کے حکمراں صدام حسین نے اپنی ایک لاکھ فوج ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت کے اندر داخل کر دی۔ انھوں نے بزور کویت کو عراق میں ملا کر اعلان کر دیا کہ "کویت عراق کا ۱۹ واں صوبہ ہے"۔

اس کے بعد اقوام متحدہ متحرک ہوئی۔ مختلف ملکوں نے عراق کے اس جارحانہ اقدام کی مذمت کی۔ یہاں تک کہ امریکہ کی قیادت میں پورے عراق کا فوجی محاصرہ کر لیا گیا۔ عراق کی ۹۵ فی صد آمدنی کا انحصار تیل کی فروخت پر ہے۔ مگر عراقی تیل سے بھرے ہوئے ٹینکر سمندر میں کھڑے ہو گئے، زرعی اور صنعتی پسماندگی کی وجہ سے عراق فوجی ہتھیاروں سے لے کر دوا اور غذا تک ہر چیز باہر سے منگاتا ہے، ان کا آنا بھی بند ہو گیا۔ اب عراق کے حکمراں صدام حسین روزانہ امریکہ کے خلاف تیز و تند بیانات جاری کر رہے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اگست ۱۹۹۰) کے مطابق، صدام حسین نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ وہ کویت کی حیثیت کے بارہ میں امریکہ سے بات چیت کریں۔ انھوں نے پُرجوش طور پر کہا کہ کیا کویت امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ ہے:

Is Kuwait the 52nd state of the United States?

جواب کی یہی قسم ہے جس کو دھاندلی کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کویت اگر امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ نہیں تو وہ عراق کا بھی ۱۹ واں صوبہ نہیں۔ صدام حسین عین اسی چیز کے لیے امریکہ کو متہم کر رہے ہیں جس میں وہ خود شدید تر انداز میں مبتلا ہیں۔

آج دنیا کے بیشتر لوگ اسی قسم کی دھاندلی میں مبتلا ہیں۔ کاش لوگ جانتے کہ اُسی بات کی قیمت ہے جو خدا کے یہاں قیمتی ٹھہرے۔ مومن وہ ہے جو اُن الفاظ کو آج ہی بے قیمت سمجھ لے جو کل خدا کے یہاں بے قیمت ہونے والے ہیں۔ جو آج آزادانہ طور پر اُس بات کو مان لے جس کو کل وہ مجبورانہ طور پر مانے گا، مگر اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

اعلیٰ مقصد

ایک عرب ملک کی ٹیم بمبئی آئی اور ایک ہوٹل میں ٹھہری۔ ان کو اپنے ملک کے لیے کچھ کارکنوں کی ضرورت تھی۔ انھوں نے انگریزی اخبارات میں اشتہار چھپوایا۔ اس کو دیکھ کر دہلی کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان نے بھی اپنے کاغذات انھیں بھیجے۔ اس کے جواب میں اس کے پاس بمبئی سے انٹرویو کارڈ آ گیا۔ مذکورہ نوجوان رکشہ پر بیٹھ کر اپنے گھر سے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے ہمراہ اس کا ایک ساتھی بھی تھا جو اس کو چھوڑنے کے لیے اسٹیشن تک جا رہا تھا۔ سڑک پر ایک جگہ کچھ جاہل قسم کے لڑکے کھیل رہے تھے۔ رکشہ ان کے پاس سے گزرا تو ایک لڑکے نے ان کے خلاف برے الفاظ کہے۔ دوسرے نے کنکر پھینک دیا۔ اب نوجوان کے ساتھی کو غصہ آ گیا۔ اس نے چاہا کہ رکشہ روک کر اترے اور لڑکوں کو مارے۔ نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور کہا: چھوڑو ہمارے پاس اس کا وقت کہاں ہے۔

مذکورہ نوجوان کے سامنے ایک منزل تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وقت پر اسٹیشن پہونچ کر ٹرین پکڑے۔ بمبئی جا کر انٹرویو دے اور پھر عرب پہونچ کر دس ہزار روپیہ مہینہ کمائے۔ اس مقصد نے اس کی نظر میں لڑکوں کی گالی یا ان کی کنکری کو حقیر بنا دیا۔ وہ ان کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اہل اسلام کا ہے۔ اہل اسلام وہ لوگ ہیں جو دعوت حق کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہوں۔ دعوت کا اعلیٰ تصور ان کی نظر میں بقیہ تمام چیزوں کو ہیچ کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں کی طرف سے بُرے الفاظ سنتے ہیں، ان کی طرف پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ مگر وہ ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے۔ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کا وقت کہاں ہے کہ ہم اس قسم کی چھوٹی چیزوں میں الجھیں۔

مذکورہ نوجوان کے سامنے صرف دس ہزار روپیہ مہینہ کی منزل تھی۔ مگر داعی اور مومن کے سامنے جنت کی منزل ہوتی ہے۔ اس کے سامنے خدا کا یہ وعدہ ہوتا ہے کہ اس کا جو بندہ اس کے پیغام کو انسانوں تک پہونچائے گا اور اس راہ میں ہر قسم کی تکلیف اور دل آزاری کو برداشت کرے گا، اس کے لیے آخرت میں ابدی جنت ہے۔ وہ کہہ اٹھتا ہے کہ صبر ہی تو جنت کی قیمت ہے۔ پھر اگر میں لوگوں کی ایذا رسانی پر صبر نہ کروں تو آخرت میں مجھے جنت کا داخلہ کس طرح ملے گا۔

اعراض میں دنیا کی کامیابی بھی ہے اور اسی میں آخرت کی کامیابی بھی۔

جدید سائنس

رابرٹ بائل (Robert Boyle) مشہور سائنس داں ہے۔ وہ ۱۶۲۷ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۶۹۱ میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے سائنس کے مطالعہ کو اپنا موضوع بنایا۔ مگر سائنس کے مطالعہ نے اس کو مذہب سے دور نہیں کیا۔ بلکہ اور قریب کر دیا۔ آخر میں وہ پختہ قسم کا پروٹسٹنٹ عیسائی بن گیا۔ اس نے شادی نہیں کی اور اپنی تمام کمائی مسیحی مذہب کی تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔

رابرٹ بائل خدا کے وجود کو مانتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق، فطرت کا نظام ایک گھڑی کی مانند ہے۔ خدا نے اس کو پیدا کیا اور اس کو ابتدائی طور پر چلا دیا۔ اب وہ ثانوی قانون کے تحت عمل کر رہی ہے۔ جس کا سائنس کے ذریعہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

> In his view of divine providence, nature was a clocklike mechanism that had been made and set in motion by the Creator at the beginning and now functioned according to secondary laws, which could be studied by science (3/97).

یہ بیسویں صدی سے پہلے کی سائنس تھی۔ اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات میں یکسانیت (uniformity) ہے۔ کائنات کے تمام اجزا ریکساں قوانین کے تحت چل رہے ہیں۔ مگر بیسویں صدی میں پہونچ کر یہ نظریہ باقی نہ رہ سکا۔

کائنات کبیر (macrocosm) کے مطالعہ میں بظاہر یہ دکھائی دیا تھا کہ کائنات میں یکسانیت کی کارفرمائی ہے۔ مگر کائنات صغیر (microcosm) کے مطالعہ نے اس مفروضہ کو رد کر دیا۔ شمسی نظام کی سطح پر انسان کو جو یکسانیت نظر آتی تھی وہ ایٹم کی سطح پر پہونچ کر ٹوٹ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کو خدا ہی نے اپنے حکم سے بنایا ہے۔ اور وہی اپنے حکم سے اس کو چلا رہا ہے۔ نہ کائنات کو بنانے میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کائنات کو چلانے میں کوئی اس کا شریک۔ ایک خدا کو چھوڑ کر جو نظریہ بھی کائنات کی توجیہہ کے لیے بنایا جاتا ہے وہ بالآخر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ایک خدا کی توجیہہ ہی صحیح توجیہہ ہے۔ اس کے سوا ہر دوسری توجیہہ صرف انسان کا ذہنی مفروضہ ہے، اس کے باہر اس کا کوئی وجود نہیں۔

غیر مؤثر

آسٹریلیا کے ایک صحافی مسٹر ہارڈنگ (Mervyn Hardinge) کا ایک مضمون پرتھ (Perth) میں چھپا۔ اس کا موضوع آسٹریلیا میں شراب نوشی کا مسئلہ (drink problem) تھا۔ اس مضمون کو دوبارہ نئی دہلی کے انگریزی اخبار اسٹیٹسمین نے اپنے شمارہ ۲ اگست ۱۹۹۰ (صفحہ ۶) میں نقل کیا ہے۔

مضمون نگار نے آسٹریلیا کے ہیلتھ سروسز کے منسٹر مسٹر اسٹیپلس (Mr Staples) کے ایک بیان کے حوالے سے بتایا ہے کہ آسٹریلیا کے لوگ سالانہ پانچ بلین ڈالر شراب پر خرچ کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہاں سڑک کے حادثات بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں، آسٹریلیا کے ہر دس آدمی میں سے ایک آدمی کو شراب سے تعلق رکھنے والے دماغی مرض (alcohol-related brain damage) میں مبتلا پایا گیا ہے۔ شراب کے خلاف اشتہار، شراب کے ٹیکس میں اضافہ وغیرہ شراب نوشی کو روکنے یا کمی کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

آسٹریلیا کے کچھ دانشوروں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس مسئلہ کو تعلیم کے ذریعہ حل کیا جائے۔ مگر مضمون نگار کا کہنا ہے کہ اس قسم کی کوشش مفید ثابت نہ ہوگی۔ کوئی بھی شراب مخالف تعلیمی پروگرام ناگزیر طور پر ناکام ہو جائے گا، اور اس کی سادہ سی وجہ یہ ہوگی کہ جن طلبہ کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے، ان کی بیشتر تعداد اتنی مخمور ہوگی کہ وہ کلاس میں حاضر ہی نہ ہوگی :

> Any anti-liquour education programme must inevitably fail for the simple reason that most of the prospective pupils would usually be too fuddled to attend class.

یہ بات جو یہاں شراب مخالف تعلیم کے بارہ میں کہی گئی ہے، وہی اس قسم کی اکثر کوششوں کے بارہ میں صحیح ہے۔ مثلاً پاکستان میں "اسلامائزیشن" کی اسکیم کے تحت ٹیلی وزن پر اسلامی پروگرام جاری کیے گئے۔ مگر ان کو صرف وہ لوگ دیکھتے تھے جن کو اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں، اور جن کو دیکھنا چاہیے، ان کا حال یہ تھا کہ جیسے ہی اسلامی پروگرام شروع ہوا، انھوں نے ٹی وی سٹ کو بند کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی فکری اصلاح ہمیشہ تبلیغی مہم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ وہ اسکول کی تعلیم یا ٹی وی کے پروگرام کے ذریعہ کبھی پیدا نہیں ہوتی۔

احتساب غیر

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۹۶۹ - ۱۸۹۷) نے ایک بار بتایا کہ جب وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وائس چانسلر بن کر آئے تو یونیورسٹی کے کچھ لوگ ان سے ملے اور کہا کہ یونیورسٹی میں کئی اسٹاف ممبر رجعت پسند اور فرقہ پرست ہیں۔ ان کی وجہ سے یونیورسٹی بدنام اور تباہ ہو رہی ہے۔ اگر ان سب لوگوں کو نکال دیا جائے تو اس کے بعد یونیورسٹی کی فضا بالکل درست ہو جائے گی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ آپ ایسے لوگوں کی فہرست بنا کر مجھے دیدیجئے۔

پھر کچھ دوسرے لوگ ذاکر صاحب سے ملے۔ انھوں نے دوبارہ کہا کہ یونیورسٹی کے کئی استاد کمیونسٹ اور دہریہ ہیں۔ ان کو آپ یہاں سے نکال دیں تو اس کے بعد یونیورسٹی کی فضا بالکل صحیح ہو جائے گی۔ ذاکر صاحب نے ان سے بھی کہا کہ آپ مذکورہ افراد کی فہرست بنا کر مجھے دیدیں۔

دونوں صاحبان کی طرف سے فہرستیں بن کر آگئیں۔ اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں تقریباً تین سو آدمیوں کا ٹیچنگ اسٹاف تھا۔ جب کہ دونوں فہرستوں میں دو دو سو نام درج تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا: "میں حیران ہوں کہ آخر تین سو آدمیوں میں سے چار سو آدمیوں کو کیسے نکال دوں"

دونوں فہرستوں کو ملا کر جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ تقریباً پچاس نام ایسے ہیں جو دونوں فہرستوں میں مشترک طور پر موجود ہیں۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ بتائیے، اگر میں ان سب کو نکال دوں تو پھر یونیورسٹی میں کون رہ جائے گا جو یہاں بچوں کو پڑھائے (الجمعیتہ۔ دہلی، ۲۸ جون ۱۹۸۰)

یہ واقعہ قوم کی اخلاقی حالت کو بتا رہا ہے۔ آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہر ایک دوسروں کے بارہ میں سوچنے کا بادشاہ ہے۔ کوئی شخص اپنے بارہ میں سوچنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر ایک کے پاس بیرونی غلط کاروں کی لمبی لمبی فہرستیں ہیں۔ مگر خود اپنی غلط کاری کی فہرست کسی کے پاس بھی نہیں۔

کسی قوم کے افراد میں احتساب خویش کا مزاج ہو تو اس کے تمام معاملات درست رہتے ہیں۔ اور جس قوم کے افراد میں احتساب غیر کا مزاج پیدا ہو جائے، اس کے تمام معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ احتساب خویش کے مزاج سے دنیا بھی درست ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ احتساب غیر کا مزاج دنیا کو بھی بگاڑ دیتا ہے اور آخرت کو بھی۔

اتحاد کی اہمیت

حضرت ابوسعید خُدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اپنی صفوں کو درست کرو اور خلل کو اچھی طرح پُر کرلو (اذا قمتم فاعدلوا صفوفکم وسدوا الفرج)

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ جس شخص نے صف کو ملایا اللہ اس کو ملائے اور جس شخص نے صف کو کاٹا اللہ اسے کاٹ دے (من وصل صفاً وصله الله ومن قطع صفاً قطعه الله)

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں اپنی صفوں کو اچھی طرح پر کرو اور خوب مل کر کھڑے ہو۔ گردنوں کو برابر رکھو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں شیطان کو دیکھتا ہوں کہ وہ صفوں کے خلل سے بکری کے بچہ کی طرح داخل ہورہا ہے (رُصُّوا صفوفکم وقاربوا بینها وحاذوا بالاعناق فوالذی نفسی بیده انی لأری الشیطان یدخل من خلل الصف کانها الحذف) ابو داؤد، نسائی

اس طرح کی بہت سی روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں جن میں یہ تاکید ہے کہ جب نماز باجماعت کے لیے کھڑے ہو تو خوب مل کر صف بندی کرو۔ کچھ روایتوں میں یہ بھی ہے کہ دو نمازیوں کے بیچ میں اگر خلل رہے گا تو وہاں سے شیطان داخل ہوجائے گا۔ کچھ لوگوں نے اس کو لفظی معنوں میں لے لیا۔ حالاں کہ اگر اس کو بالکل لفظی معنوں میں لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ قابل عمل ہی نہیں۔ کیوں کہ دو نمازی جب اپنے پیروں کو پھیلا کر ایک دوسرے سے ملاتے ہیں تو خود ایک نمازی کے اپنے دو پیروں کے درمیان اتنا خلل ہوجاتا ہے جو "بکری کے بچہ" کے داخل ہونے کے لیے کافی ہو۔

ان روایتوں میں ایک حقیقت پر زور دینا مقصود ہے نہ کہ محض ایک ظاہری شکل پر۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی پوری زندگی میں متحد ہو کر رہنا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اپنی تمام سرگرمیوں کو اتحاد کے ساتھ انجام دیں۔ ان کے ہر عمل میں اتحاد کے جذبہ کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔ حتیٰ کہ چند مسلمان اگر سفر کریں تو وہ بھی اپنا ایک امیر بنالیں اور متحدہ صورت میں سفر کریں۔ مسلمان جہاں بھی باہمی اتحاد میں کمی کریں گے وہیں شیطان ان کی صفوں کے اندر گھس جائے گا اور ان کے تمام مقاصد کو برباد کردے گا۔ آپس کے تعلقات میں اگر دوری پیدا ہوجائے تو نہ مسجد کے اندر کی دنیا فتنوں سے خالی رہے گی اور نہ مسجد کے باہر کی دنیا۔

مسائلِ ملّت

مسلمانوں کے موجودہ مسائل کا قرآنی حل ـــــ یہ وہ موضوع ہے جس پر مجھے اظہار خیال کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ سوال بظاہر ایک سادہ سا سوال معلوم ہوتا ہے۔ مگر نظری اعتبار سے سادہ ہونے کے باوجود، عملی اعتبار سے وہ سادہ سوال نہیں۔ قرآن میں اگرچہ اس کا واضح جواب موجود ہے، مگر اس جواب کو پانا اور اس کو اختیار کرنا بلا شبہہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔

"آج کون سی تاریخ ہے" اس سوال کا جواب معلوم کرنا ہو تو ہر شخص اس کو نہایت آسانی کے ساتھ جان لے گا۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ آج سنیچر کا دن ہے اور فروری کا مہینہ، تو اپنی دیوار کا کلنڈر دیکھ کر آپ نہایت آسانی کے ساتھ جان لیں گے کہ آج کیا تاریخ ہے۔ آپ کلنڈر میں فروری کا صفحہ کھولیں گے اور پھر سنیچر کے خانہ میں دیکھیں گے تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ آج فروری ۱۹۹۰ کی دس تاریخ ہے۔

مگر قرآن سے اس طرح ٹکنیکل انداز میں مذکورہ سوال کا جواب معلوم کرنا ممکن نہیں۔ آپ کے پاس پورا قرآن موجود ہو۔ آپ عربی زبان جانتے ہوں، حتیٰ کہ آپ کسی مدرسہ میں شیخ التفسیر کے عہدے پر فائز ہوں تب بھی یہ پیچیدگی بدستور باقی رہے گی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلنڈر سے تاریخ نکالنے کا معاملہ صرف ایک فنی معاملہ ہے۔ مگر مسلمانوں کے مسائل کا قرآنی حل جاننے کا معاملہ، اسی کے ساتھ امتحان کا معاملہ بھی ہے۔ اس کا امتحان کا معاملہ ہونا اس کو انتہائی آسان ہونے کے باوجود، انتہائی مشکل بنا دیتا ہے۔

سنّت امتحان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے موجودہ دنیا میں اس لئے رکھا ہے کہ اس کا امتحان لے (الملک ۲) موجودہ دنیا کی تمام چیزیں اسی مقصد حیات کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہر ہدایت کے ساتھ ہمیشہ ایک شبہہ کا عنصر (element to doubt) موجود رہتا ہے۔ تاکہ آدمی کا امتحان لیا جائے کہ وہ خدا کی دی ہوئی عقل سے شبہ کا پردہ پھاڑتا ہے یا نہیں۔ اس دنیا میں ہدایت صرف اس شخص کو ملتی ہے جو شبہہ

م پردہ کو پھاڑ کر سچائی کو اس کی بے حجاب صورت میں دیکھ سکے۔ جو شخص اس امتحان میں پورا نہ
بے اس کو موجودہ دنیا میں کبھی ہدایت نہیں ملے گی۔

اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت پر غور کیجئے:

ہ کہتے ہیں کہ پیغمبر پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم فرشتہ اتاریں تو پھر معاملہ کا فیصلہ
وجائے۔ اس کے بعد انھیں کوئی مہلت نہ ملے۔ اور اگر ہم کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے تب بھی اس کو آدمی
ی کی صورت میں بھیجتے۔ اور لوگوں کو اسی شبہ میں ڈال دیتے جس شبہ میں وہ اب مبتلا ہو رہے
ہیں (الانعام ۹)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی ہدایت کبھی اس طرح برہنہ صورت میں نہیں آتی کہ آدمی کے لئے اس میں کچھ بولنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ فرشتہ اگر اپنی اصل صورت میں خدا کا پیغام لے کر ظاہر ہو جائے تو کون ہوگا جو اس کے نمائندۂ خدا ہونے پر شبہ کرے۔ اس لئے خدا اپنے پیغام کی پیغام رسانی کا کام انسانوں میں سے کسی انسان کے ذریعہ کرتا ہے تاکہ پیغام کی سچائی کے باوجود اس میں شبہ کا ایک پہلو باقی رہے۔

یہی اس دنیا کے لئے خدا کا قانون ہے۔ یہاں جب بھی ہدایت ظاہر ہوتی ہے، اس میں شبہ کا ایک پہلو بھی ضرور شامل رہتا ہے۔ یہی آدمی کا امتحان ہے۔ آدمی کو یہاں شبہ کے پردے کو پھاڑنا پڑتا ہے۔ جو آدمی شبہ کے پردے کو پھاڑ دے، وہ ہدایت کو اس کی برہنہ صورت میں دیکھ لے گا اور جو آدمی شبہ کے اس پردے کو پھاڑنے میں ناکام رہے، وہ ہدایت کو پانے میں بھی ناکام رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر بصیرت کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ یہ بصیرت گویا ایک قسم کی خدائی کسوٹی ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی بصیرت کو بے آمیز روپ میں استعمال کریں، وہ اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس بصیرت کو بے آمیز روپ میں استعمال نہ کر سکیں وہ ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مسائل کے قرآنی حل کو پہچاننے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ کیوں کہ جب بھی قرآن کے حوالہ سے اس کا بتایا ہوا حل پیش کیا جاتا ہے، تو خواہ وہ کتنا ہی مدلل اور مُبرہن ہو، اس میں شبہ

ایک پہلو ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ اس شبہ والے پہلو میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔
ایت کے واضح ہونے کے باوجود وہ اس کو اپنی زندگی میں اختیار نہیں کر پاتے۔

دور اوّل کی مثال

اس سلسلہ میں ایک مثال لیجئے۔ قدیم مکہ میں ایک شخص تھا اس کا نام روایات میں الحارث بن
ان بن نوفل بن عبد مناف بتایا گیا ہے۔ اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب
ید کی دعوت پیش تو اس نے اپنی قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ سے کہا:

ا انعلم ان الذی تقول حق ولکنا ان	ہم جانتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ بلاشبہ حق
عناك خفنا ان تخرجنا العرب من	ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے
ض مکۃ (التفسیر المظہری)	کہ عرب ہم کو مکہ کی سرزمین سے نکال دیں گے۔

شان نزول کی روایات کے مطابق، قرآن کی سورہ نمبر ۲۸ میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد
ا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ اس ہدایت کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے کہ ہم کو ہماری زمین
ے اُچک لیا جائے گا (وَقَالُوٓا إِن نَّتَّبِعِ ٱلْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَآ ، القصص ۵۷)

قدیم مکہ میں وہاں کے لوگوں کی سرداری اور معاش دونوں کا خاص ذریعہ شرک تھا۔ انھوں نے
کیا تھا کہ مکہ کے تمام قبیلوں کا بت کعبہ میں رکھ دیا تھا۔ چنانچہ کعبہ میں ۳۶۰ مختلف بت جمع ہو گئے تھے۔
ں طرح مکہ کے لوگوں کو عرب کے تمام قبیلوں کی سرداری حاصل ہو گئی تھی۔ اسی کے ساتھ ان کو یہ
اشی فائدہ بھی تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اپنے اپنے بتوں پر نذر چڑھانے کے لئے مکہ آتے تھے۔ یہ
م نذرانے مکہ والوں کو ملتے تھے۔ اس طرح شرک مکہ والوں کے لئے بیک وقت قیادت کا ذریعہ بھی تھا
ر معاشیات کے حصول کا ذریعہ بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کیا تو ان کی فطرت
ے اس کے برحق ہونے کی تصدیق کی۔ مگر ان کا ذہن اس سوال میں اٹک گیا کہ اگر وہ یہ کہیں کہ خدا صرف
ک ہے۔ بقیہ تمام دیوتا فرضی ہیں، تو وہ اچانک تمام مشرک قبائل سے کٹ جائیں گے۔ اس کے بعد
ن کی سرداری بھی ان سے چھن جائے گی اور ان کی معاش بھی۔ ہدایت کے واضح ہونے کے باوجود ایک
شبہہ ان کے لئے قبولیت کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔

ہندستانی مسلمان

ہندستانی مسلمانوں کا حال بھی موجودہ زمانہ میں یہی ہو رہا ہے۔ مختلف شبہات کی بنا پر وہ قرآن سے رہنمائی لینے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے جب قرآن کی بات رکھی جاتی ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق یہی بات درست ہے۔ مگر فوراً ہی کچھ سوالات سامنے آکر انھیں اس کی طرف سے شبہ میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ اپنے شبہات کی بنا پر قرآن کو اپنانے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

مثلاً جب ان کے سامنے صبر و اعراض کی آیتیں پیش کی جائیں تو وہ اس شبہہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم قومی معاملات میں صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو ہندو ہمارے اوپر دلیر ہو جائے گا۔ جب ان کے سامنے قرآن کا دعوتی اور تعمیری پیغام رکھا جائے تو انھیں یہ شبہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اگر ہم سیاست کی مہم نہ چلائیں تو ہم ملک میں ہونے والے سیاسی عمل سے کٹ جائیں گے۔ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ ہندو تمہارے لئے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں اور مدعو سے مطالبہ اور احتجاج کو قرآن میں منع کیا گیا ہے، تو فوراً وہ یہ شبہ پیش کر دیں گے کہ اگر ہم مطالبہ اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ دیں تو اس ملک میں ہم اپنے دستوری حقوق سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ وغیرہ۔

آج کے سوال کے بارہ میں اصل مشکل یہی ہے۔ قرآن بلاشبہ ایک کامل اور مفصل کتاب ہے۔ اس میں قیامت تک پیش آنے والے تمام سوالات کا واضح جواب موجود ہے۔ مگر اللہ تعالی کی سنت التباس (الانعام ۹) کی بنا پر ان تمام جوابات میں شبہ کا ایک عنصر بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آج کا مسلمان جانچ کی میزان پر کھڑا ہوا ہے۔ اگر وہ شبہ کا پردہ پھاڑ کر قرآن کی طرف بڑھے تو وہ یقیناً اپنے مسائل کا قرآنی حل پالے گا۔ اور اگر وہ شبہ کی بات میں اٹک جائے تو کوئی بھی آیت یا کوئی بھی حدیث اس کو رہنمائی دینے کے لئے کافی ثابت نہیں ہوگی۔

اب میں مسلمانوں کے موجودہ مسائل کے قرآنی حل پر کلام کروں گا۔ اس سلسلہ میں میری گفتگو کے تین حصے ہوں گے۔ اور ہر حصہ کی بنیاد قرآن کی ایک واضح آیت پر ہوگی۔

تحفظ کا مسئلہ

ہندستان کے مسلمانوں، خاص طور پر شمالی ہند کے مسلمانوں، کے نزدیک ان کا نمبر ایک

مسئلہ جان و مال کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ وہ سب سے زیادہ اسی مسئلہ پر سوچتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں سب سے زیادہ اسی سوال پر مرتکز رہتی ہیں۔ اس سوال کو ذہن میں رکھ کر اگر ہم قرآن کو پڑھنا شروع کریں تو اس کو پڑھتے ہوئے ہم سورۂ المائدہ کی اس آیت (نمبر ۶۷) پر پہنچیں گے جس میں تحفظ کے مسئلہ کا جواب نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں موجود ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

یاایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس ان اللہ لا یہدی القوم الکفرین

اے پیغمبر جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت پر غور کیجئے۔ اس میں عبارت النص کی سطح پر یہ بات نکل رہی ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ جب بھی مسلمانوں کو محسوس ہو کہ ان کے لئے غیر اقوام کی طرف سے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے تو انھیں فوراً دعوت الی اللہ کے کام میں مشغول ہو جانا چاہئے اور اس کو اس کے تمام ضروری آداب کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے۔ یہی تحفظ کے مسئلہ کا سب سے زیادہ یقینی حل ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرتی ہے تو عین اس وقت بھی اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت کو بدل دے۔ یہ فطرت پیدائشی طور پر اسلام کی طالب ہوتی ہے۔ ہر آدمی اپنی ابتدائی فطرت کے اعتبار سے دین اسلام پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر دشمن امکانی طور پر ان کا دوست ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیا جائے تو وہ اسلام قبول کر لے گا۔ اور جب وہ اسلام قبول کر لے گا تو وہ بھی مسلمانوں کی ملت میں شامل ہو کر ان کا جزء بن جائے گا۔ اور اس کے بعد مسلمانوں کا مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

تاریخ نے بار بار قرآن کے اس اصول کی تصدیق کی ہے۔ دور اول میں عرب کے مشرکین نے ابتداءً رسول اللہ کی سخت مخالفت کی مگر آپ ان کی مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے صبر اور حکمت

کے ساتھ انھیں اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف بیس سال کے مختصر عرصہ میں تمام عرب قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ جو لوگ بظاہر آپ کے دشمن تھے، وہ آپ کے دوست اور ساتھی بن گئے۔ اسلام کے سپاہی بن کر انھوں نے اسلام کی عالمی تاریخ بنائی۔

۱۳ ویں صدی عیسوی میں تاتاری قبائل ایک وحشی طوفان بن کر اٹھے اور انھوں نے سمرقند سے لے کر بغداد تک مسلمانوں کے تمام ملی نشانات کو مٹا ڈالا۔ بغداد کی عباسی خلافت ان کی فوجی یلغار کی تاب نہ لا کر ختم ہو گئی۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ مسلمانوں کے قومی کھنڈر سے اسلام کی دعوتی قوت ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ اسلام کے عقیدہ نے فاتح تاتاریوں کو مسخر کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ پچاس برس میں پوری تاریخ بدل گئی۔ مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح بن گئے۔ ہلاکو نے مسلم دنیا کی جن مسجدوں کو ڈھایا تھا، اس کے پوتوں نے ان مسجدوں کو دوبارہ بنایا۔ اور ان مسجدوں میں خدائے واحد کے سامنے جھک کر اپنے عجز کا اعتراف کیا۔

اسلامی تاریخ کا یہی واقعہ ہے جس کا ذکر علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ میں آل انڈیا مسلم لیگ (الٰہ آباد) کے اجلاس میں اپنا خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے اس طرح کیا تھا کہ ــــ مسلمانوں کی تاریخ سے مجھے یہ سبق ملا ہے کہ ان کی تاریخ کے نازک مواقع پر یہ اسلام تھا جس نے مسلمانوں کو بچایا نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کو:

One lesson I have learnt from the history of Muslims. At critical moments in their history it is Islam that has saved Muslims and not vice versa.

یہی بات اقبال نے عوامی انداز میں اپنے اس شعر میں کہی ہے:

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو ماضی کے اعتبار سے سمجھا۔ مگر اس کو انھوں نے حال کے اعتبار سے دریافت نہیں کیا۔ انھیں یہ تو دکھائی دیا کہ گزری ہوئی تاریخ میں اسلام کی دعوتی طاقت نے مسلمانوں کو بچایا ہے مگر حال کے اعتبار سے وہ اس طاقت کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۳۰ میں جغرافی تقسیم (پاکستان) کو ہندستان کے مسلمانوں کا حل بتایا۔ حالاں کہ

انہیں مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا چاہئے تھا کہ تم غیر اقوام کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرو۔ اس کے بعد تمہارے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے جس طرح وہ ماضی میں حل ہو گئے۔

کسی قوم کے رہنما اور دانشور ہی وہ لوگ ہیں جو پوری قوم کا ذہن بناتے ہیں۔ ان کی تقریریں اور تحریریں لوگوں کو کسی ایک طرف یا دوسری طرف لے جاتی ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کی مشکل یہ ہے کہ ان کے رہناؤں اور دانشوروں میں دعوتی ذہن موجود نہیں۔ وہ صرف قومی طرز فکر کو جانتے ہیں۔ اور ہمیشہ قومی طرز فکر کے مطابق لکھتے اور بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ملک کے قومی مسائل تو دکھائی دیتے ہیں۔ مگر انھیں ملک کے دعوتی امکانات نظر نہیں آتے۔

اس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ہندستان میں کروروں کی تعداد میں وہ لوگ آباد ہیں جن کو اچھوت یا پست اقوام کہا جاتا ہے۔ ہندو مذہب اور روایات اس میں مانع ہیں کہ ان کو ملک میں برابر کا سماجی درجہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ مستقل طور پر مایوسی اور ذہنی انتشار میں مبتلا رہتے ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر (۱۸۹۳-۱۹۵۶) ایک اچھوت خاندان میں پیدا ہوئے۔ مگر انھوں نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہاں تک کہ وہ چوٹی کے دانشور بن گئے۔ اپنی ذہنی اور علمی خصوصیات کی بنا پر انھوں نے پوری اچھوت برادری میں واحد نمائندہ لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی۔

ڈاکٹر امبیڈکر کو اس بات کی بہت زیادہ فکر تھی کہ وہ اپنی قوم کو اوپر اٹھائیں اور ان کو ملکی سماج میں برابری کا درجہ دیں۔ ہندو ازم اور ہندو سماج کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندو دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اپنی قوم کو یہ درجہ نہیں دلا سکتے۔ دوسری طرف اسلام کے مطالعہ نے انھیں بتایا کہ یہ مطلوبہ درجہ ان کو اور ان کی قوم کو نہایت کامیابی کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے اگر وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی پوری برادری کے ساتھ اسلام قبول کر لیں۔

اس سلسلہ میں انھوں نے مختلف تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسلام پست طبقات کو وہ سب کچھ دیتا ہے جس کی

ں ضرورت ہے۔ اقتصادی اعتبار سے اسلام کے ذرائع لامحدود ہیں۔ سماجی اعتبار سے مسلمان پورے
۔ یا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مسلمان ملک کے ہر صوبے میں موجود ہیں اور وہ پست طبقات کے نومسلموں
پوری مدد کر سکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے پست طبقات وہ تمام حقوق پالیں گے جو مسلمانوں کو
صل ہیں:

Islam, seems to give the Depressed Classes all they need. Financially, the resources behind Islam are boundless. Socially, the Mohammedans are spread all over India. There are Mohammedans in every province and they can take care of new converts from the Depressed Classes and render them all help. Politically the Depressed Classes will get all the rights which Mohammedans are entitled to.

Politics of Conversion, New Delhi, 1986, p.321

واقعات بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر امبیڈکر اسلام کے بالکل قریب آچکے تھے اور عین ممکن تھا کہ وہ
نی پوری برادری کے ساتھ اسلام قبول کرکے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو جائیں۔ حتی کہ انھوں
۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ کو وہ اعلان کیا جس کو ایولا ڈیکلریشن (Yeola Declaration) کہا جاتا ہے۔
ں اعلان میں انھوں نے ۴۰ ملین ہریجنوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے موجودہ مذہب کو چھوڑ کر دوسرے
ہب میں داخل ہو جائیں (صفحہ ۳۲۲)

مگر مسلم لیڈروں میں سے کسی بھی قابل ذکر شخص نے ڈاکٹر امبیڈکر کی طرف توجہ نہ کی۔ حتی کہ کسی نے ان
سے ملاقات کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ دوسری طرف عین اسی زمانہ (۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ کے درمیان) مسلمانوں
نے بحیثیت قوم یہ مظاہرہ کیا کہ انھیں ملک کی تقسیم کے سوا کسی اور چیز سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ مسلم
ہنماؤں نے ہریجنوں کو اسلام کے سایۂ رحمت میں داخل کرنے سے کوئی حقیقی دل چسپی نہ لی۔ انھوں
نے اپنی ساری دل چسپی اس بات کے لئے دکھائی کہ ملک سیاسی اعتبار سے دو حصوں (ہندو انڈیا،
سلم انڈیا) میں بانٹ دیا جائے۔

مسلمانوں کی یہ قومی پالیسی ڈاکٹر امبیڈکر کی امیدوں کے سراسر خلاف تھی۔ انھوں نے قدرتی
ور پر یہ سمجھا کہ بٹوارہ کے بعد وہ اور ان کی قوم ہندو انڈیا میں باقی رہے گی۔ کیونکہ ہریجن زیادہ تر اسی
لاقہ میں آباد تھے۔ تقسیم کے بعد مسلمان اس حیثیت میں نہ ہوں گے کہ وہ ان کی کوئی مدد کر سکیں۔
وسری طرف وہ تبدیلی مذہب کے نتیجہ میں مستقل طور پر ہندو غضب ناکی کا شکار ہو کر رہ جائیں گے۔

ا نچہ انھوں نے اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے کا ارادہ ختم کر دیا۔

مسلم رہنماؤں میں اگر دعوتی ذہن ہوتا تو وہ سمجھتے کہ پست طبقات کو اسلام میں داخل کر کے
ز وہ ان کا درجہ اونچا کریں تو یہ خود ان کے لئے بھی حد درجہ مفید ہوگا۔ اس کے بعد ان کی آبادی ملک
ں مجموعی طور پر تقریباً ۵۰ فی صد ہو جائے گی۔ اور اگر آئندہ تبلیغی عمل کو جاری رکھا جائے تو قریبی
متقبل میں وہ پچاس فیصد سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں۔ حتی کہ اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی کہ وہ
پاکستان" کی صورت میں اپنے لئے سیاسی پناہ کا ایک گوشہ تلاش کریں۔ مگر مسلم رہنماؤں کے غیر
آنی ذہن کا یہ نقصان ہوا کہ انھیں قومی خطرات دکھائی دئے مگر انھیں دعوتی امکان نظر نہ آیا۔

دعوت الی اللہ سے عصمت من الناس کا فائدہ حاصل ہونا اتنا یقینی ہے کہ وہ کسی براہ
است کوشش کے بغیر اپنے آپ حاصل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ مسلمان اپنی کسی نادانی سے اس کے
مل میں رکاوٹ ڈالنے کا سبب نہ بنیں۔

اس کا زندہ ثبوت ۱۹ویں صدی اور پھر ۲۰ویں صدی کے آغاز کی تاریخ ہے۔ واقعات
تاتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام نہایت تیزی کے ساتھ ہندستان میں پھیل رہا تھا۔ ہر روز
مبالغہ ہزاروں آدمی اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ اگر اس عمل کو بدستور جاری رہنے دیا جاتا تو کسی
بال یا جناح کی ضرورت نہ تھی جو بٹوارہ کی صورت میں مسلمانوں کے مسئلہ کا حل تجویز کرے۔ مگر پہلی
لمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) کے بعد مسلمانوں میں جو قومی تحریکیں اٹھیں، جس کا آخری عروج آل انڈیا
سلم لیگ تھی، اس نے سارا نقشہ بگاڑ دیا۔ ان تحریکوں نے انتہائی غیر دانش مندانہ طور پر ہندوؤں
مسلمانوں کے درمیان اختلافی باتوں کو ابھارا۔ انھوں نے اپنی دھواں دھار کارروائی کے
ریعہ دونوں قوموں میں نفرت کی ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دی۔ مسلم لیڈروں کی یہی نفرت انگیز
یاست ہے جس نے اسلام کی اشاعت کے اس سیلاب کو روک دیا جو مغل سلطنت کے زوال کے بعد
ہویں صدی میں اس ملک میں جاری ہوا تھا۔

ہندستان میں مسلمانوں کو مستقبل کی تعمیر کے لئے دو میں سے ایک کام کرنا تھا۔ یا تو وہ سچے داعی
ن کر دوسری قوموں کو اپنا مدعو بناتے اور صبر اور حکمت کے ساتھ انھیں اسلام کی دعوت دیتے۔ اور
گر وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے تو دوسرا کام ان کے کرنے کا یہ تھا کہ وہ اسلام کی فطری اشاعت کے عمل میں

کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کریں۔ وہ اس معاملہ میں خاموش ہو جائیں اور اسلام کو اپنی ذاتی طاقت سے آگے بڑھنے کا موقع دیں۔

مسلمان ان دونوں میں سے جو بھی طریقہ اختیار کرتے اس کا نتیجہ جلد یا بدیر ایک ہی نکلتا۔ مگر وہ نہ اسلام کے براہ راست داعی بن سکے اور نہ بالواسطہ معاون۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صدی کی پرشور اور ہنگامہ خیز سیاست کے باوجود ان کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔

موجودہ مسلمان

آج بھی ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہی ہے۔ اس موقع کو استعمال کرنے کا میدان اب بھی ان کے لئے کھلا ہوا ہے۔ آج بھی اگر ان کے اندر داعیانہ ذہن پیدا ہو جائے تو آج بھی وہ اس میدان میں متحرک ہو کر اس کے تمام فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ سورہ المائدہ (۶۷) میں خدا کی جو سنت بتائی گئی ہے، وہ ایک ابدی سنت ہے۔ وہ جس طرح ماضی کے لئے تھی، اسی طرح وہ آج کے لئے بھی ہے، اور وہ قیامت تک اسی طرح باقی رہے گی۔

انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ آج بھی جو انسان پیدا ہو رہے ہیں وہ یقیناً فطرت اللہ پر پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا انسان بھی اپنی پیدائشی فطرت کے تحت اس کا منتظر ہے کہ کوئی آئے اور اس کی فطرت کے دروازے کو کھٹکھٹائے، تاکہ وہ اپنے خالق کے سکھائے ہوئے سبق کے مطابق اس کا جواب دے سکے۔

تاہم اس دعوتی امکان کو حاصل کرنے کے لئے ایک شرط لازمی طور پر ضروری ہے، اور وہ صبر و اعراض ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں داعی بننے کے لئے یہ کرنا ہوگا کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ اپنے تمام نزاعات کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔ یہ ختم کرنا مصنوعی طور پر نہ ہو، بلکہ دل کی گہرائی کے ساتھ ہو اب تک وہ دوسری قوم کو اپنا حریف بنائے ہوئے تھے۔ اب انھیں دوسری قوم کو اپنا دعوتی محبوب بنانا ہوگا۔ انھیں اس حد تک ان کا خیر خواہ بننا ہوگا کہ ان کے دل سے دوسری قوم کے لوگوں کے لئے دعائیں نکلنے لگیں۔

جس دن مسلمان ایسا کریں گے، اسی دن اس ملک میں دعوتی عمل کا آغاز ہو جائے گا، اور اسی کے ساتھ وہ نتیجہ بھی ظاہر ہونا شروع ہو جائے گا جو دعوت الی اللہ کے ساتھ اللہ نے ابدی طور پر مقدر کر دیا ہے

عسر کے ساتھ یسر

قرآن میں ایک نہایت اہم اصول یہ بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا کبھی یک طرفہ طور پر کسی کے لئے غیر موافق نہیں ہو سکتی۔ خدا کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں ہمیشہ مشکل کے ساتھ آسانی بھی موجود رہے گی۔ کوئی شخص یا قوم جب بھی کسی محرومی سے دوچار ہو تو یقینی طور پر وہیں اس کے لئے امکانات اور مواقع کا نیا دروازہ بھی کھلا ہوا ہوگا۔ یہ اصول قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فَاِنَّ مع العسر یسرا اِنَّ مع العسر یسرا (الانشراح)

پس بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اس دنیا میں نہ صرف یہ ہے کہ ہر مشکل کا ایک کامیاب حل ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ بلکہ مزید اطمینان بخش بات یہ ہے کہ مشکل کے مقابلہ میں حل کی مقدار دوگنا ہوتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے کہ لن یغلب عسر یسرین (ایک مشکل دو آسانی پر غالب نہیں آسکتی)

ہندستان کے مسلم رہنما اور دانشور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مسلسل یہ اعلان کر رہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے مشکلات ہیں۔ یہاں ان کے خلاف تعصب اور ظلم کیا جاتا ہے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا روزانہ یہی بات دہرا رہا ہے۔

مگر اس قسم کے بیانات خدا کی کتاب کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ مسلمان خدا کی کتاب کے بیانات پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر انھیں خدا کی کتاب پر یقین ہوتا تو وہ مشکل پیش آنے کی صورت میں آسانی کو تلاش کرتے۔ اس کے بعد وہ جان لیتے کہ جہاں مشکل پائی جا رہی تھی، وہیں آسانی (اس کا حل) بھی دگنا مقدار میں موجود تھا۔ اس کے بعد ان کے لئے اعلان کرنے کی چیز مسئلہ کا حل ہوتا نہ کہ صرف مسائل اور مشکلات۔

ہندو مسئلہ

ہندستان کے مسلمانوں کا عام ذہن یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو ان کے حق میں متعصب اور ظالم ہے ہندوؤں کے تعصب اور عناد نے ان کے لئے ناقابل حل مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ اس ملک میں ان کے لئے باعزت زندگی گزارنے کے تمام دروازے بند ہیں۔

مگر یہ رائے جن ہندوؤں کے تجربات کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے وہ زیادہ تر عام قسم کے ہندو ہیں۔ وہ ہندو جو جلسہ اور جلوس کی بھیڑ میں اضافہ کرتے ہیں۔ جو سڑکوں پر جمع ہو کر نعرہ لگاتے ہیں۔ جو فساد کے موقع پر لوٹتے اور جلاتے ہیں۔ یہ سب ہندو عوام ہوتے ہیں نہ کہ ہندو خواص۔ مسلمانوں کو ہندو عوام یا ہندو فرقہ پرستوں کی طرف سے جو تجربہ ہو رہا ہے، اس کو وہ پوری ہندو قوم پر چسپاں کر دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہندو سب کے سب ان کے مخالف ہیں۔

مگر یہ رائے خطرناک حد تک خلاف واقعہ ہے۔ ہندوؤں کا مذہبی طبقہ اور ہندو عوام دونوں میں بلاشبہ ایک ایسا گروہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ عناد رکھتا ہے۔ مگر ہندوؤں کا خواص طبقہ جس نے جدید طرز پر تعلیم حاصل کی ہے، اس کی بہت بڑی اکثریت فرقہ وارانہ عناد اور شورش کی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ مزید یہ کہ یہی ہندو خواص ہیں جو اپنی تعلیم کی بنا پر ملک کے تمام کلیدی عہدوں پر قابض ہیں وہی ملک کا پورا سیاسی اور اقتصادی نظام چلا رہے ہیں۔ اخبارات اور تمام اشاعتی ادارے انھیں کے تحت چل رہے ہیں۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لئے یہاں میں ایک حوالہ دوں گا۔ ٹائمس آف انڈیا (۹ فروری ۱۹۹۰) میں ایک مفصل آرٹیکل چھپا ہے۔ اس کے لکھنے والے مسٹر چندن مترا ہیں، اور اس کا عنوان ہے:

Militant Hinduism is self-limiting

مضمون نگار الٰہ آباد کے ماگھ میلہ (جنوری ۱۹۹۰) میں موجود تھے جہاں وشو ہندو پریشد نے اپنا "عظیم الشان" جلسہ کیا تھا۔ وہ وشو ہندو پریشد اور دوسری فرقہ پرست ہندو جماعتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اگرچہ "رام جنم بھومی" کا جذباتی اشو لے کر عوامی ہندوؤں کی ایک بھیڑ اپنے گرد جمع کر لی ہے اور نومبر ۱۹۸۹ کے الکشن میں وقتی کامیابی بھی حاصل کی ہے، مگر مذہب کے نام پر اٹھنے والی ان ہندو جماعتوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے طبقۂ خواص کو اب تک اپنا ہم نوا نہ بنا سکے۔

وہ لکھتے ہیں کہ تاہم بی جے پی کا مسئلہ یہ ہے کہ دسیوں سال کی سخت کوشش کے باوجود وہ اس میں ناکام رہی ہے کہ سیکولر شہری ہندوؤں سے اپنے حق میں فکری جواز حاصل کر سکے جو عوام کی رائے کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اور یہ بعید از قیاس ہے کہ مستقبل قریب میں وہ اپنی اس کوشش

میں کامیاب ہو سکے :

> The BJP's problem, however, is that despite decades of strenuous effort, it has failed to acquire intellectual legitimacy from the secularised, urban Hindus who dominate public opinion. And it is unlikely to succeed in this endeavour in the foreseeable future.

مذہبی طبقہ اگر سچے مذہب پر ہو تو وہ انصاف پر کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ مگر جب مذہبی طبقہ میں بگاڑ آجائے تو اس کے پاس تعصب کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی جس پر وہ اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔ ہندوؤں کا موجودہ مذہبی طبقہ حقیقۃً ایک بگڑا ہوا مذہبی طبقہ ہے، اس لئے اس کا مذہب تمام تر تعصب پر مبنی ہے۔ وہ مذہبی سچائی پر نہیں بلکہ مسلم عناد کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔

ہندو عوام کا معاملہ بھی ایک اور اعتبار سے یہی ہے۔ ہندو عوام کی اکثریت جاہل اور غریب ہے۔ وہ ایک بے شعور انسانوں کی بھیڑ ہے۔ ایسے لوگوں کو کوئی بھی شوشہ کی بات کہہ کر بھڑکایا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک قریبی مثال یہ ہے کہ ہندو عوام پچھلی نصف صدی سے زیادہ تر کانگرس کو ووٹ دیتے آرہے تھے۔ مگر ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو ہونے والے الکشن میں فرقہ پرست ہندو جماعتوں نے اپنے عوام کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ راجیو گاندھی ایک سیکولر آدمی ہے۔ وہ خود پارسی کا لڑکا ہے، اور ایک عیسائی عورت سے شادی کئے ہوئے ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اجودھیا میں مقدس رام مندر کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر شمالی ہند کے ہندو بھڑک گئے اور انھوں نے مخالفانہ ووٹ دے کر راجیو گاندھی کی پارٹی کو شمالی ہند میں ہرا دیا۔

ان اسباب سے مسلمانوں کے لئے عقلمندی کی بات یہ ہے کہ وہ اختلافی معاملات کو ہندو خواص کی سطح پر لاکر حل کریں۔ وہ اس کو ہندو عوام (مذہبی طبقہ اور عوامی طبقہ) تک نہ جانے دیں۔

موجودہ ہندو قوم میں دو مختلف طبقے کا ہونا قرآن کے اس اصول کے عین مطابق ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عسر کے ساتھ یسر موجود رہتا ہے۔ ہندوؤں کا فرقہ پرست طبقہ اگر مسلمانوں کے لئے عسر کے درجہ میں ہے، تو انھیں ہندوؤں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مسلمانوں کے لئے یسر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہبی طبقہ کے اندر اگر مسلمانوں کے خلاف تعصب و عناد ہے، تو تعلیم یافتہ طبقہ اپنی روشن خیالی کی بنا پر مسلمانوں کے معاملہ میں انصاف کا اور حقیقت پسندی کا فیصلہ کرتا ہے۔

مزید یہ کہ قانون الٰہی کے مطابق، یہاں بھی عسر کے مقابلہ میں یُسر کی طاقت زیادہ ہے۔ ہندوؤں کے فرقہ پرست طبقہ کے پاس صرف جذباتی نعرے ہیں۔ دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا حال یہ ہے کہ وہی ہر قسم کے علمی، انتظامی، اقتصادی اور صحافتی اداروں پر قابض ہے۔ اعلیٰ سطح کے تقریباً تمام فیصلے اسی کے دفتروں سے کئے جاتے ہیں۔

دو مسجدوں کا قصہ

یہاں میں ایک تقابلی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس سے اس اصول کی صداقت خالص عملی اور واقعاتی سطح پر ثابت ہوتی ہے۔ یہ اجودھیا اور دہلی کی مسجد کی مثال ہے۔

بابری مسجد (اجودھیا) کا مسئلہ اپنی موجودہ شکل میں ۱۹۸۶ میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے مسلم رہنماؤں کی رہنمائی میں کیا کیا۔ وہ اس مسئلہ کو سڑک پر لے آئے۔ جلسہ اور جلوس، ریلی اور مارچ، بائیکاٹ اور لاؤڈ اسپیکر کے شور کے ذریعہ انھوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کوشش کی۔ یہ طریقہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ہندو عوام اور ہندو مذہبی طبقہ کی سطح پر مسئلہ کو حل کرنا تھا۔ چنانچہ وہ سراسر ناکام رہا۔

سڑک کی سیاست نے جوابی طور پر ہندوؤں میں اسی قسم کی شدید تر سیاست پیدا کی۔ ہندوؤں کے مذہبی طبقہ کو یہ موقع ملا کہ وہ جذباتی اپیلیں کرکے ہندو عوام کو بھڑکا دیں۔ انھوں نے ہندو عوام سے کہا کہ ۱۹۴۷ میں ملک کے بٹوارے کو مان کر ہم نے مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلی شکست کھائی تھی، اب اجودھیا میں رام جنم بھومی کی تعمیر کے سوال پر ہم مسلمانوں سے دوسری شکست (second defeat). کبھی قبول نہیں کریں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند کے ہندو عوام بھڑک اٹھے۔ جگہ جگہ خوں ریز فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ عوامی ضد اور جوش نے مسئلہ کو پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ جو چیز پہلے محدود مقامی مسئلہ کی حیثیت رکھتی تھی وہ پورے ملک کے لئے قومی وقار کا مسئلہ بن گئی۔ مسلمانوں کو بابری مسجد تو حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ بہت سی چیزیں جو اس سے پہلے انھیں حاصل تھیں وہ بھی انھوں نے اپنے غلط طریق کار کے نتیجہ میں کھو دیں۔ (اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لئے راقم الحروف کا مضمون "حکیمانہ تدبیر" ملاحظہ فرمائیں)

اب اس کے برعکس ایک مثال لیجئے۔ نئی دہلی کے ایک قیمتی علاقہ میں ایک قدیم شکستہ مسجد تھی۔ جس کے ساتھ وسیع زمین شامل تھی۔ اس زمین کا رقبہ مجموعی طور پر اٹھارہ ایکڑ ہوتا تھا۔ ۱۹۴۷ کے بعد اس زمین پر دہلی کی حکومت کے تین محکموں (آرکیالوجی، ڈی ڈی اے اور کارپوریشن) نے قبضہ کر لیا۔ وہاں انھوں نے اپنا دفتر قائم کر دیا۔ ان کا مقصد اس کو جدید قسم کے پکنک اسپاٹ میں تبدیل کرنا تھا۔ اس نقشہ کے مطابق کام بھی شروع ہو گیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے وہاں کئی لاکھ روپیہ خرچ کر دیا۔

اس کے بعد ایک مولوی صاحب کو یہ خیال آیا کہ اس قدیم مسجد پر قبضہ کیا جائے۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے نہ مسلمانوں کا جلسہ کیا، نہ اخباروں میں بیانات چھپوائے، نہ پوسٹربازی کی مہم چلائی، نہ سڑکوں پر "ہماری مسجد ہم کو واپس کرو" کے نعرے لگائے۔ اس قسم کے کسی بھی مظاہراتی کام کو چھوڑ کر انھوں نے یہ کیا کہ نہایت خاموشی سے اس علاقہ کے ہندو خواص سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ان سے نجی ملاقاتوں میں کہا کہ یہ ایک مسجد (عبادت خانہ) ہے اور عبادت خانہ ہر حال میں مقدس ہوتا ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ہو۔ اس لئے آپ لوگ اس کو واگزار کرانے میں ہماری مدد کریں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو جو سکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا وہ ان کا ساتھ دینے کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا۔ اس نے مذکورہ تینوں محکموں سے باقاعدہ ربط قائم کیا۔ ہر قسم کے دستاویزات جمع کئے۔ اس سلسلہ کے تمام خطوط اور ڈرافٹ جو انگریزی میں ہوتے تھے وہ خود تیار کرتا اور مولوی صاحب کے ساتھ متعلقہ دفاتر میں جاتا۔

یہ خاموش دفتری جنگ تین سال تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ مذکورہ ہندو سکریٹری اور کچھ دوسرے اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کی مدد سے مذکورہ تینوں محکمے اس پر راضی ہو گئے کہ وہ مسجد کو واگزار کر دیں۔ مولوی صاحب کو باقاعدہ تحریری طور پر یہ اجازت مل گئی کہ وہ مسجد کو آباد کر سکتے ہیں اور ملحقہ ۱۸ ایکڑ زمین پر ۸ فٹ اونچی باؤنڈری تعمیر کر سکتے ہیں۔ آج یہاں نہ صرف مسجد اور مدرسہ قائم ہے بلکہ تمام تمدنی سہولتیں مثلاً بجلی، ٹیلیفون اور سیور لائن بھی وہاں آچکی ہیں۔ اب یہ جگہ ایک پر رونق اسلامی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

اجودھیا کی مسجد کو مسلمانوں نے مزید نقصان کے ساتھ کھو دیا۔ اور دہلی کی نسبتاً زیادہ بڑی اور زیادہ اہم مسجد کو انھوں نے شاندار طور پر دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں

کے نادان رہنماؤں نے اجودھیا کی مسجد کو جاہل عوام کی سطح پر حل کرنا چاہا۔ اس کے برعکس دہلی کی مسجد کے مسئلہ کو تعلیم یافتہ خواص کی سطح پر حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی واحد وجہ ہے جس کے نتیجہ میں ایک مقام پر مسلمان مفتوح اور مغلوب ہوگئے اور دوسرے مقام پر انھوں نے شاندار فتح حاصل کی۔

یہ اصول صرف مسجد کے لئے خاص نہیں۔ مسلمان جس معاملہ میں بھی عوامی ہنگامہ کھڑا کریں گے وہاں ان کا ٹکراؤ عوامی ہندوؤں سے ہو جائے گا، اور آخر کار ان کو شکست ہوگی۔ اس کے برعکس جب وہ خاموش انداز اختیار کریں گے اور ہندوؤں کے خواص طبقہ سے ربط قائم کریں گے تو معاملہ ہندو خواص کی سطح پر رہے گا۔ ایسی صورت میں وہ ہمیشہ اپنے موافق فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے، بشرطیکہ ان کا معاملہ انصاف اور صداقت پر مبنی ہو۔

ہم پئیں، وہ نہ پئیں

اس سلسلہ میں ایک صحابی کا قول نہایت بامعنی اور سبق آموز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غزوۂ بدر پیش آیا تو یہ سوال تھا کہ میدان جنگ کے لئے کس مقام کا انتخاب کیا جائے۔ ایک صحابی الحباب بن المنذر الجموح نے ایک مقام کی تجویز پیش کی۔ اس کی خصوصیت انھوں نے یہ بتائی کہ جب وہاں ہم ٹھہریں گے تو پانی کے چشمے ہمارے قبضہ میں آجائیں گے۔ اور فریق ثانی پانی کے ذخائر سے محروم ہو جائے گا۔ اس تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پھر ہم پئیں گے اور وہ نہ پئیں گے (فنشرب ولا یشربون)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو پسند فرماتے ہوئے فوراً اس کو قبول کر لیا (سیرۃ ابن ہشام ۲/۲۶۱)

اسی قسم کا معاملہ ہندستان کا بھی ہے۔ موجودہ حالات میں اگر ہم اپنے مسئلہ کو ہندو عوام کی سطح پر لے جائیں تو ایسی صورت میں ہندوؤں کا فرقہ پرست طبقہ پانی پئے گا، اور مسلمان پانی سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنے مسئلہ کو ہندو خواص کی سطح پر رکھ کر طے کریں تو ایسی صورت میں پانی مسلمان کے حصہ میں آئے گا، اور ہندو فرقہ پرست پانی سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔

دور اول کی مثال

عوام اور خواص کے اس فرق کی مثال اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بھی موجود ہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایک تعداد مکہ سے ہجرت کرکے سمندر پار کے ملک حبش چلی گئی تھی۔ وہاں ان کے لئے عوام اور مذہبی طبقہ کی طرف سے اسی قسم کے مسائل پیدا ہوئے جو ہم کو ہندستان میں درپیش ہیں۔ مگر یہ مسائل جب وہاں کے خواص کے سامنے آئے تو انتہائی انصاف کے ساتھ یہ مسائل مسلمانوں کے حق میں طے کر دئے گئے۔

مسلمان جب حبش کے ساحل پر اترے تو وہاں کے باشندے خارجی ہونے کی بنا پر ان کو حقیر سمجھتے تھے اور انھیں پریشان کرتے تھے۔ یہ مسلمان اگر مشتعل ہوکر عوام کے خلاف ایجی ٹیشن کرتے تو نتیجہ برعکس نکلتا۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور مقامی عوام اکثریت میں، اس لئے مسئلہ بڑھتا اور مسلمانوں کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

مگر مسلمانوں نے عوامی سطح پر شکایت اور احتجاج سے کامل پرہیز کیا۔ وہ ان سے اعراض کرتے ہوئے اپنا کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آیا جب کہ ان کو بادشاہ وقت نجاشی کے دربار میں جانے کا موقع ملا۔ نجاشی نے ان سے پوچھا کہ کیا حبش میں کوئی تم کو ستاتا ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہاں۔ نجاشی نے فیصلہ دیا کہ جو شخص مسلمانوں کو ستائے، اس سے چار درھم بطور جرمانہ وصول کرکے مظلوم مسلمان کو دیا جائے۔ اس کے بعد اس نے مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا اتنا جرمانہ کافی ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ نہیں۔ نجاشی نے دوبارہ فیصلہ دیا اور جرمانہ کی مقدار بڑھا کر آٹھ درھم کر دی (حیاۃ الصحابہ، الجزء الاول، صفحہ ۳۵۵)

اسی ہجرت کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام جب مکہ سے حبش پہنچے تو مکہ کے مشرکین نے اپنا ایک وفد حبش بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کو وہاں سے واپس لائے۔ مشرکین کے وفد نے حبش پہنچ کر وہاں کے مذہبی طبقہ سے ملاقاتیں کیں اور آخر میں نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے۔

مشرکین مکہ کے وفد کی باتوں کو سن کر وہاں کے مذہبی پیشواؤں کا گروہ (بگڑا ہوا مذہبی طبقہ) ان کا حامی بن گیا۔ انھوں نے نجاشی سے کہا کہ مسلم مہاجرین کو اس وفد کے حوالے کر دینا چاہئے۔ حتی کہ ایک موقع پر انھوں نے دربار میں مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ شور وغل برپا کر دیا۔ ایسی حالت میں معاملہ اگر اس مذہبی طبقہ کی سطح پر لایا جاتا تو یقیناً اس کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوتا۔

مگر مسلمان وہاں کے مذہبی طبقہ سے مطلق نہیں الجھے۔ انھوں نے مذہبی طبقہ کو نظر انداز کرتے

ئے صرف نجاشی کے سامنے اپنی بات پیش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نجاشی نے مکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں
نا فیصلہ دے دیا۔ اس نے مشرکین مکہ کے وفد کو دربار سے نکال دیا۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ
ب تک چاہو حبش میں عزت کے ساتھ رہو۔ یہاں سے نکلنے پر تمھیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا (سیرۃ ابن کثیر
ملد ثانی)

حرف آخر

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ مقابلہ کی یہ صورت حال ہمیشہ باقی رہے گی، کیوں کہ اس کو کسی "دشمن اسلام" نے قائم نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کو خود خدا نے اپنی دنیا میں قائم کیا ہے۔ اس لئے مخالفین کی سازش اور فساد کو لے کر اس کے خلاف فریاد کرنا سراسر احمقانہ ہے۔ اس قسم کی فریاد کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

اس دنیا میں کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ حالات کو سمجھا جائے۔ "مخالفین" کے منصوبوں کو جان کر ان کے خلاف حکیمانہ انداز میں جوابی منصوبہ بندی کی جائے۔ مخالف حالات کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کی جائے۔ ہر پیش آنے والے عُسر کو یُسر کی طاقت سے زیر کیا جائے۔ اس دنیا میں کامیابی اس شخص کے لئے ہے جو مشکل کو اپنی غذا بنا سکے، جو ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کر سکے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، ان کے لئے صرف یہ انجام مقدر ہے کہ وہ حالات کے خلاف بے فائدہ احتجاج کرتے رہیں، یہاں تک کہ تاریخ کے قبرستان میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائیں۔

روشن مستقبل

الرسالہ جنوری ۹۱ خصوصی نمبر کے طور پر بعنوان "روشن مستقبل" شائع کیا گیا تھا۔ جس میں ملک کے موجودہ حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا تھا۔ اب اس شمارہ کو علیحدہ سے ایک مستقل کتابچہ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو ہر طبقہ کے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ جو حضرات اس کو زیادہ تعداد میں منگوا کر تقسیم کرنا چاہیں ان کو خصوصی رعایت کے ساتھ یہ کتابچہ فراہم کیا جائے گا۔

ایک سفر

سوویت یونین میں گلاسناسٹ (openness) کی پالیسی کے تحت حال میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس کے تحت روسی حکومت چاہتی ہے کہ بیرونی دنیا سے اپنے تعلقات بڑھائے۔ چنانچہ مختلف طبقہ کے لوگوں کو سوویت یونین جانے کے مواقع دئے جا رہے ہیں۔

اسی میں سے یہ ہے کہ سوویت حکومت عالم اسلام کی مختلف شخصیتوں کو دعوت دے رہی ہے کہ وہ سوویت یونین جاکر اپنی آنکھ سے وہاں کے مسلمانوں کے حالات کو دیکھیں۔ مثلاً سعودی عرب کے شیخ محمد بن ناصر العبودی اسی سلسلہ میں روس جا چکے ہیں۔ چنانچہ سوویت حکومت نے مجھ کو بھی روس کے سفر کی دعوت دی۔ اس کے تحت جولائی۔ اگست ۱۹۹۰ میں سوویت یونین کا سفر ہوا۔

شیخ عبودی (رابطۃ اسلامی، مکہ) کی سرکردگی میں جو وفد پندرہ دن کے لئے سوویت یونین گیا تھا، اس نے وہاں کی مسلم جمہوریتوں کا دورہ کیا۔ روسی مسلمانوں کے حالات اور ضرورتوں کا جائزہ لیا۔ اس نے روسی مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اسلام کی راہ میں تنہا نہیں ہیں بلکہ دنیا کے دوسرے مسلمان ان کے ساتھ ہیں۔

وفد نے وہاں کی ان مسجدوں کا بھی جائزہ لیا جو حال میں واگذار کی گئی ہیں۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان مسجدوں کی اصلاح ومرمت کافی ہے یا ان کو از سر نو تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ روسی حکومت نے جن مقامات پر نئی مسجدوں کی تعمیر کی اجازت دی ہے، ان کے لئے مناسب زمین حاصل کرنے کی بابت ذمہ داروں سے گفت گو کی۔

روس میں اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ میں آیا جب کہ ابھی میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ تاہم سن شعور کو پہنچتے ہی اشتراکی روس کی باتیں میرے کان میں پڑنے لگیں۔ غالباً ۱۹۳۶ کا واقعہ ہے۔ میں اعظم گڈھ میں مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵ - ۱۸۸۴) کے مکان پر تھا۔ گفت گو کے دوران سوویت روس کا ذکر آیا۔ انھوں نے خاندان کے ایک نوجوان کا نام لے کر کہا کہ ان کے کورس میں روسی زبان کا بھی ایک پرچہ ہے۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد امید ہے کہ وہ روس جائیں گے۔ پھر ان کے ذریعہ سے وہاں کی صحیح باتیں معلوم ہوں گی۔ مذکورہ نوجوان اب بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ تاہم وہ روس نہ جا سکے۔ سرکاری

ملازمت کے بعد اب وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔

۱۹۳۶ میں میں ایک مدرسہ میں کتاب النحو اور کتاب الصرف کے اسباق پڑھ رہا تھا۔ اس وقت بظاہر ناقابل تصور تھا کہ میں کبھی روس کا سفر کر سکوں گا۔ مگر عجیب اتفاق کہ اس واقعہ کے تقریباً ۵۵ سال بعد یہ "قرعہ" میرے نام آیا۔ جولائی ۱۹۹۰ میں میں نے اس ملک کا سفر کیا جس کا پورا نام یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلکس (USSR) ہے۔

۱۱ جون ۱۹۹۰ کو نئی دہلی کے روسی سفارت خانہ سے ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مجھ کو دس روزہ پروگرام کے تحت سوویت روس بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ میں وہاں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کو براہ راست دیکھوں، نیز یہ کہ ۲۸ جولائی کے لئے انھوں نے میری سیٹ ریزرو کرا دی ہے۔ اس سے پہلے بھی تاریخ کے تعین کے بغیر وہ اس پروگرام کی بابت مجھ کو اطلاع دے چکے تھے۔ جولائی کے مہینہ میں میری بعض مصروفیات تھیں۔ مگر میں نے ان مصروفیات میں تبدیلی کرکے ان کی پیش کش کو قبول کر لیا۔

کسی روسی آدمی کو پہلی بار میں نے پچاس سال قبل دیکھا تھا۔ اس وقت میں ایک عربی مدرسہ (الاصلاح، اعظم گڈھ) میں پڑھ رہا تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ صدر مدرس مولانا امین احسن اصلاحی اپنے کمرہ کی طرف چلے تو ان کے ساتھ نئے حلیہ کا ایک آدمی تھا۔ صاف رنگ، بھاری جسم، سر پر غیر ہندستانی وضع کی ٹوپی۔ میری ان سے ملاقات تو نہ ہو سکی۔ البتہ مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ انھیں کئی بار مدرسہ کے احاطے میں چلتے پھرتے دیکھا۔ اتنا یاد ہے کہ مولانا اصلاحی سے ان کی گفتگو عربی زبان میں ہوتی تھی۔ اس وقت مدرسہ کی آبادی میں وہ سب سے زیادہ پرشکوہ شخصیت والے نظر آئے۔

یہ علامہ موسیٰ جار اللہ روسی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اسی زمانہ میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ان کی بابت اپنے ماہنامہ الاصلاح میں "شذرات" کے تحت کچھ لکھا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس مضمون کو دیکھوں۔ میں نے مولانا عبد الرحمن ناصر اصلاحی کو خط لکھا کہ الاصلاح کے مذکورہ مضمون کی فوٹو کاپی روانہ کر دیں۔ خط لکھنے کے چند دن بعد پانچ صفحہ کے اس مضمون کی فوٹو کاپی مجھے بذریعہ ڈاک دہلی میں مل گئی۔ واضح ہو کہ دہلی اور سرائمیر (اعظم گڈھ) کے درمیان ۸۰۰ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر اس میں شکر کا عظیم الشان سرمایہ موجود ہے۔ یہ انسانی

ذہن کی کیسی عجیب خصوصیت ہے کہ ۵۰ سال پہلے کا واقعہ ایک سکنڈ میں اس کو یاد آجائے۔ حالانکہ مجھے یاد نہیں آتا کہ زمانہ طالب علمی کے بعد دوبارہ کبھی اس کا ذکر آیا ہو۔ پھر ڈاک کا یہ نظام انسان کے لئے کتنی بڑی سہولت ہے۔ اگر موجودہ وسائل نہ ہوں تو مذکورہ مضمون کو حاصل کرنے کے لئے مجھے سولہ سو کیلو میٹر کا سفر طے کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس میں غالباً دو ماہ لگ جاتے۔ پھر فوٹو کاپی کی مشینیں کتنی بڑی نعمت ہیں جن کی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کسی چیز کا ویسا کا ویسا ہی عکس بلاتاخیر حاصل کر لیا جائے۔

یہ باتیں بظاہر بالکل معمولی ہیں، مگر معمولی چیز کو غیر معمولی چیز کے روپ میں دیکھنے ہی کا نام شکر ہے۔ اگر آدمی جذبۂ شکر کے ابلنے کے لئے انوکھے معجزہ کا انتظار کرے تو وہ کبھی بھی خدا کا سچا شکر گزار نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسے اسباب شکر کسی کے لئے ظاہر ہونے والے ہی نہیں۔

علامہ موسیٰ جار اللہ ۱۹۳۸ کے وسط میں روس سے پناہ گزیں کے طور پر ہندستان آئے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کا ان کے بارہ میں مضمون الاصلاح کے شمارہ جون ۱۹۳۸ میں چھپا تھا۔ اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ علامہ موسیٰ جار اللہ عربی، فارسی، ترکی، روسی اور فرنچ زبانیں بخوبی جانتے ہیں۔ علوم مشرقیہ کی مختلف شاخوں میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ عالم اسلام کی اس زمانہ کی تمام سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کو قریب سے جانتے ہیں۔ وہ دو دن مدرستہ الاصلاح (سرائمیر، اعظم گڈھ) میں مقیم رہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے مضمون کا ایک اقتباس یہ ہے: "علامہ موسیٰ جار اللہ نے مجھ سے سوال کیا کہ ہندستان میں علوم عربیہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے، تمہارے خیال میں اس کا آخری انجام کیا ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ عربی تعلیم، مدارس عربیہ اور ساتھ ہی مذہب کی تباہی۔ مجھے خیال تھا کہ علامہ اس کی تردید کریں گے لیکن انھوں نے اس کی حرف حرف تائید کی"۔

میں نے اپنی تحریری زندگی شروع کی تو میں کمیونزم کا مخالف بن چکا تھا۔ کانگرس کا ڈائمنڈ جوبلی سشن جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں ہوا تھا۔ اس موقع پر جواہر لال نہرو کی تحریک پر کانگرس نے یہ تجویز منظور کی تھی کہ ہمارا مقصد ہندستان میں سوشلسٹ طرز کا سماج (socialistic pattern of society) بنانا ہے۔ اسی زمانہ میں میں نے اس کے بارہ

میں ایک مقالہ لکھا تھا جو "ہندستان کی منزل : سوشلزم یا اسلام" کے نام سے چھپا تھا۔ اس میں دونوں نظاموں کا تقابل کرنے کے بعد آخر میں میں نے لکھا تھا :

پنڈت نہرو نے کہا ہے کہ ہندستان کی منزل سوشلزم ہے۔

ہم کہتے ہیں : ہندستان کی منزل اسلام ہے۔

اس کے بعد میں نے اس موضوع پر زیادہ جامع کتاب لکھی جو اپریل 1959 میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا : مارکسزم جس کو تاریخ رد کر چکی ہے۔ اس کے جلد ہی بعد اس موضوع پر میری دوسری کتاب اگست 1959 میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا : سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ۔

پچھلے ۳۵ سال کے اندر اس موضوع پر میں کم از کم ایک سو مضامین اور کتابیں اردو، عربی اور انگریزی میں شائع کر چکا ہوں۔ ان تمام مضامین اور کتابوں میں ہمیشہ میں نے کیونزم اور سوشلزم کی مخالفت کی ہے۔ ایک زمانہ میں بہت سے اسلام پسند (مثلاً ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی وغیرہ) سوشلزم کی طرف مائل ہو چکے تھے اور اس کو اسلامی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر میں ہمیشہ اس نظریہ کا مخالف رہا۔

سوویت روس کی موجودہ حکومت کا میرے جیسے ایک "مخالف" کو اپنے ملک میں بلانا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید سیکولرزم کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو اس کو سارے عالم پر غالب کئے ہوئے ہے۔ وہ یہی فراخ دلی اور برداشت ہے۔ مغربی جمہوریت جس کو اب روس اختیار کر رہا ہے، وہ موافق اور مخالف کی اصطلاحوں سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرتی ہے۔ وہ اپنے ایک مخالف کی پذیرائی کے لئے بھی تیار رہتی ہے۔ اس کی اسی صفت نے اس کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے۔

موجودہ زمانہ کے اسلامی اداروں کا حال اس معاملہ میں بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف اپنے موافق کے لئے جگہ ہے۔ جس شخص کو وہ اپنا مخالف سمجھ لیں، اس کے سایہ سے بھی وہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایک شخص اگر کسی اسلامی ادارہ کے "اکابر" پر تنقید کر دے تو اس کی تنقید خواہ کتنی ہی علمی اور مدلل کیوں نہ ہو، اس کے بعد وہ شخص اس ادارہ کی نظر میں اتنا مبغوض ہو جائے گا کہ وہ معقول انداز میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتے، کجا کہ اس کو اپنے ادارہ کے کسی پروگرام میں شرکت کے لئے بلائیں

موجودہ اسلامی اداروں کی یہی کمزوری ہے جس نے ان کو آج کی دنیا میں بالکل بے قیمت بنادیا ہے۔

اس کا مزید نقصان یہ ہے کہ یہ ادارے سطحی انسانوں کی سرائے بن کر رہ گئے ہیں۔ کم از کم پچھلے پچاس سال کی بابت میں کہہ سکتا ہوں کہ اس مدت میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا جس کی آج کی دنیا میں کوئی اہمیت ہو۔ زندہ اور اعلیٰ انسان وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں کھلی تنقید اور آزادانہ اختلاف رائے کا ماحول ہو۔ ان اداروں میں یہ ماحول سرے سے موجود ہی نہیں، پھر وہاں اعلیٰ درجہ کے انسان کیوں کر پیدا ہو سکتے ہیں۔

آج اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لئے مجتہدانہ صلاحیت رکھنے والے افراد درکار ہیں۔ مگر موجودہ اسلامی اداروں میں اکابر پرستی اور تقلید شخصی کا ماحول اتنی گہرائی کے ساتھ چھایا ہوا ہے کہ وہاں صرف تنگ نظر اور مقلد انسان ہی بن سکتے ہیں۔ ان اداروں سے مجتہدانہ اوصاف والی شخصیت کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں۔ ان اداروں سے کسی اعلیٰ انسان کا ابھرنا ویسا ہی ایک عجوبہ ہوگا جیسا کسی قبرستان سے ایک زندہ انسان کا نکل آنا۔

روس کے لئے روانگی سے پہلے وہ لوگ "روس میں اسلام" کی بابت ایک "فلم شو" دکھانا چاہتے تھے۔ اس کے تحت ۲۱ جون ۱۹۹۰ کو پہلی بار نئی دہلی کے روسی کلچرل سنٹر کے دفتر میں جانا ہوا۔ وہاں انھوں نے ایک مخصوص ہال میں مذکورہ "فلم شو" دکھایا۔

میں سنٹر میں پہنچا تو ایک روسی افسر نے "السلام علیکم" کہہ کر استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا نام (Bolat K. Nurgaleyev) ہے۔ "فلم شو" میں تصویروں اور آوازوں کے ذریعہ روس کے مسلم علاقہ (سنٹرل ایشیا) کو دکھایا گیا تھا۔ ایک گھنٹہ کی فلم میں "مسلم روس" کا مکمل تعارف سامنے آگیا۔ اسلامی دور کے آثار، موجودہ اسلامی سرگرمیاں، روسی مسلمانوں کے رہن سہن کا طریقہ، غرض ہر چیز کامیاب تصویروں کے ذریعہ اس طرح دکھائی گئی کہ کچھ عرصہ کے لئے محسوس ہوا کہ ہم دہلی میں نہیں ہیں، بلکہ سنٹرل ایشیا میں گھوم رہے ہیں اور سامنے کے مناظر کو براہ راست اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

"فلم شو" کو دیکھنے کے بعد جب ہم واپس آنے کے لئے لفٹ کے دروازہ پر پہنچے تو سنٹر کے روسی ڈائرکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "اب تو روس جاکر دیکھنے کی ضرورت نہیں"۔ ان کے اس جملہ میں دراصل ان کا یہ احساس چھلک رہا تھا کہ جو چیز آپ آئندہ روس میں جاکر دیکھیں گے، اس کو ہم نے کامیاب

"فلم شو" کی صورت میں آپ کو یہیں دکھا دیا ہے۔

اس "فلم شو" کو دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

قرآن میں جنت کے بارہ میں کہا گیا کہ و اُتوبہ متشابہا (البقرہ ۲۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزیں آخرت کی چیزوں کا تمثیلی تعارف ہیں۔ اسی کا ایک نمونہ یہ "فلم شو" بھی ہے۔ جدید ٹکنیک نے اس کو ممکن بنا دیا کہ "مسلم روس" کو واضح تصویروں کی صورت میں دہلی کے اندر پیشگی طور پر دیکھا جا سکے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں موت سے پہلے کی دنیا میں موت کے بعد والی دنیا کو پیشگی طور پر تمثیل کے روپ میں دیکھ سکتی ہیں۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۰ کی شام کو روانگی ہوئی۔ دفتر سے نکل کر گاڑی پر بیٹھا تو دل سے بے اختیار یہ دعا نکلی: خدایا خیریت کے ساتھ لے جائیے اور خیریت کے ساتھ واپس لائیے۔ دنیا اور آخرت میں خیریت کا معاملہ فرمائیے۔

دہلی میں میں ۱۹۶۷ سے ہوں۔ یہاں کی مانوس سڑکوں سے گزرتے ہوئے جب میں ایئر پورٹ کی طرف جا رہا تھا تو خیال آیا کہ زندگی نام ہے مانوس راہوں میں نامانوس سفر طے کرنے کا۔ خارجی ظواہر میں اندرونی حقائق کو پالینے کا۔ جو لوگ صرف دیکھے کو جانیں انھوں نے نہیں دیکھا۔ جو لوگ ان دیکھے کو پالیں وہی دراصل وہ لوگ ہیں جن کو جاننے والا کہا جائے۔

قرآن کے مطابق، حیات دنیا کا ایک ظاہر ہے اور اسی کے ساتھ حیات دنیا کا ایک باطن ہے (الروم ۷) ایک مفسر نے اس آیت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ انھوں نے چھلکے کو جانا اور وہ مغز کو نہ جان سکے (انھم عرفوا القشور ولم یعرفوا اللباب) دنیا کے دکھائی دینے والے مناظر میں اللہ تعالیٰ نے نہ دکھائی دینے والی آخرت کی نشانیاں چھپا دی ہیں۔ وہی لوگ حقیقۃً آنکھ والے ہیں جنھوں نے دکھائی دینے والی دنیا میں نہ دکھائی دینے والی آخرت کا مشاہدہ کر لیا۔

مغرب اور عشا کی نماز ایئر پورٹ پر وی آئی پی لاونج میں پڑھی۔ لاونج کے باہر دہلی کا موسم گرم تھا۔ مگر لاونج کے اندر مجھے سوئٹر پہننا پڑا۔ ایر کنڈیشنگ کے ذریعہ مصنوعی طور پر موسم کو بدل لینا بظاہر اچھی بات ہے۔ مگر یہ سہولت آدمی کو صرف اس قیمت پر ملتی ہے کہ وہ "نیچر" سے بے تعلق ہو جائے۔ اس کو انسانی مصنوعات کی خبر ہو، مگر خدائی مصنوعات اس کے لئے لامعلوم چیز بن جائیں۔

دہلی سے ایروفلاٹ کی پرواز ۵۳۶ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز میں ہر چیز کا معیار یورپ کی اچھی ہوائی کمپنیوں سے کم نظر آیا۔ اشتراکی روس نے جنگی صنعت کی ترقی میں بہت زیادہ توجہ دی۔ مگر انسان کے وسائل محدود ہیں۔ ایک شعبہ میں بہت زیادہ آگے بڑھنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے شعبوں میں پیچھے رہ جائے۔ یہی روس کے ساتھ ہوا۔ جنگی صنعت میں تقدم کا نتیجہ اس کے لئے غیر جنگی شعبوں میں تخلف کی صورت میں برآمد ہوا۔ گورباچوف کا پروسترائیکا (re-structuring) روسی زندگی میں اسی عدم توازن کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہے۔

جہاز میں ایروفلاٹ کا میگزین "سوویت ایئرلائنز" موجود تھا۔ ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ سیکڑوں روسی ہوابازوں میں سے پانچ کو ہیروازم اور ہمت (courage) کی بنا پر خصوصی انعام دیا گیا۔ ناموں سے اندازہ ہوا کہ ان میں سے ایک مسلمان ہواباز تھے۔ ان کا نام میجر رشید بتایا گیا تھا۔ ان کا جہاز فضا میں سخت حالات کا شکار ہو گیا۔ مگر انھوں نے غیر معمولی محنت اور مہارت سے کام لے کر جہاز کو اور اس کے مسافروں کو بچا لیا۔ مگر جب ان کا جہاز زمین پر اترا تو ان کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی سیٹ سے اپنے آپ نہیں اٹھ سکتے تھے۔ انھوں نے جہاز کو بچانے کے لئے اپنی ساری طاقت خرچ کر دی تھی:

But when the plane came to a standstill he could not leave the cabin by himself. He had no strength left (p.3).

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مسلمان یہاں کی اعلیٰ سروسوں میں ہیں۔ مزید یہ کہ انھوں نے اپنی غیر معمولی کارکردگی سے نمایاں درجہ حاصل کر لیا ہے۔

درمیان میں جہاز ایک گھنٹہ کے لئے تاشقند میں رکا۔ لینڈنگ اتنی اچھی تھی کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ کب وہ اڑ رہا تھا اور کب زمین پر اتر گیا۔ اکثر مسافر تاشقند ایئرپورٹ دیکھنے کے لئے اترے۔ میں بھی اترا۔ یورپی معیار کے لحاظ سے ہوائی اڈہ کم تر معیار کا تھا۔ "ٹرانزٹ پاس" سے لے کر کرسیوں اور ٹوائلٹ تک ہر چیز نسبتاً معمولی تھی۔

ہوائی اڈہ موجودہ زمانہ میں قوموں کی ترقی کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ روس کی موجودہ تبدیلیاں گویا فطرت انسانی کی چیخ ہیں۔ ستر برس کے ناکام تجربہ کے بعد

یہاں کے انسان کی فطرت چیخ اٹھی کہ ہم کب تک مارکس کے مصنوعی نظام کا بوجھ اپنے اوپر لادے رہیں جس نے ہمیں دنیا کی قوموں سے پیچھے کر دیا۔

تاشقند ازبیک علاقہ کی راجدھانی ہے۔ اس کی تاریخ دوسری صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ ازبیک زبان میں تاشقند کے معنی "پتھر کا گاؤں" ہیں۔ مگر آج وہ ماسکو، لینن گراڈ اور خیف کے بعد سوویت یونین کا چوتھا سب سے بڑا شہر ہے۔ عربوں نے اس شہر کو آٹھویں صدی عیسوی میں فتح کیا تھا۔ تیرھویں صدی میں اس پر منگولوں نے قبضہ کر لیا۔ مگر منگولوں کے قبول اسلام کے بعد وہ بدستور مسلم سلطنت کا ایک جزء رہا۔ ۱۹۱۷ سے اس پر کمیونسٹ روس کا قبضہ ہے۔ سابق وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری نے اسی مقام پر پاکستان کے ساتھ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ کو "تاشقند معاہدہ" پر دستخط کئے تھے جس کے اگلے دن حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔

تاشقند ہی میں قرآن کا وہ نسخہ موجود ہے جس کو مصحف عثمان کہا جاتا ہے۔ خلیفہ سوم عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کے پانچ مکمل نسخے تیار کرائے۔ اس کے بعد مکہ، بصرہ، کوفہ اور دمشق میں ایک ایک نسخہ رکھوایا، اور ایک نسخہ اپنے پاس رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ یہی عثمانی نسخہ پہلی صدی ہجری میں سمرقند پہنچا۔ پھر ۱۸۶۹ء میں اس کو قیصر روس نے حاصل کیا اور اس کو پیٹرس برگ کی سرکاری لائبریری میں محفوظ کر دیا۔ تاہم اس سلسلہ میں دوسری روایتیں بھی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ تیمور نے جب دمشق پر قبضہ کیا تو وہاں سے اس نے مصحف عثمان کو حاصل کیا اور اس کو اپنے ساتھ سمرقند لے آیا۔ ابن الخولی مصری جامعۃ الازہر کے استاد تھے۔ ان کی ایک عربی کتاب ہے جس کا نام ہے: الارتباطات بین النیل والفولغا۔ اس کتاب میں انھوں نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ مصحف عثمانی کس طرح تاشقند پہنچا۔ تاہم انھوں نے مختلف روایات کو جمع کر دیا ہے۔ کسی ایک روایت کو انھوں نے ترجیح نہیں دی۔

اس علاقہ کے مسلمان اول روز سے یہ چاہتے تھے کہ حکومت روس یہ مصحف ان کے حوالے کر دے۔ مگر قدیم دور میں انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ ۱۹۱۷ کے اشتراکی انقلاب کے بعد مسلمانوں نے دوبارہ مشورہ کیا اور ایک وفد اس سلسلہ میں لینن کے پاس بھیجا گیا۔ لینن نے مسلم وفد کی بات سننے کے بعد اس سے اتفاق کیا اور اسی وقت حکومت کے متعلقہ ذمہ دار کے نام مصحف کی واپسی کے

لئے ایک خط لکھا جس پر ۹ دسمبر ۱۹۱۷ کی تاریخ درج تھی۔ اس خط کا عربی ترجمہ میں نے المفتی ضیاء الدین خان بن ایشان باباخان کی عربی کتاب الاسلام والمسلمون فی البلاد السوفیتیہ میں دیکھا ہے (صفحہ ۸۶ - ۸۷)

اس مصحف کے کچھ صفحات ضائع ہو گئے ہیں۔ موجودہ مصحف میں کل ۳۵۲ صفحات ہیں۔ ۱۹۲۳ تک وہ شہر اوفا میں تھا۔ ۱۹۲۳ میں اس کو خصوصی اہتمام کے ساتھ سمرقند لایا گیا اور شہر کی جامع مسجد خوجہ احرار میں رکھا گیا۔ ۱۹۴۳ سے وہ ایک میوزیم میں ہے جو خاص اسی کے نام پر بنایا گیا ہے۔

تاشقند اس سوویت خطہ میں واقع ہے جس کو سنٹرل ایشیا کہا جاتا ہے۔ روس کے مشہور عالم المفتی ضیاء الدین خان بن ایشان باباخان نے اپنی ۲۸۵ صفحہ کی کتاب (الاسلام والمسلمون فی البلاد السوفیتیہ) میں بتایا ہے کہ اسلام یہاں سب سے پہلے آذربائیجان اور داغستان میں پہنچا۔ یہ خلیفہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ساتویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد اسلام پورے سنٹرل ایشیا میں پھیل گیا جو اس زمانہ میں ماوراء النہر کہا جاتا تھا۔ خلفاء بنی امیہ نے اس علاقے میں کثرت سے ایسے مسلمان بھیجے جو یہاں اسلام کی اشاعت کریں اور لوگوں کو قرآن اور عربی زبان کی تعلیم دیں۔ انھیں میں سے ایک قثم بن عباس بن عبد المطلب بھی تھے جن کی قبر آج بھی سمرقند میں موجود ہے۔ دسویں صدی عیسوی تک اس علاقہ کے قبائل بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کر چکے تھے۔

سنٹرل ایشیا سے اسلام کی زبردست تاریخ وابستہ ہے۔ اس علاقہ سے اسلام کی نہایت ممتاز اسلامی شخصیتیں اٹھیں۔ مثلاً محمد بن اسماعیل البخاری، محمود الزمخشری، ابونصر الفارابی، ابوعلی بن سینا، ابوعیسی الترمذی، وغیرہ۔

۲۹ جولائی کی صبح کو ہمارا جہاز ماسکو ایئرپورٹ پر اترا۔ لینڈنگ حیرت انگیز حد تک "اسموتھ" تھی۔ جہاز کی خاتون اناؤنسر نے جب اعلان کیا کہ "اب آپ ماسکو میں ہیں" تو اچانک مجھے خیال آیا کہ اسی طرح ایک روز خدا کے فرشتے مجھے ایک سفر کرائیں گے اور منزل پر پہنچ کر اعلان کریں گے کہ "اب تم عالم آخرت میں ہو۔" ماسکو بھی میرے لئے ایک نئی دنیا ہے اور آخرت بھی میرے لئے نئی

دنیا ہوگی۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ "ماسکو" میرے سفر حیات کی صرف درمیانی منزل ہے، جب کہ "آخرت" میرے سفر حیات کی آخری منزل ہوگی۔ ماسکو ہوائی اڈہ پر تو میرے استقبال کے لئے حکومت کے نمائندے آئے ہوئے ہیں۔ یہاں میرے سفر کے لئے گاڑی موجود ہے اور قیام کے لئے ہوٹل کا کمرہ پیشگی طور پر رزرو کر دیا گیا ہے۔ مگر آخرت کی دنیا میں میرے اوپر کیا بیتے گی، اس کو احکم الحاکمین کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔

ماسکو کا ہوائی اڈہ تاشقند کے ہوائی اڈہ سے بہتر تھا۔ مگر جدید معیار جو جدہ، روم، فرینکفرٹ جنیوا وغیرہ میں نظر آتا ہے، اس کے لحاظ سے اس کو صرف دوسرے درجہ کا کہا جا سکتا ہے۔ ہوائی اڈہ کی ہر چیز اعلیٰ معیار سے کم تر تھی۔ سوویت روس نے جنگی طاقت میں امریکہ کی برابری (parity) حاصل کر لی ہے۔ مگر اس کی قیمت اس کو یہ دینی پڑی کہ وہ دوسری چیزوں میں غیر برابر ہو کر رہ گیا۔ یہ سوویت روس کو مارکسزم کا تحفہ ہے۔

ایرپورٹ سے ہوٹل کا راستہ تقریباً پون گھنٹہ کا تھا۔ مسٹر الکسی گالکن (Alexei Galkin) بطور گائڈ ساتھ تھے۔ ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ فضا میں کہر بھی تھا۔ اس لئے اطراف کے مناظر بہت زیادہ صاف نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم ایک چیز نمایاں تھی۔ سڑک کے دونوں طرف جو عمارتیں نظر آئیں وہ زیادہ تر کثیر منزلہ تھیں۔ اگر آپ دبئی ایرپورٹ سے شارجہ کی طرف جائیں تو آپ کو وہاں کی بیشتر عمارتیں یک منزلہ یا دو منزلہ دکھائی دیں گی۔ یہاں کی بیشتر عمارتیں کثیر منزلہ تھیں۔ اس فرق کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید وہاں کے لوگ افقی ترقی (horizontal growth) پر یقین رکھتے ہیں اور یہاں کے لوگ عمودی ترقی (vertical growth) پر۔

ماسکو میں میرا قیام جس ہوٹل میں تھا اس کا نام ازمائیلوف (Izmailovo) تھا۔ یہ ۲۸ منزلہ ہے۔ اس ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۲۹ میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ کمرہ کافی اچھا تھا۔ تاہم اس کمرہ کی سب سے ممتاز چیز وہ تھی جس کو میں استعمال نہ کر سکا۔ اور وہ ٹی وی سیٹ تھا۔ بظاہر اس کی کوالٹی اچھی تھی۔ مگر بدقسمتی سے اس معاملہ میں میں بہت بے ذوق واقع ہوا ہوں۔ کمرہ میں ٹی وی کا خصوصی اہتمام یہاں کے نظام کی علامت تھا۔ کیوں کہ کمیونسٹ نظام کے تحت سوویت روس میں اسلحہ کی تیاری کے بعد دوسری جس چیز پر سب سے زیادہ توجہ دی گئی وہ پبلسٹی تھی۔ (ساقی)

جناب کے کلیم الدین صاحب نیویارک (امریکہ) میں مقیم ہیں۔ وہ وہاں منظم انداز میں الرسالہ کے مشن کو پھیلا رہے ہیں۔ الرسالہ انگریزی اور انگریزی کتابوں کے علاوہ اردو کتابوں کو بھی انھوں نے اس کا ذریعہ بنایا ہے۔ امریکہ میں ان سے حسب ذیل ٹیلیفون نمبر پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے ___ (718)258 3435

۲ ویٹیکن کی طرف سے اٹلی (باری) میں ایک عالمی امن کانفرنس ۲۵ - ۲۶ ستمبر ۱۹۹۰ کو ہوئی۔ اس کا دعوت نامہ صدر اسلامی مرکز کے نام آیا تھا۔ مگر آخر وقت میں بعض اسباب پیش آنے کی وجہ سے سفر نہ ہوسکا۔ تاہم ڈاکٹر ثانی اثنین خاں نے مرکز کے نمائندہ کے طور پر باری اور روم کا سفر کیا اور وہاں "امن اور اسلام" کے موضوع پر ایک انگریزی مقالہ پیش کیا۔

۳ امریکی میگزین ٹائم کی اسپیشل کرسپانڈنٹ انیتا پرتاپ ۶ ستمبر ۱۹۹۰ کو اسلامی مرکز میں آئیں اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع "عورت کا درجہ اسلام میں" تھا۔ انٹرویو کے خاتمہ پر انھیں ایک قرآن مجید (انگریزی ترجمہ کے ساتھ) اور انگریزی الرسالہ دیا گیا۔

۴ منسٹری آف ویلفر کی طرف سے نئی دہلی (پارلیمنٹ ہاؤس) میں ایک نیشنل کانفرنس ۱۱ اگست ۱۹۹۰ کو ہوئی۔ اس میں اقلیت کے لیڈروں اور انٹلکچول افراد کو بلایا گیا تھا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ بعض اسباب سے وہ اس موقع پر شرکت نہ کرسکے۔ البتہ موضوع بحث سے تعلق رکھنے والا کچھ انگریزی لٹریچر انھیں بھیج دیا گیا۔

۵ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں نے "الاسلام" کا مطالعہ کیا، ایسی کتاب اسی شخص کے قلم کا نتیجہ ہوسکتی ہے جس کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے بے پایاں درد ہو اور جو اسلام کو نافذ و سربلند دیکھنے کا بے حد متمنی ہو، وہ ہر عامل اور ہر سبب پر غور کرتا رہتا ہو کہ آخر وہ کونسی کمی ہے کہ اسلام نافذ و غالب نہیں ہو پا رہا ہے اور پھر وہ اس کمی کی گرفت کرلیتا ہے اور پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ اسلام کے دعویداروں کو باخبر کردیتا ہے۔

اسے خدا کے نیک بندے ہم گواہ ہیں کہ تونے حق تبلیغ ادا کردیا (بدر جمال اصلاحی، سرائمیر)

۶ پاکستان سے ایک صاحب لکھتے ہیں: میں الرسالہ کا قاری ہوں۔ اس سلسلہ میں اپنا ایک واقعہ آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۴ جولائی ۱۹۹۰ کو ہمارے یہاں میرے پوتے کا عقیقہ اور سالگرہ تھا۔ گیٹ پر اور دروازہ پر غبارے لگائے گئے تھے۔ محلہ کے بچوں نے دھوم مچا رکھی تھی اور چند بچے شرارت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان غباروں پر پتھر مار رہے تھے۔ میں نے چوکیدار کو ہدایت کی کہ ان بچوں سے سختی سے نمٹا جائے۔ لیکن اچانک الرسالہ کی نصیحت یاد آئی۔ میں نے چوکیدار کو واپس بلایا اور خود گیٹ پر جاکر بچوں میں چند غبارے تقسیم کر دئے۔ وہ بچے بے حد خوش ہوئے اور واپس چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ الرسالہ ہر گھر میں پڑھا جانا چاہئے۔ انشاء اللہ اپنے حلقہ میں اس کی اشاعت بڑھانے کی کوشش کروں گا (احمد عبد الجبار کراچی)

۷ ایک صاحب لکھتے ہیں: ہمارے شہر اورنگ آباد میں مکتبہ اسلامی کے یہاں الرسالہ کی ایجنسی تھی۔ جن سے ہم ہر ماہ الرسالہ لیا کرتے تھے۔ اگست ۱۹۹۰ کے الرسالہ کی ہم نے ان سے مانگ کی تو معلوم ہوا کہ الرسالہ انھوں نے منگوانا بند کر دیا ہے۔ جس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ مولانا کی ہماری جماعت سے کھلی دشمنی نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ان کے الرسالہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ان کی اس تنگ نظری اور نازیبا حرکت پر الرسالہ پڑھنے والوں میں کافی غم وغصہ پایا جاتا ہے۔ جس کا تبادل ذریعہ ہمارے نزدیک یہ طے ہوا کہ ہم خود الرسالہ کی ایجنسی لے لیں۔ لہٰذا گزارش ہے کہ آپ ہر ماہ الرسالہ کی ۲۰ کاپیاں ہمارے پتہ پر روانہ کریں (حاجی عارف خاں، اورنگ آباد)

۸ مولانا محمد یوسف ندوی بھوپال سے لکھتے ہیں: ہندی الرسالہ کی خبر الرسالہ کے قارئین کے لئے انتہائی خوش کن ہے۔ مولانا حمید اللہ ندوی ہندی الرسالہ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کے لئے کوشاں ہیں۔ الحمد للہ ایک درجن سے زیادہ لوگوں نے ہر ماہ پانچ الرسالہ لینے کا عہد کیا ہے۔ یہ حضرات ہر ماہ پانچ الرسالہ ہندی خرید کر اپنے غیر مسلم دوستوں میں تقسیم کریں گے۔ یہاں عام تاثر یہ ہے کہ ہندی الرسالہ انشاء اللہ غیر مسلموں میں صحیح اسلام کے تعارف اور غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ بنے گا۔

۹ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی ہانگ کانگ گئے۔ وہاں ۱۷ اگست ۱۹۹۰ کو انھوں نے مقامی جامع مسجد

میں جمعہ کی نماز پڑھی ۔ نماز کے بعد ایک صاحبان سے ملے اور الرسالہ کی بات شروع کردی۔ ڈاکٹر صدیقی نے ایک ملاقات میں بتایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ الرسالہ ہانگ کانگ میں بھی پہنچا ہوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ آج الرسالہ دنیا کے ہر حصہ میں پہنچ رہا ہے۔

۱ سید لیاقت علی صاحب (ناگپور) نے بتایا کہ وہ آفسٹ پرنٹنگ کا کام کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھیں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ لوگ اکثر اسلام کے بارہ میں انگریزی کتابیں مانگتے ہیں۔ لیاقت علی صاحب نے کہا کہ ان لوگوں کو دینے کے لئے سب سے زیادہ موزوں کتابیں اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں ہیں۔ چنانچہ میں ان لوگوں کو یہ کتابیں دیتا رہتا ہوں۔ اسی طرح اور بہت سے لوگ ہیں جو اس انداز پر کام کر رہے ہیں۔

۱ ایک صاحب لکھتے ہیں : ایک دوست کی دکان پر الرسالہ اردو پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کافی متاثر ہوا۔ فوراً اس کا سالانہ خریدار بن گیا۔ باقاعدگی سے اس کو پڑھ رہا ہوں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کے لئے دیتا ہوں۔ فائل بھی بنائی ہے ہر پرچہ کا بے چینی سے انتظار کرتا ہوں۔ تبلیغی و دعوتی کام کو آپ بہت اچھی طرح انجام دے رہے ہیں (سراج الدین بلساری، بمبئی)

۱۱ ایک صاحب لکھتے ہیں : اگر کوئی شخص اس مصروف اور مشینی زندگی میں صرف ایک رسالہ پڑھنا چاہے تو اس کو الرسالہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ وہ کون سا شعبہ ہے جو الرسالہ میں نہیں۔ اسلامیات تاریخ، جغرافیہ، ادب، فلسفہ، منطق، عام معلومات، غرض الرسالہ ہر موضوع کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ انداز بیان اتنا دلکش اور موثر کہ پڑھتے ہی دل میں اتر جائے۔ الرسالہ واقعی روح کی غذا ہے یہ واحد رسالہ ہے جو اسلام کو موجودہ سائنٹفک اسلوب اور موثر پیرایہ میں پیش کرتا ہے۔ (مناظر حسن شاہین، گیا)

۱۱ پاکستان سے ایک صاحب لکھتے ہیں : آپ کی کتاب " اللہ اکبر " پڑھ کر بہت ہی طبیعت کو سرور حاصل ہوا۔ اور ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اگر آپ اجازت دیں تو دل چاہتا ہے کہ میں اس کا انگریزی ترجمہ کروں۔ تاکہ مغربی دنیا کی مادی زندگی کو اس کا شعور دلایا جائے۔ اس سلسلہ میں میں کوئی مالی فائدہ حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ محض ایک فرض ادا کرنا چاہتا ہوں (محمد عبد الجلیل، کراچی)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک کے لیے

ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسؤل نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

اپریل ۱۹۹۱ ▫ شمارہ ۱۷۲

AL-RISALA (Urdu) Monthly

لیس کمثلہ شئ

قرآن میں خدا کے بارہ میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اس کے مثل کوئی چیز نہیں (الشوریٰ ۱۱) خدا ہر اعتبار سے ایک برتر ہستی ہے۔ اس کا برتر ہونا ہی اس کو یہ حیثیت دیتا ہے کہ وہ تمام موجودات کا خدا ٹھہرے سب کے سب اس کے آگے جھک جائیں۔ سب کے سب اس کو اپنا بڑا بنا کر اس کے مقابلہ میں چھوٹا بننے پر راضی ہو جائیں۔

خدا اپنی ذات میں قائم ہے۔ انسان پیدا کیے جانے سے پیدا ہوا ہے۔ مگر خدا اس سے بلند ہے کہ کوئی اس کو پیدا کرے۔ خدا کا وجود ایک مستقل وجود ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ایک ہے۔ وہ سب سے بے نیاز ہے۔ اس کا نہ کوئی باپ ہے اور نہ کوئی اس کا بیٹا۔ اس کے برابر کوئی نہیں۔

خدا "نہیں" سے "ہے" کو برپا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے تمام غیر موجود چیزوں کو موجود کیا۔ مادہ اور حرکت اور روشنی اور توانائی اور شعور کی صورت میں جو کچھ آج کائنات میں نظر آتا ہے، وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو وجود بخشا ہے۔

خدا غیب کا علم رکھتا ہے۔ وہ ماضی اور حال کے ساتھ مستقبل کو بھی پوری طرح جانتا ہے۔ خدا کی اسی صفت خاص کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ وہ کائنات کی ایسی منصوبہ بندی کرے کہ اس کے تمام اجزار ایک دوسرے سے متوافق ہوں۔ ان میں ابدی طور پر کسی نقص کا ظہور نہ ہو سکے۔

خدا ایک زندہ ہستی ہے۔ وہ نیند اور تکان اور کمزوری سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ وہ اپنی وسیع کائنات کا مسلسل نظم کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں بلین سال گزرنے کے بعد بھی کائنات کی حرکت برابر جاری ہے۔ اس میں کبھی وقفہ نہیں پڑا۔ اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔

خدا ایک صاحب قوت ہستی ہے۔ خدا اگر صاحب قوت نہ ہو تو انسان کے پاس قوت کہاں سے آئے۔ خدا تمام چیزوں کو دیکھنے والا ہے۔ خدا اگر نہ دیکھے تو انسان بھی دیکھنے سے محروم رہے۔ خدا شعور اور ادراک کا مالک ہے۔ خدا اگر شعور اور ادراک کا مالک نہ ہو تو انسان کے پاس نہ شعور ہو گا اور نہ وہ کسی چیز کا ادراک کر سکے گا۔ خدا سب کچھ ہے۔ خدا ان صفات کا مالک بھی ہے جن کو ہم جانتے ہیں اور ان صفات کا مالک بھی جن کو ہم نہیں جانتے۔ موجودہ دنیا میں خدا کی خالقیت کا ظہور ہوا ہے، آخرت میں خدا کی حاکمیت اپنی کھلی ہوئی صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔

محمد رسول اللہؐ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم قدیم مکہ میں پیدا ہوئے تو وہاں شرک چھایا ہوا تھا۔ تمام مفادات شرک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مگر آپ نے اپنے آپ کو ماحول سے اوپر اٹھایا۔ حالات سے موافقت کرنے کے بجائے آپ نے اپنے کو تلاش حق کی راہ میں لگا دیا۔ اللہ نے آپ کی مدد فرمائی۔ آپ کو سچائی کی ہدایت ملی اور مزید انعام کے طور پر نبوت بھی عطا کی گئی۔

آپ خدا کے سچے عبادت گزار بن گئے۔ آپ نے اپنے تمام اعلیٰ جذبات کا مرکز صرف ایک خدا کو بنا لیا۔ آپ نے اپنے پورے وجود کو خدا کے حوالے کر دیا۔ نہ صرف دن میں بلکہ راتوں میں بھی آپ خدا کی عبادت کرتے۔ نہ صرف لوگوں کے سامنے بلکہ تنہائی میں بھی آپ خدا کے خاشع بنے رہتے۔

آپ نے بلند کرداری کو اپنا اخلاق بنایا۔ لوگوں کے برے سلوک کے باوجود آپ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے۔ لوگ آپ کو تکلیف پہنچاتے مگر آپ ان کے حق میں دعا دیتے۔ آپ نے ظالموں کے ظلم پر صبر کیا۔ آپ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہوئے۔

آپ کے لیے اپنے وطن میں رہنا ناممکن بنا دیا گیا۔ آپ کو مجبوراً اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ آپ مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ آپ نے فرار کو ہجرت میں تبدیل کر دیا۔ آپ کے خلاف لوگوں نے جنگ کی طاقت کا مظاہرہ کیا مگر آپ نے بے پناہ عزم کے ساتھ بتایا کہ امن کی طاقت جنگ کی طاقت سے بھی زیادہ بڑی ہے۔

آپ کو مقبولیت ملی مگر آپ نے فخر نہیں کیا۔ آپ کے پاس دولت آئی مگر آپ عیش سے دور رہے۔ آپ کو حکومت دی گئی مگر اس نے صرف آپ کی تواضع میں اضافہ کیا۔ آپ کو ہر قسم کی بلندیاں ملیں مگر آپ نے عجز اور عبدیت کو اپنا شعار بنایا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر قسم کے لمحات آئے اور زندگی کے تمام تجربات گزرے۔ آپ معاشی تنگی کے دور سے بھی گزرے اور فراخی اور آسودگی کے دور سے بھی۔ آپ کو صحت کا تجربہ بھی ہوا اور بیماری کا تجربہ بھی۔ آپ کا سابقہ تعریف کرنے والوں سے بھی پیش آیا اور تنقید کرنے والوں سے بھی۔ آپ کو اپنی زندگی میں دشمن بھی ملے اور دوست بھی۔ آپ شکست سے بھی دوچار ہوئے اور آپ نے عظیم کامیابی بھی حاصل کی۔ مگر ہر حال میں آپ اعتدال پر قائم رہے۔ ہر حال میں آپ اللہ کے صابر اور شاکر بندہ بنے رہے۔

روزہ اور عید

حدیث میں آیا ہے کہ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی افطار کے وقت، اور ایک خوشی اس
ہ کہ وہ اپنے رب سے ملے گا (للصائم فرحتان فرحة عند فطره و فرحة عند
ربه، متفق علیہ)

روزہ میں آدمی صبح سے شام تک بھوک اور پیاس کو برداشت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ سورج غروب
ہ اور وہ روزہ توڑ کر کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے۔ اس وقت آدمی کی وہ حالت ہو جاتی ہے جس کے
ں حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: ذهب الظمأ وابتلت العروق وثبت الاجر انشاء الله تعالی
ں چلی گئی اور رگیں تر ہو گئیں اور اجر ثابت ہو گیا، انشاء اللہ)

روزہ اور افطار دونوں دو مختلف تجربے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ دنیا کی اور آخرت کی تمثیل ہیں۔ دنیا
ں پابندیوں اور ذمہ داریوں میں بندھا ہوا ہے۔ آخرت میں وہ خوشیوں اور لذتوں سے محظوظ ہونے
ﮯ آزاد کر دیا جائے گا۔ اس طرح روزہ کا وقت گویا دنیا کی علامت ہے، اور افطار کا وقت آخرت
مت۔ رمضان کا مہینہ دنیا کی زندگی کو بتا رہا ہے، اور عید، جو زیادہ بڑے افطار کا دن ہے۔
ن کی زندگی کا تعارف کراتی ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ رمضان کے دنوں میں جب وہ روزہ رکھے تو روزہ اس کے لئے دنیوی زندگی
پہچان بن جائے۔ روزہ کی حالت میں اس کی نفسیات یہ ہو کہ جس طرح میں نے کھانے اور پینے سے
آپ کو روکا ہے، اسی طرح مجھے خدا کی منع کی ہوئی تمام چیزوں سے رکے رہنا ہے۔ اس دنیا میں
ر بھر ایک روزہ دار زندگی گزارنا ہے۔

اس کے بعد جب شام ہو اور وہ روزہ ختم کر کے افطار کرے تو اس کا احساس یہ ہو کہ گویا وہ عالم
ن میں پہنچ گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مہمانی کی جا رہی ہے۔ آنسوؤں کی بارش میں وہ پکار اٹھے
مدایا، میں نے تیری خاطر "روزہ" رکھا، اب تو میرے لئے "افطار" کی زندگی لکھ دے۔ میں نے تیرے
رمضان کو پورا کیا، اب تو میرے اوپر ابدی عید کی لامحدود نعمتوں کے دروازے کھول دے۔

مومن کے لئے روزہ، دنیا کی زندگی کا تجربہ ہے اور افطار، آخرت کی زندگی کا تجربہ۔

رسالہ اپریل ۱۹۹۱

ترتیب

خلیفہ دوم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ذکر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اتنا مختصر ہے کہ وہ الرسالہ انگریزی کی صرف دو سطروں کے برابر ہے۔ مگر ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے اپنی مشہور کتاب (The 100) میں پوری تاریخ سے جن ایک سو بڑے آدمیوں کا انتخاب کیا ہے، ان میں عمر بن الخطاب کا نام نمبر ۵۱ پر ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ میں کسی کا نام آنا یا نام نہ آنا، یا کم ذکر ہونا یا زیادہ ذکر ہونا، کوئی معیار نہیں۔ مؤرخین کبھی کسی شخصیت کو اپنی کتاب میں حذف کر دیتے ہیں، حالانکہ وہی شخصیت سب سے زیادہ قابل ذکر ہوتی ہے، اور کبھی کسی شخصیت کو نمایاں کر کے بیان کرتے ہیں، حالانکہ وہ شخصیت سرے سے اس قابل نہیں ہوتی کہ اس کو بیان کیا جائے۔

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے بارہ میں ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے ——— عمر کی کامیابیاں حقیقۃً بے حد اثر انگیز ہیں۔ کچھ لوگوں کو تعجب ہوگا کہ عمر، جو کہ مغرب میں تقریباً غیر معروف ہیں، ان کو اس کتاب میں شارلیمان اور جولیس سیزر جیسی شخصیتوں سے زیادہ بڑا مقام دیا جائے۔ تاہم عمر کی شاندار قیادت کے تحت عربوں نے جو فتوحات حاصل کیں، ان کا پھیلاؤ اور ان کی مدت اپنی حقیقت کے اعتبار سے سیزر اور شارلیمان کے کارناموں سے زیادہ اہم ہیں:

> Umar's achievements are impressive indeed... It may occasion some surprise that Umar – a figure virtually unknown in the west – has been ranked higher than such famous men as Charlemagne and Julius Caesar. However, the conquests made by the Arabs under Umar's brilliant leadership, taking into account both their size and their duration, are substantially more important than those of either Caesar or Charlemagne (p. 257).

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے عمر فاروق کو کوئی خاص قابل ذکر مقام نہیں دیا۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے آپ کو دنیا کے بڑے انسانوں میں نمبر ۵۱ پر رکھا۔ اسلامی تاریخ میں آپ کا نام نمبر ۲ پر لکھا ہوا ہے۔

کتنے اللہ کے بندے ہیں جن کو دنیا کے لکھنے اور بولنے والوں نے ناقابل ذکر ٹھہرا رکھا ہے۔ آخرت کا انقلاب اس کی تصحیح کرے گا۔ اس وقت ہر ایک کا نام وہاں لکھا جائے گا جس کا وہ حقیقۃً مستحق تھا، نہ کہ وہاں جہاں لوگوں نے بطور خود اس کا نام لکھ رکھا تھا۔

ایک دعا

عمرو بن بحر بن محبوب الکنانی (۲۵۵-۱۶۳ھ) بصرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ وہ عام طور پر
جاحظ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا شمار ادب کے ائمہ میں ہوتا ہے۔ مطالعہ کے اتنے زیادہ حریص تھے کہ آخر عمر میں
جب مفلوج ہو کر مرے تو ان کے سینہ پر کتاب رکھی ہوئی تھی۔ ان کی ایک کتاب "البیان والتبیین" ہے۔ اس
کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے یہ دعا لکھی ہے :

اللّٰھم إنا نعوذ بك من فتنة القول
كما نعوذ بك من فتنة العمل۔
و نعوذ بك من التكلف لما لا نحسن
كما نعوذ بك من العجب بما نحسن۔
و نعوذ بك من السلاطة والهذر
كما نعوذ بك من العي والحصر

اے اللہ، ہم تجھ سے قول کے فتنہ سے اسی طرح پناہ مانگتے ہیں جس طرح ہم تجھ سے عمل کے فتنہ سے پناہ مانگتے ہیں۔ اور ہم تجھ سے اس کام کا بار اٹھانے سے پناہ مانگتے ہیں جس کو ہم بخوبی نہیں کر سکتے اور اسی طرح اس کام پر گھمنڈ سے پناہ مانگتے ہیں جس کو ہم بخوبی کر سکتے ہیں۔ اور ہم تجھ سے زباں درازی اور لغویات سے پناہ مانگتے ہیں جس طرح ہم تجھ سے کلام پر قادر نہ ہونے اور گفتگو میں عاجز ہو جانے سے پناہ مانگتے ہیں۔

یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ کوئی نہ کوئی آزمائش کا پہلو لگا ہوا ہے۔ اس لیے وہ شخص جو خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو، اس کو ہر معاملہ میں خدا سے پناہ مانگنا چاہیے اور ہر معاملہ میں خدا کی مدد کا طالب ہونا چاہیے۔

اس دنیا کا اصل امتحان یہ نہیں ہے کہ آدمی نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ یہاں اصل امتحان یہ ہے کہ کھونے یا پانے کے موقع پر اس نے کیا ردعمل (response) پیش کیا۔ اس کو قول کے معاملہ میں بھی اتنا ہی محتاط ہونا چاہیے جتنا کوئی شخص عمل کے معاملہ میں محتاط ہوتا ہے۔ اس کو اپنے کیے کو بھی اسی خانہ میں ڈالنا چاہیے جس خانہ میں وہ اپنے نہ کیے کو ڈالتا ہے۔ اس کو قدرت کے موقع پر بھی اسی طرح عبدیت کا ثبوت دینا چاہیے جس طرح عجز کے موقع پر عبدیت کا ثبوت دیا جاتا ہے۔

اس دنیا میں کامیابی بھی آزمائش ہے اور ناکامی بھی آزمائش۔ یہاں عمل بھی جانچ کا لمحہ ہے اور بے عملی بھی جانچ کا لمحہ۔

اشاعت اسلام

ٹائمس آف انڈیا (دہلی اڈیشن) ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۰، صفحہ ۲ کے پہلے کالم میں ذاتی (personal) کے عنوان کے تحت یہ اعلان درج ہے کہ ــــــ میں، اشوک مدن، عمر ۳۰ سال، ولد شری اے ایل مدن، ساکن جی ۱۲/۲، مالویہ نگر، نئی دہلی، نے اپنے آزادانہ اختیار سے اسلام قبول کر لیا ہے اور اب سے میرا نام اختر مدن ہوگا:

I, Ashok Madan, aged 30, son of Shri A.L. Madan, resident of G-12/2, Malviya Nagar, New Delhi, have embraced Islam on my own free choice and will henceforth be known as Akhtar Madan. (C-59254)

یہ کوئی اتفاقی یا استثنائی خبر نہیں۔ اس طرح کے واقعات اس ملک میں اور ساری دنیا میں ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کہ زمین پر چلنے پھرنے والی کچھ روحیں اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام کے دائرہ میں داخل نہ ہو جائیں۔

یہ جو ہو رہا ہے، کیا وہ مسلمانوں کی کسی تبلیغی کوشش کے نتیجہ میں ہو رہا ہے۔ ہرگز نہیں۔ آج مسلمان ساری دنیا میں ایک ارب کی تعداد میں آباد ہیں۔ ان کے درمیان اسلام کے نام پر بے شمار بڑی بڑی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر واحد سرگرمی جس سے خدا کی زمین تقریباً خالی ہے، وہ دعوت و تبلیغ کی سرگرمی ہے۔ خدا کے بندوں تک خدا کا دین پہنچانے کا کام واحد کام ہے جس کو کرنے والا آج زمین کی پیٹھ پر کوئی نہیں۔

اس کے باوجود اسلام کیوں پھیل رہا ہے۔ جواب یہ ہے کہ خود اپنی طاقت کے ذریعہ۔ خدا اور مذہب کا جذبہ انسان کی فطرت میں پیوست ہے۔ وہ اپنے فطری جذبہ کے تحت خدائی مذہب کی تلاش میں نکلتا ہے۔ مگر چونکہ دوسرے مذاہب انسانی آمیزش کے نتیجہ میں بگڑ چکے ہیں، اس لیے ان متلاشیوں کی تسکین دوسرے مذاہب میں نہیں ہوتی۔ اس کے بعد جب وہ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہی وہ چیز ہے جس کو ان کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔ اسلام کا غیر محرف ہونا اور اس کا تاریخی طور پر ثابت شدہ مذہب ہونا، وہ خصوصیت ہے جس نے اسلام کے اندر یہ طاقت پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے آپ پھیلتا رہے، خواہ کسی نے اس کی تبلیغ کی کوشش کی ہو یا نہ کی ہو۔

تقویٰ اور اخلاق

رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اکثرِ ما یُدخل الناس الجنۃ۔ قال: تقوی اللہ وحسن الخُلق (رواہ الترمذی)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ وہ کیا چیز ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو جنت میں لے جائے گی۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کا ڈر، اور اچھا اخلاق۔

انسان خدا کا بندہ ہے۔ اسی کے ساتھ موجودہ دنیا میں اس کو دوسرے انسانوں کے ساتھ رہنا ہوتا ہے۔ اس طرح آدمی بیک وقت دو تعلق کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک خدا سے تعلق۔ اور دوسرا، انسانوں سے تعلق۔ اس اعتبار سے انسان کے امتحان کے دو پہلو ہو جاتے ہیں۔ اور امتحان کے ان دونوں پرچوں میں اس کو پورا اترنا ہے۔

خدا کی نسبت سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ آدمی خدا کو اپنا خالق ومالک سمجھے۔ وہ خدا کی عظمتوں کے احساس سے سرشار ہو۔ اس عقیدہ اور اس احساس سے کسی کے اندر جو قلبی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اسی کا نام تقویٰ ہے۔

خدا بڑا ہے، انسان چھوٹا ہے۔ خدا قادر ہے، انسان عاجز ہے۔ خدا دینے والا ہے، انسان لینے والا ہے۔ ان حقیقتوں کا شعور آدمی کے اندر اعتراف اور تواضع اور مسئولیت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر سرکشی کا مزاج ختم ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی محبت اور خوف کے جذبات کے تحت دنیا میں زندگی گزارنے لگتا ہے۔

اس قسم کا انسان جب دوسرے انسانوں کے درمیان آتا ہے، تو ان سے معاملہ کرتے ہوئے اس کی پوری روش حسنِ اخلاق میں ڈھل جاتی ہے۔ اس کا بول تواضع کا بول ہوتا ہے۔ اس کا عمل انصاف کا عمل ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے انسان کی طرح زندگی گزارنے لگتا ہے جو یہ دیکھ رہا ہو کہ اس کے اوپر اس کا خدا کھڑا ہوا اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ وہ اس کے ہر قول وفعل کا حساب لینے والا ہے۔ ایسے انسان سے جو اخلاق ظاہر ہو، اسی کا نام حُسنِ خُلق ہے۔

جو آدمی ان دونوں امتحانوں میں پورا اترے، وہی وہ شخص ہے جس کو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کیا جائے گا۔

شدید تر زلزلہ

فروری ۱۹۸۳ میں آسٹریلیا میں ایڈیلیڈ (Adelaide) کے علاقہ میں آگ لگی۔ اکہتر آدمی جل کر مرگیے۔ اور آٹھ ہزار آدمی بے گھر ہو گیے۔ اس کو بجھانے کی کوشش کرنے والوں میں سے ایک شخص نے کہا:

It was man versus nature and although it may sound dramatic no amount of resources or of bravery would have helped.

یہ انسان اور فطرت کا مقابلہ تھا اور اگرچہ یہ ڈرامائی معلوم ہوتا ہے مگر وسائل یا بہادری کی کوئی بھی مقدار اس موقع پر مددگار نہیں ہو سکتی تھی (گارجین ۲۷ فروری ۱۹۸۳)

زلزلہ کے بارے میں یہ نہایت صحیح تبصرہ ہے۔ زلزلہ خدا کی اس بے پناہ طاقت کا ابتدائی تعارف ہے جو قیامت کی صورت میں آئندہ ظاہر ہونے والی ہے۔ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ خدا موجودہ دنیا کو ایک عمومی اور شدید تر زلزلہ کے ذریعہ توڑ دے اور کوئی انسان اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکے۔

اس دن پہاڑ ریت کے ذروں کی طرح بکھر جائیں گے۔ سمندر شدید تلاطم کی بنا پر خشکی کے اوپر بہہ پڑیں گے۔ بڑے بڑے شہر آندھی کے تنکے کی طرح زمین بوس ہو جائیں گے۔ ساری دنیا میں انسان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی جہاں بھاگ کر وہ پناہ لے سکے۔

یہ موجودہ دنیا کے خاتمہ اور نئی دنیا کے آغاز کا دن ہوگا۔ آج کی دنیا میں انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ برائے امتحان ملا ہے۔ اگلی دنیا میں آدمی کو جو کچھ ملے گا وہ عمل کی جزا کے طور پر ملے گا۔

اس دن دنیا کا خالق و مالک ظاہر ہو کر تمام انسانوں کا حساب کرے گا۔ اچھے لوگ ایک طرف اور برے لوگ دوسری طرف کر دیئے جائیں گے۔ اچھے لوگوں کے لیے اچھی زندگی ہوگی اور برے لوگوں کے لیے بری زندگی۔ ہر ایک اپنے اپنے انجام کو ابدی طور پر بھگتتا رہے گا۔

آج کا زلزلہ کل کے شدید تر زلزلہ کی تمہید ہے۔ عقل مند وہ ہے جو آج کے آئینہ میں کل کو دیکھ لے۔ جو کل کے آنے سے پہلے کل کی تیاری میں لگ جائے۔ کیوں کہ تیاری کا جو کچھ موقع ہے وہ آج ہے۔ کل کا دن صرف بھگتنے کا دن ہوگا نہ کہ تیاری کرنے کا دن۔

زلزلہ کو جاننے والا وہ ہے جو آج کے زلزلہ میں کل کے زلزلہ کو دیکھ لے۔

جاہلیت کی پکار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بنی المصطلق (۶ھ) سے واپس آرہے تھے۔ راستہ میں ایک مقام پر آپ نے پڑاؤ ڈالا۔ یہاں پر مریسیع نام کا ایک کنواں تھا۔ یہاں پانی لیتے ہوئے دو مسلمانوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک مسلمان کا تعلق مہاجرین سے تھا اور دوسرے مسلمان کا تعلق انصار سے۔ جب تکرار بڑھی تو دونوں نے اپنے اپنے قبیلہ کو حمایت کے لیے پکارا۔ ایک نے کہا کہ یامعشر الانصار (اے گروہ انصار) دوسرے نے کہا کہ یامعشر المهاجرین (اے گروہ مہاجرین) اس کے بعد دونوں گروہ کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف جمع ہو گئے اور قریب تھا کہ دونوں آپس میں لڑ پڑیں۔ ایک روایت کے مطابق، پکار کے الفاظ یہ تھے: یاللانصار (اے انصار دوڑو) یاللمهاجرین (اے مہاجرین دوڑو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ وہاں آئے اور پوچھا کہ یہ جاہلی پکار کیا ہے (ما بال دعوی الجاهلية) لوگوں نے قصہ بتایا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑو۔ کیوں کہ یہ سب گندی باتیں ہیں (دعوها فإنها منتنة) حیاۃ الصحابہ ۱/ ۴۶۳-۴۶۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پکار کو جاہلیت کی پکار کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ پکار دو آدمیوں کے انفرادی مسئلہ کو پوری قوم کے لیے غیرت اور حمیت کا مسئلہ بنا رہی تھی، ہر معاشرہ میں ایسا ہوتا ہے کہ مقامی سطح پر بعض افراد کے درمیان کچھ نزاع پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ایسی نزاع کو عمومی رنگ دینا اس کو غیر ضروری طور پر بڑھانا ہے۔ ہر وہ پکار جاہلیت کی پکار ہے جس میں کسی ذاتی یا مقامی مسئلہ کو جذباتی نعروں کے ذریعہ پوری قوم کا مسئلہ بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔

جزئی یا مقامی مسئلہ کو جزئی یا مقامی دائرہ میں رکھ کر اسے حل کرنا چاہیے۔ اگر ایسے کسی مسئلہ کو جذباتی اشوبنا کر کہا جانے لگے کہ یہ ہمارے قومی وجود کی علامت ہے۔ یہ ملی غیرت کے لیے چیلنج ہے، یہ پوری امت کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، تو یہ سب جاہلیت کی پکار ہو گی۔ اور جاہلیت کی پکار سے بربادی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہیں۔ جزئی مسئلہ کو اگر اپنے حال پر رہنے دیا جائے تو اس کو حل کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ مگر جب اس کو بڑھا دیا جائے تو اس کو حل کرنا اتنا ہی زیادہ مشکل ہو گا جتنا زیادہ اس کو بڑھایا گیا ہے۔

ایک تقابل

الکزینڈر توسپکو (Aleksandr Tosipko) سوویت روس کے ایک مشہور فلسفی ہیں۔ ان کی عمر ۵۰ سال کے قریب ہے۔ وہ ماسکو کے انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اکونومک اینڈ پولیٹکل اسٹڈیز میں پروفیسر ہیں۔ نیویارک کے ہفتہ وار میگزین نیوز ویک کے نمائندہ نے ان سے ماسکو میں ملاقات کی اور ایک خصوصی انٹرویو لیا جو نیوز ویک کے شمارہ ۲۳ جولائی ۱۹۹۰ میں چھپا ہے۔ ایک سوال وجواب یہ ہے :

Q. How did your views of Marxism evolve? What was most important in your personal development?

A When you read 'Das Kapital' it's all crystal clear by the time you reach page three. Only an idiot can really believe in Marxism.

نیوز ویک کے نمائندہ نے پوچھا کہ مارکسزم کے بارہ میں آپ کے خیالات کا ارتقا کس طرح ہوا۔ آپ کے ذاتی ارتقا میں سب سے زیادہ اہم کیا چیز تھی۔ روسی پروفیسر نے جواب دیا: جب آپ مارکس کی کتاب داس کیپٹال کو پڑھیں تو اس کے تیسرے صفحہ تک پہنچتے ہی بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کوئی دیوانہ ہی حقیقۃً مارکسزم کی صداقت پر یقین کرسکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ اقتصادیات کے بارہ میں مارکس نے اپنی کتاب داس کیپٹال جرمن زبان میں لکھی تھی۔ وہ پہلی بار ۱۸۶۷ء میں چھپی۔ اشتراکی حضرات کا کہنا تھا کہ یہ دور جدید کا قرآن ہے۔ اب انسان کو بائبل یا قرآن کی ضرورت نہیں، اب داس کیپٹال انسان کے لیے رہنما کتاب ہے۔ مگر صرف ایک صدی کے اندر اس کا طلسم ٹوٹ گیا۔ حتی کہ اب خود اشتراکی دنیا میں اس کتاب کو دیوانگی کی کتاب کہا جارہا ہے۔

اس کے برعکس قرآن اپنی اہمیت کو چودہ سو سال سے مسلسل برقرار رکھے ہوئے ہے۔ قرآن اور صاحب قرآن کے خلاف اب تک اس قسم کی کوئی بات ثابت نہ کی جاسکی۔ قرآن آج بھی "کتاب لاریب" بنا ہوا ہے۔ یہ قرآن کی ابدی صداقت کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہے۔

انسانی کتابوں کا حال یہ ہے کہ وہ "تیسرے صفحہ" تک پہنچتے ہی اپنی غلطی کو واضح کر دیتی ہیں۔ اس کے برعکس قرآن اپنے "آخری صفحہ" تک ایک بے خطا کتاب ہے۔ یہ علمی واقعہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے نہ کہ کوئی انسانی کتاب۔

داعی کا اخلاق

ایک دکاندار ہے۔ اس کے یہاں ایک گاہک آتا ہے۔ اس گاہک کو ۵۰ ہزار روپیہ کا مال خریدنا ہے۔ بات چیت کے دوران گاہک کی زبان سے کوئی کڑوا بول نکل جاتا ہے۔ اس پر دکاندار کو غصہ آجاتا ہے۔ وہ بھی جواب میں کڑوی بات بول دیتا ہے۔ گاہک بگڑ جاتا ہے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے، اور دوسری دکان سے خریداری کا معاملہ کرتا ہے۔

اب یہ دکاندار اگر واقعی دکاندار ہے تو وہ اپنے آپ کو ملامت کرے گا۔ وہ سوچے گا کہ میں کیوں غصہ ہوگیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں اس کی بات کو برداشت کر لیتا۔ اس کے کڑوے بول کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے میٹھا بول بولتا۔ اگر میں ایسا کرتا تو ایک قیمتی گاہک میرے ہاتھ سے نہ نکلتا۔ خواہ مخواہ میں نے آئے ہوئے گاہک کو کھو دیا۔

اس کے برعکس اگر دکاندار کے اندر "دادا" والا مزاج ہے تو وہ اپنے آپ کو بھول کر صرف گاہک کو برا بتائے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ شخص خریداری کرنے آیا تھا یا میرے اوپر ڈکٹیٹری کرنے آیا تھا۔ میں کیوں کسی سے دبوں، کیا میں کسی کا غلام ہوں۔ مجھے ایسے گاہکوں کی کوئی پروا نہیں۔ ان کو آنا ہے تو آئیں اور نہیں آنا ہے تو نہ آئیں —— اس مثال میں پہلا دکان دار سچا دکاندار ہے، اور دوسرا دکاندار جھوٹا دکاندار۔

دعوت کے عمل کو قرآن میں تجارت (الصف ۱۰) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تاجر ہمیشہ ذمہ داری کو خود قبول کرتا ہے، اس کے بغیر وہ دوسروں کو اپنا گاہک نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح خدا کا داعی ایسا کرتا ہے کہ وہ فریق ثانی کی زیادتیوں کو نظر انداز کر کے یک طرفہ طور پر اس کے ساتھ حسن اخلاق کا معاملہ کرتا ہے، کیوں کہ اس کے بغیر وہ دوسروں کو اپنا مدعو نہیں بنا سکتا۔

ایک تاجر اپنی دنیا کے فائدہ کے لیے جو کچھ کرتا ہے، وہی ایک داعی اپنی آخرت کے فائدہ کے لیے کرتا ہے۔ اس اعلیٰ کردار کے بغیر نہ کوئی تاجر تاجر بن سکتا، اور نہ کوئی داعی داعی۔

تاجرانہ کردار کے بغیر تجارت نہیں، اسی طرح داعیانہ کردار کے بغیر دعوت نہیں۔

ناقابل تسخیر طاقت

ابن خلدون (۱۴۰۶ - ۱۳۳۲ء) کی زندگی کا ایک حصہ شام میں گزرا۔ ۱۴۰۰ء میں جب کہ تیمور نے وحشی تاتاری قبائل کے ساتھ دمشق کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ابن خلدون اس وقت دمشق ہی میں تھا۔ محاصرہ کے دوران تیمور اور دمشق کے باشندوں میں بات چیت شروع ہوئی۔ اس وقت تیمور نے ابن خلدون سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی جو تاریخ داں کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ دمشق کے باشندوں نے یہ سمجھا کہ تیمور صلح پر آمادہ ہے۔ چنانچہ ابن خلدون کو رسیوں میں باندھ کر شہر پناہ کی دیوار سے باہر کی طرف لٹکایا گیا۔ اس طرح وہ تیمور کے کیمپ میں پہونچا۔ ابن خلدون سات ہفتہ تک تیمور کے کیمپ میں رہا۔ تیمور نے ابن خلدون کی کافی عزت کی۔ اس نے ابن خلدون کی خواہش کے مطابق اس کے لیے بحفاظت مصر جانے کا انتظام کر دیا۔ وغیرہ۔

تاہم اس عزت افزائی کے پیچھے تیمور کا خود اپنا مفاد تھا۔ بظاہر مزید فتوحات کا خواب دیکھتے ہوئے، تیمور نے ابن خلدون سے شمالی افریقہ کا تفصیلی نقشہ دریافت کیا۔ اس موضوع پر اس نے نہ صرف ابن خلدون کی گفت گو سنی، بلکہ اس سے ایک جامع تحریری رپورٹ بھی حاصل کی:

Probably dreaming of further conquests, Timur asked for a detailed description of North Africa and got not only a short lecture on that subject, but also an extensive written report. (9/149).

تیمور اگرچہ اہلِ دمشق کے لیے اتنا سفاک تھا کہ صلح کی پیش کش کے باوجود اس نے دمشق کو تباہ کر دیا اور وہاں کی عظیم مسجد کو نذرِ آتش کر دیا۔ مگر شخصی سطح پر اس نے ابن خلدون کی پوری قدردانی کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن خلدون نے اپنے ممتاز جغرافی اور تاریخی علم کی بنا پر یہ ثابت کیا تھا کہ وہ تیمور کے لیے نہایت مفید رہنما بن سکتا ہے۔

آدمی اگر اپنی افادیت ثابت کر دے تو وہ ہر ایک کی نظر میں محترم بن جاتا ہے، حتیٰ کہ سفاک دشمن کی نظر میں بھی۔ افادیت اور نفع بخشی ایسی چیز ہے جو خوں خوار لوگوں کو بھی مہربان بنا دے، بادشاہوں کو بھی آدمی کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے۔

اخلاق رسول

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ایک غزوہ وہ ہے جس کو ذات الرقاع کہا جاتا ہے۔ یہ جمادی الاول ۴ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ سفر کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام پر آرام فرما رہے تھے۔ آپ کی تلوار درخت کی شاخ سے لٹکی ہوئی تھی۔

اس وقت آپ تنہا تھے۔ ایک مشرک غورث بن الحارث نے آپ کو اس حالت میں دیکھ لیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے فاتحانہ انداز میں کہا کہ کیا میں تمہارے لیے محمد کو قتل نہ کر دوں (الا اقتل لكم محمداً) انھوں نے کہاں ہاں (قالوا بلی) اس کے بعد وہ خاموشی سے وہاں پہونچا جہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تنہا لیٹے ہوئے تھے۔ اس نے درخت سے تلوار اتاری اور ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر آپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔

اس نے کہا کہ اے محمد، اب کون تم کو مجھ سے بچا سکتا ہے (من يمنعك مني يا محمد) آپ نے فرمایا اللہ۔ آپ کی زبان سے پر اعتماد لہجہ میں "اللہ" کا نام سن کر مشرک پر ہیبت طاری ہو گئی۔ اس نے تلوار رکھ دی۔ اب آپ نے وہ تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس سے کہا کہ بتاؤ، اب تم کو کون میرے ہاتھ سے بچائے گا۔ اس نے کہا کہ آپ بہتر صاحب تلوار بنیں (كُن خيرَ آخذ) اس کے بعد آپ نے اس کو چھوڑ دیا اور کہا کہ جاؤ میں نے تم کو معاف کیا۔

اس واقعہ کے بعد وہ مشرک اپنے قبیلہ میں واپس چلا گیا۔ وہی شخص جو اپنے قبیلہ سے یہ کہہ کر گیا تھا کہ میں محمد کو قتل کرنے جا رہا ہوں، اب ان سے یہ کہنے لگا کہ میں ایک ایسے آدمی کے پاس سے آیا ہوں جو تمام انسانوں میں سب سے بہتر انسان ہے (جئتكم من عند خير الناس) سیرۃ ابن کثیر ۳/۱۶۴

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر مذکورہ مشرک کی گستاخی اور اس کے جرم پر اس کو قتل کر دیتے تو اس کے قبیلہ میں یہ خبر پہونچتی کہ محمد نے ہمارے آدمی کو قتل کر دیا۔ اس خبر سے قبیلہ والوں میں انتقامی احساس جاگتا۔ مگر اب قبیلہ والوں میں یہ خبر پہونچی کہ محمد بہترین اخلاق کے آدمی ہیں۔ انھوں نے مجرم پر قابو پانے کے باوجود اس کو معاف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر اخلاقی احساس جاگ اٹھا۔ پہلے مذکورہ شخص (غورث بن الحارث) نے اسلام قبول کیا اور اس کے بعد اس کا پورا قبیلہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ایک روش کی صورت میں وہاں انتقام کی ہوائیں چلتیں، دوسری روش کی صورت میں وہاں دین رحمت کی ہوائیں چل پڑیں۔

انسان کی بے کسی

۱۲ اگست ۱۹۸۵ کو جاپان میں ایک ہولناک ہوائی حادثہ ہوا۔ ایک بڑا جہاز (۷۴۷) جو ٹوکیو
ے اوسا کا جارہا تھا وہ راستہ میں پہاڑ سے ٹکرا کر برباد ہو گیا۔ اس کے مسافروں میں صرف چند آدمی
چے۔ باقی ۵۱۹ مسافر فوراً ہلاک ہو گئے۔

اس حادثہ سے متعلق جو مختلف تفصیلات اخباروں میں آئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ
ب جاپانی خاتون مسز ماریکو شرائی (Mrs Mariko Shirai) بھی انھیں ہلاک ہونے والوں میں
ے تھیں۔ ان کی عمر ۲۶ سال تھی۔ جہاز کے برباد شدہ سامانوں میں سے ایک ٹائم ٹیبل کے اوراق تھے جو
مدکو دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ ٹائم ٹیبل اس وقت مذکورہ خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت مذکورہ
اتون نے اس ٹائم ٹیبل کے حاشیہ پر چند الفاظ لکھے جو محفوظ حالت میں پائے گیے ہیں۔ وہ الفاظ یہ تھے،

Help me, horror, horror, horror.

ری مدد کرو، دہشت، دہشت، دہشت (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ اگست ۱۹۸۵)

قرآن میں ہے کہ انسان کو ضعیف اور کمزور پیدا کیا گیا ہے (النساء ۲۸) عام حالات میں
نسان اپنے ضعف کو بھولا رہتا ہے۔ حتی کہ وہ سرکشی کرنے لگتا ہے۔ مگر جب کوئی نازک لمحہ آتا ہے تو
س کو محسوس ہوتا ہے کہ میں بالکل بے بس ہوں۔ میں اپنی ذاتی بنیاد پر اس دنیا میں کھڑا نہیں
ہو سکتا۔ اسی قسم کا ایک نازک لمحہ تھا جو مذکورہ جاپانی خاتون پر گزرا۔

اس طرح کے لمحات آدمی پر کبھی کبھی ڈالے جاتے ہیں تاکہ وہ اس دنیا میں اپنی حیثیت کو
سمجھے۔ تاکہ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے تواضع کی روش پر قائم ہو جائے۔ مگر انسان
کا یہ حال ہے کہ جب کوئی نازک لمحہ آتا ہے، اس وقت تو وہ وقتی طور پر متواضع بن جاتا ہے۔ مگر جیسے
ہی موقع ختم ہوتا ہے وہ دوبارہ سرکش بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

اس دنیا میں اصلاح کی توفیق اس کو ملتی ہے جو جزئی واقعہ سے کلی اثر قبول کرے۔ جو وقتی تجربہ کو
پنی پوری زندگی کا تجربہ بنالے۔ جو ایک دن کے سبق آموز واقعہ کو اس طرح پکڑے کہ وہ اس کی ساری عمر کے
لیے سبق اور نصیحت کا ذریعہ بن جائے۔

نفع بخش کی طاقت

ہندستان ٹائمس (۲۰ جولائی ۱۹۹۰) کے نمائندہ مقیم ماسکو مسٹر بھابنی سین گپتا نے سوویت یونین کے بارہ میں ایک رپورٹ شائع کی ہے، اس کا عنوان ہے ——— ایک نیا روس ابھر رہا ہے :

A new USSR is emerging

اس رپورٹ میں سوویت روس میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ آخر میں لکھتے ہیں کہ بین اقوامی معاملات کے ایک ممتاز روسی ماہر نے ماسکو میں مجھے بتایا کہ سوویت روس کا پہلا محبوب امریکہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا پہلا محبوب متحدہ یورپ ہوگا۔ اور پھر جاپان، اس کے بعد امریکہ اور چین۔ میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا، اور انڈیا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ روسی عالم نے پُر اطمینان لہجہ میں کہا کہ انڈیا کا معاملہ ایک مخصوص معاملہ ہے۔ انڈیا ہمارا پہلا یا دوسرا یا تیسرا محبوب نہیں۔ انڈیا ہمارا دائمی محبوب ہے :

> An outstanding Soviet specialist in international affairs told me, "The United States will not be the first love of the U.S.S.R. The first love will be united Europe. And then Japan, the U.S. and Canada." "What about India?" I asked with mixture of surprise and amusement. "India is special", the academician replied placidly. "India is not our first or second or third love. It is our love-for-ever" (p.1).

پچھلے چالیس سال سے ہماری حکومت ہم کو یقین دلا رہی تھی کہ سوویت روس ہمارا سب سے بڑا دوست ہے۔ مگر روسی عالم کا مذکورہ جواب بتاتا ہے کہ اب سوویت روس نے انڈیا کو رسمی تعلق کے خانہ میں ڈال دیا ہے۔ اس فرق کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ پہلے روس کو ہماری ضرورت تھی، اب روس کو ہماری ضرورت نہیں رہی۔ سرد جنگ کی سیاست میں روس ہم کو امریکہ کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اب روس اور امریکہ میں صلح ہو جانے کے بعد یہ حریفانہ سیاست مر گئی، اس لیے روس کی نظر میں ہماری اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ اب روس کے لیے اہمیت صرف ان ملکوں کی ہے جو جدید اقتصادی تنظیم میں اس کے مددگار بن سکیں۔ اور یہاں یورپ اور جاپان اس کے لیے مددگار ہیں نہ کہ انڈیا۔

کسی فرد یا قوم کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں کی ضرورت بنا دے۔ اس کے سوا دوسری ہر بنیاد فرضی ہے جو ہوا کے پہلے ہی جھونکے میں زمیں بوس ہو جاتی ہے۔

ہندستان ٹائمس (۲۸ دسمبر ۱۹۹۰) نے ایک ہندستانی صحافی مقیم واشنگٹن مسٹر این سی فن کی رپورٹ چھاپی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ عام طور پر لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ جب روسی صدر میخائل گوربا چیف نے راجیو گاندھی کی حکومت کے زمانہ میں انڈیا کا دورہ کیا۔ اس وقت سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی نے انڈیا، چین اور سوویت یونین کے درمیان قریبی تعاون کی تجویز پیش کی تھی تاکہ امریکی دیو (اور شاید یورپ کے ابھرتے ہوئے اتحاد) کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوستانہ دھڑا قائم کیا جا سکے۔ صدر گوربا چیف نے بے رحمانہ صاف گوئی کے ساتھ اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس وقت ہمیں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ نئی ٹکنالوجی ہے، اور نئی ٹکنالوجی ہم کو نہ چین دے سکتا ہے اور نہ انڈیا :

It is not generally known that when Soviet President Mikhail Gorbachev visited India, then Prime Minister Rajiv Gandhi had suggested closer cooperation among India, China and the Soviet Union as a friendly counterpoise to the US giant (and perhaps to the emerging European conglomerate). President Gorbachev responded with brutal frankness that what we need desperately is new technology, and neither China nor India can give us that (p.13).

پچھلے چالیس سال سے روس نے "سرمایہ دار مغرب" کو اپنا دشمن سمجھ رکھا تھا۔ اور "سوشلسٹ انڈیا" کو اپنا دوست بنائے ہوئے تھا۔ مگر لمبے تجربے کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ انڈیا سے اس کو کوئی فائدہ نہیں، جب کہ سرمایہ دار مغرب اس کی ترقی میں نہایت اہم مددگار بن سکتا ہے۔ اس نے انڈیا کو چھوڑ دیا اور اختلاف اور شکایت کو نظر انداز کرتے ہوئے سرمایہ دار مغرب سے دوستی قائم کر لی۔

"سرمایہ دار ملک" نے اپنی نفع بخشی کی صلاحیت کے ذریعہ اپنے سب سے بڑے دشمن کو جیت لیا۔ اور سوشلسٹ انڈیا کی غیر نفع بخشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اپنے سب سے بڑے دوست سے محروم ہو جانا پڑا۔

یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا اصل راز ہے۔ اس دنیا میں کامیابی نفع بخشی کی بنیاد پر ملتی ہے نہ کہ الفاظ کا گنبد کھڑا کرنے سے۔

الّو کا سبق

الّو کو عام طور پر نحوست اور بیوقوفی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کو بیکار سمجھ کر مار ڈالتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کی دنیا میں کوئی چیز بے فائدہ نہیں۔ الّو ہماری زراعت اور فصلوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ کیوں کہ وہ فصل کو نقصان پہونچانے والے کیڑوں کو شکار کر کے انھیں کھا جاتا ہے۔

الّو کی غذا نقصان رساں کیڑے اور موذی جانور ہیں۔ اس اعتبار سے الّو ان بہت سے انسانوں سے اچھا ہے جو محض اپنی حرص اور اپنے اقتدار کے لیے لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ جو کار آمد چیزوں کو برباد کر کے فتح حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

الّو کی ۱۳۰ قسمیں معلوم کی گئی ہیں۔ وہ چار اونس سے لے کر چھ پونڈ وزن تک کے ہوتے ہیں۔ اسی اعتبار سے ان کی غذا کی مقدار بھی مختلف ہے۔ چھوٹے الّو تقریباً سات اونس خوراک کھاتے ہیں۔ اور بڑے الّو دو پونڈ سے زیادہ تک کھا جاتے ہیں۔ الّو عام طور پر رات کے وقت شکار کرتے ہیں۔ وہ بڑے کیڑے، چوہے، چھپکلیاں، سانپ، چھوٹے خرگوش وغیرہ کو پکڑتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو زراعت کو یا انسان کو نقصان پہونچانے والی ہیں۔

الّو کے جسم کی بناوٹ شکار کے کام کے لیے نہایت موزوں ہے۔ مثلاً ایک ماہر طیور کے لفظوں میں، وہ رات کے وقت انتہائی خاموش پرواز (Silent flight) کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ رات کی تاریکی میں کیڑوں یا جانوروں کی صرف آواز سے ان کے مقام کا پتہ لگا لیتا ہے اور تیزی اور خاموشی سے وہاں پہونچ کر اچانک ان کو پکڑ کر نگل جاتا ہے (ہندستان ٹائمس ۹ ستمبر ۱۹۸۹)

خدا کی دنیا میں کوئی چیز بے فائدہ نہیں۔ یہاں کوئی چیز حکمت سے خالی نہیں۔ خدا کی دنیا میں الّو جیسی چیز بھی اس کا ایک مفید جزء ہے۔ ایسی حالت میں جو انسان دنیا میں اس طرح رہیں کہ انھوں نے دوسروں کے لیے اپنی افادیت کھودی ہو۔ جو دنیا کے مجموعی نظام میں ایک فائدہ بخش عنصر کی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ جو انسانی سماج میں مفید حصہ بننے کے بجائے مضر حصہ بن گیے ہوں۔ وہ بلاشبہ خدا کی نظر میں الّو سے بھی زیادہ بے قیمت ہیں۔ ایسے لوگوں کی ضرورت نہ خدا کو ہے اور نہ عام انسانیت کو۔

مشتعل نہ کیجئے

ہندستان میں سب سے زیادہ شیر گیر کے جنگل میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں ان کے لیے بہت بڑا کھلا پارک بنایا گیا ہے جس کو (Gir forest sanctuary) کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہاں ۲۰ سے بھی کم تعداد میں شیر پائے جاتے تھے۔ مگر مئی ۱۹۹۰ کی گنتی کے مطابق، اب وہاں ۲۸۰ شیر ہیں۔ ان شیروں کی وجہ سے انسانی زندگی کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۹۰) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے دو برسوں میں ان شیروں نے علاقہ کے ۱۶ آدمی مار ڈالے اور ۱۴۰ آدمیوں کو زخمی کیا۔

ان حادثات کے بعد مسٹر روی چیلم کی قیادت میں ایک ٹیم کو مقرر کیا گیا تاکہ وہ صورت حال کے بارہ میں تحقیق کرے۔ انھوں نے تحقیق کے بعد یہ بتایا ہے کہ شیروں نے اگرچہ بہت سے انسانوں کو نقصان پہنچایا اور ان پر حملے کیے۔ مگر یہ حملے محض شیروں کی درندگی کی بنا پر نہ تھے۔ ریسرچ کرنے والوں نے انسان کے اوپر شیر کے اکثر حملوں کا سبب اشتعال انگیزی کو قرار دیا ہے :

The researchers have attributed most of the lion attacks on human to provocations of the animals.

شیر ایک خوں خوار درندہ ہے۔ وہ انسان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ مگر شیر اپنی ساری درندگی کے باوجود اپنی فطرت کے ماتحت رہتا ہے۔ اور اس کی فطرت یہ ہے کہ وہ اشتعال انگیزی کے بغیر کسی انسان کے اوپر حملہ نہ کرے۔

یہ قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ "درندہ انسانوں" کے ظلم سے کس طرح بچا جائے۔ درندہ انسان کے ظلم سے بچنے کی واحد یقینی تدبیر یہ ہے کہ اس کو اس کی فطرت کی ماتحتی میں رہنے دیا جائے۔ اشتعال دلانے سے پہلے ہر انسان اپنی فطرت کے زیر حکم رہتا ہے۔ اور اشتعال دلانے کے بعد ہر آدمی اپنی فطرت کے حکم سے باہر آ جاتا ہے۔ گویا فطرت خود ہر آدمی کو ظلم و فساد سے روکے ہوئے ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو جوابی کارروائی کرنے کی کیا ضرورت۔

مشتعل ہونے سے پہلے شیر ایک بے ضرر حیوان ہے۔ مشتعل ہونے کے بعد شیر ایک مردم خور حیوان بن جاتا ہے۔ آپ شیر کو مشتعل نہ کیجئے، اور پھر آپ اس کے نقصان سے محفوظ رہیں گے۔

منفی بنیاد

جمال عبد الناصر (۱۹۷۰-۱۹۱۸) شاہ فاروق کے زمانہ میں مصر کی فوج میں ایک جونیر افسر تھے۔ ۱۹۴۸ میں مصر اور اسرائیل کے درمیان لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں جمال عبد الناصر نے اپنے دستہ کے ساتھ غیر معمولی بہادری دکھائی۔ تاہم اسرائیل جیت گیا اور مصر کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔

اس جنگ کے بعد جمال عبد الناصر کے دل میں سخت انتقامی جذبہ جاگ اٹھا۔ ایک طرف مصر کے شاہ فاروق کے خلاف، کیوں کہ وہ ان کی نظر میں غدار تھا، دوسری طرف اسرائیل کے خلاف، کیونکہ وہ انھیں ظالم دکھائی دے رہا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ میں دونوں کو مٹائے بغیر چین نہیں لوں گا۔

پہلے انھوں نے مصر کی فوج کے کچھ افسروں کو ساتھ لے کر ان کی ایک خفیہ تنظیم بنائی۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ کو جمال عبد الناصر نے اِن مصری افسروں کی مدد سے شاہ فاروق کے خلاف فوجی انقلاب کیا۔ شاہ فاروق جلاوطن ہوکر روم چلے گئے جہاں ۱۸ مارچ ۱۹۶۵ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

جمال عبد الناصر کے انتقامی جذبات کا دوسرا نشانہ اسرائیل تھا۔ انھوں نے مصر کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد روس سے ہتھیار حاصل کیے اور دو بار اسرائیل سے جنگ کی۔ ۱۹۵۶ میں اور ۱۹۶۷ء میں۔ مگر دونوں بار انھیں مکمل شکست ہوئی۔ اسرائیل نہ صرف جیتا بلکہ اس نے اپنے مقبوضہ رقبہ کو پانچ گنا بڑھا لیا۔

جمال عبد الناصر منفی اور انتقامی جذبہ کے تحت اٹھے تھے۔ چنانچہ یہ جذبہ ان کے اوپر اتنا زیادہ چھایا کہ ان کی ساری کارروائیاں اسی کے رنگ میں رنگ گئیں۔ انھوں نے ۱۹۶۲ میں یمن میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ انھوں نے مصر کی اخوانی جماعت کو کچلنے کی کوشش کی۔ انھوں نے خود اپنی فوج کے بہت سے افسروں کو ہلاک کر دیا۔ وہ اسی قسم کی منفی کارروائیوں میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ کو ان پر ہارٹ اٹیک ہوا اور اسی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

جو لوگ منفی سوچ اور انتقامی جذبات سے متاثر ہوکر اٹھیں وہ آخر تک اسی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کسی مثبت پروگرام یا کسی تعمیری عمل کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اور بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں اٹھنے والے تمام مسلم رہنماؤں کا معاملہ یہی ہے۔ وہ منفی فکر کے تحت اٹھے، اس لیے وہ کوئی مثبت کارنامہ انجام نہ دے سکے۔

چھوٹا واقعہ بڑا سبق

مولانا سید امیر علی (۱۹۲۱ - ۱۸۵۸) ملیح آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں وفات پائی۔ انھوں نے مڈل اسکول تک تعلیم حاصل کی تھی کہ ان کی تعلیم چھوٹ گئی۔ عزبت کی وجہ سے انھیں ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ بہرائچ کے ایک سب پوسٹ آفس میں ان کو پوسٹ ماسٹر کی جگہ مل گئی۔ ملازمت کی ضرورت کے تحت انھوں نے معمولی انگریزی سیکھ لی اور کام کرنے لگے۔

گھریلو تربیت کے تحت وہ نماز کے پابند تھے۔ ایک دن وہ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد گیے۔ اسی وقت سرکاری افسر ڈاک خانہ کے معائنہ کے لیے آگیا۔ پوسٹ ماسٹر کو غیر حاضر پاکر وہ بہت غصہ ہوا۔ سید امیر علی صاحب کو مسجد میں اطلاع پہونچی تو وہ وضو کر رہے تھے۔ انھوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اطمینان کے ساتھ نماز پڑھ کر واپس آئے۔ افسر مذکور نے پوچھ گچھ کی تو وہ چپ رہے۔ نہ کوئی جواب دیا اور نہ کسی قسم کی معذرت کی۔ خاموشی کے ساتھ ایک کاغذ لیا۔ اس پر اپنا استعفا لکھا اور افسر کو دے کر گھر چلے گیے۔

سید امیر علی صاحب اس وقت تک صرف اردو اور کچھ انگریزی جانتے تھے۔ وہ عربی اور فارسی سے ناواقف تھے۔ استعفار کے بعد انھیں ایک جھٹکا لگا۔ انھوں نے سوچا کہ جس دین کی خاطر میں نے ملازمت سے استعفار دیا ہے، اس کی بابت براہ راست میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ اس سلسلہ میں کوئی شخص سوال کرے تو میں اس کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ میں نماز ضرور پڑھتا ہوں مگر نماز کا مطلب کیا ہے، اس سے میں بے خبر ہوں۔ قرآن و حدیث سے مجھے کوئی واقفیت نہیں۔

اب ان کے اندر ایک نیا جذبہ جاگ اٹھا۔ انھوں نے عربی اور فارسی پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ عربی زبان میں انھوں نے اتنی مہارت پیدا کی کہ ماہر علمار میں شمار کیے جانے لگے۔ دار العلوم ندوۃ العلمار میں وہ شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرس رہے۔ منشی نول کشور (وفات ۱۸۹۵) کے مطبع سے وابستہ ہو کر بڑی بڑی عربی کتابوں کے اردو ترجمے کیے، مثلاً صحیح بخاری، فتاویٰ عالمگیری، وغیرہ (قومی آواز ۴ فروری ۱۹۹۰) آدمی کے اندر اگر زندگی ہو تو ایک معمولی واقعہ اس کے اندر حرکت پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ عالی شان کارنامے انجام دے سکے۔ اور جس آدمی کے اندر زندگی نہ ہو اس کے ساتھ بڑے بڑے واقعات پیش آئیں گے مگر وہ اس طرح پڑا رہے گا جیسے کہ اس نے نہ کچھ جانا اور نہ کوئی سبق لیا۔

غلطی میری نہیں

اڈولف ہٹلر (۱۹۴۵-۱۸۸۹) کی موت کے بعد سے اب تک اس کے بارہ میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد صرف انگریزی زبان میں تقریباً ۵۵ ہزار ہے۔ اس میں تازہ اضافہ برلن کا بنکر (The Berlin Bunker) ہے جو لندن سے چھپی ہے۔ ہٹلر کے آخری ۵ء۱۰ دن بنکر (فوجی تہ خانہ) میں گزرے تھے۔ مصنف نے اس زمانہ کے ہٹلر کے ساتھیوں سے معلومات حاصل کرکے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ ۱۶ جنوری ۱۹۴۵ کو جب ایک ہزار امریکی بمباروں نے برلن کو تہس نہس کر دیا تو ہٹلر اپنے عملہ کے ساتھ خاموشی سے بنکر کے اندر چلا گیا۔ اس زمانہ میں اس کا اتنا برا حال تھا کہ ۵۵ سال کا ہو کر وہ ۷۰ سال کا دکھائی دینے لگا۔ اس کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ روس کی بڑھتی ہوئی فوجیں پہنچ کر اس کو پکڑ لیں گی۔ ان حالات میں ایک ایک شخص اس کا ساتھ چھوڑتا گیا۔ یہاں تک آخر میں صرف اس کا کتا اس کے ساتھ رہ گیا۔

ہٹلر کی حکومت چونکہ شروع سے آخر تک تشدد پر قائم تھی اس لیے ہٹلر کو ہر وقت اپنی موت کا شبہ لگا رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۴۵-۱۹۳۹ کے درمیان ہٹلر کے اوپر ۲۵ بار قاتلانہ حملے ہوئے۔ مگر ہر بار وہ بچ جاتا تھا۔ اس کی وجہ اس کا زبردست حفاظتی عملہ نہ تھا۔ بلکہ ہٹلر کا یہ مزاج تھا کہ وہ اکثر بالکل آخر وقت میں اپنا پروگرام بدل دیتا تھا۔ پروفیسر ہاف من کا کہنا ہے کہ ہٹلر بعض اوقات اپنا پروگرام طے کرنے کے لیے سکہ اچھالتا اور اس کو دیکھ کر فیصلہ کرتا۔

تاہم اس کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ آخر وقت تک ہٹلر نے یہ نہ کہا کہ "میں نے غلطی کی"۔ وہ ہمیشہ اپنے جنرلوں اور یہودیوں اور کمیونسٹوں کو ساری باتوں کا الزام دیتا رہا۔ حتی کہ اپنے عوام کو بھی۔ مایوسی جب اپنی آخری حد پر پہونچ گئی تو ہٹلر نے سائنائڈ کیپسول کھا کر خودکشی کر لی (۶ جنوری ۱۹۸۰)

دنیا میں کوئی آدمی اپنی غلطی کو نہیں مانتا، حتی کہ ہٹلر جیسا آدمی بھی نہیں جس کو تمام دنیا غلط قرار دے چکی ہو۔ آدمی کو معلوم نہیں کہ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ وہ اپنی غلطی ماننے پر مجبور ہوگا۔ حتی کہ اگر وہ اپنی زبان سے نہ کہے کہ میں غلطی پر تھا تو خود اس کے اپنے اعضا اس کے خلاف گواہی دیں گے اور وہ اس پر قادر نہ ہوگا کہ ان کو روک سکے (۴۱/۲۱)

حد سے باہر

اخبار قومی آواز (۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰) میں ایک صاحب کا مضمون "بابری مسجد۔ رام جنم بھومی تنازعہ" کے بارہ
ں چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــــ "ضرورت ہے رام چرن داس اور امیر علی کی" اس مضمون میں
جودھیا کے مسئلہ کی سنگینی کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"بات ۱۸۵۷ کی ہے۔ (اس وقت بھی بابری مسجد اور رام جنم کے تنازعہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں
شیدگی پیدا کر دی تھی) فیض آباد ضلع گزیٹیر سے پتہ چلتا ہے کہ اجودھیا کے مقامی مسلم رہنما امیر علی اور (مقامی) ہندو
ہنما بابا رام چرن داس نے رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے تنازعہ کا حل تلاش کرنے کی غرض سے دونوں فریقوں کی طرف
سے معاہدہ کیا کہ جنم بھومی کی مخصوص متنازعہ آراضی ہندوؤں کو سونپ دی جائے۔ اس کے عوض بابا رام چرن داس
نے ہندوؤں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ پوری عمارت پر قابض ہونے کا مطالبہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گے تاکہ
سلمانوں کو مسجد نہ ہٹانا پڑے"

اس مضمون سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج رام چرن داس اور امیر علی جیسے لوگ موجود نہیں ہیں۔
ر ایسے افراد آج ہوتے تو مسئلہ فوراً حل ہو جاتا۔ مگر یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی رام چرن داس
ور امیر علی جیسے لوگ موجود ہیں اور سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن وہ موثر ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔
یسی حالت میں اصل سوچنے کی بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ کے رام چرن داس اور امیر علی مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب
ہو گئے تھے مگر آج کے رام چرن داس اور امیر علی مسئلہ کو حل کرنے میں سراسر ناکام ہو رہے ہیں، اس کا سبب کیا ہے۔

اس کا سبب بالکل سادہ ہے۔ ۱۸۵۷ میں یہ مسئلہ ایک مقامی مسئلہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اجودھیا کے
دو فرقوں کا مسئلہ تھا نہ کہ سارے ملک میں بسنے والی دو قوموں کا مسئلہ۔ اس وقت بابری مسجد کے نام پر کوئی
ل انڈیا یا انٹرنیشنل تنظیم نہیں بنی تھی جو اس کو بڑھا چڑھا کر تمام ہندوؤں اور تمام مسلمانوں کے لیے وقار
کا مسئلہ بنا دے۔

دو قوموں کے درمیان جب کوئی نازک مسئلہ پیدا ہو تو اس کو ہمیشہ مقامی دائرہ میں باقی رکھنا چاہیے۔ مسئلہ کا مقامی
دائرہ میں رہنا اس کا محدود دائرہ میں رہنا ہے۔ مگر مسئلہ جب قومی اور ملکی سطح پر پھیلا دیا جائے تو اس وقت وہ غیر محدود
دائرہ میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر ناممکن ہو جاتا ہے کہ کوئی ہندو یا کوئی مسلمان اس کو حل کر سکے۔

آسمانی انتظام

ابتدائی دور کی جنگوں میں صرف انسانی آنکھ دیکھنے کا کام کرتی تھی۔ اس کے بعد دوربین سے کام لیا جانے لگا۔ اب ٹکنالوجی کی ترقی نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ آسمان میں گھومتی ہوئی مشینوں (سٹلائٹ) کے ذریعہ دشمن کے ٹھکانوں کو معلوم کیا جائے اور نہایت صحت کے ساتھ ان کو دور سے نشانہ بنایا جا سکے۔ خلیج کی جنگ اسی قسم کی ایک جنگ ہے۔ اس میں ایسی پیچیدہ ٹکنالوجی استعمال کی گئی جو اس سے پہلے کبھی کسی جنگ میں استعمال نہیں کی گئی تھی۔ اس اعتبار سے اس جنگ میں بہت سے نہایت اہم سبق ملتے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۳۱ جنوری ۱۹۹۱) میں خلیج کی جنگ سے متعلق اسی قسم کی ایک نصیحت آموز رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان اخبار نے ان لفظوں میں قائم کیا ہے کہ اتحادی فوجوں کی آنکھ آسمان میں :

Eyes of the Allies in the sky

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جنوری ۱۹۹۱ میں عراق نے کئی درجن اسکڈ میزائل (Scuds) اسرائیل اور سعودی عرب پر پھینکے۔ مگر ان کی زیادہ تعداد درمیان ہی میں بیکار کر دی گئی۔ وہ نشانہ پر نہ پہنچ سکی۔ اس سے پہلے جو جنگیں ہوتی تھیں ان میں توپ کے گولے یا بم جب دشمن کی طرف پھینکے جاتے تھے تو ان کو راستہ کے درمیان ناکارہ کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ پھر موجودہ جنگ میں کیوں کر ایسا ہوا

SATELLITE RECONNAISSANCE
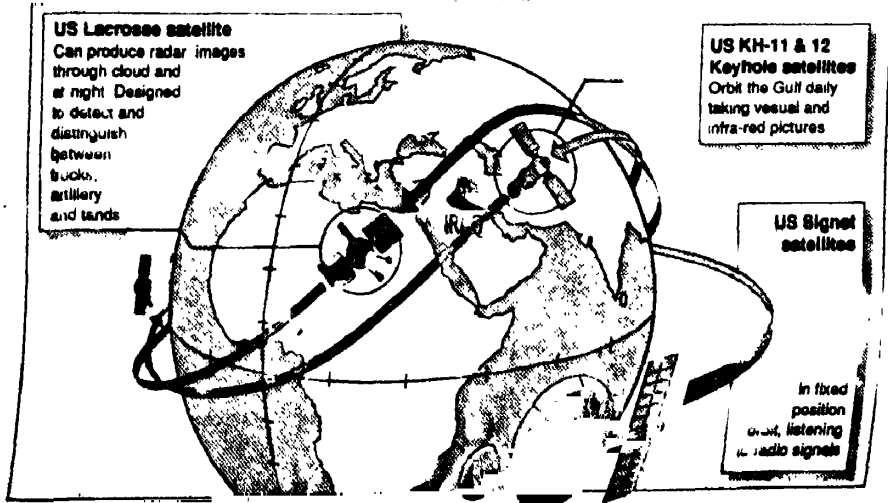
کہ ایک فریق کے پھینکے ہوئے میزائل کو دوسرے فریق نے راستہ ہی میں ناکارہ کر دیا۔ اس کا جواب خاص طور پر دو امریکی سیاروں میں ہے جو ایک زمینی اسٹیشن سے کنٹرول کئے جارہے تھے ۔ یہ زمینی اسٹیشن وسط آسٹریلیا میں واقع ہے۔

اس تدبیر کو ڈیفنس سپورٹ پروگرام کہا جاتا ہے۔ امریکہ کے یہ جاسوسی سیارے ڈیڑھ سو میل اوپر زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ وہ مسلسل عراق کے بارے میں معلومات دیتے رہتے ہیں ، خواہ موسمی حالات جو بھی ہوں۔ وہ نہ صرف اس وقت عراق کی تصویر لیتے ہیں جب کہ وہ براہ راست عراقی فضا کے اوپر ہوں بلکہ وہ مخصوص نظام کے تحت اس وقت بھی عراق کی تصویر حاصل کر لیتے ہیں جب کہ وہ کنارے کی طرف اڑ رہے ہوں۔

اس سیارے میں تین میٹر لمبی انفرارڈ دور بین لگی ہوئی ہے۔ جب اسکڈ میزائل چھوڑا جاتا ہے تو فضا میں اس کی سخت گرمی کے ذریعہ یہ سیارہ فوراً ہی اس کو معلوم کر لیتا ہے۔ اور عین اسی لمحہ زمین پر لگے ہوئے پیٹریٹ میزائل کو اس کی خود دے دیتا ہے۔ اس کے بعد کمپیوٹر فوراً پیٹریٹ میزائل کو نشانہ کی طرف داغ دیتا ہے۔ میزائل فضا میں پہنچ کر اسکڈ سے ٹکرا کر اس کو عین راستہ میں برباد کر دیتا ہے۔ یہ سارا کام صرف ایک منٹ کے اندر انجام پاتا ہے۔ سٹیلائٹ کے ذریعہ جاسوسی کا خاص فائدہ یہ ہے کہ وہ دشمن کی مار کی حد سے پوری طرح محفوظ رہتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دفاعی سپورٹ کا یہ پورا سیاراتی نظام ۲۴ گھنٹے عراق کا جائزہ لیتا ہے اور اس کی تصویریں بھیجتا رہتا ہے ۔ وہ ہر موسمی حالت میں یکساں طور پر کام کرتا ہے :

These Defence Support Programme satellites provide round-the-clock coverage of Iraq in all weather conditions.

یہ واقعہ تمثیل کے روپ میں یاد دلاتا ہے کہ اسی طرح ایک اور "آسمانی مشاہدہ" ہے جو زیادہ بڑے پیمانہ پر ساری دنیا کی نگرانی کر رہا ہے۔ وہ دونوں فریقوں کو یکساں طور پر دیکھ رہا ہے۔ وہ کسی ایک ملک کو نہیں بلکہ تمام ملکوں اور تمام انسانوں کا ہر لمحہ معائنہ کر رہا ہے۔

یہ وہ برتر مشاہدہ ہے جو خدائی نظام کے تحت قائم ہے۔ خدائی مشاہدہ کا یہ نظام اس لئے قائم کیا گیا ہے تاکہ وہ ظالم کے ظلم کا توڑ کرے ، تاکہ وہ مجرم کے خلاف بروقت مداخلت کرکے اس کے مفسدانہ

منصوبہ کو ناکام بنائے اور جو شخص حق پر ہے اس کی مدد کرکے اسے کامیاب کر دے۔

جب بھی کوئی شخص کسی کے خلاف برا اقدام کرے تو اس کو جاننا چاہئے کہ اس کے اقدام کا ناکام ہو جانا یقینی ہے۔ اس کے برے اقدام کو خدا کے فرشتے درمیان ہی میں مداخلت کرکے بے اثر کر دیں گے۔ خدا کی دنیا میں کوئی فاسد منصوبہ کبھی اپنی تکمیل تک پہنچنے والا نہیں۔

موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ آزمائش کی مصلحت کی بنا پر یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ ہر شخص کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ اس آزادی کی بنا پر کبھی ایک آدمی دوسرے آدمی کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

مگر یہ آزادی لامحدود نہیں ہے۔ آزادی دینے کے ساتھ خدا لوگوں کی نگرانی بھی کر رہا ہے۔ وہ کسی کو یہ موقع نہیں دیتا کہ وہ اپنی آزادی کو بے قید اور لامحدود انداز میں استعمال کرے۔ ایک حد کے بعد خدا آدمی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ ایک حد کے بعد وہ آدمی کو اس سے روک دیتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کو دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کرے۔

خدا کا وعدہ ہے کہ وہ مشکل کے وقت ضرور اپنے بندہ کی مدد کرتا ہے۔ کبھی مشکل پیش آنے کے بعد فوراً اور کبھی مشکل پیش آنے کے کچھ دیر بعد۔ خدا کی یہ مدد کبھی ایک صورت میں آتی ہے اور کبھی دوسری صورت میں۔ اس کی کوئی ایک مقرر اور متعین صورت نہیں۔

بابری مسجد کا مسئلہ

بابری مسجد ۔ رام جنم بھومی کا مسئلہ یقینی طور پر حل ہو سکتا ہے ۔ جس چیز نے اس کو اب تک لاینحل بنا رکھا ہے وہ خود مسئلہ نہیں ہے بلکہ طریق کار ہے ۔ دنیا میں اس سے بھی زیادہ بڑے بڑے مسئلے حل کئے گئے ہیں اور آج بھی حل ہو رہے ہیں ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ مسئلہ حل نہ ہو سکے ۔ لیکن جب طریق کار ہی غلط اختیار کیا جائے تو کوئی بھی مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا ۔ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ۔

اس معاملہ میں جو لوگ اب تک براہ راست شریک رہے ہیں، ان کے پیش نظر بد قسمتی سے لیڈری زیادہ رہی ہے اور مسئلہ کا حل کم ۔ اس لئے وہ اس معاملہ میں سنجیدہ طریق کار اختیار نہ کر سکے ۔

دونوں فریق کی طرف سے اب تک جس طریقے کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ صرف ایک ہے ۔ یعنی دعویٰ اور جواب دعویٰ ۔ پریس یا پلیٹ فارم کے ذریعہ اب تک اس معاملہ میں دونوں فریق کے ذریعہ جو کیا گیا ہے وہ زیادہ تر یہی ہے ۔ مگر اس طرح کے نازک مسئلہ کے حل کے لئے یہ طریقہ بنیادی طور پر غیر مفید ہے ۔ اس طرح کے نزاعات میں اگر صرف دعویٰ اور مطالبہ کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ہمیشہ ایسا ہوگا کہ ہر فریق دوسرے فریق کے جواب میں اپنے موافق کچھ الفاظ بول دے گا، اور پھر مسئلہ وہیں کا وہیں پڑا رہے گا ۔

اس معاملہ میں اصلی اور پہلا کام یہ ہے کہ دونوں فریق کسی تیسرے فریق (تھرڈ پارٹی) کو تلاش کریں جس کا فیصلہ انھیں منظور ہو سکے ۔ وہ پیشگی طور پر راضی ہو جائیں کہ یہ تیسرا فریق جو فیصلہ دے گا اسے دونوں فریق بلا بحث مان لیں گے ۔

اس طرح کے کیس میں عدالت یہ تھرڈ پارٹی نہیں بن سکتی ۔ الّا یہ کہ عدالتی فیصلہ سامنے آنے سے پہلے دونوں فریق اس کا باضابطہ اقرار نامہ دے چکے ہوں کہ عدالت جو بھی فیصلہ کرے گی اس کو وہ لازمی طور پر مان لیں گے ۔ بصورت دیگر ایسا ہوگا کہ عدالت کا فیصلہ جس فریق کے موافق ہوگا وہ اس کو مانے گا ، اور جس فریق کے خلاف ہوگا وہ اس کو ماننے سے انکار کر دے گا ۔ اس طرح مسئلہ دوبارہ وہیں آجائے گا جہاں وہ پہلے تھا ۔

عدالت کا فیصلہ اس وقت کام کرتا ہے جب کہ معاملہ ایک فرد یا چند افراد کا ہو ۔ ایسی

صورت میں فرد یا افراد اگر عدالتی فیصلہ کو نہ مانیں تو پولیس اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ انھیں ماننے پر مجبور کیا جاسکے۔ مگر بابری مسجد ـ رام جنم بھومی کا مسئلہ دو افراد کا مسئلہ نہیں بلکہ دو قوموں کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اور جس مسئلہ میں دو پوری قوم شامل ہو جائے۔ اس میں عدالت کا فیصلہ قوم کی مرضی ہی سے نافذ کیا جاسکتا ہے۔ قوم کی مرضی کے بغیر ایسے فیصلہ کا نفاذ ممکن نہیں۔

یہی خاص فرق ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ شاہ بانو کیس کے معاملہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کو نہ مانیں، اور ان کا نہ ماننا سپریم کورٹ کے فیصلہ کو بے اثر بنا دے۔ اگر اس کی حیثیت صرف شخصی معاملہ کی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ شاہ بانو کے شوہر محمد احمد کے انکار سے ایک عدالتی فیصلہ کالعدم ہو کر رہ جائے۔

میرے نزدیک اس مسئلہ کا واحد قابل عمل حل یہ ہے کہ دونوں فریق ثالثی (arbitration) کے اصول پر راضی ہو جائیں۔ دونوں فریق پیشگی طور پر تحریری اقرار نامہ دیں کہ یہ ثالث (تھرڈ پارٹی) جو بھی فیصلہ دے گا اس کو وہ بلا بحث مان لیں گے۔ فیصلہ کے بعد وہ اس کے خلاف مزید کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ تقریباً چار سال پہلے یہ مسئلہ اس حل کے کنارے پہنچ چکا تھا مگر بعض مسلم لیڈروں کی ناقابل فہم نادانی کی بنا پر وہ عملاً واقعہ نہ بن سکا۔

ایک تاریخی میٹنگ

یہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی بات ہے۔ نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں اسی خاص مسئلہ پر ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔ اس میں ہندو سائڈ اور مسلم سائڈ دونوں طرف کے ذمہ دار لوگ جمع ہوئے۔ ہندو سائڈ سے جو لوگ شریک ہوئے، ان میں دوسرے ذمہ داروں کے علاوہ مہنت اویدناتھ بھی تھے جو رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمتی کے صدر ہیں اور وشو ہندو پریشد کے ٹکٹ پر ایم پی بھی ہیں۔ مسلم سائڈ سے جو لوگ شریک ہوئے، ان میں سید شہاب الدین صاحب اور دوسرے ذمہ دار حضرات موجود تھے۔

اس میٹنگ میں میں بھی خصوصی دعوت پر شریک تھا۔ پہلے حسب عادت دونوں فریق اپنا اپنا دعویٰ پیش کرتے رہے اور ایک دوسرے کی بات کا جواب دیتے رہے۔ دعویٰ اور اس کی تردید کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔

آخر میں میں نے کہا کہ یہ طریقہ مسئلہ کو حل کرنے کا نہیں ہے۔ مسئلہ کے حل کی واحد تدبیر یہ ہے کہ

دونوں فریق ایک تھرڈ پارٹی کو ثالث بنانے پر راضی ہو جائیں اور پیشگی اس بات کا تحریری اقرار کریں کہ یہ تھرڈ پارٹی جو فیصلہ دے گی اس کو وہ منظور کریں گے۔ میں نے کہا کہ اس تھرڈ پارٹی کے لئے سب سے بہتر باڈی مورخین کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے تجویز پیش کی کہ ہندستان کے مسلّم مورخین جنھوں نے انڈین ہسٹری کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو ان کا ایک منتخب بورڈ بنا دیا جائے اور اس کو پورا اختیار دیا جائے کہ وہ تاریخی حقائق کی روشنی میں اپنا قطعی فیصلہ دے۔ وہ جو فیصلہ دے اس کو دونوں فریق بلا بحث مان لیں۔

میری اس تجویز کو ہندو سائڈ نے کسی بحث کے بغیر پوری طرح مان لیا۔ حتی کہ وہ میری تجویز کے اس جزء پر بھی راضی ہو گئے کہ اس بورڈ کے تقرر کو کسی بھی حال میں نظیر نہیں بنایا جائے گا، اور آئندہ کسی اور مسجد یا مساجد کے لئے اس قسم کے باب ہرگز نہیں کھولے جائیں گے۔ مہنت اوید ناتھ نے اس کو اتنا زیادہ پسند کیا کہ انھوں نے کھڑے ہو کر میرے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس تجویز کو فائنل کرنے کے لئے جلد ہی دوسری میٹنگ بلائی جائے۔

مگر عین اس وقت ایک "حادثہ" پیش آیا جس نے سارے معاملہ کو بگاڑ دیا۔ وہ یہ کہ جناب سید شہاب الدین صاحب ناقابل فہم طور پر اس کے مخالف ہو گئے۔ وہ اس مخالفت میں اتنا شدید ہوئے کہ تقریباً چیخنے لگے۔ حتی کہ ان کی چیخ پکار میں میٹنگ ختم ہو گئی۔

اس میٹنگ میں جماعت اسلامی کے نمائندہ کے طور پر افضل حسین صاحب مرحوم بھی موجود تھے۔ مگر وہ مکمل طور پر خاموش رہے۔ اگر مسلم نمائندوں نے اس موقع پر ناقابل فہم حد تک نادان رول نہ ادا کیا ہوتا تو یہ مسئلہ ۱۹۸۷ میں ہی ختم ہو جاتا اور ملک اور خاص طور پر مسلمان ان اندوہناک نقصانات سے بچ جاتے جو بعد کو اسی کے نتیجہ میں پیش آئے اور موجودہ سطروں کے لکھنے تک پیش آرہے ہیں۔

آج بھی اگر اس مسئلہ کا کوئی حل ہے تو یہی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیڈر صاحبان پچھلے تلخ تجربات کے بعد اب اس تجویز کی اہمیت کو محسوس کریں گے اور ذاتی وقار کا خیال کئے بغیر اس کی تائید کریں گے۔ نیز ہندو سائڈ جو ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو اس تجویز کو منظور کر چکی تھی، وہ دوبارہ اس کو مان کر مسئلہ کے حل کا قابل عمل راستہ نکالے گی۔

مسجد اسلام میں

اب میں مسجد کے بارہ میں مسلم نقطۂ نظر کو بتانا چاہتا ہوں۔ یہ بات صحیح ہے کہ مسجد اسلامی شریعت کے مطابق ایک مقدس جگہ ہے۔ جب ایک مقام پر مسجد بنادی جائے تو وہ جگہ ہمیشہ کے لئے مسجد ہو جاتی ہے اور مسلم عقیدہ کے مطابق اس کو کسی بھی طریقہ پر ختم یا تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

مگر جہاں مسجد کے بارے میں یہ شدید مسلم عقیدہ ہے۔ اسی کے ساتھ خود مسلم عقیدہ کے مطابق یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر مسجد غصب کی جگہ پر یا ناجائز جگہ پر بنائی جائے تو وہ مسجد نہیں ہوگی۔ وہاں نماز پڑھنا ناجائز ہوگا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں پر یہ فرض ہوگا کہ وہ اس جگہ کو اس کے اصل مالک کی طرف واپس لوٹا دیں۔

اجودھیا کی مذکورہ عمارت کے حل کے لئے اگر مذکورہ تدبیر اختیار کی جائے تو وہ کسی بھی اعتبار سے مسلم عقیدہ سے نہیں ٹکراتی۔ اگر مورخین کا بورڈ یہ فیصلہ کرے کہ موجودہ عمارت جائز طور پر مسجد کی حیثیت سے بنائی گئی تھی تو اس کی موجودہ حیثیت علیٰ حالہ برقرار رہے گی۔ اس کے برعکس اگر مورخین کا بورڈ تاریخی حقائق کے حوالہ سے یہ فیصلہ دیتا ہے کہ موجودہ عمارت کی حیثیت جائز طور پر تعمیر کردہ مسجد کی نہیں ہے تو ایسی حالت میں اس کو اصل مالکوں کی طرف لوٹا دینا ہی شریعت کا تقاضا ہوگا۔

بالفرض اگر مورخین کے بورڈ کا فیصلہ مسلمانوں کے موجودہ دعوی کے مطابق نہ ہو تب بھی مسلمانوں کو اسے قبول کر لینا چاہئے کیوں کہ مورخین کے فیصلہ کے بعد وہ ذاتی طور پر بری الذمہ ہو جاتے ہیں اس کے بعد خالص شرعی اعتبار سے ان کی کوئی پکڑ نہیں ہے۔ اس کے بعد خدا کے یہاں اگر کسی کی ذمہ داری ہے تو وہ مورخین کا بورڈ ہے نہ کہ مسلمان۔

ثالثی کا مسئلہ

یہاں میں ثالثی کے اسلامی اصول کے بارہ میں مختصراً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن میں ثالث (arbiter) کا اصول بتایا گیا ہے۔ بیوی اور شوہر میں باہمی نزاع ہو تو اس کو حل کرنے کے لئے یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ دو افراد کا ایک ثالثی بورڈ مقرر کر کے اس کو حل کیا جائے (۴ : ۳۵)۔ قرآن کے انگریزی مترجم عبداللہ یوسف علی نے اس اصول کو بجا طور پر خاندانی جھگڑے کو حل کرنے کا بہترین طریقہ کہا ہے:

An excellent plan for settling family disputes.

قرآن میں یہ حکم ابتداءً خاندانی نزاع کو حل کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کے بعد یہ مسلم قانون کا ایک مستقل جزء بن گیا اور اسلامی تاریخ میں بار بار نزاعی معاملات اس اصول کے ذریعہ حل کئے گئے۔ یہاں میں اس نوعیت کی ایک مثال مختصراً درج کرنا چاہتا ہوں۔

بنو امیہ کے زمانہ میں دمشق میں جامع مسجد بنائی گئی جو ۷۱۵ء میں مکمل ہوئی۔ وہ آج بھی وہاں موجود ہے۔ اس مسجد کے بارہ میں شام کے عیسائیوں کو یہ شکایت تھی کہ اس میں ایک قدیم چرچ کا حصہ بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ عمر بن عبد العزیز ۷۱۷ء میں خلیفہ مقرر ہوئے۔ ۷۲۰ء میں خلیفہ کی حیثیت سے ان کا انتقال ہوا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز جو اسلامی تاریخ میں عمر ثانی کہے جاتے ہیں، ان کے پاس شامی عیسائیوں کا ایک وفد آیا۔ اس نے شکایت کی کہ پچھلے خلیفہ نے ہمارے چرچ کو مسجد میں شامل کر دیا تھا۔ اب آپ انصاف کریں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے محمد بن سُوَید الفِہری کو ثالث مقرر کیا۔ انھوں نے تحقیق کر کے بتایا کہ عیسائیوں کی شکایت درست ہے۔ اس کے بعد عمر بن عبد العزیز نے حکم دیا کہ مسجد میں گرجا کا جو حصہ ہے وہ پوری زمین عیسائیوں کو دے دی جائے۔

تاہم اس حکم پر عملدر آمد کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ عیسائی اصلاً اسلامی انصاف کو آزمانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کو آزمایا اور اس کو پورا پایا۔ اس کے بعد انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہم اپنی خوشی سے یہ حصہ مسلمانوں کے عبادت خانہ کے لئے دیتے ہیں۔ (خلیفۃ الزاہد عمر بن عبد العزیز)

اوپر جو بات کہی گئی، وہ دینی اور تاریخی دونوں اعتبار سے انتہائی واضح ہے۔ مسلمانوں کے نام نہاد سیاسی لیڈروں کی بابت میں کوئی پیشگی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ وہ کسی اصول کے پابند نہ ہونے کی بنا پر قابل پیشین گوئی کردار (predictable character) کے حامل نہیں۔ تاہم میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلم علماء اور مسلم عوام دونوں میری اس تجویز سے اتفاق کریں گے۔ یہ تجویز عین شرعی حدود کے مطابق ہے۔ اس لئے مسلم علماء کے لئے اس کو قبول کرنا مشکل نہیں ہو سکتا۔ اور جہاں تک مسلم عوام کا تعلق ہے، وہ ہر چیز سے پہلے پرامن زندگی چاہتے ہیں، اور یہ تجویز بلاشبہہ ان کے لئے اس ملک میں پرامن زندگی کی یقینی ضمانت ہے۔

ایک انتباہ

میرا یہ مضمون اس سے پہلے انگریزی زبان میں نئی دہلی کے روزنامہ ہندستان ٹائمس کے شمارہ ۶ جنوری ۱۹۹۱ میں چھپا تھا۔ انگریزی اخبار میں اس کی اشاعت کے بعد ایک مسلم دانشور کا ٹیلیفون ملا۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے اپنے مضمون میں جو تجویز پیش کی ہے، وہ بہت پسندیدہ اور معقول ہے۔ مگر آپ نے اس کو پیش کرنے میں تاخیر کر دی۔ یہ تجویز آپ کو بہت پہلے پیش کرنا چاہئے تھا۔

مذکورہ مسلم دانشور کے اس تبصرہ پر مجھے سخت تعجب ہوا۔ کیوں کہ عین اسی مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ ثالثی کی یہ تجویز میں نے ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو نئی دہلی کے ایک باضابطہ اجتماع میں پیش کی تھی۔ اس وقت میں نے اس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کے تمام ضروری اجزاء کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اس میٹنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے اعلیٰ ذمہ دار اور نمائندے موجود تھے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود مذکورہ مسلم دانشور نے ایسی بات کیوں کہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیڈر اور ہمارے دانشور ایک عرصہ سے "خارجی عذر" کی اصطلاح میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ ہر ٹھوس بات کے مقابلہ میں ایک خارجی عذر کا حوالہ دے کر اسے رد کر دیتے ہیں۔ یہ مزاج بلاشبہہ موجودہ زمانہ میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس مزاج کو ختم کرنا انتہائی ضروری ہے ورنہ ہم نہ کسی منصوبہ پر عمل کر سکیں گے اور نہ امکانات کو استعمال کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ اس مزاج کی موجودگی میں ہماری بربادی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

مسٹر گولب بیف نے کہا کہ اب میں آپ کو اپنے گھر لے چلتا ہوں تاکہ آپ دیکھیں کہ ایک روسی کا گھر کیسا ہوتا ہے اور وہ اپنے گھر کے اندر کس طرح رہتا ہے۔ اس کے بعد میں ان کے فلیٹ پر گیا۔ یہ کافی بڑا اور سجا ہوا فلیٹ تھا۔ انھوں نے اپنے باورچی خانہ میں خود بنا کر چائے پلائی کیوں کہ اس وقت وہ گھر میں اکیلے تھے۔

چائے خوش رنگ تھی۔ میں نے اس میں دودھ نہیں ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ آپ چائے میں دودھ نہیں ڈال رہے ہیں تو کم از کم ایک چمچہ ہمارا دودھ چکھئے تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ ہمارے یہاں کا دودھ کیسا ہوتا ہے۔ کھانے کی میز پر کاغذی پیکنگ میں دودھ رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے انھوں نے ایک چمچہ دودھ نکال کر مجھ کو دیا۔ میں نے کھایا تو دودھ بالکل خالص اور لذیذ معلوم ہوا۔ یہی حال مکھن کا تھا۔

میں نے سوچا کہ ہم ہندستان میں کسی غیر ملکی سے یہی بات نہیں کہہ سکتے۔ ایک شخص جو خود گائے اور بھینس پالے ہوئے ہو وہ تو کہہ سکتا ہے۔ مگر اس کے کہنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہاں بازار سے یا ڈیری سے ایک عام شخص کو کیسا دودھ اور کیسا مکھن ملتا ہے۔ ہندستان میں ہم نے سوشلزم اور سرمایہ داری دونوں کو جمع کیا۔ مگر یہاں دونوں کی برائیاں تو جمع ہوئیں مگر دونوں کی خوبیاں جمع نہ ہو سکیں۔

ماسکو سے روسی زبان میں ایک غیر سرکاری ویکلی اخبار نکلتا ہے۔ آرگومنتے ای فاکتے (Arguments and Facts) یہ صرف سیاسی اخبار نہیں بلکہ وہ ہر قسم کے علمی اور سماجی موضوعات کو کور کرتا ہے۔ اس کی موجودہ اشاعت ۳۳ ملین سے زیادہ ہے۔ وہ سارے ملک میں پڑھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اودیف (Gennady P. Avdeyev) نے یہ بات مجھے بتائی تو مجھے بڑا رشک آیا۔ ہندستان میں ہم فخر کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری آبادی ۲۰ کروڑ ہے، مگر ہندستان میں مسلمانوں کا کوئی ایسا اخبار نہیں جو بڑی تعداد میں چھپتا ہو اور سارے ملک میں تمام مسلمانوں تک پہنچے۔ مسلمان فخر کے میدان میں سب سے آگے ہیں اور عمل کے میدان میں سب سے پیچھے۔

سوویت یونین میں بہت سی زبانیں ہیں۔ اس کا مسئلہ انھوں نے قابل تقلید انداز میں حل کیا ہے۔ سوویت یونین پندرہ ریپبلک پر مشتمل ہے۔ اس میں سے ایک روسی ریپبلک ہے۔ روسی ریپبلک کی فرسٹ زبان روسی زبان ہے جو مرکزی حکومت کی سرکاری زبان ہے۔ بقیہ چودہ ریپبلک میں

ان کی مقامی زبان کو فرسٹ زبان کی حیثیت حاصل ہے اور روسی زبان سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے۔

ایک روسی تعلیم یافتہ شخص سے میں نے سوویت یونین میں مذہب کا حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ اشتراکی انقلاب کے بعد مذہب یہاں بطور "عقیدہ" ختم ہوگیا تھا۔ مگر "رسم" کی سطح پر وہ ہمیشہ باقی رہا۔ مثلاً شادی کی رسم، موت کی رسم۔ ان چیزوں میں مذہب پہلے بھی سوویت سوسائٹی میں باقی تھا۔ اب گورباچیف کے زمانہ میں مذہب کو نئی آزادی ملی تو وہ عقیدہ اور عبادت کے اعتبار سے بھی زندہ ہو رہا ہے۔

اس سے مذہبی رسوم کی نئی طاقت کا اندازہ ہوا۔ مذہبی رسوم مذہب کے معاملہ میں راکھ میں چنگاری کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ چنگاری راکھ کے ڈھیر میں دبی رہتی ہے۔ اور جب موقع ملتا ہے تو وہ بھڑک کر شعلہ بن جاتی ہے۔

ماسکو میں قیام کے دوران میں نے ہزاروں سوویت باشندوں کو دیکھا۔ وہ مجھے خوش نظر آئے۔ میرے ہوٹل میں روزانہ بہت بڑی تعداد میں مختلف علاقوں کے طلبہ بسوں سے آتے تھے۔ یہ لوگ تعلیمی ٹور کے تحت یہاں بھیجے جاتے ہیں۔ وہ لوگ اکثر ہنستے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہوٹل کے ملازمین کا حال بھی یہی تھا۔ میں نے ایک انگریزی داں روسی سے پوچھا۔ اس نے بتایا یہ ایک نیا ظاہرہ ہے۔ یہ لوگ دراصل "پریسترویکا" کی وجہ سے اتنا خوش ہیں کیوں اب وہ اپنے کو آزاد محسوس کرتے ہیں۔

سوویت یونین میں دنیا کے ۱۱۸ ملکوں کے ساتھ اچھے تعلقات کے لئے فرینڈشپ سوسائٹیاں قائم ہیں۔ مثلاً سوویت۔ سری لنکا فرینڈشپ سوسائٹی۔ اس کے سکریٹری مسٹر گالکن (Alexey V Galkin) ہیں۔ انھوں نے چار سال لنکا میں رہ کر سنہالی زبان سیکھی اور اس میں مہارت پیدا کی۔ اسی طرح سوویت انڈین فرینڈشپ سوسائٹی۔ اس کے جنرل سکریٹری مسٹر گولب یف (Isaac Golubyev) ہیں۔ انھوں نے ایم اے تک اردو پڑھی۔ اس کے بعد انھوں نے تین سال پاکستان میں گزارے۔ وہ روانی کے ساتھ اردو بولتے ہیں۔ ان دونوں سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔ اسی طرح دوسرے تمام ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لئے یہاں باضابطہ سوسائٹیاں بنی ہوئی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سوویت یونین ایک نظریاتی ریاست ہے۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اسلام ایک کامل اور عالمی نظریہ ہے۔ مگر کسی بھی مسلم ملک میں دوسرے ملکوں سے تعلقات کے لئے اس قسم کی سوسائٹیاں قائم نہیں۔ حتیٰ کہ پاکستان میں بھی نہیں جو نصف صدی سے یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ ایک نظریاتی ملک اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مسلم دانشوروں کا نظریاتی دعویٰ محض اظہار فخر کے لئے ہے، وہ سنجیدہ عمل کے لئے نہیں۔

یکم اگست کو ماسکو کی مسجد دیکھی۔ یہاں کے موذن کا نام رئیس بلال (۲۳ سال) ہے اور امام کا نام ادریس بن اسماعیل تھا۔ امام اور موذن دونوں کے سر پر گول ٹوپی تھی۔ مگر وہ کوٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھے اور ٹائی لگائے ہوئے تھے۔ نماز کے وقت دونوں نے ایک لمبی عبا اپنے اوپر ڈال لی۔ ماسکو میں ہی ایک مسجد ہے۔ مسجد وسط ماسکو میں ہے۔ بہت اچھی بنی ہوئی ہے۔ چوڑی شاہراہ کے عین کنارہ ہے۔ اس کے ساتھ ملا ہوا پارک اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔ مسجد چاروں طرف سے کھلی ہوئی تھی۔ مسجد کے اندر ٹیلیفون وغیرہ کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ وسیع دفتر میں میز اور کرسی کی نشست کا انتظام تھا۔ ماسکو میں ایک اور مسجد ہے جو اس وقت بند ہے۔ یہاں کے مسلمان حکومت سے اس کو کھولنے کی بات چیت کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وہ بھی جلد کھل جائے گی۔

ماسکو میں مسلمانوں کی تعداد ۲۰۰,۰۰۰ ہے۔ جمعہ کے دن ایک ہزار سے زیادہ آدمی اس مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ موذن صاحب نے قرآن کا ایک نسخہ دکھایا۔ یہ متن کے بغیر روسی زبان میں قرآن کا کامل ترجمہ تھا۔ اس کے مترجم کا نام کراچکووسکی تھا۔ یہ ایک غیر مسلم روسی ہے۔ مگر وہ عربی زبان کا اچھا عالم تھا۔ اس نے قرآن کا لفظی ترجمہ کیا ہے جس کو حکومت نے شائع کیا ہے۔

امام صاحب کو میں نے "الاسلام یتحدیٰ" بطور ہدیہ پیش کیا۔ وہ اچھی عربی جانتے تھے۔ ان سے گفتگو عربی زبان میں ہوئی۔ وہ کتاب پاکر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس کا ترجمہ روسی زبان اور تاتاری زبان میں کرائیں گے۔ سوویت یونین کے مسلمانوں کی بڑی تعداد تاتاری زبان بولتی ہے۔ یہاں کی مسجد میں میں نے ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی۔

آج یہاں کوئی خاص دن نہیں تھا۔ مگر لوگ مسلسل امام صاحب کے "دفتر" میں آرہے تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بھی بار بار بج رہی تھی۔ سب لوگ بہت "نشیط" دکھائی دے رہے تھے۔

مسجد میں داخل ہوا تو دروازہ کے بائیں طرف دیوار سے ملی ہوئی لمبی الماری تھی۔ اس میں جوتا رکھنے کے لئے بہت سے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ یہ خانے اس طرح سلیقہ سے بنائے گئے تھے کہ وہ مسجد کے دوسرے خوب صورت حصوں کے ساتھ بے جوڑ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت تقریباً ساٹھ نمازی تھے۔ کسی نے اپنے جوتے کو اتارنے کی جگہ چھوڑ دیا، کسی نے خانہ میں رکھ دیا۔ تمام نمازیوں میں سے کوئی بھی شخص نہ تھا جو جوتے کو اتار کر ہاتھ میں لے اور اس کو سجدہ گاہ کے سامنے رکھ کر نماز ادا کرے۔

نماز سے فارغ ہو کر نکلا تو جوتا اتارنے کی جگہ پر وہ منظر دکھائی نہیں دیا جو دہلی اور دوسرے مقامات کی مسجدوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ ایک یا ایک سے زیادہ آدمی حیران وپریشان کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ آپ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تو وہ بتائیں گے کہ "یہاں جوتا اتارا تھا، مگر وہ کہیں نظر نہیں آرہا ہے"۔ ہندستان اور پاکستان والوں کو دعویٰ ہے کہ ان کے یہاں سب سے زیادہ اسلام پایا جاتا ہے۔ مگر غالباً ہندستان اور پاکستان ہی وہ ملک ہے جہاں کی مسجدوں میں نمازیوں کے جوتے اٹھا لئے جاتے ہیں۔

وضوخانہ مسجد کے وسیع احاطہ میں باہر کی طرف تھا۔ اس کو "ماڈرن" وضوخانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں خاص انداز کے مقام وضو کے علاوہ صابن، تولیہ، واش بیسن اور کموڈ وغیرہ کا انتظام تھا۔ میرے قریب ایک صاحب بنچ پر بیٹھے ہوئے وضو کر رہے تھے۔ وہ کوٹ پتلون اور ٹائی میں تھے۔ مگر وہ عربی یا انگریزی نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے نہایت پرمسرت لہجہ میں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "حج ... جدہ ... مکہ" پھر چار انگلیوں سے اشارہ کیا۔ اس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ میں نے اور میرے خاندان کے چار آدمیوں نے حج کیا ہے۔

آج یہاں دو جنازہ بھی تھا۔ نماز ظہر سے پہلے جنازہ کی نماز پڑھی گئی۔ دونوں نمازوں سے پہلے اور بعد کو امام صاحب نے ذکر ودعا کے کلمات کہے۔ ظہر کی نماز میں کافی آدمی تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آج جنازہ کی وجہ سے بہت سے مرد اور عورتیں یہاں آئی ہوئی تھیں۔ یہاں جو عورتیں نظر آئیں وہ سب اسکرٹ پہنے ہوئے تھیں۔ یہاں مسلم اور غیر مسلم عورتوں کا لباس اتنا ملتا جلتا ہے کہ باہر دیکھ کر بظاہر یہ سمجھا نہیں جا سکتا کہ کون مسلم خاتون ہیں اور کون غیر مسلم خاتون۔

امام اور موذن دونوں کوٹ اور پتلون اور ٹائی پہنے ہوئے تھے۔ مگر نماز کے وقت دونوں نے اوپر سے ایک خاص طرح کی لمبی جبا پہن لی۔ اور سر پر خاص طرح کی پگڑی رکھ لی۔ نمازیوں میں زیادہ تر بوڑھی عمر کے نظر آئے۔ دو صفیں بھری ہوئی تھیں۔ کل تقریباً ۶۰ نمازی تھے۔ مسجد کا نیچے کا حصہ خواتین کے لئے مخصوص ہے۔ گراؤنڈ فلور وسیع ہال کی صورت میں ہے۔ مسجد کے پورے حصہ میں قالین بچھا ہوا ہے۔ سنٹرل ہیٹنگ کا انتظام ہے۔ وغیرہ۔ اوپر کا حصہ بھی نہایت عمدہ اور خوب صورت ہے۔ نماز کے بعد امام صاحب نے میرا تعارف روسی زبان میں کرایا۔ چنانچہ تمام نمازیوں نے آکر مجھ سے معانقہ کیا اور دعائیں دیں۔

مسجد کے باہر تعمیرات ہو رہی تھیں اور تعمیری مشینیں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ مسجد سے باہر کوئی چیز بن رہی ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ مسجد کا حصہ ہے اور مسجد کے تحت بن رہا ہے۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ کیوں کہ وہ کافی بڑا تھا اور تعمیر کے بعد اس میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا جاسکتا تھا۔

ماسکو کی جامع مسجد کے امام اور خطیب کا نام راوی بن اسماعیل عین الدین تھا۔ وہ ابھی جوانی کی عمر میں تھے۔ مسجد سے ملا ہوا امام صاحب کا کمرہ جدید طرز کے دفتر کی مانند تھا۔ وہ کافی بڑا تھا۔ نشست میز کرسی پر تھی۔ ان سے میں نے پتہ لکھنے کو کہا تو انھوں نے دو ٹیلیفون نمبر کے ساتھ اپنا یہ پتہ لکھا:

Ravil Gainoutdin, Imam Jama Masjid, Moscow, USSR
Tel: 281-49-04, 281-38-66.

سوویت روس کے موجودہ صدر میخائیل گورباچوف نے دو ایسے کام کئے ہیں جو کسی بھی موجودہ مسلم ملک میں ناقابل تصور ہیں۔ ایک، ساکھ کے سوال کو مکمل طور پر نظر انداز کرکے افغانستان سے روسی فوجیں واپس بلانا۔ دوسرے خود اپنے ملک کے نظام میں وہ تبدیلی لانا جس کو ایک دانشور نے انقلاب کو توڑنے (dismantling a revolution) سے تعبیر کیا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ روسی قوم ایک بے حد جاندار قوم ہے۔ روس کے پاس، امریکہ کے بعد دوسرا سب سے بہتر جغرافیہ ہے۔ مگر پہلی عالمی جنگ کے بعد روسی قوم مسلسل زوال کا شکار ہوتی رہی۔ اسلحہ سازی کے سوا وہ کسی بھی دوسرے میدان میں ترقی نہ کرسکی۔

اس کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک مارکسی نظریہ کے تحت عالمی قیادت کا جنون۔ دوسرے

ریاستی اقتصادیات (state economy) کا طریقہ اختیار کرنے کی وجہ سے روسی معیشت میں محرکِ عمل کا ختم ہو جانا۔ گورباچوف اگر اپنی کوششوں میں کامیاب ہوتے ہیں، تو وہ روسی قوم سے ان دونوں کمزوریوں کو دور کر دیں گے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہو جائے گا کہ روسی قوم کی امکانی صلاحیت ظاہر ہونا شروع ہو جائے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد پیدا ہونے والے حالات نے روس کو دوسرے سپر پاور کی حیثیت دے دی تھی۔ لیکن گورباچوف کی قیادت میں روس نے امریکہ سے مفاہمت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، اگر وہ کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہا تو تقریباً یقینی ہے کہ مستقبل قریب میں روس اپنی سپر پاور کی حیثیت کھو دے گا۔ روس کو سپر پاور کی حیثیت ہتھیار کی سطح پر حاصل تھی۔ موجودہ معاہدوں کے تحت جب ہتھیار کو غیر موثر بنا دیا جائے گا تو اس کے بعد اصل فیصلہ کن چیز اقتصادی طاقت بن جائے گی۔ اور غیر حربی اقتصادی میدان میں روس، امریکہ اور جاپان سے بہت پیچھے ہے۔ تاہم اس تاریک حال میں اس کے لئے ایک روشن مستقبل کا امکان چھپا ہوا ہے۔

ماسکو کی ایک بے حد چوڑی سڑک تھی۔ دونوں طرف درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ موسم نہایت خوشگوار تھا۔ ہماری گاڑی اس پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ یہ ایک خصوصی آرام دہ گاڑی تھی۔ سیٹ کے آگے اتنی زیادہ خالی جگہ تھی کہ آدمی پورا پاؤں نہایت آسانی کے ساتھ پھیلا سکتا تھا۔ میں خاموشی سے سر پکڑے ہوئے اس کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔

میرے ساتھی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: یہ گاڑی جس میں آپ سفر کر رہے ہیں وہ یہاں بے حد اہم شخصیتوں (VVIPs) کے لئے ہوتی ہے۔ اس وقت ہم لوگ ایک روسی وزیر سے ملنے کے لئے جا رہے تھے۔ میں نے ساتھی کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ مجھے بہت جلد ماسکو سے دہلی واپس بھیج دیجئے۔

سفر میرے لئے ہمیشہ مصیبت کا باعث ہوتا ہے۔ سفر میں معمولات کا ٹوٹنا میرے لئے اتنا سخت ثابت ہوتا ہے کہ آرام بھی مجھ کو کاٹنے لگتا ہے۔ اور اب بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد تو یہ کیفیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ حتی کہ اب میں یہ سوچنے لگا ہوں کہ میں اسفار کا سلسلہ بالکل بند کر دوں۔ حالاں کہ ان سطور کے لکھنے کے وقت بھی میرے پاس کئی مقامات کے دعوت نامے موجود

ہیں ـــــ امریکہ، جاپان، جرمنی، انگلینڈ، اٹلی، پاکستان، لیبیا، وغیرہ

روسی میزبانوں کے سخت اصرار کے باوجود میں نے اپنا سفر مختصر کر دیا اور درمیان سے واپسی کا فیصلہ کیا۔ بالآخر وہ لوگ بھی راضی ہو گئے۔ اب مجھے ۳۱ جولائی کو ہوٹل چھوڑنا تھا۔ صبح کو فجر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ٹوٹتے ہوئے دل کے ساتھ دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے: یا اللہ مجھے بخش دیجئے۔ آپ کے اس عاجز بندہ کو غیر جہنم بھی برداشت نہیں، پھر جہنم اس سے کیوں کر برداشت ہوگی۔ ایک ایسا انسان جو راحت کا بھی تحمل نہیں کر سکتا، وہ عذاب کا تحمل کس طرح کرے گا۔

یکم اگست ۱۹۹۰ کو میں ماسکو ایئرپورٹ پر جہاز کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مختلف سرگرمیوں کے مناظر آنکھوں کے سامنے تھے۔ مختلف ملکوں کے عورت اور مرد آتے جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس دوران ایک لطیف تجربہ گزرا۔ دل کے احساس کو رقم کرنے کے لئے آنکھوں نے روشنائی فراہم کی۔ ایک ربانی ارتعاش اندر سے نکل کر فضا میں مرتسم ہو گیا۔

میں نے اپنے بیگ سے قلم اور کاغذ نکالا۔ میں نے چاہا کہ اس ربانی تجربہ کو انسانی الفاظ میں لکھوں۔ مگر پھر میں نے لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ کثیف حقیقتوں کو سمجھنا بھی ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ پھر لطیف حقیقتوں کو آخر کون سمجھے گا۔ یہ تو وہ حقیقتیں ہیں جو صرف آنسوؤں سے لکھی جاتی ہیں اور دل کی دھڑکنوں سے پڑھی جاتی ہیں۔ مگر آج انسان کی سطحیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے پاس نہ آنکھ کے آنسو ہیں اور نہ دل کی دھڑکنیں۔ پھر کون ہے جو اس کو پڑھے اور کون ہے جس کے لئے اسے لکھا جائے۔

جہاز سازی کی صنعت کو ترقی دینے میں روس کا خاص حصہ رہا ہے۔ مثلاً روس نے پہلی بار کئی انجن والے جہاز (multi-engined plane) بنائے۔ اس کا ڈیزائن سکورسکی (Sikorsky) نے تیار کیا تھا۔ اور وہ پہلی بار ۱۹۱۵ میں کامیابی کے ساتھ اڑایا گیا تھا۔ روسی قوم کے اندر غیر معمولی امکانی صلاحیت ہے۔ کمیونزم کے جابرانہ نظام نے اس صلاحیت کے ظہور پر روک لگا دی تھی۔ اب امید ہے کہ روسی قوم دوبارہ ترقی کے نئے زینے طے کر سکے گی۔

یکم اگست ۱۹۹۰ کی شام کو ایروفلاٹ کی پرواز نمبر ۵۵ کے ذریعہ ماسکو سے دہلی کے

لئے روانگی ہوئی۔

راستہ میں جہاز ایک گھنٹہ کے لئے تاشقند میں رکا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی جہاز سے باہر آگیا اور یہ وقت تاشقند ایرپورٹ پر گزارا۔ ایرپورٹ پر تاشقند کے قدیم آثار کی بہت سی بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ اپنے طرز تعمیر کے اعتبار سے اسلامی عہد کی معلوم ہوئیں۔ ایک گنبد کی تصویر تھی۔ اس پر نقش ونگار کے انداز میں کچھ عربی کلمات لکھے ہوئے تھے۔ مگر آرٹسٹک خط کو پڑھنے کے معاملہ میں میں بہت کمزور ہوں۔ چنانچہ میں ان کلمات کو پڑھ نہ سکا۔

تاشقند کی زمین ماضی کے ان ایام کو یاد دلاتی ہے جب یہاں مسلمانوں کا دور دورہ تھا۔

تاشقند سوویت یونین کے اس علاقہ میں واقع ہے جس کو سنٹرل ایشیا (وسط ایشیا) کہا جاتا ہے۔ سنڈے ٹائمس (لندن) نے اپنے شمارہ ۱۰ جون ۱۹۹۰ میں لکھا تھا کہ سوویت سنٹرل ایشیا کے جنوبی کنارہ پر واقع تمام مسلم علاقے آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ سوویت یونین کی کل آبادی کا ۲۰ فی صد حصہ ہیں (خود اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ فی صد ہے) سوویت فوج میں ان کی تعداد ۳۳ فی صد ہے۔ نیشنلزم اور مذہبی بنیاد پرستی کی ایک لہر مسلمانوں کو آزادی کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ کسی نہ کسی دن سوویت اقتدار سے آزادی حاصل کرلیں گے اور بقیہ مسلم دنیا کے ساتھ مل جائیں گے۔

سوویت یونین میں مسلمان زیادہ تر سنٹرل ایشیا کے علاقہ میں رہتے ہیں زبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، کرغیزیہ، قزاقستان۔ سوویت یونین کے مسلمان زیادہ تر سنی ہیں۔ البتہ آذر بائیجان میں شیعہ کی اکثریت ہے جو کہ ایران سے ملا ہوا ہے۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق پورے ملک میں ۱۲۰۰ مسجدیں ہیں۔ تاہم یہ اعداد صحیح معلوم نہیں ہوتے۔ بخارا میں الغ بیگ کا مدرسہ ہے۔ یہ مدرسہ ۱۸-۱۴۱۷ میں بنایا گیا تھا۔ وہ وسط ایشیا کا قدیم ترین مدرسہ سمجھا جاتا ہے۔

حکومت سے منظور شدہ بہت سے مسلمانوں کے بورڈ ہیں جو مسلم معاملات کی تنظیم کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مسلم بورڈ نے ۱۹۸۹ میں قرآن کے ۵۰ ہزار نسخے چھپوائے۔ اسی طرح ایک بورڈ ایک ماہانہ میگزین (مسلمس آف دی سوویت ایسٹ) شائع کرتا ہے۔ یہ انگلش، فرنچ، عربی، دری، فارسی

ں پچاس ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے اور ۸۰ ملکوں میں بھیجا جاتا ہے۔ اب روس اور سعودی عرب
ں سفارتی تعلقات بھی قائم ہو گئے ہیں۔

اسی علاقہ میں سمرقند واقع ہے۔ یہاں کے ایک گاؤں خرتنگ میں امام بخاری کی قبر
تھی۔ یہاں ۱۹۱۷ کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کی کوششوں سے دوبارہ نئی تعمیر کی گئی ہے۔
اور اب یہاں ایک باقاعدہ مقبرہ ہے اور اسی کے ساتھ ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔
زائرین کثیر تعداد میں یہاں آتے ہیں۔ (اس صفحہ کے نیچے امام بخاری کے مقبرہ کی
موجودہ تصویر دی جا رہی ہے)

سوویت یونین کی پندرہ ریاستوں میں سے ایک وہ ہے جس کا نام (Tadzhikistan)
(تاجکستان) ہے۔ اس کی راجدھانی دوشنبے (Dushanbe) ہے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد اتنی
زیادہ ہے کہ وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ انھیں آزاد کیا جائے اور تاجکستان کا سرکاری مذہب اسلام
قرار دیا جائے۔

نیویارک کے ہفت روزہ نیوز ویک نے اپنے نمائندہ ڈیوڈ ریمنکین کی ایک رپورٹ شائع

کی ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دوشنبے میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے دفتر کے سامنے دس ہزار مسلمانوں نے جمع ہو کر احتجاج کیا۔ مظاہرے کے دوران اچانک ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مظاہرین میں سے کچھ مسلم نوجوانوں نے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے پاس کھڑے ہوئے روسی فوجیوں سے کہا کہ آپ لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔

روسی فوجی اس "حکم" پر حیران ہوئے۔ تاہم کچھ دیر کے بعد وہ سڑک پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ڈاڑھی رکھے ہوئے ایک بزرگ مسلمان نکلے۔ انھوں نے ایک فوجی گاڑی کے اوپر کھڑے ہو کر اذان دی۔ اس کے بعد تمام مظاہرین صف باندھ کر کھڑے ہو گئے اور باجماعت نماز ادا کی۔ روسی فوج کے لوگ انھیں اچنبھے کے ساتھ دیکھتے رہے۔

نیوز ویک کے رپورٹر کے مطابق، تاجکستان میں مسلمانوں کی تعداد روس کی دوسری ریاستوں میں بسنے والے مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ وہ سب سے زیادہ مذہبی بھی ہیں۔ پچھلے کمیونسٹ دور میں ان کے مذہبی جذبہ کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ حتی کہ ظاہری طور پر دیکھنے والوں کے لئے وہ ختم بھی ہو گیا۔ لیکن موجودہ روسی حکمراں مسٹر گورباچوف کی اصلاحات کے بعد اچانک یہاں اسلام دوبارہ ظاہر ہو گیا ہے۔ روس میں پانچ کروڑ مسلمان ہیں۔ چوں کہ سرکاری طور پر اس قسم کی معلومات چھاپی نہیں جاتی تھیں، اس لئے خود روسیوں کو اس واقعہ کا علم پہلی بار ہوا ہے۔

تاجکستان میں تقریباً ۳۰۰ نئی مسجدیں بن گئی ہیں۔ فیکٹریوں، سڑکوں اور جیل وغیرہ میں نماز پڑھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ جو اسلام پسند مسلم ملکوں میں حکمرانوں کے خلاف مہم چلا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان "سیکولر" حکمرانوں کو ہٹانا ضروری ہے۔ ورنہ یہاں سے اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ایسے لوگوں کو روس کے واقعہ سے سبق لینا چاہئے۔ جب کمیونسٹ حکومت کے شدید ترین سلوک کے باوجود اسلام روس میں ختم نہ ہو سکا تو وہ مصر، پاکستان شام، اردن جیسے ملکوں سے کیوں کر ختم ہو جائے گا۔

حال ہی میں افریقہ (سینیگال) گیا تھا۔ اس کے بعد روس کا سفر ہوا۔ دونوں کے درمیان ایک عجیب فرق تھا۔ افریقہ میں سب کے سب لوگ سیاہ فام دکھائی دیتے تھے، یہاں سب کے سب لوگ سفید فام نظر آتے ہیں۔

یہ فرق اللہ تعالیٰ نے "تعارف" کے لئے رکھا ہے نہ کہ "امتیاز" کے لئے۔ یہ صورت حال در
مل انسان کے حالتِ امتحان میں ہونے کا ایک جزء ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ بیشتر انسان اس امتحان
ں ناکام ہو گئے۔ سفید فام لوگوں نے رنگ کی بنا پر اپنے کو مخصوص نسل سمجھ لیا۔ اس کے جواب میں
یاہ فام نسل میں ردعمل پیدا ہوا۔ انھوں نے کہا کہ سیاہ بہتر ہے (Black is good) حتی کہ انھوں
نے کہا کہ خدا بھی سیاہ ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

ماسکو میں بہت بڑے بڑے پارک ہیں۔ مثلاً فرینڈشپ پارک اتنا بڑا ہے کہ ایک منظم جنگل
معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اندر رابندر ناتھ ٹیگور کا اسٹیچو ہے۔ اس کے علاوہ ماسکو میں گاندھی، نہرو،
اور اندرا کے اسٹیچو بھی ہیں۔ یہ ایک علامت ہے جس سے ہند اور روس کے درمیان گہرے تعلقات
کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۲ اگست ۱۹۹۰ کی صبح کو دوبارہ میں دہلی کے اسی ایئرپورٹ پر اتر گیا جہاں سے میں اس سفر
پر روانہ ہوا تھا۔ انسان جہاں سے آیا ہے، وہیں اس کو دوبارہ لوٹ کر جانا ہے۔ دنیا کے سفر میں
ہر روز انسان کو اس حقیقت کا تجربہ کرایا جا رہا ہے۔ مگر مسافروں کی بھیڑ میں شاید کوئی بھی مسافر ایسا
نہیں جو اس ابتدائی تجربہ میں اس کے انتہائی سبق کو پا رہا ہو۔ ہر آدمی واقعہ کے "نصف اول" کا ماہر
بنا ہوا ہے، واقعہ کے "نصف ثانی" کی خبر کسی کو نہیں۔

واپس آتے ہوئے اخبار میں ایک رپورٹ پڑھی۔ اس کا عنوان تھا ——— ایک نیا سوویت
روس ابھر رہا ہے:

A new USSR is emerging

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ خمسینات میں سوویت یونین نے ساری دنیا کو حیرانی میں ڈال
دیا جب کہ اس نے اپنا اسپٹنک زمین کے مدار میں داخل کر دیا۔ اس طرح اس نے فوجی طاقت میں امریکہ
کی برابری (strategic parity) حاصل کر لی۔ روایتی ہتھیاروں کے اوپر اس کو واضح برتری
حاصل ہو گئی۔ مگر یہ حیثیت اس کو ایک بے حد مہنگی قیمت پر ملی۔ فوجی برتری حاصل کرنے کی کوشش
میں اس نے اپنی اقتصادیات کو برباد کر لیا۔ چنانچہ سوویت یونین اب ۷۰ سالہ اشتراکی لبادہ کو اتار
رہا ہے اور عام جمہوری انداز پر اپنی اقتصادیات کی نئی تنظیم کرنا چاہتا ہے۔

اگر آپ ایک ملین ڈالر خرچ کرکے بید کی ایک چھڑی حاصل کریں تو یہ پانا نہیں ہوگا۔ وہ کھونے کی بدترین شکل ہوگی۔ کوئی بڑا اقدام صرف اس وقت بڑا ہے جب کہ وہ نتیجہ خیز بھی ہو۔ جو اقدام بظاہر بڑا ہو مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ چھوٹا ہو، وہ اقدام نہیں بلکہ خودکشی کی چھلانگ ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

روس نے ایک غلط اقدام کیا مگر ۷ سال بعد وہ غلطی کا اعتراف کرکے اس سے لوٹ آیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی قیادت ۷۰ سال سے ایک کے بعد ایک غلط اقدام کر رہی ہے، مگر اب تک اسے غلطی کے اعتراف کی توفیق نہ ہو سکی۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ اصحاب ایمان جو اصحاب الحاد سے بھی کم اعتراف کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

ہندی میں الرسالہ کے اجرا کو بہت پسند کیا گیا ہے۔ چند خط نقل کئے جاتے ہیں :

- ہندی الرسالہ کی کاپی بیگم شروانی صاحبہ کو مل گئی ہے۔ وہ ہندی الرسالہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اب ہم صحیح معنوں میں عوام کی خدمت کر سکیں گے اور اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا سکیں گے (انصار الحق سکریٹری ، الہ آباد)
- مشہور انگریزی جرنلسٹ مسٹر خوشونت سنگھ ایک خط میں لکھتے ہیں :

You have done well to bring out this Risala in Devnagari. It should have a much wider impact. (Khushwant Singh)

- خدا خدا کر کے ہندی الرسالہ منظر عام پر آگیا۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ تعمیری کام میں یہ پرچہ بہت اہم رول انجام دے گا۔ اس پرچہ کو نکالنے میں جہاں آپ حضرات کی محنت شاقہ موجود ہے، وہیں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت خاص ضرور پوشیدہ ہے۔ میرا تو یہی احساس ہے (شیخ محی الدین ، پونہ)
- ہم لوگوں کو انتہائی خوشی ہوئی جب کہ ہم نے الرسالہ ہندی کو پایا۔ خاص کر میں نے اس الرسالہ کو چوما۔ دل سے مولانا کے لئے بہت ہی دعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ ان کے مقصد میں کامیابی دے (جمال الدین صدیقی ، ناندیڑ)
- ہندی الرسالہ کا نمونہ دیکھا۔ دیکھ کر بے حد مسرت حاصل ہوئی۔ اب تک الرسالہ اردو صرف اکیلا پڑھا کرتا تھا۔ ہندی الرسالہ جاری ہونے سے میرے بچے اور دیگر احباب بھی اس سے فیض یاب ہوں گے (محمد یوسف چھاونی والا ، پالی)
- الرسالہ ہندی شائع ہونے کی خبر نئی دنیا میں پڑھی۔ دل کو خوشی ہوئی۔ کیوں کہ اس کی سخت ضرورت تھی۔ آپ نے الحمد للہ بہت سے لوگوں کی ضرورت پوری کر دی ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ انشاء اللہ یہ رسالہ قوم کی ترقی اور تعمیری انداز میں اصلاح کرنے میں معین و مددگار ہوگا (خلیل احمد ، مظفر نگر)

۲۔ ڈاکٹر تھیوڈور رائٹ (Prof. Theodore P. Wright) نیویارک اسٹیٹ یونیورسٹی میں پولٹیکل سائنس کے پروفیسر ہیں۔ وہ ۲۴ جنوری ۱۹۹۱ کو اسلامی مرکز میں آئے۔ اور " ہندستانی مسلمانوں کے مسائل " کے موضوع پر صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی تبادلہ خیال کیا۔ آخر میں انھیں انگریزی کے متعلقہ مضامین دئے گئے۔

۳۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : الرسالہ جنوری ۱۹۹۱ میں نے حضرت مفتی شیخ الحدیث مولانا ریاست علی صاحب مد ظلہ العالی کو پڑھ کر سنایا۔ حضرت مولانا نے جناب والا کو دور حاضر کا عظیم مبلغ اسلام فرمایا۔ میں خود فلسفہ کے اسکالر ہونے کی حیثیت سے آپ کو وقت کا ایک عظیم فلسفی سمجھتا ہوں (محمد شفیع ، پرگتی میدان ، نئی دہلی)

۴۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس نے اپنے شمارہ ۶ جنوری ۱۹۹۱ میں صدر اسلامی مرکز کا ایک مفصل آرٹیکل شائع کیا ہے۔ یہ آرٹیکل بابری مسجد ۔ رام جنم بھومی کے مسئلہ پر ہے اس آرٹیکل میں کہا گیا ہے کہ اس نزاع کو ثالثی کے اصول پر حل کرنا چاہئے۔

نئی دہلی میں ۲۰ دسمبر ۱۹۹۰ کو ایک مشترک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور تقریباً آدھ گھنٹہ کی ایک تقریر کی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام ہی وہ نظام فکر ہے جو سائنس کے نظریاتی سوالات کو حل کرتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ محفوظ دین ہونے کی وجہ سے انسان کی روحانی و مذہبی تلاش کا واحد جواب ہے۔

۵۔ الرسالہ کے مضامین اپنی عمومی افادیت کی بنا پر برابر ملک کے مختلف پرچوں میں نقل کئے جارہے ہیں۔ مثلاً الرسالہ انگریزی کا ایک مضمون نئی دہلی کے انگریزی جرنل پرافیٹیبلی یورس (Profitably Yours) کے شمارہ جولائی ۔ دسمبر ۱۹۹۰ میں نقل کیا گیا ہے

۶۔ مسٹر دیوی سرن (بھوپال) لکھتے ہیں : الرسالہ ہر ماہ مل جاتا ہے۔ آپ جس طرح بات کو ذہن نشیں کراتے ہیں وہ صرف آپ کا ہی حصہ ہے۔ میں آپ کے طرز تحریر کا اور نفس مضمون کی افادیت کا بیحد قائل ہوں۔ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی بھی جانتا ہوں، اس لئے مجھے تینوں زبانوں کا استفادہ حاصل ہے۔ ہندی کا الرسالہ بھی خوب ہے۔ اس سے ہندی داں طبقہ کو فائدہ ہوگا، اس کا یقین ہے۔

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۲ مارچ ۱۹۹۱ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ تقریر کا عنوان تھا: مذہب میں ایجاب وقبول کی روایات۔ ان شاء اللہ آئندہ الرسالہ میں یہ تقریر شائع کر دی جائے گی۔

احادیث رسول کا ایک مجموعہ تیار کیا گیا ہے۔ اس میں دو سو منتخب حدیثیں ہیں۔ کتابت کی تکمیل کے بعد ان شاء اللہ اس کو شائع کیا جائے گا۔

نئی دہلی میں ایک اسکول فادر اینجل اسکول کے نام سے ہے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۹۱ کو انھوں نے اپنے یہاں ایک انٹر ریلیجس اجتماع کیا۔ اس کا عنوان تھا: Living together in peace. اس موقع پر اسلامی مرکز کو دعوت دی گئی۔ مرکز کی طرف سے ڈاکٹر ثانی اثنین خاں نے شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے ایک تقریر کی۔

الرسالہ اب بیک وقت تین زبانوں (اردو، ہندی، انگریزی) میں نکل رہا ہے۔ اس سے اسلامی مرکز کے تعمیری اور دعوتی مشن کا اشاعتی حلقہ بہت بڑھ گیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ مرکز کے اقتصادی مسائل میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ہم اصحاب خیر اور دردمند حضرات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنا مالی تعاون روانہ فرمائیں، تاکہ اس دینی مشن کو موثر طور پر جاری رکھا جا سکے۔

کچھ عرصہ پہلے بعض مخیر حضرات کے تعاون سے مرکز کی طرف سے تقسیم کتب کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم نے دینی مدارس اور اردو لائبریریوں سے گزارش کی تھی کہ وہ ہمیں اپنے پتے اور تعارف نامے روانہ کریں تاکہ انھیں کتابیں بھیجی جائیں۔ دوسری طرف اصحاب خیر سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ اپنے فیاضانہ تعاون کے ذریعہ تقسیم کتب کے اس سلسلہ کو مزید وسعت دینے کی کوشش فرمائیں۔

اس اعلان کے بعد ہمارے پاس سینکڑوں کی تعداد میں دینی اداروں اور لائبریریوں کے پتے آگئے ہیں۔ تاہم ہمارے خصوصی معاونین کی تعداد اور مرکز کے وسائل محدود ہونے کی بنا پر ان سب کے لیے کتابوں کی فراہمی بروقت ممکن نہیں۔ لہٰذا اہل خیر حضرات سے دوبارہ گزارش کی جاتی ہے کہ وہ اشاعت دین کی اس مہم میں ہمارے ساتھ حوصلہ مندانہ تعاون کے لیے آگے بڑھیں۔ ایک فرد کے لیے خصوصی تعاون کی کم از کم حد یہ ہے کہ وہ ایک سال کے لیے الرسالہ کا زر تعاون مبلغ ساٹھ روپے ارسال کر دے۔ جس کے عوض ان کی طرف سے کسی مدرسہ یا لائبریری کو مفت الرسالہ جاری کر دیا جائے گا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے (ہوائی ڈاک)		[illegible]
ایک سال	۹۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	[illegible] ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ 〃 〃	[illegible] 〃 〃
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ 〃 〃	۲۵ 〃 〃
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ 〃 〃	۴۰ 〃 〃
خصوصی تعاون (سالانہ)	۳۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ 〃	— —

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

خلیج ڈائری

خلیج کی جنگ کے سبق آموز پہلو

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

۱۵ جنوری ۱۹۹۱

۱۵ جنوری ۱۹۹۱ کے اخبارات یہ خبر لائے کہ آج رات کو گیارہ بج کر انسٹھ منٹ (11.59) پر وہ ڈیڈ لائن ختم ہو جائے گی جو کویت سے عراقی فوج ہٹانے کے لیے اقوام متحدہ نے مقرر کی تھی۔ اس کے بعد فوراً امریکہ کو یہ حق ہو جائے گا کہ وہ عراق پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ حملہ کر دے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ جنوری) کے ایڈیٹوریل کی سرخی تھی ــــــ الٹا شمار صفر پر پہنچنے والا ہے:

Countdown to zero

امریکی نیوز ایجنسی اے پی کے نمائندہ نے سعودی عرب میں اس مقام کا دورہ کیا جہاں امریکہ نے فوجی اڈہ بنایا ہے۔ یہاں انتظام کیا گیا ہے کہ جنگ شروع ہونے کی حالت میں عراق کے اوپر رات دن مسلسل بمباری کی جائے تاکہ یا تو صدر صدام حسین ہتھیار ڈال دیں یا عراق کو اسٹون ایج میں پہنچا دیا جائے۔

اے پی کے نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے امریکی میجر کوگلان (J.J. Coghlan) نے کہا کہ یہاں ہر آدمی اپنی گھڑی کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے تاکہ یہ معلوم کرے کہ ۱۵ تاریخ کو کون سا دن ہے۔ ہر ایک اپنے آپ کو ارجنٹ صورت حال میں محسوس کر رہا ہے:

Everybody looks at the watch all the time to see which day the 15th is. There's a sense of urgency.

جس طرح اقوام متحدہ کے رزولیوشن ۶۷۸ (۲۹ نومبر ۱۹۹۰) کے مطابق، امریکہ نے عراق کو الٹی میٹم دیا کہ وہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک کویت سے اپنی فوجیں ہٹالے، ورنہ اس کے اوپر حملہ کر کے اس کو برباد کر دیا جائے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کی ایک عمر مقرر کر دی ہے اور اعلان فرمایا ہے کہ اس متعین وقت تک لوگ اپنی اصلاح کر لیں۔ اس کے بعد دنیا کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اور ہر ایک کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ خدا کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے عمل کا حساب دے۔

اگر لوگوں کو اس خدائی اعلان کا شعور ہو تو ہر آدمی ارجنسی کے احساس (sense of urgency) میں زندگی گزارنے لگے۔ ہر آدمی اپنا محاسبہ کرنے میں لگ جائے۔ ہر آدمی اپنے قول و عمل کا نگراں بن جائے۔ ہر آدمی اپنا دن اس طرح گزارے گویا کہ وہ شام تک نہیں رہے گا۔ اور شام اس طرح گزارے گویا اگلی صبح اس کے لیے آنے والی نہیں۔ لوگ قیامت کے آنے سے پہلے اپنے آپ کو قیامت میں کھڑا ہوا محسوس کرنے لگیں۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۱

آج کل سب سے بڑا موضوع خلیج کا بحران ہے۔ ہر شخص عراق اور کویت کے مسئلہ پر بات کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ عراق ایک بڑا ملک ہے اور کویت اس کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ملک۔ عراق کا رقبہ ۱۹۸۸۸۰ مربع میل ہے۔ جب کہ کویت کا رقبہ صرف ۶۸۸۰ مربع میل۔ عراق نے اپنی تیل کی دولت کے بڑے حصہ کو فوجی مدوں میں خرچ کرکے ۱۰ لاکھ کی طاقت ور فوج بنالی ہے، دوسری طرف کویت کے پاس عملاً کوئی فوج نہیں۔ اس فرق سے فائدہ اٹھا کر عراق کے حکمراں صدام حسین نے اپنی ایک لاکھ فوج ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت کے اندر داخل کردی۔ انھوں نے بزور کویت کو عراق میں ملا کر اعلان کر دیا کہ "کویت عراق کا ۱۹واں صوبہ ہے"۔

اس کے بعد اقوام متحدہ متحرک ہوئی۔ مختلف ملکوں نے عراق کے اس جارحانہ اقدام کی مذمت کی۔ یہاں تک کہ امریکہ کی قیادت میں پورے عراق کا فوجی محاصرہ کرلیا گیا۔ عراق کی ۹۵ فی صد آمدنی کا انحصار تیل کی فروخت پر ہے۔ مگر عراقی تیل سے بھرے ہوئے ٹینکر سمندر میں کھڑے ہوگئے، زرعی اور صنعتی پسماندگی کی وجہ سے عراق فوجی ہتھیاروں سے لے کر دوا اور غذا تک ہر چیز باہر سے منگاتا ہے، ان کا آنا بھی بند ہوگیا۔ اب عراق کے حکمراں صدام حسین روزانہ امریکہ کے خلاف تیز و تند بیانات جاری کررہے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۳۱ اگست ۱۹۹۰) کے مطابق، صدام حسین نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ وہ کویت کی حیثیت کے بارہ میں امریکہ سے بات چیت کریں۔ انھوں نے پُر جوش طور پر کہا کہ کیا کویت امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ ہے:

Is Kuwait the 52nd state of the United States?

جواب کی یہی قسم ہے جس کو دھاندلی کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کویت اگر امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ نہیں تو وہ عراق کا بھی ۱۹واں صوبہ نہیں۔ صدام حسین عین اسی چیز کے لیے امریکہ کو متہم کر رہے ہیں جس میں وہ خود شدید تر انداز میں مبتلا ہیں۔

آج دنیا کے بیشتر لوگ اسی قسم کی دھاندلی کر رہے ہیں۔ کاش لوگ جانتے کہ اُسی بات کی قیمت ہے جو خدا کے یہاں قیمتی ٹھہرے۔ مومن وہ ہے جو اُن الفاظ کو آج ہی بے قیمت سمجھ لے جو کل خدا کے یہاں بے قیمت ہونے والے ہیں۔ جو آج آزادانہ طور پر اُس بات کو مان لے جس کو کل وہ مجبورانہ طور پر مانے گا، مگر اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۱

ہندستانی وقت کے مطابق، آج صبح ساڑھے تین بجے وہ وقت آگیا جس کا اندیشہ تھا۔ امریکی فوجوں نے عراق کے اوپر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ فجر کی نماز سے پہلے بی بی سی (لندن) کے ذریعہ ریڈیو سے یہ خبر معلوم ہوگئی۔ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ رات کے وقت عراق میں ایک واقعہ ہوتا ہے۔ اس کے چند منٹ بعد لندن سے اس کی خبر نشر ہو جاتی ہے اور ایک لمحہ کے اندر ساری دنیا اس کو جان لیتی ہے۔

اپنی مختصر سی زندگی میں دو بڑی جنگیں دیکھنا میرے لیے مقدر تھا۔ دوسری عالمی جنگ جس کا قائد برطانیہ تھا۔ اور پھر موجودہ جنگ جو گویا تیسری عالمی جنگ ہے اور جس کی قیادت امریکہ کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ۲۸ ملک عملاً شریک ہیں۔ بقیہ ملکوں کی اکثریت بھی نظری طور پر شریک ہے، کیوں کہ امریکہ نے یہ جنگی اقدام اقوام متحدہ کے فیصلہ کے تحت کیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ باقاعدہ طور پر یکم ستمبر ۱۹۳۹ کو شروع ہوئی جب کہ ہٹلر کے تحت جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ چند دن کے بعد الٰہ آباد کے انگریزی اخبار پانیر (pioneer) نے اپنے پہلے صفحہ پر اس کی خبر دیتے ہوئے اس کی جو سرخی قائم کی وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ اس کے الفاظ غالباً یہ تھے:

Poland in Germany's hand

یہ تباہ کن جنگ چند سال تک جاری رہی۔ بے شمار جانی و مالی نقصان کے بعد آخر کار جو ہوا وہ یہ کہ ہٹلر کی خودسری مایوسی میں تبدیل ہوگئی۔ ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ کو اس نے اپنی محبوب عورت کے ساتھ برلن کے کھنڈر پر خودکشی کر لی:

Isolated and reduced to despair, Hitler married his mistress, Eva Braun, on April 30, 1945 and comitted suicide with her in the ruins of the chancellery. (19/1011)

بظاہر حالات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے ڈکٹیٹر کا انجام بھی ایک یا دوسری صورت میں وہی ہونے والا ہے جو جرمنی کے ڈکٹیٹر کا ہوا تھا۔ عراق کی طاقت اور امریکہ کے زیر قیادت اتحادیوں کی طاقت میں وہی فرق ہے جو چیونٹی اور ہاتھی میں ہے۔ اس فرق کے ساتھ عراق کا جنگ میں کودنا صرف خودکشی ہے نہ کہ بہادری۔

عراق کے پاس زیادہ تر روایتی ہتھیار ہیں جو اس نے روس سے یا دوسرے مغربی ملکوں سے خرید کر حاصل کیے ہیں جب کہ امریکہ کے ہتھیار اس کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ "خریدے ہوئے" ہتھیاروں کے ذریعہ کوئی ملک ایک ایسی قوم پر فتح حاصل نہیں کر سکتا جس نے اپنے ہتھیار خود بنائے ہوں۔

۱۸ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۱۸ جنوری) میں مسٹر رے (A.K. Ray) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ مضمون نگار نے صدام حسین کے اقدام کو دیوانگی (madness) اور احمقانہ قسم کا غلط اقدام (stupid misadventure) بتایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ صدام حسین کی عظیم فوج کے بارہ میں حال میں جو خبریں چھپی ہیں، وہ سب پروپگنڈے کی باتیں (propaganda ploy) ہیں۔ عراقی صدر کو اپنے غلط اعمال کی بھاری قیمت دینی ہوگی :

The Iraqi President will have to pay a terribly heavy price for his wrongdoings. (p. 13)

مضمون نگار کی یہ بات لفظ بلفظ درست ہے۔ صدام حسین کا اقدام بلاشبہ ہلاکت کی چھلانگ ہے۔ صدام حسین جنون عظمت (paranoia) کے مریض ہیں۔ وہ عرب لیڈر بننے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۸۰ میں ایران پر حملہ کیا تاکہ الجیرز ٹریٹی (۱۹۷۵) کو ختم کر کے شط العرب نیز خوزستان پر قبضہ کر لیں۔ مگر اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ ایک ملین انسان مارے گئے۔ بے شمار لوگ زخمی ہوئے۔ عراق کے اوپر ۸۲ بلین ڈالر کا قرض ہو گیا۔ کویت پر حملہ (۲ اگست ۱۹۹۰) کے وقت ہر عراقی باشندہ ۴۸۲۴ ڈالر کا مقروض تھا۔ وغیرہ

آٹھ سالہ جنگ میں صدام حسین ایران کو مغلوب نہیں کر سکے تھے۔ مگر اپنے مجنونانہ جوش کی بنا پر انھوں نے اس سے سبق نہیں لیا۔ اور دوبارہ ناقابل فہم حماقت کے تحت عالمی سپر پاور (امریکہ) سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

اس وقت ساری دنیا کے مسلم عوام جذباتی طور پر صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ صدام حسین آج مسلم دنیا کے ہیرو ہیں۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے عام مسلمان بھی اسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہیں جس میں صدام حسین مبتلا ہیں۔ وہ اپنے جنون عظمت کی تسکین کے لیے صدام کے حامی بن گئے ہیں۔ حقیقی اسلام آدمی کو متواضع بناتا ہے۔ مگر خودساختہ اسلام آدمی کی انا کو جگا کر اس کو جنون عظمت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہی موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اپنی اس کمزوری کی بنا پر وہ حقیقت پسندی سے دور ہو گئے ہیں۔ وہ ہر اس آدمی کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں جو بڑے بڑے الفاظ بولے۔ خواہ عالم واقعہ میں ان الفاظ کی کوئی قیمت نہ ہو۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ میں پہلی بار جدید وارفیر کی وہ صلاحیت سامنے آئی ہے جس کو عین نشانہ پر بمباری (pinpoint bombing) کہا جاتا ہے۔ الائیڈ فورس نے بغداد کی ڈیفنس بلڈنگ پر بم مارنا چاہا تو عین اسی مخصوص بلڈنگ پر بم گرا، جب کہ وہاں سیکڑوں دوسری بلڈنگیں بھی موجود تھیں۔ حتی کہ ٹی وی کے گنبد کو نشانہ بنایا تو ان کا بم صرف گنبد سے ٹکرایا اور بقیہ عمارت کو چھوڑ دیا۔ وغیرہ

لندن کی ایک رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ جنوری) میں کہا گیا ہے کہ اب تک عراق پر چار ہزار ہوائی حملے کیے جا چکے ہیں۔ موصولہ تصویریں بتاتی ہیں کہ یہ حملے عین نشانہ پر لگے۔ اس انتہائی صحیح حملہ نے یہاں فوجی لوگوں کے اندر تموج کی کیفیت پیدا کر دی ہے :

At least four of these 4,000 air sorties yielded pictures of the sequence of highly accurate attacks that thrilled the military community, heralding a new era in warfare.

عین نشانہ پر بم کا گرنا ایک بے حد پیچیدہ عمل ہے۔ یہ ابھی تک ایک فوجی راز ہے۔ سادہ طور پر اس کا نظام یہ ہے کہ پہلے سٹلائٹ کے ذریعہ مطلوبہ مقام کا فوٹو لیا جاتا ہے۔ پھر زیر نشانہ عمارت کی تصویر کو ہوائی جہاز میں لگے ہوئے کمپیوٹر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاز فضا میں اڑ کر لیزر شعاعوں کے ذریعہ مذکورہ مقام کو معلوم کرتا ہے۔ کمپیوٹر کے اندر فیڈ کی ہوئی تصویر جب نشانہ کی تصویر سے مطابقت کرتی ہے تو کمپیوٹر مشین کو متحرک کرتا ہے اور بم اس تصویری نشانہ پر جا گرتا ہے۔ یہ انتہائی پیچیدہ اور تفصیلی عمل صرف منٹوں کے اندر انجام پاتا ہے۔

فوجی لوگ جب اس قسم کے واقعات کو دیکھتے ہیں تو ان کے اندر جدید ٹکنالوجی کے بارہ میں تھرل (تموج) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اُس خدا کی قدرت پر تھرل کی کیفیت پیدا ہو جس نے کائنات میں اس قسم کے حیرت انگیز امکانات رکھے اور وہ انسانی ذہن بنایا جو ان امکانات کو استعمال کرکے ایسے کارنامے انجام دے سکے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ وہ عجائب (marvels) جو خالق کی یاد دلانے والے تھے، ان سے انسان صرف مخلوق کی یاد کی غذا حاصل کر رہا ہے۔ ان واقعات سے اگر صحیح سبق لیا جائے تو انسانی دنیا میں ایک حیرت ناک انقلاب برپا ہو جائے۔

۲۰ جنوری ۱۹۹۱

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۱۸ جنوری) کے پہلے صفحہ پر ایک خبر نمایاں سرخی کے ساتھ چھپی تھی کہ کراچی سے خیبر تک تمام پاکستانی مسلمان امریکہ کی مخالفت اور صدام حسین کی حمایت میں متحد ہو گئے۔ اسی اخبار میں "امریکہ دشمن نمبر ا" کے عنوان کے تحت ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک پیراگراف یہ ہے :

"امریکہ کے صدر بش کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی بدولت پاکستان کے تمام طبقے اور تمام مکاتب فکر پہلی دفعہ امریکہ دشمنی کے حوالے سے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو گئے ہیں۔ اس وقت پوری پاکستانی قوم امریکہ کو عالم اسلام کا دشمن نمبر ا سمجھ رہی ہے۔ سمجھتی تو شاید پہلے بھی رہی ہے۔ لیکن اس کا بھرپور اور متفقہ اظہار پہلی دفعہ (امریکہ کے عراق پر حملہ کے بعد) ہو رہا ہے۔" (صفحہ ۲)

آج کل مسلمانوں کے اخباروں میں بار بار ایسی رپورٹیں اور مضامین چھپ رہے ہیں جن میں "عالمی اسلامی اتحاد" کی خبر دی جاتی ہے۔ مگر یہ اتحاد محض ایک منفی اجتماع ہے۔ اور منفی اجتماع اپنی حقیقت کے اعتبار سے کوئی اتحاد نہیں۔ وہ محض ایک وقتی قسم کی بھیڑ ہے نہ کہ کوئی حقیقی اور پائدار اتحاد۔ اس قسم کا اتحاد صرف قوم کی کمزوری کو بتاتا ہے نہ کہ فی الواقع اس کی قوت و طاقت کو۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں جب بھی کوئی بڑا اتحاد ہوا ہے، وہ منفی بنیاد پر ہوا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر ہند کے مسلمان "خلافت" کے نام پر متحد ہوئے۔ مگر یہ کوئی مثبت اتحاد نہ تھا، وہ صرف انگریز دشمنی کے جذبہ کے تحت ظہور میں آیا تھا۔ اسی طرح موجودہ صدی کے وسط میں مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے متحد ہو گئے۔ یہ اتحاد بھی کوئی مثبت واقعہ نہ تھا۔ وہ تمام تر ہندو دشمنی کے جذبہ کے تحت برپا ہوا تھا اب صدی کے آخر میں مسلمان پھر متحد نظر آ رہے ہیں۔ مگر یہ اتحاد بھی صرف امریکہ دشمنی کے جذبہ کے تحت ظاہر ہوا ہے، اس اتحاد کے پیچھے کوئی مثبت بنیاد موجود نہیں۔ اس لیے وہ باقی رہنے والا بھی نہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اس قسم کے اتحادی واقعات پر بار بار خوشیوں کے چراغ جلاتے ہیں مگر شام کے جلائے ہوئے چراغ صبح کو بجھ جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ملت بدستور اختلاف و انتشار کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔

مثبت بنیاد پر جمع ہونا حقیقی اتحاد ہے، منفی بنیاد پر جمع ہونا محض ایک بے معنی بھیڑ۔ اتحاد کسی قوم میں شعوری عمل سے آتا ہے اور بھیڑ صرف جذباتی الفاظ سے۔

۲۱ جنوری ۱۹۹۱

ٹائم (۱۵ - ۲۱ جنوری) "گلف اسپشل" کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ امریکہ اور عراق دونوں اپنی آخری حد پر جا چکے ہیں، اور بظاہر اب دونوں فریق جنگ کے لیے تیار ہیں، کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی اس مفروضہ بدنامی کو اپنے اوپر لینا نہیں چاہتا کہ اس نے دوسرے کے آگے ہتھیار ڈال دیے (۹ - ۱۰)

ٹائم نے لکھا تھا کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں غیر مشروط طور پر واپس بلا لیں، تو یہ ان کے لیے آخری بہترین انتخاب (choice) ہوگا۔ کویت یہ اعلان کر چکا ہے کہ فوجوں کی واپسی کے بعد وہ عراق کی شکایت پر بات چیت کے لیے تیار ہے۔ حتیٰ کہ صدام حسین کے سابقہ مطالبہ کے مطابق، عالمی امن کانفرنس بلانے کا امکان بھی موجود ہے۔

ٹائم کے مطابق، خود امریکہ نے کھلے طور پر یہ وعدہ کیا تھا کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں تو صدام مخالف اتحاد اس کے بعد عراق پر حملہ نہیں کرے گا۔ مزید یہ کہ جارج بش نے اس بات کا بھی اشارہ دیا تھا کہ عراق اپنے سرحدی جھگڑوں کے بارہ میں کویت سے بات چیت کر سکے گا، اور غالباً فلسطین کے مسئلہ پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس بھی منعقد کر سکے گا (صفحہ ۱۲) سویت یونین اور فرانس وغیرہ بھی یہ کہہ چکے تھے کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں ہٹا لیں تو ویسٹ ایشیا کے تمام مسائل کے مجموعی حل (package deal) کے بارہ میں اقوام متحدہ کے تحت کانفرنس کی جائے گی اور تمام مسائل کو حل کیا جائے گا۔ ٹائم نے یہ امکان ظاہر کیا تھا کہ اسرائیل پر دباؤ ڈال کر اس کو راضی کیا جائے گا کہ وہ ویسٹ بینک اور غازہ پٹی کو فلسطینیوں کے لیے خالی کر دے تاکہ وہ وہاں اپنی اسٹیٹ بنا سکیں (صفحہ ۱۴)

مگر صدام حسین نے ان تمام تجویزوں کو رد کر دیا۔ یہاں تک کہ جنگ شروع ہو گئی۔ اب مزید کچھ پانا تو درکنار، یہ یقینی ہے کہ صدام حسین کے پاس جو کچھ ہے، اس کو بھی وہ کھو دیں گے۔ اس دنیا میں بہترین عقلمندی یہ ہے کہ آدمی زیادہ کا مطالبہ کرے مگر وہ کم پر راضی ہو جائے۔ ٹکراؤ کے بغیر فریق ثانی جو کچھ دے رہا ہے، اس پر راضی ہو جانا مزید ترقی کا راستہ کھولتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی اگر ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرے تو وہ حاصل شدہ چیز کو بھی ضائع کر دیتا ہے۔

جنگ سے پہلے صدام حسین کو جو کچھ مل رہا تھا، جنگ کے بعد وہ اس کو لینا چاہیں گے مگر اس وقت وہ کم بھی نہ پا سکیں گے۔ وقت گزر جانے کے بعد کوئی چیز کسی کو نہیں ملتی۔

۲۲ جنوری ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ میں امریکہ کی زیر قیادت جو "ملٹی نیشنل فورس" بنی ہے، اس میں برطانیہ بھی شامل ہے۔ برطا
کے فوجی پائلٹ ٹارنیڈو (Tornado) نامی جہاز کے ذریعہ عراق پر حملے کر رہے ہیں۔ کچھ برطانی پائلٹوں نے
اے پی کے نمائندہ کو اپنے جنگی تجربات بتائے۔

اسکوئڈرن لیڈر مسٹر میسن (Pablo Mason) نے کہا کہ جب ہم دشمن کے اوپر بمباری کرنے کے
لیے اڑتے ہیں تو دشمن کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ہر وقت یہ اندیشہ بھی رہتا ہے کہ ہم خود کسی متوقع یا غیر متوقع
حادثہ میں تباہ ہو سکتے ہیں۔ اس وقت سارا معاملہ صرف سکنڈوں کا ہوتا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۲ جنوری ۱۹۹۱) کی رپورٹ کے مطابق، پائلٹ میسن نے کہا کہ جنگ کے حالات
میں ہمارے اندر مسلسل یہ شعور موجود ہوتا ہے کہ چند منٹوں میں وہ لمحہ آسکتا ہے کہ میں دنیا میں نہ رہوں :

There is a constant awareness that in a few seconds' time you may not exist. (p. 7)

یہ احساس یا شعور جو ایک فوجی پائلٹ کے اندر جنگی حالات کے درمیان ہوتا ہے، وہی مومن کی
مستقل زندگی ہے۔ مومن موجودہ دنیا کی زندگی کو امتحان سمجھتا ہے۔ خدا اس کو دنیا میں پیدا کرکے ہر لمحہ
اس کی نگرانی کر رہا ہے، جیسے ہی خدا کی طرف سے مقرر کی ہوئی مدت پوری ہوگی، فوراً موت کا فرشتہ
آجائے گا تاکہ اس کی روح قبض کرے اور اس کو دنیا سے نکال کر آخرت کے عالم میں پہنچا دے۔

جس آدمی کو یہ احساس ہو کہ اگلے سکنڈ میری موت آسکتی ہے، وہ بے حد چوکنا ہو جائے گا۔ ہر لمحہ کو
وہ اپنے لیے آخری لمحہ سمجھے گا۔ وہ جینے سے زیادہ مرنے کو یاد کرے گا۔ وہ آج سے زیادہ کل کی فکر
کرے گا۔ وہ آخری حد تک یہ کوشش کرے گا کہ دنیا کے ذریعہ آخرت کو کمائے نہ کہ دنیا کے ذریعہ دنیا
کو۔ کیوں کہ دنیا بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔ یہ صرف آخرت ہے جو اگلے لمحہ کے بعد اس کے لیے
باقی رہے گی۔

"میں اگلے لمحہ نہ رہوں گا" یہ احساس آدمی کے لیے حال کے مقابلہ میں مستقبل کو زیادہ اہم بنا
دیتا ہے۔ اس کی ساری توجہ موجودہ کے مقابلہ میں آئندہ کی طرف لگ جاتی ہے۔ وہ دنیا پرستی کو چھوڑ کر
آخرت پسند انسان بن جاتا ہے۔

۲۳ جنوری ۱۹۹۱

آج کی اہم ترین خبر یہ ہے کہ عراق نے کویت کے تیل کے سیکڑوں کنوؤں میں آگ لگا دی ہے جس کے نتیجہ میں وہاں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور فضا میں کالا دھواں چھا گیا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۲۳ جنوری) کی پہلی سرخی یہ تھی کہ کویت کے تیل کے کنویں اڑا دیے گئے (Kuwait oilwells blown up) غالباً صدام حسین کو اب یہ یقین نہیں رہا ہے کہ وہ کویت کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے کویت کے تیل کے کنوؤں کو برباد کرنا شروع کر دیا ہے۔ تاکہ کویت کو چھوڑنا ہو تو اس طرح چھوڑیں کہ وہاں کچھ باقی نہ رہے۔ تقریباً ۳۵۰ ملین گیلن تیل انھوں نے سمندر میں بہا دیا۔

صدام حسین نے حال میں عراق کے جھنڈوں پر اللہ اکبر لکھوایا تھا۔ وہ اپنی موجودہ جنگ کو اسلامی جہاد کہتے ہیں۔ ان کے اس قسم کے نعروں سے متاثر ہو کر ساری دنیا میں مسلمانوں کی اکثریت اس فریب میں پڑ گئی کہ واقعتہً یہ اسلام اور کفر کی جنگ ہے۔ مگر جو لوگ خدا کی نعمتوں میں آگ لگائیں وہ کبھی اسلام کے مجاہد نہیں ہو سکتے۔ خلیفہ اول نے خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اسامہ کی سرکردگی میں شام کی طرف مہم روانہ کی تو ان کو یہ ہدایت دی کہ تم لوگ وہاں کوئی درخت نہ کاٹنا (لا تقطعوا شجراً)

جنگ میں "ایک درخت" کاٹنا بھی منع ہے۔ پھر تیل کے کنویں کو جلانا تو اس سے ہزاروں گنا زیادہ بڑی برائی ہے۔ تیل کے کنویں کو جلانے سے صرف تیل کا قدرتی ذخیرہ ہی برباد نہیں ہوتا بلکہ اس سے جو دھواں نکلتا ہے وہ آس پاس کی پوری فضا کو مہلک گیس سے بھر دیتا ہے۔ تیل کا ذخیرہ کسی شخص کی ملکیت نہیں۔ وہ انسانیت کے لیے اللہ کا ایک قیمتی عطیہ ہے۔ وہ خدا کی ایک قیمتی امانت ہے۔ انسان اس کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے مگر وہ اس کو ضائع کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ تیل کے ذخیرہ کو قصداً برباد کرنا خدا کی امانت میں ظالمانہ تصرف کرنے کے ہم معنی ہے جو بلاشبہہ ناقابل معافی جرم ہے (تفصیل کے لیے: سائنس رپورٹر، نئی دہلی، مارچ ۱۹۹۱)

صدام حسین نے تیل کے کنوؤں میں آگ لگائی۔ تیل کو سمندر میں بہا کر نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ چڑیوں اور مچھلیوں تک کے لیے خطرناک مسائل پیدا کر دیے۔ اس کے باوجود مسلمان صدام حسین کو "مجاہد اسلام" کا لقب دیے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اسلامی جہاد کا نام لیں مگر وہ اسلام کے احکام پر عمل نہ کریں، ایسے لوگوں کا کیس جہاد کا کیس نہیں بلکہ سرکشی کا کیس ہے۔ وہ سزا کے مستحق ہیں نہ کہ انعام کے مستحق۔

۲۴ جنوری ۱۹۹۱

خلیج کی ہولناک جنگ جاری ہے۔ دونوں طرف سے زبردست نقصانات ہو رہے ہیں۔ انسان مارے جارہے ہیں۔ شہر تباہ ہو رہے ہیں۔ سمندروں اور فضاؤں میں زہریلے اثرات پھیل جانے کی وجہ سے یہ حالت ہے کہ چڑیاں اور مچھلیاں تڑپ تڑپ کر مر رہی ہیں۔ اس تباہ کن جنگ پر صرف امریکہ کے زیر قیادت اتحادی فوجوں (الائیڈ فورسز) کا خرچ تقریباً ایک بلین ڈالر روزانہ ہے۔

جنگ لڑنے والے ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ وہ انسانی فلاح کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ خلیج کی موجودہ جنگ میں امریکہ کے زیر قیادت ۲۸ ملکوں کا اتحادی گروہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک کمزور قوم کے ساتھ ایک طاقت ور کی جارحیت کے خلاف لڑ رہا ہے۔ صدام حسین کے نزدیک اس جنگ کا مقصد ماضی کی غلطی کی اصلاح ہے یعنی کویت، جو اُن کے نزدیک عراق کا حصہ تھا، اس کو دوبارہ عراق میں شامل کیا جائے۔

۱۸۹۸ میں امریکن۔ اسپینش جنگ چھڑی۔ اس وقت برطانیہ اور دوسرے یورپی ملکوں کے چھ سفیر واشنگٹن میں جمع ہوئے تاکہ امریکہ کے صدر میک کنلے کو جنگ سے اعراض پر آمادہ کریں۔ اس وقت دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی، اس کا خلاصہ امریکی اخبار میں اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ سفیروں نے کہا کہ ہم کو امید ہے کہ انسانیت کی خاطر آپ جنگ نہیں کریں گے۔ صدر نے جواب دیا کہ ہم کو امید ہے اگر ہم جنگ کریں تو یہ عین انسانیت کی خاطر جنگ ہوگی:

Their ambassadors in Washington had a meeting with the US President, and the diplomatic exchanges were summarised by the New York World, of April 8, 1898, thus:

Said the six ambassadors: "We hope for humanity's sake you will not go to war."

Said Mr McKinley in reply: "We hope if we do go to war, you will understand that it is for humanity's sake."

پچھلے پچاس سال میں صرف "تیسری دنیا" میں تین سو چھوٹی بڑی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ہر فریق اپنے آپ کو برحق بتاتا ہے۔ یہ صورت حال آخرت کو ایک لازمی اخلاقی ضرورت ثابت کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت نہ آئے تو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ کون شخص حق پر تھا اور کون شخص ناحق پر۔

جنگ چھیڑنا اپنے اختیار میں ہے مگر جب جنگ چھڑ جائے تو اس کی تباہی اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ عقلمند وہ ہے جو جنگ کی نوبت ہی آنے نہ دے۔

۲۵ جنوری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۵ ۲ جنوری) میں اردو پریس کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بمبئی کے اردو روزنامہ "اردو ٹائمز" پر مسلمانوں کے ایک مشتعل ہجوم نے سنگ باری کی۔ اس کی کاپیاں سڑک پر جلائی گئیں۔ اخبار کے ملازموں کو دھمکیاں دی گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو ٹائمز واحد اردو پرچہ ہے جس نے خلیج کی جنگ میں صدام حسین کی مذمت کی اور سعودی حکومت کی موافقت کی پالیسی اختیار کی۔ عدم برداشت کا یہ مزاج کسی حقیقی صحافت کو وجود میں لانے کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

آج کل تمام اردو اخبارات پرجوش طور پر صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ ان کو صلاح الدین ایوبی اور "صدام مجاہد اسلام" لکھا جا رہا ہے۔ مسلم علاقوں میں صدام حسین کی تصویریں ہاٹ کیک کی طرح بک رہی ہیں۔ جن اردو اخبارات کی اشاعت بہت کم تھی، انھوں نے صدام حسین کی حمایت میں جذباتی مضامین لکھ کر اپنی اشاعت بہت زیادہ بڑھالی۔ مسلمانوں میں وہی اخبارات مقبول ہو رہے ہیں جن میں اس قسم کی سرخیاں ہوں:

"عراقی مزائلوں سے اسرائیل کی نیند حرام"۔ "بش نے صدام کے آگے گھٹنے ٹیک دیے" وغیرہ

مسلم صحافت کا اور مسلمانوں کا یہ حال دیکھ کر مجھے دوسری عالمی جنگ کا واقعہ یاد آتا ہے۔ اس زمانہ میں ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ مسلمان انگریزوں سے بے حد متنفر تھے۔ جنگ میں جب ہٹلر کی فوجوں نے برطانیہ پر بم گرائے تو مسلمان بہت خوش ہوئے۔ اخبارات میں ایک اردو شاعر کی نظم چھپ کر بہت مقبول ہوئی۔ اس کا عنوان تھا "ہٹلر اعظم"۔ اس نظم میں ہٹلر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

خبر لینے بکنگھم کی جواب کی بار پھر جانا ہمارے نام کا بھی ایک گولہ پھینکتے آنا

یہی جذباتیت آج مسلمانوں میں شدت سے ابھر آئی ہے۔ مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں سے سخت نفرت ہے۔ صدام حسین نے عیسائیوں (امریکہ) کے بارہ میں کہا کہ تم کو خلیج عرب میں غرق کر دیا جائے گا۔ اور اسرائیل کے اوپر کچھ اسکڈ (Scud) مزائل پھینک دیے۔ اس کے بعد مسلمان ایک طرف سے صدام حسین کی حمایت کرنے لگے۔ مگر یہ صرف سطحیت ہے۔ اس کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

مسلمانوں کے اس مزاج نے اردو صحافت کو انتہائی حد تک سطحی بنا دیا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اردو اخبارات پڑھنے والا آدمی عالمی حقیقتوں سے اتنا ہی بے خبر رہتا ہے جتنا غالب اور ذوق کا دیوان پڑھنے والا آدمی سائنسی علوم سے۔

۲۶ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۲۶ جنوری) میں صدام حسین کے اس محل کی تفصیل چھپی ہے جو انھوں نے بغداد میں بنوایا ہے۔ اس کی سرخی یہ ہے ــــ صدام اپنے اس محل کے تہ خانہ میں ایک سال تک رہ سکتے ہیں :

Saddam can live 1 year in his bunker

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بغداد کا یہ صدارتی محل ۱۲۰ فٹ گہرا ہے اور پورا لوہے اور سمنٹ پر بنایا گیا ہے۔ وہ مکمل طور پر ایر کنڈیشنڈ ہے۔ اس میں نیچے سے اوپر تک لفٹ کا انتظام ہے۔ صدام حسین اس میں ایک سال تک ایٹمی حملہ سے محفوظ حالت میں رہ سکتے ہیں۔ اس میں ایک زمین دوز ذخیرۂ آب سے پانی پہنچایا جاتا ہے جو محل سے ۴۰۰ میٹر فاصلہ پر واقع ہے۔ وغیرہ

ایک فرنچ انجینئر جس نے اس محل کو بنانے میں مدد دی تھی، اس نے کہا کہ جب آپ لفٹ کے ذریعہ اس زمین دوز محل میں اتریں تو آپ ایک نہایت موٹے دروازہ سے گزر کر صدام حسین کے دفتر میں پہنچیں گے۔ صدام حسین کی اندرونی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے کئی ایسے چیمبر سے گزرنا ہوتا ہے جو صرف کوڈ کے ذریعہ کھلتے ہیں۔ اس کے لیے میگنیٹک کارڈ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کے اور بہت سے خفیہ حفاظتی انتظامات ہیں جن کی تفصیل ڈیلی ٹیلی گراف نے چھاپی ہے۔

اس محل کے اندر ہر قسم کے تمام ضروری سامان کیے گئے ہیں۔ اس کے اندر ایسا کمیونی کیشن نظام ہے کہ صدام حسین اس کے اندر رہتے ہوئے تمام ملک سے اور پوری افواج سے مسلسل ربط قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ یہیں سے اپنی قوم کے نام ٹی وی پروگرام نشر کرتے ہیں۔ صدام حسین کوئی چیز اس وقت تک نہیں کھاتے جب تک کوئی دوسرا شخص ان کے سامنے اس کو چکھ نہ لے۔ فرانسیسی انجینیر نے کہا کہ صدام حسین اس زمین دوز محل میں لمبی مدت تک رہ سکتے ہیں اور یہاں سے جنگ کی رہنمائی کر سکتے ہیں :

Saddam Hussein could survive and function from this emplacement for a long time.

اس قسم کا زمین دوز محل بنا کر "ام المحارب" میں فتح کا خواب دیکھنا صرف صدام حسین کی کم عقلی کا ثبوت ہے۔ یہ "کلھیا میں گڑ پکانا" ہے۔ اور جو شخص کلھیا میں گڑ پکائے اس کا گڑ اس عالم اسباب میں کبھی تیار نہیں ہوتا۔

۲۷ جنوری ۱۹۹۱

مکہ متفقہ طور پر مسلمانوں کا سب سے زیادہ مقدس مقام ہے۔ خلیج کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد ۲۳-۲۵ جمادی الآخرۃ ۱۴۱۱ھ (۹-۱۱ جنوری ۱۹۹۱) کو مکہ میں ایک عالمی کانفرنس ہوئی۔ اس میں سعودی عرب کے اور تمام دنیا کے علماء جمع ہوئے۔ تین دن کے غور و بحث اور مشورہ کے بعد "اعلان مکۃ المکرمۃ الی الامۃ الاسلامیۃ" جاری ہوا۔ میرے سامنے اس کا وہ مستند متن ہے جو ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۱۰ جنوری ۱۹۹۱ء) میں سات صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس روداد کا عنوان یہ ہے ——— عراقی فوج کے نام پیغام، صدام کی نافرمانی شرعی طور پر واجب ہے (رسالۃ الی الجیش العراقی، عصیان صدام واجب شرعی)

رپورٹ کے مطابق، علماء کی موتمر نے متفقہ طور پر صدام کے خلاف یہ پکار بلند کی کہ تم فوراً کویت سے نکل جاؤ (اخرج یا صدام حسین من الکویت۔ اخرج الآن ولیس غدا) اس میں کہا گیا ہے کہ عراقی فوج پر لازم ہے کہ وہ ظالم صدام کی اس کے ظلم میں حمایت نہ کرے (الواجب علی جیش العراق الآیطیع الظالم فی ظلمہ) علماء اسلام کی اس عالمی کانفرنس نے متفقہ طور پر ساری دنیا کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ صدام حسین کا ساتھ نہ دیں، وہ خلیج میں صدام حسین کے اقدام کی مذمت کریں جس کے نتیجہ میں امریکہ اور مغربی طاقتوں کو خلیج میں آنے کا موقع ملا۔ اسی طرح دہلی میں بھی ہندستانی علماء کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں بھی وہی باتیں کہی گئیں جو مکہ کی کانفرنس میں کہی گئی تھیں۔

اصولاً میں علماء کی اس پکار سے متفق ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس پکار کے باوجود یہ ہوا کہ تقریباً ساری دنیا کے مسلمان صدام حسین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی بھی ملک کے مسلمانوں نے ان اعلانات اور ان اپیلوں کی پروا نہیں کی۔ عراق کی فوج کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صدام حسین کا ساتھ دینے کے لیے مجبور تھی۔ مگر مسلم عوام تو آزادانہ طور پر خود اپنے فیصلہ کے تحت صدام حسین کے حامی بنے ہوئے ہیں۔ مسلم علماء اور مسلم عوام کے درمیان علیحدگی کی اتنی بڑی مثال تاریخ میں کوئی اور نہیں ملتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مسلم علماء اور مسلم رہنماؤں نے ان قوموں کے خلاف مسلم عوام کو اتنا متنفر کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اب اس معاملہ میں غیر جذباتی رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔ "نفرتِ مغرب" کی جو نفسیات مسلمانوں میں پیدا کی گئی ہے، اس کا نتیجہ وہی نکل سکتا تھا جو نکلا۔

۲۸ جنوری ۱۹۹۱

عراقی لیڈر کی بلند بانگ تقریریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ عرب کے صحرا کو امریکیوں اور اتحادیوں کا قبرستان بنا دیا جائے گا۔ اس طرح کی باتیں مسلمانوں کو مجاہدانہ معلوم ہوتی ہیں۔ دوسری طرف سعودی عرب کے شاہ فہد کی بات مسلمانوں کو کمتر محسوس ہوتی ہے، کیونکہ انھوں نے امریکہ اور اس کے حلیفوں سے اتحاد کر لیا ہے۔ آج ایک صاحب نے بتایا کہ جامع مسجد کے علاقہ میں دیواروں پر ایسے پوسٹر لگائے گئے ہیں جن پر لکھا ہوا ہے: سعودی اور یہودی ایک سکہ کے دو رخ۔ ایک مسجد میں نماز ختم ہوئی تو ایک مسلمان نے ہاتھ اٹھا کر کہا: خدایا، سعود اور یہود کو ہلاک کر دے۔

خلیج کی نزاع میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر، اس کو سمجھنے کے لیے احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس معاملہ میں سعودی عرب حق پر ہے اور دوسرا گروہ ناحق پر۔

امام الترمذی نے عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں یہ قرینہ ملتا ہے کہ آخر زمانہ میں حق جزیرۂ عرب کی طرف ہوگا۔ اس روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دین حجاز میں پناہ لے گا جس طرح سانپ اپنی بل میں پناہ لیتا ہے (إن الدين ليأرز إلى الحجاز كما تأرز الحية إلى جحرها) جامع الاصول فی احادیث الرسول، ۹/ ۳۴۱

دوسری روایت میں موجودہ حالات کے بارہ میں براہ راست اشارہ ملتا ہے۔ امام ابوداؤد نے "کتاب الملاحم" میں نقل کیا ہے کہ ذو مخبر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم آئندہ روم (عیسائیوں) سے پُرامن صلح کرو گے۔ پھر تم اور وہ دونوں ایک اور دشمن سے لڑو گے۔ پھر تم لوگوں کو فتح ہوگی۔ تم غنیمت حاصل کرو گے اور سلامت رہو گے۔ پھر تم لوگ واپس ہوگے یہاں تک کہ تم ایک چراگاہ میں ٹھہرو گے جہاں ٹیلے ہوں گے۔ اس وقت عیسائیوں میں سے ایک شخص صلیب اٹھائے گا اور کہے گا کہ صلیب غالب آئی۔ پھر مسلمانوں میں سے ایک شخص کو غصہ آئے گا، وہ صلیب کو توڑ دے گا۔ اس وقت روم (عیسائی) عہد کو توڑ دیں گے اور جنگ کے لیے جمع ہو جائیں گے (سنن ابی داؤد، ۴/ ۱۰۹)

ان احادیث کی موجودگی میں مسلمانوں کی موجودہ روش یقینی طور پر درست نہیں۔ یہ صرف خواہش پرستی ہے نہ کہ قرآن و سنت کی پیروی۔

۲۹ جنوری ۱۹۹۱

انڈیا کے ایک انگریزی جرنلسٹ مسٹر ایس نہال سنگھ خلیجی جنگ کے زمانہ میں بغداد میں تھے۔ انھوں نے اپنے کچھ تجربات ہندستان ٹائمس (۲۹ جنوری) میں شائع کیے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ وہ کچھ اور صحافیوں کے ساتھ بغداد کے ممتاز ہوٹل الرشید میں مقیم تھے۔ مگر اس کا حال یہ تھا کہ کسی بھی بل کی ادائگی کے لیے صرف امریکی ڈالر ہی واحد قابل قبول سکہ تھا۔ یہاں امریکہ انتہائی نفرت کی علامت تھا، مگر عملاً امریکی ڈالر ہی بغداد پر حکومت کر رہا تھا :

> Much as the United States was the hated symbol of Western might, the dollar ruled Baghdad.

یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ آج امریکہ اور ترقی یافتہ مغربی ممالک نے کس طرح تمام ذرائع پر قبضہ کر رکھا ہے۔ آپ امریکہ جائیے تو آپ دیکھیں گے کہ جو مسلمان امریکہ سے نفرت کرتے ہیں، وہی اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے امریکہ کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں۔

ایسی حالت میں کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلم دنیا کو جدید سائنسی میدانوں میں ترقی یافتہ بنایا جائے۔ مگر اس رخ پر کسی بھی مسلم ملک میں کوئی قابل ذکر کام نہیں ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلم ملکوں کو پٹرول کا خزانہ دے کر وہ اقتصادی طاقت دے دی تھی جس کے ذریعہ مسلم دنیا اپنے ترقیاتی منصوبوں کو مکمل کر سکے مگر اس قدرتی خزانہ کو کچھ ممالک عیش وعشرت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اور کچھ ممالک یہ کر رہے ہیں کہ مغربی ملکوں سے خطرناک ہتھیار خرید کر خود مسلم ملکوں کے خلاف جارحانہ کارروائی کریں جس کی بدترین مثال وہ ہے جو عراق نے پیش کی ہے۔

صدام حسین کو پٹرول کی صورت میں مفت کی دولت مل گئی۔ اس دولت کو انھوں نے عراق کی ترقی میں نہیں لگایا۔ انھوں نے یہ کیا کہ روس، جرمنی، فرانس وغیرہ سے مہلک ہتھیار خرید کر پڑوسی ملکوں کو چیلنج کرنے لگے۔ اس کے برعکس اگر وہ اس قدرتی دولت کو ملک کی ترقی میں لگاتے تو عین ممکن تھا کہ عراق سکہ بھی وہ اقتصادی اہمیت حاصل کرلے جو آج امریکی ڈالر کو حاصل ہے۔

مسلمانوں کی بربادی کا سبب ان کی یہی داخلی کمزوری ہے نہ کہ کوئی بیرونی سازش۔ جو لوگ بیرونی سازشوں کی خبریں چھاپتے ہیں وہ صرف اپنی بے خبری کا ثبوت دے رہے ہیں۔

۳۰ جنوری ۱۹۹۱

لندن کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ لندن کے تمام مسلمان خلیج کے موجودہ بحران
ں صدام حسین کے حامی ہیں۔ صرف وہ تھوڑے سے مسلمان جن کو سعودی عرب سے پیسہ ملتا ہے، وہ سعودی عرب
اساتھ دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو کوئی دلیل نہیں۔ اس بات کو الٹ کر اگر میں یہ کہوں کہ جو لوگ
سدام حسین کے حامی ہیں ان کو عراق کی حکومت نے پیسہ دے رکھا ہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔
میں نے کہا کہ صدام حسین کو اگر حملہ کرنا تھا تو انھوں نے اسرائیل پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ کویت پر کیوں حملہ
یا۔ انھوں نے کہا کہ میں لندن میں عراق کے سفیر سے ملا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کویت پر کیوں حملہ کیا۔ سفیر
نے کہا کہ اصل میں تو ہم اسرائیل پر حملہ کرنا چاہتے تھے، ہم نے سعودی عرب اور کویت سے کہا کہ اس معاملہ میں
مارا ساتھ دو، مگر وہ ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس لیے ہم کو ایسا کرنا پڑا۔ میں نے کہا کہ آپ کو سفیر
راق سے پوچھنا چاہیے تھا کہ جب آپ نے سعودی عرب اور کویت کی حمایت کے بغیر ایران اور کویت پر
ملہ کر دیا تو اسی طرح آپ ان کی حمایت کے بغیر اسرائیل پر بھی حملہ کر سکتے تھے۔

پھر انھوں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ عراقی سفیر کے بیان کے مطابق، عراق کو یہ خطرہ تھا کہ جب
وہ اسرائیل پر حملہ کرے گا تو امریکہ کی فوجیں خلیج میں عراق کے خلاف آجائیں گی۔ میں نے کہا کہ آپ کو عراقی
سفیر سے دوبارہ کہنا چاہیے تھا کہ امریکی فوج تو کویت پر حملہ کی صورت میں بھی مکمل طور پر خلیج میں آگئی ہے۔
پھر جس طرح کویت پر حملہ کے وقت آپ نے امریکی فوج کی آمد کی پروا نہیں کی، اسی طرح آپ اسرائیل پر حملہ
کے وقت بھی امریکی فوج کی آمد سے بے پروا ہو کر اسرائیل کے خلاف اپنی فوجی کارروائی کر سکتے تھے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سوچ کتنی زیادہ سطحی
ہوگئی ہے اور مسلمانوں کے لیڈر کس طرح مسلمانوں کی کم فہمی کا استغلال کر رہے ہیں۔

انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ذاتی محرک کے تحت ایک اقدام کرتا ہے اور پھر اس کو جائز ثابت
کرنے کے لیے اصول کی زبان بولتا ہے۔ وہ اپنی قیادت قائم کرنے کے لیے ہنگامے کھڑے کرتا ہے اور اس
کو جہاد فی سبیل اللہ کا عنوان دیتا ہے۔ وہ قومی خواہش اور مادی مفاد کے تحت عمل کرتا ہے اور کہتا ہے
کہ وہ حق کی خاطر ایسا کر رہا ہے۔ ایسے لوگ سرکشی کی حد تک مجرم ہیں خواہ اپنی تبریہ کے لیے وہ کتنے ہی خوب
صورت الفاظ بولتے رہیں۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۳۱ جنوری) میں نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ـــــــ مسلمانوں کو مغرب کی طرف سے غضب ناک ردعمل کا اندیشہ :

Muslims fear backlash

اس رپورٹ میں دوسرے حوالوں کے ساتھ مسٹر کلیم خواجہ کا بیان نقل کیا گیا ہے۔ وہ امریکہ کی ایسوسی ایشن آف انڈین مسلمس کے پریسیڈنٹ ہیں۔ امریکہ میں اس وقت ایک لاکھ (100,000) ہندستانی مسلمان رہتے ہیں۔ تاہم جو مسئلہ پیدا ہوا ہے وہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے بارہ میں ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ خلیج کی جنگ اور اس معاملہ میں مسلمانوں کے عام رویہ نے مغرب کی مسیحی قوموں میں ان کے خلاف سخت نفرت اور غصہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ اس صورت حال کا شکار ہو رہے ہیں جس کو مسٹر خواجہ نے نسلی غضب ناکی (racist backlash) کا نام دیا ہے۔ مغربی ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کو نہ صرف تحقیر کا تجربہ ہو رہا ہے بلکہ ان کے خلاف تشدد کے واقعات بھی ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پرجوش مظاہروں نے خلیج کی جنگ کو اسلام اور عیسائیت کی جنگ بنا دیا ہے۔ اس نے غیر ضروری طور پر لوگوں میں صلیبی دور کی یادیں تازہ کر دی ہیں۔

مسٹر کلیم خواجہ نے اپنے بیان میں کہا کہ انھیں یہ پریشانی بھی ہے کہ خلیج کی جنگ سے پیدا شدہ اس صورت حال کا اثر جنوب ایشیائی ملکوں (مسلم ممالک) کی اقتصادیات پر بھی پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا ایک فوری اثر یہ متوقع ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کی طرف ٹکنالوجی کی آمد رک جائے گی۔ یہ ان ملکوں کے لیے ترقی میں رکاوٹ کے ہم معنی ثابت ہوگا :

> One immediate effect that can be expected, will be a halt of the supply of technology to third world countries. That will prove to be a major set-back. (p. 14)

امریکہ کے مسلم لیڈر کو موجودہ حالات کا یہ خطرناک نتیجہ نظر آتا ہے کہ مغربی ملکوں سے مسلم ملکوں کی طرف ٹکنالوجی کے آنے میں رکاوٹ پڑے گی۔ مگر میری نظر میں اس سے بڑا خطرہ وقوعی ہے۔ خلیج کی جنگ میں مسلمانوں کے پرجوش رویہ نے مسلمانوں اور مغرب کی مسیحی قوموں کے درمیان جو نفرت پیدا کی ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ان قوموں کے اندر اسلام کی اشاعت کا عمل رک جائے گا۔ یا کم از کم اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

یکم فروری ۱۹۹۱

ایک صاحب ایک اردو ماہنامہ لےکر آئے اور کہا کہ اس کے شذرات کو پڑھئے۔ اس میں لکھا ہوا تھا:

"امریکہ کے سخت رویہ اور مسلمانوں کو کچل دینے کی پالیسی نے عرب کی سرزمین کو اس وقت میدان کارزار میں تبدیل کر دیا ہے جہاں مانند آب مسلمان کا لہو ارزاں ہو گیا ہے اور تثلیث کے فرزند کھلم کھلا میراث خلیل میں دراندازی کر رہے ہیں۔ حالانکہ نبی آخر الزماں کا ارشاد ہے کہ اخرجوا الیهود والنصاریٰ من جزیرة العرب (جزیرۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دو) اور قرآن مجید میں ان سے عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے (لا تتخذوا الیهود والنصاریٰ اولیاء) مگر آپ کے پیروؤں اور خالص وارثوں نے ان کو اپنا حلیف بنا لیا ہے۔ اور اب ان کا لشکر جزیرة العرب میں دندناتا پھر رہا ہے۔ اور مسلمانوں کے اہم اور مرکزی شہر ناگاساکی اور ہیروشیما بنتے جا رہے ہیں" (معارف فروری ۱۹۹۱)

میں نے انھیں عربی ہفت روزہ الدعوۃ کے شمارے (۳۱ جنوری، ۲۱ فروری ۱۹۹۱) دکھائے۔ ان میں الشیخ ابن باز نے اضطرار کے اسلامی اصول کے تحت غیر مسلم حکومتوں سے تعاون لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر وہ بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ جو مولوی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ سب سعودیہ کے نمک خوار ہیں، وہ امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں، خاص طور پر ان کے "لکھنے اور بولنے والے طبقہ" کا عام انداز ہے۔ یہ لوگ اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اختلاف رائے پیش آتے ہی وہ طنز و تعریض اور عیب جوئی اور الزام تراشی کا انداز اختیار کر لیتے ہیں وہ تنقید کا جواب صرف تعییب سے دینا جانتے ہیں۔

اسلام میں صرف یہود و نصاریٰ کے جغرافی اخراج کا حکم نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ نفسیاتی امراض کے قلبی اخراج کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان سے بغض نہ رکھے۔ وہ انانیت میں مبتلا نہ ہو۔ وہ بے انصافی نہ کرے، وہ دوسرے کا بدخواہ نہ بنے۔ وہ انتقامی جذبہ کو اپنے دل سے نکال ڈالے۔ وہ کسی کی کردار کشی نہ کرے۔ کسی کی نیت پر حملہ نہ کرے۔ وہ کسی کی طرف غلط بات منسوب نہ کرے۔ وہ کسی کی بربادی کے درپے نہ ہو۔

مگر اس دوسرے "اخراج" سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔ جغرافی اخراج کے چیمپین قلبی اخراج کے معاملہ میں بے حقیقت ثابت ہو رہے ہیں۔

۲ فروری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۲ فروری) میں مسٹر شام لال کا ایک آرٹیکل چھپا ہے۔ خود آرٹیکل میں تو کوئی گہری بات نہیں، البتہ اس کا عنوان مجھے پسند آیا جو ان الفاظ میں ہے ـــــ لڑائی جیتو اور امن ہار دو :

Win the War; Lose the Peace

خلیج کی جنگ میں پچھلے دو ہفتہ کے اندر تقریباً پچاس بلین ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے۔ یہ نقصان مزید بڑھتا رہے گا۔ جنگ میں خواہ جو فریق جیتے، جہاں تک امن کا تعلق ہے، وہ بہرحال کھویا جا چکا ہوگا۔ بنگلہ دیش کی جنگ (۱۹۷۱) میں انڈیا جیت گیا۔ مگر اس کے بعد ملک میں تشدد اور مہنگائی اور کرپشن کا جو طوفان آیا اس نے امن اور سکون کو ہمیشہ کے لیے غارت کر دیا۔

یہی حال خلیج کی جنگ کے بعد بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ہونے والا ہے۔ اس جنگ میں فتح کا تمغہ جس فریق کو بھی ملے، عام انسان کی مصیبتوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ اور یہ مصیبتیں عالمی ہوں گی، حتی کہ اس کا برا اثر اس ملک تک بھی پہنچ جائے گا جس نے جنگ کے بعد فتح کا تمغہ حاصل کیا ہے۔

جنگ خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، وہ مسائل کے حل کے نام پر لڑی جاتی ہے، مگر ہر جنگ صرف مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک مغربی مفکر نے بالکل صحیح کہا کہ مسائل ہمیشہ وہ لوگ پیدا کرتے ہیں جو مسائل حل کرنے کے لیے سرگرم ہوتے ہیں :

Problems are created by problem-solving activity.

جنگوں کی تاریخ میں معلوم طور پر ایک ہی استثنائی نمونہ ہے، اور وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ پیغمبر اسلام کا دوسروں سے ٹکراؤ پیش آیا۔ مگر آپ نے جنگ کا طریقہ اتنا کم استعمال کیا کہ عملاً اور مقابلۃً وہ جنگ نہ کرنے کے برابر ہے۔ اس کے باوجود آپ نے انسانی مسائل کو اتنے کامیاب طور پر حل کیا کہ تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

پیغمبر اسلام کے ساتھ وہ تمام احوال پیش آئے جن کے نام پر جنگ کی جاتی ہے۔ مگر آپ نے جنگ کے بجائے امن کی طاقت سے ان کا مقابلہ کیا۔ مسلمان اگر اپنے پیغمبر کی اس سنت کو زندہ کریں، وہ دنیا کو دوبارہ دکھائیں کہ امن کی طاقت کس طرح سب سے بڑی طاقت ہے تو وہ نہ صرف خود اپنی جنگ لڑائی کے بغیر جیت لیں گے، بلکہ اس ربانی طریقہ کا مظاہرہ کرکے وہ قوموں کے امام بن جائیں گے۔

۳ فروری ۱۹۹۱

آج کل اخبارات کا پہلا صفحہ خلیج کی جنگ کی خبروں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مزید خصوصی
فحات صرف اسی جنگ کے بارہ میں ہوتے ہیں جن کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے : خلیجی جنگ
(The Gulf War ہندستان ٹائمس (۳ فروری) کا صفحہ ۱۴ اسی قسم کا ایک صفحہ ہے۔ اس میں حسب معمول
یج کی جنگ سے متعلق خبریں شائع ہوئی ہیں۔

جنگ کی ہلاکت کی خبروں کے درمیان ایک بلا عنوان خبر چار سطروں میں ہے۔ وہ یہ ہے —— ایک شخص
، پر الزام تھا کہ اس نے ۱۹۸۸ سے اب تک نیویارک کے راشسٹر علاقہ کی ۱۰ عورتوں کو قتل کیا ہے، اس کو
ِالت نے ۲۵۰ سال قید کی سزا دی ہے جو امریکی قانون میں ایسے مجرم کی کم سے کم سزا ہے :

A man convicted of killing ten Rochester area women in New York since 1988 has been sentenced to a minimum of 250 years in prison.

اخباری ترتیب میں بظاہر یہ سب سے چھوٹی خبر ہے۔ شاید ہی کسی پڑھنے والے نے اس خبر کو پڑھا ہو۔ مگر
یقت کے اعتبار سے وہ بلا شبہ سب سے بڑی خبر ہے۔ مہلک جرائم کی سزا جو ملکی قوانین میں مقرر کی گئی ہے،
ہ گویا انسانی ضمیر کی آواز ہے۔ یہ سزائیں دراصل انسانی ضمیر کا قانونی اظہار ہیں۔

انسانی ضمیر یہ چاہتا ہے کہ قتل کرنے والے کو قتل کیا جائے۔ یا کم از کم لمبی مدت تک کے لیے اس کو
بشقت قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی ضمیر کے مطابق، ان لوگوں کی
ِا کتنی زیادہ سخت ہونی چاہیے جو ایسی جنگ برپا کرتے ہیں جس میں لاکھوں افراد ہلاک ہوں۔ کروروں انسان
ٰمی اور اپاہج ہو جائیں۔ زندگی کے قیمتی وسائل بے حساب مقدار میں برباد ہوں۔ خشکی اور سمندر اور فضا
ب فساد سے بھر جائیں۔ جن قدرتی ذرائع کو خدا نے انسانیت کی تعمیر کے لیے پیدا کیا ہے، ان کو انسانیت
، تخریب میں ضائع کر دیا جائے۔ مذکورہ قاتل مزید ۲۵۰ سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ گویا انسانی عدالت
یک انفرادی مجرم کو بھی سزا دینے کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر جو لوگ ساری انسانی نسل پر ہلاکت کا عذاب
ڈیل دیں، ان کو سزا دینا کس کے اختیار میں ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ موجودہ محدود دنیا
ے بجائے ایک اور لامحدود دنیا ظہور میں آئے۔ لامحدود دنیا میں قائم ہونے والی عدالت ہی کے لیے
مکن ہے کہ وہ ایسے سرکش انسانوں کو بھرپور سزا دے سکے۔

۴ فروری ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ ۱۷ جنوری کو شروع ہوئی۔ اس وقت سے رات دن مسلسل بم باری کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر دو ہفتہ تک سارا معاملہ تقریباً یک طرفہ رہا۔ اتحادی جہاز عراق کے اوپر آگ برساتے رہے اور صدام حسین اور ان کی فوج زمین دوز بنکروں کے نیچے بیٹھی رہتی۔

۳۰ جنوری کو اس میں تبدیلی آئی۔ عراق کی زمینی فوج نے اچانک پیش قدمی کر کے سعودی عرب کی سرحدی بستی الخفجی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے فوراً بعد اتحادیوں کی زمینی اور ہوائی فوج متحرک ہوئی۔ دو دن تک "گھمسان کی لڑائی" کی خبریں آتی رہیں۔ آخر عراقی فوج کو بری طرح شکست ہوئی۔ بڑی تعداد میں عراقی ہلاک ہوئے۔ کچھ گرفتار ہوئے اور کچھ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگے۔

جنگ کے ایک ماہر نے کہا ہے کہ الخفجی کی جنگ عراقیوں کے لیے الٹی پڑے گی۔ اس سے پہلے امریکہ اور اس کے ساتھی عراق کی زمینی فوج سے ڈرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ زمینی جنگ میں عراق کو زیر کرنا بہت مشکل ہوگا۔ مگر الخفجی کے تجربہ نے انھیں عراقی فوج کی کمزوریوں (weaknesses) کو بتا دیا۔ اس جزئی جنگ میں اتحادیوں نے پایا کہ عراقی فوج کا کمیونی کیشن کا نظام بہت کمزور تھا۔ اسی طرح عراقی فوجیوں میں مہارت (skill) کی بھی بہت کمی نظر آئی۔ مزید یہ کہ انھوں نے محسوس کیا کہ عراقی فوجی دل سے لڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ عراقی فوجی لڑائی میں اتنے سخت نہیں تھے جتنا کہ خیال تھا کہ وہ ہوں گے :

...they were not as tough as we thought they might be

تازہ رپورٹ کے مطابق، الخفجی کے بعد امریکی فوج کے حوصلے بہت بلند ہو گئے ہیں اور اب وہ منصوبہ بنا رہے ہیں کہ پوری طاقت کے ساتھ کویت اور عراق پر حملہ کر کے کم سے کم مدت میں عراقی فوج کو تباہ کر دیں۔ الخفجی کے واقعہ نے عراقی فوج کا بھرم ختم کر دیا۔ اب تقریباً یقینی نظر آ رہا ہے کہ عراقی فوج امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا مقابلہ زمینی جنگ میں نہیں کر پائے گی اور رسوا کن شکست سے دوچار ہوگی۔

خواہ دو آدمیوں کا معاملہ ہو یا دو قوموں کا معاملہ، دھاک کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ آدمی اگر لڑ کر جیتنے والا نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ خاموش بیٹھا رہے۔ نہ لڑنے سے کم از کم یہ ہوتا ہے کہ وہ فریق ثانی کے اوپر اپنی دھاک قائم رکھتا ہے، جب کہ جنگ چھیڑنے کی صورت میں وہ جنگ بھی ہار جاتا ہے اور اسی کے ساتھ دشمن کی نظر میں وہ اپنی دھاک بھی کھو دیتا ہے۔

۵ فروری ۱۹۹۱

ریاض کے مشہور عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲۲ رجب ۱۴۱۱ھ) میں خلیج کی جنگ کے بارہ میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: الحماقۃ سلاح ایضا (بیوقوفی بھی ایک ہتھیار ہے)

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ مغرب کے فوجی افسروں میں سے ایک سے پوچھا گیا کہ اتحادی طاقتوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اتحادی طاقتوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار صدام حسین کی بے وقوفی اور اس کا طیش اور جنون ہے۔ اور انھیں چاہیے کہ وہ اِس ہتھیار سے فائدہ اٹھائیں تاکہ وہ جلد فتح حاصل کر سکیں:

سُئل احد القادة العسكريين الغربيين عن ابرز الاسلحة واشدها فتكا في يد القوات الدولية المتحالفة۔ فقال ان ابرز سلاح في ايدي القوات المتحالفة هو غباء صدام وطيشه وجنونه وان عليهم ان يستثمروا هذا السلاح ليتمكنوا من تحقيق نصر سريع (صفحہ ۱۰)

اس پر میں یہ اضافہ کروں گا کہ کوئی بھی شخص بے وقوف نہیں ہوتا۔ مشہور قول کے مطابق، کسی چیز کے لیے بڑھی ہوئی محبت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (حبك الشيئ يُعمي ويُصم) صدام حسین کی اصل کمزوری ان کا جنون عظمت ہے۔ اپنے آپ کو بڑا دیکھنے کے شوق نے ان کو مجنون بنا دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ ایسے اقدامات کر ڈالتے ہیں جو ان کی واقعی طاقت سے باہر ہوتے ہیں۔

۱۹۷۹ میں عراق کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد وہ مسلسل اسی قسم کی احمقانہ کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۸۰ میں انھوں نے الجزائر معاہدہ (۱۹۷۵) کو یک طرفہ طور پر منسوخ کر کے ایران پر حملہ کر دیا اور آٹھ سال تک بے فائدہ اس سے لڑتے رہے۔ اسی طرح ۲ اگست ۱۹۹۰ کو انھوں نے اچانک کویت پر حملہ کر کے اپنے آپ کو اتنی بڑی مشکل میں پھنسا لیا جس سے نپٹنے کی طاقت ان کے اندر نہیں۔

ایمان آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے، اور جس آدمی کے اندر تواضع کی صفت پیدا ہو جائے وہ ہر قسم کی حماقتوں سے بچ جائے گا۔ وہ ایسی طاقت بن جائے گا کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی اس کو زیر نہ کر سکے۔ حماقت اکثر حالات میں اپنے آپ کو بڑا سمجھ لینے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ایمان آدمی کو بڑائی کے جذبہ سے بچا لیتا ہے، اس لیے ایمان آدمی کو احمقانہ کارروائی سے بھی بچا لیتا ہے۔

۶ فروری ۱۹۹۱

مزائل (missile) سب سے پہلے جرمنوں نے دوسری عالمی جنگ میں استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد روس اور امریکہ وغیرہ نے اس کو مزید ترقی دے کر خطرناک قسم کے دور مار ہتھیار کی حیثیت دے دی۔ یہ ایک پیچیدہ مشین ہے جس کے سرے پر دھماکہ خیز چیزیں نصب ہوتی ہیں۔ اس کو لانچر کے ذریعہ دور کے نشانہ پر پھینکا جاتا ہے۔ اس کی رفتار ریڈیو کی لہروں کے ذریعہ کنٹرول ہوتی ہے۔ وہ نہایت تیز پٹاخہ کی طرح فضا میں اڑتے ہوئے مطلوبہ نشانہ پر جاکر گرتا ہے۔

جرمن ٹکنالوجی کو مزید ترقی دے کر روسیوں نے ایک خطرناک مزائل بنایا جس کو اسکڈ (Scud) کہا جاتا ہے۔ یہ اسکڈ مزائل عراق نے بڑی تعداد میں سوویت روس سے خرید کر حاصل کیے اور ان کو مزید ترقی دے کر اس قابل بنایا کہ ان کو دور کے نشانوں پر مارا جا سکے۔

عراق کے صدر صدام حسین کو اپنے اسکڈ مزائل پر بہت اعتماد تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسکڈ کی صورت میں ان کے پاس ایسا ہتھیار ہے کہ وہ حیران کن طور پر اپنے دشمنوں پر ضرب لگا سکتے ہیں۔ خلیج کی جنگ کے دوران انھوں نے ان کو مسلسل استعمال کیا۔ تقریباً ڈیڑھ درجن اسکڈ مزائل انھوں نے اسرائیل کے شہروں (حیفہ اور تل ابیب) پر پھینکے۔ اتنے ہی اسکڈ انھوں نے سعودی عرب (ظہران اور ریاض) نیز بحرین پر پھینکے۔ مگر عملاً ان کے اسکڈ مزائل غیر موثر ہو کر رہ گئے۔ کیوں کہ امریکی "پیٹریٹ" نے ان کو نشانہ پر پہنچنے سے پہلے مار کر گرا دیا۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ روس نے جب اسکڈ مزائل بنائے تو امریکہ نے بھی ریسرچ شروع کر دی کہ اس کا توڑ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امریکہ نے ایک جوابی مزائل تیار کیا جس کو پیٹریٹ مزائل کہا جاتا ہے۔ پیٹریٹ

میزائل میں یہ صلاحیت تھی کہ جس وقت اسکڈ اپنے لانچر سے نکل کر روانہ ہو، عین اسی وقت پیٹریٹ بھی اڑ کر تیزی سے اس کی طرف روانہ ہو، اور اسکڈ سے ٹکرا کر درمیان ہی میں اس کو ناکارہ کر دے۔ چنانچہ خلیج کی جنگ کے دوران عراق نے کئی درجن اسکڈ میزائل استعمال کیے۔ مگر امریکی پیٹریٹ ہر بار فضا میں پہنچ کر درمیان ہی میں اس سے ٹکرا گیا اور نشانہ پر پہنچنے سے پہلے اس کو ناکارہ بنا دیا۔

نیچے کی تصویر میں دونوں میزائلوں کو عمل کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک طرف عراق سے اسکڈ میزائل روانہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف عین اسی وقت اسرائیل کے امریکی فوجی اڈہ سے پیٹریٹ میزائل اڑتا ہے اور وہ راستہ میں اسکڈ میزائل سے ٹکرا کر درمیان ہی میں اس کو برباد کر دیتا ہے۔

پیٹریٹ میزائل کے اس عمل میں مصنوعی سیارہ سے لے کر زمینی کنٹرول اسٹیشن تک نہایت پیچیدہ نظام شامل رہتا ہے۔ تاہم پیٹریٹ کی کامیابی کا خاص راز اسکڈ میزائل کی ایک کمزوری ہے۔ اسکڈ کی خود اپنی ایک کمزوری نے امریکہ کو موقع دیا کہ وہ اس کا کامیاب توڑ تیار کر سکے۔

اسکڈ جب تیزی کے ساتھ فضا میں گزرتا ہے تو وہ نہایت سخت قسم کی گرمی پیدا کرتا ہے۔ یہ گرمی اسکڈ کی کمزوری ہے۔ پیٹریٹ فضا میں اٹھ کر اسی گرمی کا پیچھا کرتا ہے۔ پیٹریٹ میں ایسا مادہ ہوتا ہے جو گرمی کی طرف کھنچے۔ چنانچہ وہ گرمی کی رہنمائی میں اسکڈ تک پہنچ جاتا ہے اور اس سے ٹکرا کر اس کو درمیان ہی میں برباد کر دیتا ہے۔

اس دنیا میں ہر چیز کی ایک کمزوری ہے۔ ہر چیز خود اپنے ساتھ اپنا ایک توڑ لیے ہوئے ہے۔ اگر آپ اس توڑ کو جان لیں تو ہر چیز کا مقابلہ نہایت کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ہر مخالف چیز کو خود اسی کے ہتھیار کی مدد سے شکست دے سکتے ہیں۔

۷ فروری ۱۹۹۱

روزنامہ ہندستان ٹائمس (۶ فروری) میں سعودی عرب کے سابق آئل منسٹر احمد ذکی یمانی کا ایک بیان پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ خلیج کی جنگ تیل کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے سویڈش روزنامہ (Svenska Dagbladet) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں جس کے ہاتھ میں تیل کے ذرائع ہوں گے، وہی دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوگی :

> ...in future the power which will have oil resources in its hands will be the superpower of the world.

انھوں نے کہا کہ خلیج فارس چونکہ تیل کے عالمی ذخیرہ کا ۷۵ فی صد حصہ رکھتا ہے، خلیج میں امریکی غلبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ امریکہ اس کے ذریعہ اس قابل ہو جائے گا کہ وہ مستقبل کے بین اقوامی حالات میں تیل کو ایٹم بم کے بدل کے طور پر استعمال کر سکے :

> ...because the Persian Gulf has 75 per cent of the entire resources of the world, a U.S. domination of Gulf oil would mean it would be able to use as an alternative to atomic bomb in future international developments (p. 12).

مزید یہ کہ آج ہی کے اخبار میں امریکی صدر مسٹر جارج بش کا ایک بیان چھپا ہے۔ انھوں نے واشنگٹن میں کہا کہ خلیج کی جنگ امریکہ کی آخری جنگ ہوگی۔ اس کے بعد نئے عالمی نظام کی وجہ سے کوئی اور جنگ لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی :

> ...the Gulf war would be America's last war. There would be no need to fight another one because of the new world order (p. 12).

دور اول میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سیاسی اقتدار دیا۔ اس کے ذریعہ وہ ساری دنیا میں اسلام کا دبدبہ قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ موجودہ زمانہ میں دوبارہ اللہ کی مدد سے مسلم دنیا کے نیچے تیل کا قدرتی خزانہ نکل آیا جو صنعتی دور میں سپر پاور بنانے کا ذریعہ ہے۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ ان کے اثاثہ کے ذریعہ دوسری قوم عالمی سپر پاور بن رہی ہے اور خود مسلمانوں کے حصہ میں مغلوبیت کے سوا اور کچھ نہیں۔

خارجی مواقع کو استعمال کرنے کے لیے داخلی طاقت درکار ہے، داخلی کمزوری کے ساتھ خارجی مواقع کو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ داخلی طاقت کے بغیر خارجی مواقع کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص کا جسم ہو مگر اس سے اس کی روح نکل گئی ہو۔

۸ فروری ۱۹۹۱

قومی آواز (۸ فروری) اور دوسرے اخبارات میں یہ رپورٹ چھپی ہے کہ پاکستان کی سیاست اس وقت بحران میں مبتلا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت خلیج کے مسئلہ میں سعودی عرب اور امریکہ کے ساتھ ہے مگر وہاں کے عوام پر جوش طور پر صدام حسین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد کے وزیر اعظم نواز شریف نے ۵ جنوری کو سارے ملک میں یوم کشمیر منایا۔ اس کا مقصد خلیجی مسئلہ سے عوام کی توجہ کو ہٹانا تھا۔ مگر حکومتی سطح پر اس کو کامیاب کرنے کی ساری کوششوں کے باوجود یوم کشمیر کامیاب نہ ہو سکا۔

یہی صورت حال زیادہ بڑے پیمانہ پر عرب دنیا کی ہے۔ وہاں واضح طور پر مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ خواص کا ایک طبقہ سعودی عرب اور امریکہ کے ساتھ ہے۔ مگر عوام بالکل طوفانی انداز میں صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال موجودہ زمانہ کی مسلم قیادت کی ایک بہت بڑی کمزوری کو بتاتی ہے۔ اور وہ ہے : سیاست کو حقیقت پسندانہ بنیاد پر چلانے کے بجائے جذباتی بنیادوں پر چلانا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد فلسطین کا جو مسئلہ پیدا ہوا وہ بلا شبہہ ایک سنگین مسئلہ تھا، اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ تھا کہ قول اور عمل میں تناسب کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی مہم چلائی جاتی۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگوں نے یہ کیا کہ عملی امکانات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بڑے بڑے الفاظ بولتے رہے۔ پچھلے پچاس برس میں ان کا حال یہ رہا کہ تقریر اور تحریر کے ہر موقع پر "قبلہ اول" کے معاملہ میں لوگوں کو جذباتیت کی خوراک دیتے رہے۔ یہاں تک کہ مشرق سے مغرب تک تمام مسلم عوام فلسطین کے مسئلہ میں آخری حد تک جذباتی ہو گئے۔

موجودہ مسلمان اسی قسم کی لفظی جذباتیت پر بنی ہوئی قوم تھے۔ صدام حسین نے اسی کا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے کہا کہ "تم فلسطین کو یہودیوں سے خالی کراؤ، اس کے بعد ہم بھی کویت سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں گے"۔ صدام حسین کا یہ بیان محض ایک خوش نما نعرہ تھا، مگر مسلمان، جن کو پہلے ہی نعرہ پسند بنایا جا چکا تھا، وہ عین اپنے مزاج کے تحت اس لفظی نعرہ کی طرف دوڑ پڑے۔

سیاست کا تعمیری طریقہ یہ ہے کہ کسی معاملہ میں عوام کو ضرورت سے زیادہ حساس نہ بنایا جائے۔ جب بھی ایسا کیا جائے گا تو یہی ہوگا کہ عوام سنجیدہ معاملہ کی اہمیت کو نہیں سمجھیں گے اور جس چیز میں انھیں مبالغہ آمیز حساسیت میں مبتلا کیا گیا ہے اس کی طرف ہجوم کر کے دوڑ پڑیں گے۔

۹ فروری ۱۹۹۱

دکتور عبدالرحمٰن العوضی کویت کی حکومت کے ایک وزیر ہیں۔ وہ امیر کویت کے خصوصی نمائندہ کے طور پر نئی دہلی آئے۔ یہاں انھوں نے حکومت ہند کے ذمہ داروں سے ملاقات کی۔ ۸ فروری ۱۹۹۱ کو انھوں نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کی۔ اس کی تفصیلات آج کے اخباروں میں شائع ہوئی ہیں۔

دکتور العوضی نے اس کا اعتراف کیا کہ اس وقت مسلم دنیا میں صدام نوازی کا طوفان آیا ہوا ہے اور امریکہ کو ظالم قرار دے کر اس کی مذمت کی جارہی ہے۔ مگر اس کی وجہ سوچ کا فرق ہے۔ انھوں نے کہا کہ خلیج کی جنگ ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو شروع نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ ۲ اگست ۱۹۹۰ سے ہی شروع ہو چکی تھی جب کہ عراق نے جارحیت کرکے کویت پر فوجی قبضہ کر لیا (قومی آواز، ۹ فروری ۱۹۹۱)

کویتی وزیر کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جنگ کا آغاز صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کیا، اس لیے ہم کو صدام حسین جارح نظر آتے ہیں۔ مسلم عوام یہ سمجھ رہے ہیں کہ جنگ کا آغاز امریکہ نے ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو کیا۔ اس لیے انھیں نظر آتا ہے کہ اس معاملہ میں زیادتی امریکہ کی طرف ہے۔

اس کو میں نے پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہ صرف خلیج کی موجودہ لڑائی کی بات نہیں ہے، یہی تمام نزاعات کی بات ہے۔ جو لوگ نزاع کے آغاز کو "۲ اگست" سے شمار کرتے ہیں وہ ایک فریق کو ذمہ دار بتاتے ہیں، اور جو لوگ نزاع کا آغاز "۱۷ جنوری" سے کرتے ہیں ان کے نزدیک ساری ذمہ داری دوسرے فریق کے خانہ میں چلی جاتی ہے۔

نزاع کی ہر کہانی میں پہلے عمل ہوتا ہے، اور اس کے بعد اس کا ردعمل۔ اس طرح اس کا ایک نصف اول ہوتا ہے، اور دوسرا اس کا نصف ثانی۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس طرح کے معاملہ میں پوری کہانی کو نہیں بتاتے۔ ہر آدمی اس حصہ کو لے لیتا ہے جو اس کے موافق ہو۔ کوئی حصۂ اول کو نمایاں کرتا ہے، اور کوئی حصۂ ثانی کو۔

جب بھی دو فریقوں میں کوئی ٹکراؤ یا فساد پیدا ہوتا ہے تو اس واقعہ کا ایک "۲ اگست" ہوتا ہے اور ایک اس کا "۱۷ جنوری"۔ جو لوگ واقعہ کو ۲ اگست کے اعتبار سے دیکھتے ہیں ان کو ایک فریق غلطی پر نظر آتا ہے، اور جو لوگ واقعہ کو ۱۷ جنوری کے اعتبار سے دیکھتے ہیں ان کو دوسرا فریق غلطی پر دکھائی دیتا ہے۔ تاہم اسلامی نقطۂ نظر سے "۲ اگست" والا فریق ہی غلط ہے، کیونکہ: البادیٔ اظلم (آغاز کرنے والا زیادہ ظالم ہے)

۱۰ فروری ۱۹۹۱

پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف نے امن مشن کے تحت چھ مسلم ملکوں کا دورہ کیا۔ جنوری ۱۹۹۱ کے آخری ہفتہ میں وہ ایران، ترکی، شام، اردن، مصر اور سعودی عرب گئے۔ ہر جگہ وہ حکومت کے سربراہوں سے ملے اور خلیج کی جنگ کو روکنے کے لیے بات چیت کی۔ ہندستان ٹائمس (۱۰ فروری) کی ایک خبر سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے "گلف پیس مشن ۲" کے تحت دوسرے دورہ پر روانہ ہوئے ہیں۔ اس دورہ میں وہ الجیریا، مراکو، تیونس اور لیبیا جائیں گے۔ اس سلسلہ میں وہ اسلام آباد میں عراقی سفیر اسماعیل حمودی حسین سے بھی کئی بار مل چکے ہیں۔ اردن کے شاہ حسین کے ذریعہ انھوں نے اپنا پیغام صدام حسین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

پاکستانی روزنامہ نوائے وقت (۲ فروری ۱۹۹۱) کے صفحہ اول کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر نواز شریف نے اسلام آباد میں وزیر اعظم سکرٹریٹ میں ملک کی سیاسی و مذہبی جماعتوں کے قائدین اور دوسرے ممتاز سیاست دانوں سے خلیج کی صورت حال پر گفتگو کی اور اپنے "امن مشن" کی تفصیلات سے انھیں آگاہ کیا۔ "وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ ہم نے صدر صدام حسین سے صرف تین لفظوں کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ یہ کہہ دیں کہ آئی ول وِدڈرا (I will withdraw) تو پھر باقی کام آسان ہو جائے گا"۔ یعنی میں کویت سے اپنی فوج واپس بلا لوں گا۔

مسٹر نواز شریف کا یہ بیان صرف ان کی سادہ لوحی کا ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مذکورہ تین لفظ (آئی ول وِدڈرا) کی بات نہیں، بلکہ ایک اور تین لفظ آئی واز رانگ (I was wrong) کی بات ہے۔ اور یہ دوسرا تین لفظ ایسا ہے جس کو کہنے والا آج کی دنیا میں کوئی نہیں، حتی کہ خود پاکستان کے اسلام پسند لیڈر بھی نہیں۔

"میں نے غلطی کی" کہنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ در اصل اپنے آپ کو رد کرنا ہے۔ یہ خود اپنی زبان سے اپنی نفی کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ جملہ کہنے کے لیے بہت بڑا حوصلہ درکار ہے۔ چونکہ لوگوں میں اتنا بڑا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس جملہ کو اپنی زبان سے دہرانے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔

آدمی جب ایک بات بول دے یا وہ ایک اقدام کر بیٹھے تو اس کے بعد وہ اس کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر میں نے اپنے کو غلط کہا یا اپنے اقدام کو واپس لیا تو لوگوں کی نظر میں بے قیمت ہو جاؤں گا۔ یہ اندیشہ اس کو اعتراف سے روک دیتا ہے۔ اپنے خیالی وقار کو بچانے کے لیے وہ اپنے پورے وجود کو اور بعض اوقات پوری قوم کو تباہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

۱۱ فروری ۱۹۹۱

عراق کے حکمراں صدام حسین نے ۱۹۸۰ میں اپنی فوجیں ایران کے اندر داخل کر دیں۔ اس وقت ان کا نعرہ تھا کہ الطریق الی القدس یمرّ بطہران (قُدس کا راستہ تہران سے گزرتا ہے) مگر آٹھ سال کی باہمی لڑائی کے بعد ۱۹۸۸ میں دونوں کے درمیان جنگ بندی ہوئی تو حال یہ تھا کہ قُدس پر یہودیوں کا قبضہ بدستور باقی تھا۔ البتہ دو مسلم ملکوں کی آپس کی جنگ میں دونوں طرف کے لاکھوں آدمی مارے گئے اور کھربوں روپیہ کی دولت ضائع ہوگئی۔

صدام حسین نے دوسری بار اگست ۱۹۹۰ میں کویت پر حملہ کر دیا۔ کویت ایک بے حد چھوٹا ملک تھا، وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکا۔ چنانچہ عراق کی فوجیں اس پر قبضہ کر کے بیٹھ گئیں۔ اس جارحانہ اقدام کے متعلق بھی دوبارہ صدام حسین کا نعرہ ہے کہ الطریق الی القدس یمرّ بالکویت (قُدس کا راستہ کویت سے گزرتا ہے)

دونوں بار مسلم دنیا کے بہت سے لوگ اس نعرہ کے فریب میں آگئے۔ انھوں نے صدام حسین کی حمایت کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے یقین کر لیا کہ صدام حسین تہران اور کویت سے ہو کر یروشلم میں داخل ہونا چاہتا ہے تاکہ قُدس (بیت المقدس) کو آزاد کرائے۔ ان مسلمانوں میں سے کسی نے یہ نہ سوچا کہ صدام حسین کو اگر یروشلم پر قبضہ کرنا تھا تو ان کو بغداد سے سیدھے یروشلم کی طرف مارچ کرنا چاہیے تھا، انھوں نے اس مقصد کے لیے یہ ٹیڑھا راستہ کیوں اختیار کیا کہ پہلے تہران اور کویت پر قبضہ کرو، اس کے بعد یروشلم کی طرف اقدام کرو۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی بے شعوری ہے جس کی وجہ سے وہ جھوٹے نعروں کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ اگر مسلمان ایک باشعور قوم ہوتے تو وہ صدام حسین کے جارحانہ اقدام کی کبھی حمایت نہ کرتے، مگر مسلمانوں کی بے شعوری کی وجہ سے صدام حسین کو مسلم دنیا میں اپنے بہت سے حامی مل گئے۔

اسی بے شعوری کی بنا پر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف الفاظ کو جانتے ہیں، معانی کی انھیں خبر نہیں۔ وہ باتوں کو صرف ظاہری سطح پر دیکھتے ہیں، وہ باتوں کو اندرونی سطح پر دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ اپنے جذبات سے واقف ہیں مگر خارجی دنیا کے حقائق کا انھیں پتہ نہیں۔ وہ سچے اقدام اور جھوٹے اقدام کا فرق نہیں جانتے۔ اور جو لوگ سچے اقدام اور جھوٹے اقدام کا فرق نہ جانیں، ان کو کوئی بھی چیز بربادی کی چھلانگ سے بچانے والی نہیں۔

اس دنیا میں "فرق" کو جاننا سب سے بڑی دانائی ہے۔ اور فرق کو نہ جاننا سب سے بڑی نادانی۔

۱۲ فروری ۱۹۹۱

"المجلۃ" ایک عربی ہفت روزہ ہے۔ وہ جدہ میں چھپتا ہے اور لندن سے شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۲ فروری ۱۹۹۱ میں کویت کے ایک وزیر الدکتور عبد الرحمن العوضی کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو کے سوالات وجوابات کا تعلق خلیج کی موجودہ صورت حال سے ہے۔

المجلہ کے نمائندہ نے دکتور العوضی سے پوچھا کہ آئندہ کویت کا مستقبل داخلی اعتبار سے کیا ہوگا (کیف سیکون مستقبل الکویت داخلیا) دکتور العوضی نے اس کا جو جواب دیا، اس کا ایک جزء یہ تھا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم ماضی کے تجربہ سے سبق سیکھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور شاید سب سے بڑی غلطی جس میں ہم مبتلا ہوئے، وہ یہ تھی کہ ہم نے ایسے شخص کے اوپر اعتماد کیا جو اس کا مستحق نہ تھا (ینبغی أن نتعلّم من دروس سابقۃ و نستفید منھا۔ ولعلّ اھمّ خطأ وقعنا فیہ ھو وضع ثقتنا فی من لا یستحقّھا) صفحہ ۳۷

کویت نے عراقی صدر کو اپنا عرب بھائی سمجھ کر ان کے اوپر اعتماد کیا اور بلینوں ڈالر کے ذریعہ ان کی مدد کی۔ مگر عراقی صدر نے اپنے آپ کو طاقتور بنا کر خود اپنے محسن کے اوپر حملہ کر دیا۔ چنانچہ اب کویت کے ذمہ دار اعلان کر رہے ہیں عراقی صدر بھروسہ قابل نہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ عین اسی وقت ساری دنیا کے مسلمانوں نے عراقی صدر کی تقریروں سے متاثر ہو کر دوبارہ ان کے اوپر سب سے زیادہ بھروسہ کر لیا ہے۔ وہ ان کو اپنا حمایتی اور اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلم عوام حال میں وہی غلطی کر رہے ہیں جو کویتی حکمرانوں نے ماضی میں کی۔ دونوں نے عراقی صدر کی باتوں کی بنیاد پر ان کے بارہ میں اپنی رائے قائم کی۔ حالانکہ اصل قابل لحاظ چیز کردار ہے نہ کہ بات۔ امام مالک نے قاسم بن محمد تابعی کے بارہ میں نقل کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے:

ادرکتُ النّاسَ وما یَعجبُون بالقولِ۔ انما یُنظرُ إلی عملِہِ ولا یُنظَرُ إلی قولِہ (موطا، صفحہ ۷۰۲)

میں نے ایسے لوگ (صحابہ) دیکھے ہیں جو قول کو کچھ بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دراصل آدمی کا عمل دیکھا جائے گا، اس کا قول نہیں دیکھا جائے گا۔

کتنا زیادہ فرق ہے صحابہ کی سوچ میں اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سوچ میں۔

۱۴ فروری ۱۹۹۱

نوائے وقت (۱۲ فروری) میں ملک امجد حسین ایڈوکیٹ کا مضمون چھپا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خلیج کی جنگ نے پاکستانی عوام کو جذبات کی رو میں بہادیا۔ وہ حقائق کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک صدام حسین اسلام کے ہیرو ہیں اور انھوں نے فلسطین کے مسئلہ کو زندہ کیا ہے۔ کویت پر قبضہ کے سلسلہ میں ان کا کہنا ہے کہ کویت تو عراق ہی کا حصہ تھا۔ اس کو ۱۹۱۸ میں انگریز نے اس سے علٰحدہ کر کے ایک آزاد اور خود مختار ریاست کا درجہ دے دیا۔

مضمون نگار کے جواب کا ایک پیراگراف یہ ہے: اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انگریز نے اپنی مصلحت کے تحت ۱۹۱۸ میں کویت کو عراق سے علٰحدہ کر کے ایک آزاد اور خود مختار ریاست میں تبدیل کیا تب بھی ایسا کہنا حقیقت کا تقاضا نہیں۔ اس طرح تو پاکستان بھی ۴۴ سال پہلے ہندستان کا حصہ تھا۔ اور بھارت والے یہ موقف اختیار کر سکتے ہیں کہ انگریز نے اپنے مفاد کے لیے اس کو ہندستان سے کاٹ کر ایک علٰحدہ ریاست بنا دیا، یہ کہہ کر وہ زبردستی پاکستان پر قبضہ کر لیں۔ ایسا خیال تاریخی اور واقعاتی طور پر درست نہیں۔ (صفحہ ۴)

اسی کا نام دہرا منطق ہے، اور دہرا منطق مسلمانوں کا خاص مزاج ہے۔ کویت پر عراقی قبضہ کے لیے وہ جس منطق کو درست سمجھتے ہیں، اسی منطق کو پاکستان پر ہندستانی یا فلسطین پر یہودی قبضہ کے لیے درست ماننے پر تیار نہیں۔

لکھنؤ کے عربی پرچہ الرائد (یکم فروری ۱۹۹۱) نے محمد وجدی قندیل کا ایک مضمون نقل کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــ خلیجی لڑائی کا ذمہ دار کون (مَن المسئول عن الحرب) مضمون نگار نے خلیج کی جنگ کے تباہ کن نقصانات کا ذکر کیا ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ جنگ کی اس آگ کو بھڑکانے کا ذمہ دار کون ہے، وہ کون ہے جس نے عراق کے اوپر جہنم کے دروازے کھول دیے۔ حقائق بتاتے ہیں کہ یہ صدام حسین ہیں جو اس جنگ کا سبب بنے۔ عراقی لیڈرشپ ہی اس ہیبت ناک المیہ کی ذمہ دار ہے جس کا سامنا عراق کو ہے (القیادۃ العراقیۃ ھی التی تتحمل المسئولیۃ عن الماساۃ الرھیبۃ التی یتعرض لھا العراق) صفحہ ۶

یہ بات اسلامی اصول کے عین مطابق ہے۔ اسلام میں سبب کو دیکھا جاتا ہے نہ کہ نتیجہ کو۔ اس طرح کے معاملات خواہ جہاں بھی ہوں، صاحب سبب کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

مگر یہ سراسر اسلام کے خلاف ہے کہ آدمی ایک جگہ ایک دلیل استعمال کرے اور دوسری جگہ دوسری دلیل۔ ایک معاملہ میں وہ ایک طریقہ کا حامی ہو اور دوسرے معاملہ میں وہ دوسرے طریقہ کی حمایت کرنے لگے۔

۱۴ فروری ۱۹۹۱

لندن سے شائع ہونے والے عربی المجلۃ (۱۳-۱۹ فروری ۱۹۹۱) میں الدکتور تحسین معلا کا انٹرویو چھپا ہے۔ موصوف نے جامعہ بغداد میں میڈیکل تعلیم حاصل کی ہے۔ ایک زمانہ میں وہ صدام حسین کے ذاتی معالج رہ چکے ہیں۔

دکتور معلا نے جنگ کے نتیجہ میں عراق کی تباہی کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ عراقی قوم آج سخت ترین مصیبت میں مبتلا ہے۔ اور یہ بلاشبہ ہر انسان کے لیے تکلیف دہ ہے۔ مگر ان مصیبتوں کا اصل ذمہ دار انھوں نے "اتحادی طاقتوں" کو نہیں قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی ذمہ داری تمام تر عراقی لیڈر شپ پر ہے۔

عراق صدام حسین کے جرائم کی قیمت ادا کر رہا ہے (العراق یدفع ثمن جرائم صدام حسین) صفحہ ۴۲

اسی طرح ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۱۴ فروری ۱۹۹۱) میں اس کے "المحرر السیاسی" کے قلم سے دو صفحہ کا ایک جائزہ چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ جنگ کے نتیجہ میں فلسطینیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، وہ ان عرب ملکوں سے کٹ گئے جو بلینوں ڈالر کے ذریعہ مسلسل ان کی مدد کر رہے تھے اور اپنے یہاں ان کو عزت کی جگہ دیے ہوئے تھے۔ وہ اس قسم کے تمام فوائد سے محروم ہو گئے۔

اس نقصان اور محرومی کا سبب عرب ممالک یا کوئی اور نہیں ہے بلکہ خود فلسطینیوں کی اپنی قیادت ہے۔ فلسطینی قوم نے بہت مہنگی اور بہت بھاری قیمت ادا کی ہے، اور اس کا سبب بعض فلسطینی لیڈروں کا وہ موقف ہے جو انھوں نے کویت پر قبضہ کے سلسلہ میں صدام حسین کے جرائم کی تائید کر کے اختیار کیا۔ (ان الشعب الفلسطینی دفع الثمن غالیاً و باھظاً بسبب الموقف الذی اتخذتہ بعض القیادات الفلسطینیۃ بتایید اجرام صدام حسین فی احتلالہ لدولۃ الکویت) صفحہ ۸

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ مگر اس کا تعلق صرف کویت اور عراق سے نہیں ہے بلکہ ساری دنیا سے ہے۔ ہر جگہ (بشمول ہندستان) آج مسلمانوں کو جن مشکلات اور مصائب کا سامنا ہے، ان سب کی واحد ذمہ داری موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں پر آتی ہے نہ کہ مفروضہ "اسلام دشمنوں" پر۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں نے، تقریباً بلا استثناء، مسلمانوں کی نہایت غلط رہنمائی کی۔ وہ ان کو جذباتی نعروں پر دوڑاتے رہے۔ اس کے نتیجہ میں خود ان لیڈروں کو تو شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی۔ مگر مسلم عوام کے حصہ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ ان کی مشکلات میں مزید بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

۱۵ فروری ۱۹۹۱

آج کی ڈاک سے لاہور کا ماہنامہ آئین (فروری ۱۹۹۱) ملا۔ یہ جماعت اسلامی پاکستان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۲۶ جنوری کو جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس میں خلیج کے مسئلہ سے متعلق ایک قرار داد اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔

قرار داد میں کہا گیا ہے کہ امریکہ خلیج کی یہ جنگ اپنے سامراجی مقاصد اور سیاسی عزائم کے لیے کر رہا ہے۔ اس کو فوری طور پر بند ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ "یہ پوری دنیا کے مسلمانوں اور امن پسند انسانوں کے دل کی پکار ہے۔ اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں اور عراق دونوں کو ضد اور ہٹ دھرمی کی روش ترک کر کے امن کی اس اپیل پر لبیک کہنا چاہیے"۔

جماعت اسلامی کی یہ اپیل میرے نزدیک کھوکھلے الفاظ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ کیوں کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا یہ ظالمانہ اقدام اپنے ذاتی انٹرسٹ کے تحت ہوا ہے، اور جہاں ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ ہو وہاں کوئی بھی اپنی ضد کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ خود مذکورہ اپیل کرنے والے لوگ بھی نہیں۔

اس کی ایک مثال خود پاکستان کا واقعہ ہے۔ پاکستان کے سابق فوجی صدر جنرل ضیار الحق نے مسٹر بھٹو پر مقدمہ چلا کر عدالت سے پھانسی کا فیصلہ حاصل کیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اور جماعت اسلامی نے پوری طرح اس معاملہ میں جنرل ضیار الحق کی تائید کی۔ جب مسٹر بھٹو کی پھانسی کا اعلان ہوا تو تمام دنیا کے ممالک (بشمول مسلم ممالک) نے اپیل کی کہ بھٹو کو پھانسی نہ دی جائے۔ مگر جماعت اسلامی اور جنرل ضیار الحق نے اس عمومی اپیل کی پروا نہ کی اور بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ بھٹو کا زندہ رہنا ان کی اپنی سیاسی موت کے ہم معنی ہوگا۔

آج تمام لوگوں کا یہ حال ہے کہ جہاں ان کا ذاتی انٹرسٹ ہو وہاں وہ کسی کی بات نہیں سنتے۔ ایسے لوگ دوسروں کو کس طرح نصیحت کر سکتے ہیں کہ تم اپنے انٹرسٹ کو نظر انداز کر کے دوسروں کی بات سنو اور اپنے اقدام کو واپس لے لو۔ لوگوں کے پاس دوسروں کے لیے اصول ہے اور اپنے لیے مفاد۔ اس معاملہ میں لوگوں کا حال وہی ہے جو برطانی ادیب ڈبلیو ایس لینڈر (۱۸۶۴ - ۱۷۷۵) نے کہا تھا کہ ہم اصول کی بات کرتے ہیں مگر ہم مفاد پر عمل کرتے ہیں :

We talk on principle, but we act interest.

۱۶ فروری ۱۹۹۱

المجلة (۱۳-۱۹ فروری) میں ایک احتجاجی جلوس (تظاهرة) کی تصویر ہے۔ یہ امریکہ میں بسنے والے عراقیوں کا جلوس ہے۔ وہ مختلف تختیاں اٹھائے ہوئے سڑک پر چل رہے ہیں۔ ایک تختی پر لکھا ہوا ہے:

الجالية العراقية غير مسئولة عن جرائم صدام (عراقی مہاجرین صدام کے جرائم کے ذمہ دار نہیں)

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ میں تین ملین عرب ہیں۔ ان میں ۸۰ ہزار عراق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان عربوں کی دوسری نسل (بیٹوں اور پوتوں) میں اپنے قدیم وطن سے زیادہ گہرا لگاؤ نہیں۔ مگر پہلی نسل جو عرب سرزمین میں پیدا ہوئی تھی، وہ اپنے آبائی وطن سے بہت گہرا قلبی تعلق رکھتی ہے، ایک امریکی عرب نے کہا:

ها انا اری وطنی الذی اخترته و وطنی الذی ولدت فیه یتحاربان۔ ها انا اری وطن اولادی واحفادی فی حرب مع وطن آبائی واجدادی	آج میں دیکھتا ہوں کہ جس وطن کو میں نے اختیار کیا اور جس وطن میں میں پیدا ہوا دونوں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے بیٹوں اور پوتوں کا وطن میرے باپ اور دادا کے وطن سے برسر جنگ ہے۔
(صفحہ ۵۸)	

اسی طرح عرب اصل سے تعلق رکھنے والے (نیز دوسرے ملکوں کے مسلمان) بڑی تعداد میں فرانس، برطانیہ، جرمنی وغیرہ میں آباد ہیں۔ ہر جگہ وہ اسی نفسیاتی کش کش میں مبتلا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں لوگ شک کی نظر سے دیکھے جا رہے ہیں۔ مقامی باشندے ان سے نفرت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جگہ جگہ ان کے خلاف تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ساری دنیا میں مسلمانوں کا وہی حال ہو جائے گا جو حال ان کا ہندستان میں ۱۹۴۷ کے بعد ہوا ہے۔ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ مسلمان عزت اور خوش حالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مگر اب وہ ان ملکوں میں ذلت اور مشکلات کے درمیان رہنے پر مجبور ہوں گے۔ اس کی ذمہ داری اگرچہ وہ مغرب کی مفروضہ "اسلام دشمنی" کے خانہ میں ڈالیں گے۔ مگر باعتبار حقیقت اس کی ذمہ داری خود مسلم لیڈروں کے سوا کسی اور کے اوپر نہ ہوگی ——— دور اول کے مسلمان دوسرے ملکوں میں دعوت اسلام کے لیے گئے۔ انھوں نے دوسرے لوگوں کے مسائل کو حل کیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان دوسرے ملکوں میں طلب معاش کے لیے گئے۔ وہ خود مسائل کا شکار ہو کر رہ گئے۔

۱۷ فروری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری) کے ایڈیٹوریل کی سرخی یہ تھی: پیکس امریکانا (Pax Americana) یعنی امریکی امن۔ میڈیٹیرینین کے علاقہ میں رومیوں نے وسیع سلطنت قائم کی جو ۲۷ ق م سے لے کر ۱۸۰ء تک رہی۔ اس زمانہ میں رومی اقتدار کے تحت اس علاقہ میں جو سیاسی امن قائم ہوا اس کو انھوں نے پیکس رومانا سے تعبیر کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد عالمی سیاست میں امریکہ کو غالب کردار ادا کرنے کا جو موقع ملا اس کی بنا پر اس عہد کو پیکس امریکانا سے تعبیر کیا جانے لگا۔ مگر اس دور میں امریکہ کے علاوہ سوویت یونین کو بھی سپر پاور کی حیثیت حاصل رہی۔ اس بنا پر پیکس امریکانا کا لقب صرف جزئی طور پر ہی امریکہ پر صادق آتا تھا۔ اب حالات مکمل طور پر بدل گئے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا نے اپنے مذکورہ ایڈیٹوریل میں بالکل درست طور پر لکھا ہے کہ دو طاقتی دنیا کا نظام جس کو سرد جنگ نے پیدا کیا تھا وہ نومبر ۱۹۸۹ میں دیوار برلن کے ساتھ ڈھ گیا۔ اس کے کھنڈر سے ایک واحد طاقتی دنیا کا نظام ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ خلیجی جنگ نے اس عمل کو حیران کن رفتار کے ساتھ تیز کر دیا ہے :

> The bi-polar world order created by the Cold War collapsed along with the Berlin Wall in November 1989. A more and more uni-polar world began to emerge from the rubble. That process has now accelerated with dizzying speed. (p. 1)

آج ٹائمس آف انڈیا (۱۷ فروری) میں فرانسیسی مورخ (Amaury de Riencourt) کا انٹرویو چھپا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صدیوں کے تاریخی عمل اور امریکہ کی غیر معمولی مادی ترقی جس طرف جا رہی ہے وہ یہی ہے کہ آنے والا دور پیکس امریکانا کا دور ہو۔ یہ امریکہ کا شاہانہ مقدر ہے کہ وہ بیسویں صدی کا روم بنے :

> It is America's imperial destiny to be the Rome of the twentieth century (p. 12).

یہ بات بطور واقعہ درست ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے دانش مندی یہ ہے کہ وہ امریکہ کی سیاسی چٹان سے اپنا سر نہ ٹکرائیں۔ بلکہ اسلام کے دعوتی مشن کو لے کر اٹھیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو عین ممکن ہے کہ دور امریکہ مستقبل میں دور اسلام بن جائے۔ کوئی بھی غلبہ دعوتی مواقع کو ختم نہیں کرتا۔ اور جہاں دعوتی مواقع موجود ہوں وہاں گویا وہ سب کچھ موجود ہے جس کی اسلام کو ضرورت ہے۔

۱۸ فروری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۱۸ فروری) میں ایک خوش کن خبر شائع ہوئی ہے۔ واشنگٹن کی ڈیٹ لائن ساتھ چھپنے والی اس خبر کا عنوان ہے ــــــ خلیج کی جنگ کے بعد کسی بھی منصوبہ میں انڈیا اپنا رول نا ہے:

India wants a role in post-war plan

خبر میں بتایا گیا ہے کہ نئی دہلی کی ہدایات کے تحت امریکہ کے ہندستانی سفیر مسٹر عابد حسین امریکہ کے ڑی آف اسٹیٹ (فار پولیٹکل افیرس) مسٹر رابرٹ کیمٹ (Robert Kimmit) سے ملے۔ ستانی سفیر نے امریکی حکومت سے یہ درخواست کی کہ جنگ کے بعد ویسٹ ایشیا کی بحالی کا جو نقشہ بنایا ہے، اس میں انڈیا کی رائے کو بھی شریک کیا جائے۔ علاقہ کی تعمیرِ نو کے پراسس میں انڈیا کا بھی بطور ایک ر شامل کیا جانا ضروری ہے۔

ہندستانی سفیر نے مسٹر کیمٹ سے کہا کہ انڈیا جیسا ایک ملک اس علاقہ میں نہایت اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ امریکہ کو چاہئے کہ وہ انڈیا کی ترقی میں مزید بہت زیادہ دلچسپی لے:

> A country like India in the subcontinent has to play an extremely important role, and the US have got to take a lot more interest in India's development. (p. 12)

موجودہ حالت میں یہ درخواست محض نادانی کی ایک خواہش ہے جو کبھی پوری ہونے والی نہیں۔ اسی رکے صفحۂ اول پر یہ خبر ہے کہ خلیج کے لئے جانے اور آنے والے امریکی ایرفورس کے ٹرانسپورٹ جہازوں کو ی اور مدراس کے ایرپورٹ پر دوبارہ تیل لینے کی سہولت (refuelling facility) دی جارہی) ۔ لیکن ہندستان کے سیاسی لیڈروں نے اس پر شور مچایا۔ چنانچہ حکومتِ ہند نے اس سہولت کو بند دیا۔ ــــــ جس عمل میں انڈیا قیمتاً تیل دینے کے بقدر بھی شریک نہ ہو، وہ اس عمل کے بعد ہکے انجام کی تشکیل میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔

اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ جو لوگ جوکھم کو برداشت کریں، وہی جوکھم کے بعد آنے والے نتیجہ ، مالک ہوں۔ موجودہ دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ جوکھم کوئی اور اٹھائے اور اس کا نتیجہ کسی دوسرے کو جائے۔ اس قسم کی خوش فہمی صرف ایک سادہ لوح انسان کے ذہن میں جگہ پا سکتی ہے۔ اس کے باہر ایسی ں فہمی کا کوئی وجود نہیں۔

۱۹ فروری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ فروری) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ بحرین کے ایک انٹرنیشنل ہوٹل میں ایک لطیفہ مشہور ہو رہا ہے کہ ایک پیٹریٹ روزانہ استعمال کرو اور اسکڈ کو دور بھگاؤ:

A Patriot a day keeps Scuds away

سوویت یونین نے اسکڈ کے نام سے خطرناک قسم کے دور مار میزائل بنائے۔ عراق نے ان کو بڑی تعداد میں خرید کر اپنے یہاں جمع کر لیا۔ عراق کے لئے ان کی حیثیت بے پناہ ہتھیار کی تھی۔ ان کے ذریعہ وہ سعودی عرب اور دوسرے عرب ملکوں پر قیامت ڈھا دیتا۔ اس نے ظہران اور ریاض وغیرہ پر بہت سے اسکڈ پھینکے۔ مگر یہ شہر تباہی سے بچ گئے۔ اس کی وجہ امریکہ کے پیٹریٹ میزائل تھے۔ جنھوں نے فضا ہی میں عراقی اسکڈ سے ٹکرا کر انھیں تباہ کر دیا۔

سوویت یونین نے جب اسکڈ بنائے تو امریکہ نے اس کے اس اہم فوجی راز کو دریافت کیا اور اس کا توڑ تیار کرنے کے لئے ریسرچ شروع کر دی۔ اسی ریسرچ کا نتیجہ پیٹریٹ تھے۔ اسکڈ جب آواز سے چھ گنا زیادہ تیز رفتار کے ساتھ فضا میں اڑتا ہے تو پیٹریٹ فوراً ہی اس کا پتہ کر لیتا ہے۔ چنانچہ جس وقت اسکڈ اپنے لانچر سے نکل کر نشانہ کی طرف چلتا ہے، عین اسی وقت پیٹریٹ بھی مخالف سمت سے اس کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ پیچھا کر کے اسکڈ سے ٹکرا جاتا ہے اور اس کو نشانہ پر پہنچنے سے پہلے برباد کر دیتا ہے۔

امریکہ کی سازش اور دسیسہ کاری نہیں، بلکہ اس کی اسی قسم کی صلاحیت ہے جس نے اس کو خلیج میں آنے کا موقع دیا ہے۔ عربوں کے پاس عراقی اسکڈ کا کوئی توڑ نہ تھا۔ اس لئے وہ مجبور تھے کہ امریکہ کو دعوت دیں۔ حتی کہ اسی ٹائمس آف انڈیا میں واشنگٹن پوسٹ کے حوالہ سے یہ خبر چھپی ہے کہ آٹھ عرب ملک (مصر، شام، سعودی عرب، کویت، بحرین، عمان، قطر، عرب امارات) ابھی سے نقشہ بنا رہے ہیں کہ پندرہ بلین ڈالر سے ایک فنڈ قائم کریں اور امریکہ سے کہیں کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد بھی اس کی بحری اور فضائی فوجیں عرب کے آفاق کے اوپر (over the horizon) محسوس طور پر باقی رہیں تاکہ عرب ملکوں کے لئے بعد کو دوبارہ کوئی سیاسی مسئلہ پیدا نہ ہو سکے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل کمزوری ان کی وسائل سے محرومی ہے۔ جب تک اس کمی کو دور نہ کیا جائے اسلام دشمنوں کی سازش اور دسیسہ کاری کے خلاف احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی باتیں صرف جھنجلاہٹ کو بڑھاتی ہیں، وہ مسئلہ کو حل نہیں کرتیں۔

۲۰ فروری ۱۹۹۱

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۷ فروری ۱۹۹۱) کے موضوع الغلاف کا عنوان تھا کہ خاتمہ قریب آگیا (النہایۃ تقترب) اسی طرح المجلۃ (۲۷ فروری) کی کور اسٹوری کا عنوان ہے: معرکۃ تحریر الکویت: الفصل الاخیر۔ ٹائم جس پر ۲۵ فروری کی تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ وہ حسب قاعدہ پیشگی طور پر مجھے آج ملا۔ اس کی کور اسٹوری خلیج کی جنگ ہے اور اس کا عنوان بھی یہی قائم کیا گیا ہے کہ خاتمہ کا آغاز:

Beginning of the end

اتحادی طاقتوں کی رات دن کی مسلسل بمباری نے عراق کی دو تہائی فوجی طاقت برباد کر دی۔ عراق کے شہر اور اس کے بیشتر اہم مقامات کھنڈر ہو گئے۔ صدام حسین جو آخری فتح سے پہلے نہ رکنے کی باتیں کرتے تھے، وہ اب جنگ بندی کی پیش کش کر رہے ہیں۔ ہولناک جنگ کے یک طرفہ خاتمہ کا آغاز شروع ہو چکا ہے۔ ٹائم کے مذکورہ شمارہ میں عراق کی تباہی کی دردناک تصویریں ہیں۔ ایک تصویر میں ایک عراقی عورت اپنے تباہ شدہ مکان کے ملبہ پر سر پکڑے ہوئے بیٹھی ہے۔ ایک تصویر میں مردہ عراقیوں کی لاشیں ٹرکوں میں لاد کرلے جائی جا رہی ہیں۔ ایک تصویر میں ایک وسیع کھنڈر کے اوپر بیٹھی ہوئی دو عورتیں رو رہی ہیں۔ ایک اور بڑے کھنڈر کے اوپر ایک عراقی مایوسی اور نامرادی کی حالت میں دکھائی دے رہا ہے۔ کسی تصویر میں پل ٹوٹے ہوئے ہیں کسی میں بڑی بڑی بلڈنگیں منہدم صورت میں نظر آ رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عراق کی یہ تباہی ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی سے ہزاروں گنا زیادہ سخت ہے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ہندو فرقہ پرست بابری مسجد (اجودھیا) کی چہار دیواری توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور اس کے گنبدوں پر بھگوا جھنڈا لہرا دیا۔ ملک میں وسیع پیمانہ پر فسادات پھوٹ پڑے۔ اسی کے ساتھ خلیج میں دشمنِ اسلام امریکہ کی فوجیں بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئیں۔ اب سارے ملک میں "قنوت نازلہ" پڑھی جانے لگی۔ مسلمان ہر طرف اللّٰہم دمّر دیارھم کی بد دعا کرنے لگے اور تمام اکابر و اصاغر نے اس پر آمین کہنا شروع کر دیا۔ یہ بد دعا تمام مسجدوں اور تمام اجتماعات میں جاری تھی۔ مگر ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو جب خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا تو "تدمیر دیار" کا عمل کافروں کے بجائے خود مسلمانوں کے اوپر ہو رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان احتجاج غیر کا طریقہ چھوڑ دیں اور احتساب خویش کا طریقہ اختیار کریں۔

۱۲ فروری ۱۹۹۱ء

سعودی عرب کے شاہ فہد اور کویت کے امیر الصباح کی دعوت پر امریکہ اور دوسرے ۲۸ مغربی ملکوں کی فوجیں تقریباً پانچ لاکھ کی تعداد میں خلیج کے علاقہ میں جمع ہیں اور عراقی صدر صدام حسین کے خلاف تباہ کن جنگ میں مصروف ہیں۔ صدام نواز مسلمان ساری دنیا میں اس پر سخت اعتراض کر رہے ہیں۔ ہندستان کے مسلم اخبارات میں اس قسم کی سرخیاں نظر آتی ہیں: اسلام عیسائیت کی چوکھٹ پر۔ عرب حکمرانوں نے کافروں کو سرزمین حرم میں داخل کر دیا، وغیرہ۔

سعودی حلقہ اس بارہ میں مختلف نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۳۱ جنوری) میں اس سلسلہ میں الشیخ ابن باز کا فتویٰ چھپا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ مسلم حکمرانوں کے لئے اس میں کوئی شرعی نقصان نہیں کہ وہ غیر اسلامی حکومتوں سے مدد لیں جب کہ انھیں ایسی مدد کی ضرورت ہو (صفحہ ۶-۷) الدعوۃ (۲۱ فروری) میں دوبارہ الشیخ ابن باز کا مفصل مضمون چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں سے مدد لینا جائز ہے جب کہ ظالم دشمن کو ہٹانے اور اس کو ہلاک کرنے اور بلادِ اسلامی کو اس کے شر سے بچانے کے لئے ضروری ہو، خواہ وہ غیر مسلم یہودی ہو یا عیسائی یا بت پرست۔ (سواء کان المستعان بہ یہودیا او نصرانیا او وثنیا، صفحہ ۲۱)

اصولی طور پر یہ بات درست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب، مطعم بن عدی، عبد اللہ بن اریقط وغیرہ سے مدد لی اور یہ سب غیر مسلم تھے۔ الشیخ ابن باز نے جو دلیل دی ہے یہی دلیل ہندستان کے علماء نے ۱۹۴۷ کے پہلے دی تھی جب کہ انھوں نے تحریکِ حرّیت میں غیر مسلموں کو اپنے ساتھ لیا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں سے تعاون لیا تو اس کا نتیجہ اسلام کے غلبہ کی صورت میں نکلا۔ جب کہ علماء ہند کے تعاون کا نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔ اسی طرح یقینی ہے کہ خلیج کی جنگ کا سب سے بڑا فائدہ اسرائیل اور مغربی طاقتوں کو پہنچے گا اور سب سے بڑا نقصان عراق کو اور پھر مختلف انداز میں ساری مسلم دنیا کو۔

مدد کس کے لئے مفید ہوگی، اس کا انحصار اس پر ہے کہ مدد لینے سے پہلے کس نے اپنی بنیاد بنائی ہے۔ دورِ اول کے مسلمان خود اپنی مضبوط بنیاد پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس لئے مدد کا فائدہ ان کے حصہ میں آیا۔ موجودہ مسلمانوں کی اپنی کوئی بنیاد نہیں، اس لئے مدد کا فائدہ بھی ان کو نہیں ملتا۔

۲۲ فروری ۱۹۹۱

امریکہ کی زیر قیادت اتحادی فوجوں نے ۱۷ جنوری کو عراق پر بمباری کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب وہ عراق کی فوجی اور اقتصادی طاقت کو تقریباً توڑ چکے ہیں۔ اندازہ کے مطابق جلد ہی وہ زمینی حملہ شروع کر دیں گے جو یقینی طور پر چند دن سے زیادہ نہیں رہے گا۔ عراق کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ ہوگی کہ وہ ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈال دے (اتحادی فوجوں نے ۲۴ فروری ۱۹۹۱ء کو زبردست زمینی حملہ کرکے عراقی فوجیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا)

ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں مقیم عراقی سفیر نے کہا ہے کہ خلیج کی جنگ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سوویت روس اب سپر پاور نہیں رہا۔ وہ بڑی طاقت کی حیثیت سے ختم ہو چکا ہے۔ انھوں نے شکایت کی کہ روس اس جنگ میں امریکہ سے یا اقوام متحدہ سے ہمارے موافق کوئی تجویز منوانے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ عراق روس کو اپنا سب سے بڑا دوست سمجھتا تھا، مگر روس عراق کے کچھ کام آتا ہوا نظر نہیں آتا۔

لیکن عراقی سفیر کو روس کے دیوالیہ پن کے بجائے خود عراقی لیڈروں کے دیوالیہ پن کا شکوہ کرنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ روس اور امریکہ نے جون ۱۹۹۰ میں باقاعدہ طور پر سرد جنگ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا تھا۔ عراقی لیڈروں نے اس اعلان کی حقیقت نہیں سمجھی۔ اس کے بعد انھوں نے اگست ۱۹۹۰ میں کویت پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا۔ عراقی لیڈروں کی کارروائیاں بتاتی ہیں کہ وہ یقین کئے ہوئے تھے کہ اس جنگ میں روس ان کی طرف سے کود پڑے گا جس طرح سرد جنگ کے زمانہ میں روس اور امریکہ ایک دوسرے کے خلاف کود پڑتے تھے۔ مگر روس کسی بھی درجہ میں عراق کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرد جنگ کا خاتمہ دونوں قوموں کے لئے برابری کا معاملہ نہ تھا۔ وہ اس بات کا مظاہرہ تھا کہ روس نے امریکہ کے مقابلہ میں سپر پاور کی حیثیت کھو دی ہے۔ مگر عراقی اپنی خوش فہمی کی بنا پر اس کو سمجھ نہ سکے۔

عراقی لیڈر کہہ رہے ہیں کہ اصل جنگ تو زمینی جنگ ہے۔ زمینی جنگ شروع ہوگی تو ہم یہاں کے صحرا کو امریکیوں کا قبرستان بنا دیں گے۔ مگر یہ محض بے خبری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور میں جنگ کا فیصلہ فضا میں ہوتا ہے اور فضا کی جنگ امریکہ جیت چکا ہے۔ اب زمینی جنگ صرف اختتامی کارروائی کے ہم معنی ہوگی نہ کہ نئی جنگ شروع کرنے کے ہم معنی۔ خوش فہمی کے گنبد میں رہنا آسان ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ حقائق کا بے رحم ہاتھ جب اس کو توڑتا ہے تو گنبد تو درکنار آدمی کے قدموں کے نیچے کی اینٹ بھی نہیں ہوتی جہاں وہ اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔

۲۳ فروری ۱۹۹۱

صدام حسین ۱۷ جنوری سے پہلے، اور پھر جنگ شروع ہونے کے ابتدائی دنوں میں بڑی بڑی باتیں کرتے تھے۔ مگر امریکہ کی زیر قیادت اتحادی طاقتوں (allied forces) نے مسلسل بمباری سے عراق کی فوجی طاقت توڑ دی۔ پہلے وہ کسی بھی حال میں کویت سے اپنا قبضہ ہٹانے پر راضی نہیں تھے۔ وہ اعلان کر چکے تھے کہ کویت اب ہمیشہ کے لئے عراق کا ۱۹واں صوبہ بن چکا ہے۔ مگر اب وہ بلا شرط کویت سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر رضامندی کا اعلان کر رہے ہیں۔ آج اخبارات کے صفحہ اول کی پہلی خبر ان کا یہی اعلان ہے جو انھوں نے سوویت روس کے واسطہ سے کیا ہے۔ ہندوستان ٹائمس (۲۳ فروری) کے پہلے صفحے کی جلی سرخی یہ ہے کہ عراق غیر مشروط واپسی پر رضامند:

Iraq agrees to unconditional pull-out

مگر اسی کے ساتھ دوسری سرخی یہ ہے کہ امریکہ نے قیام امن کی عـــراقی پیش کش کو رد کر دیا ہے۔ (US rejects peace offer) ۱۷ جنوری سے پہلے جب کہ جنگ شروع نہیں ہوئی تھی، امریکہ کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ عراق اپنی فوجوں کو کویت سے واپس بلا لے۔ شاہ فہد نے اعلان کیا تھا کہ اگر صـــدام حسین کویت کو خالی کر دیں تو ان سے دوبارہ برادرانہ سلوک کیا جائے گا اور ان کی ہر طرح مدد کی جائے گی۔ مگر اس وقت صدام حسین نے بے نیازانہ طور پر اس کو رد کر دیا۔ اب باری امریکہ اور اس کے حلیفوں کی ہے۔ اب جبکہ عملاً وہ جنگ جیت چکے ہیں، اب وہ صدام حسین کو کچلنے سے کم کسی چیز پر راضی ہونے والے نہیں۔

صدام حسین کا موجودہ جھکاؤ صرف ان کی نادانی کو ظاہر کرتا ہے۔ دانش مند آدمی جو کچھ کرتا ہے وہی بیوقوف آدمی بھی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دانش مند آدمی تباہی سے پہلے کرتا ہے اور بیوقوف آدمی تباہی دیکھنے کے بعد۔ اسی لئے فارسی شاعر نے کہا ہے کہ آدمی ایسا اقدام کیوں کرے جس کا نتیجہ شرمندگی ہو:

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اقدام وہ ہے جو کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچے۔ جو اقدام صرف بربادی پر ختم ہو وہ خودکشی کی چھلانگ ہے نہ کہ کوئی واقعی اقدام۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما تقریباً سب کے سب اسی قسم کے جھوٹے اقدام میں مشغول نظر آتے ہیں۔ ان کے غیر حقیقت پسندانہ اقدامات نے مسلمانوں کو کچھ فائدہ تو نہیں پہنچایا۔ البتہ ان کی بربادی میں مزید اضافہ کر دیا۔

۲۴ فروری ۱۹۹۱

ٹائم میگزین (۴ فروری) میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں کچھ لوگ ہیں جو خلیج کی جنگ میں شریک ہونا نہیں چاہتے۔ افریقی امریکن (سیاہ فام) جو سفید فام نسل سے نفرت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ سفید فام لوگوں کی برتری قائم کرنے کی جنگ ہے۔ اس لئے ہم کو اس میں شریک نہیں کیا جانا چاہئے (صفحہ ۳۹) یہی معاملہ امریکی مسلمانوں کا ہے۔ ان کے نزدیک امریکہ ایک اسلام دشمن ملک ہے۔ وہ موجودہ جنگ کو کافر اور مسلم کی جنگ سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی جنگ میں شرکت کے خلاف ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۱۳ فروری، صفحہ ۶)

ٹائم (۲۵ فروری) میں کوریا کے ایک شہری ڈیوڈ اسکاٹ (David E. Scott) کا خط اس کے جواب میں چھپا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکی شہریت اختیار کرنے کے بعد کسی شخص کے لئے ایسا کہنا درست نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میرا ایک لڑکا امریکی ہے۔ یہ واقعہ کہ وہ کوریا میں پیدا ہوا تھا، اس سے اس کی یہ ذمہ داری ختم نہیں ہوتی کہ وہ اس ملک کا دفاع کرے۔ اگر آپ فائدوں کو قبول کریں تو آپ کو ذمہ داریوں کو بھی قبول کرنا ہوگا:

> My son is an American. The fact that he was born Korean does not in any way diminish his responsibility to defend this country. If you accept the benefits you must also accept the responsibilities (p. 8)

میں سمجھتا ہوں کہ کوریا کے مراسلہ نگار نے جو بات کہی ہے وہ عین درست ہے۔ جب آپ ایک ملک کے شہری بنیں اور اس کی مطلق وفاداری اور اس کے دفاع کا عہد کریں تو آپ کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ خارجی وفاداریوں کو ترک کر کے صرف اس کے وفادار بنیں اور بوقتِ ضرورت اس کی طرف سے لڑیں۔ کسی شخص کو یہ حق تو ہے کہ وہ ایسے ملک سے اپنی شہریت کو ختم کر دے اور وہاں سے ہجرت کر جائے مگر شہری رہتے ہوئے ایسا کرنا درست نہیں۔

یہ نہایت سطحیت اور گراوٹ کی بات ہے کہ آدمی فائدہ کو تو لے لے، مگر وہ ذمہ داریوں کو لینے کے لئے تیار نہ ہو۔ ذمہ داریوں کو اٹھانا ہی وہ قیمت ہے جس سے فائدوں کو لینے کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ذمہ داریوں کو اٹھانے سے انکار کرے تو فائدوں کو لینے کے لئے بھی اس کا استحقاق ختم ہو جائے گا۔

۲۵ فروری ۱۹۹۱

ریڈرس ڈائجسٹ (فروری ۱۹۹۱) نے چھ صفحہ کی ایک رپورٹ چھاپی ہے اس کے لکھنے والے مسٹر فلک (Rachel Flick) ہیں۔ اس میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ مغرب نے کس طرح صدام حسین کو بیوقوف بناکر عراق کی دولت کو لوٹا۔ عراق کا تیل اور اس کی ۴۵ بلین ڈالر کی سالانہ آمدنی کا بیشتر حصہ مغربی ملکوں کو پہنچتا رہا۔ پچھلے ۲۰ سال سے عراق بیرونی فوجی ہتھیاروں کی خریداری پر ۱۴ ہزار ملین ڈالر سالانہ خرچ کرتا رہا ہے۔ مغربی ٹھیکہ داروں کے ذریعہ صدام حسین نے اپنی ایرفورس کے لئے بے شمار نہایت مہنگے انڈر گراؤنڈ بیس تیار کرائے۔ وغیرہ

صدام حسین کو عرب لیڈر بننے کا جنون تھا۔ اس جنون کو مغرب نے استعمال کیا۔ اس نے عراق سے سستا تیل خریدا اور اس کو نہایت مہنگے ہتھیار فروخت کئے۔ اس طرح یہ خود مغرب ہے جس نے صدام حسین کو اپنے تجارتی اغراض کے لئے مسلح کیا۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک سیاسی مقصد بھی تھا۔ مغرب یہ سمجھتا تھا کہ عراق اپنی فوجی طاقت کو ایران کے خلاف استعمال کرے گا، وہ اس کے دشمن کے خلاف ہتھیار ثابت ہوگا۔

مگر صدام حسین کو اپنے ڈکٹیٹرانہ مزاج کی وجہ سے حقائق کی بالکل خبر نہ تھی۔ انھوں نے ایران پر حملہ اور کویت پر حملہ کے فرق کو نہیں سمجھا۔ ایران پر حملہ مغرب کو عین مطلوب تھا مگر کویت پر حملہ مغرب کے لئے عین غیر مطلوب تھا، کویت پر حملہ کر کے صدام حسین نے خود مغرب کے مفاد پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ سارے مغرب نے متحدہ طور پر طے کیا کہ صدام حسین کو کچل دیا جائے۔

مذکورہ مضمون میں لندن کے پروفیسر کوپٹز (Hans-Heino Kopietz) کا تبصرہ نقل کیا گیا ہے انھوں نے کہا کہ ہم نے (مغربی حکومتوں نے) اس معاملہ میں اپنی آنکھیں بند کرلیں اس لئے کہ اس سے ہم کو تجارتی فائدہ تھا۔ اور اس لئے کہ صدام ایران کے خلاف ہمارے لئے ایک مفید حربہ تھے۔ صدام ایک ایسا عفریت ہے جس کو خود مغرب نے پیدا کیا:

> We closed our eyes because some business wanted to make money and because Saddam was a useful tool against Iran. Saddam is a Frankenstein monster that the West created. (150)

صدام اگر قومی تعمیر کا منصوبہ بناتے۔ وہ مغرب کے ذریعہ اپنی زراعت اور صنعت کو ترقی دیتے۔ وہ لوگوں کو تعلیم یافتہ بناتے تو عراق کا مستقبل اس سے مختلف ہوتا جو آج وہاں دکھائی دے رہا ہے۔

۲۶ فروری ۱۹۹۱ء

قومی آواز (۲۶ فروری) میں خلیج کی جنگ کے مابعد اثرات کے بارہ میں ایک جائزہ شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک پیراگراف یہ ہے: نئی دہلی کے ایک سعودی ڈپلومیٹ نے اس نامہ نگار سے گفتگو کے دوران عالمی مسلم رائے عامہ میں تبدیلی پر انتہائی برگشتگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جنگ کے خاتمہ پر سعودی عرب دنیا کی مختلف سرکردہ مسلم جماعتوں اور تنظیموں کے متعلق اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرے گا کیوں کہ یہ تمام جماعتیں اور تنظیمیں سعودی موقف کے حق میں عوامی حمایت حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں (صفحہ ۷)

سعودی عرب نے تمام دنیا کی مسلم جماعتوں کو غیر معمولی مالی امداد دی۔ مگر خلیج کے بحران کے زمانہ میں تقریباً ہر ملک کے مسلم عوام سعودی عرب کو چھوڑ کر صدام حسین کے حامی بن گئے۔ حالانکہ اس معاملہ میں سعودی عرب کی حیثیت دفاع کرنے والے کی تھی اور صدام حسین کی حیثیت جارح اور ظالم کی۔ اس کی وجہ مسلم رہنماؤں کی جذباتی سیاست ہے۔ ان رہنماؤں کا مفاد اس میں تھا کہ وہ عوام کی بھیڑ جمع کریں تاکہ عرب ملکوں کی نظر میں ان کی یہ حیثیت قائم ہو کہ مسلم عوام ان کے ساتھ ہیں۔ مسلم رہنماؤں کا یہ قیادتی تقاضا انھیں اس طرف لے گیا کہ وہ جذباتی نعروں کا استعمال کریں۔ کیوں کہ عوام کی بھیڑ صرف جذباتی نعروں پر ہی جمع کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے فلسطین کے اشو کو خوب بڑھا چڑھا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ زبان وقلم کی ساری طاقت یہ ثابت کرنے پر لگادی کہ امریکہ سب سے بڑا اسلام دشمن ہے۔

اس طرح مسلمانوں کے جذبات اسرائیل کے بارہ میں اور امریکہ کے بارہ میں شدت کے ساتھ بھڑک اٹھے۔ وہ اس معاملہ میں آخری حد تک حساس ہو گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ صدام حسین سب سے بڑے دشمنِ اسلام (امریکہ) کو چیلنج کر رہا ہے۔ وہ ظالم اسرائیل پر اسکڈ میزائل مار رہا ہے۔ اور اسرائیل کے سرپرستوں سے کہہ رہا ہے کہ ہوش میں آجاؤ۔ کیوں کہ سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ زندہ ہو گیا۔ صدام حسین کے یہ الفاظ مسلمانوں کی موجودہ نفسیات کے اعتبار سے بالکل جادو ثابت ہوئے۔ انھیں دکھائی دیا کہ سعودی عرب اسلام کے دشمن نمبر ایک کا ساتھ دے رہا ہے اور صدام حسین اسلام کے دشمن نمبر ایک کو سمندر میں غرق کرنے کا نعرہ لگا رہا ہے، تو وہ اپنی مذکورہ نفسیات کی بنا پر سعودی عرب کو چھوڑ کر صدام حسین کی طرف دوڑ پڑے —— کسی مسئلہ پر قوم کو غیر متناسب حد تک حساس بنانا شخصی قیادت کے لئے بہت کارآمد ہے۔ مگر خود قوم کے لئے وہ تباہ کن حد تک غیر مفید ہے۔

۲۷ فروری ۱۹۹۱

المجلة (۲۷ فروری ۱۹۹۱) میں دکتور علی الدین ہلال (مدیر مرکز الدراسات السیاسیۃ بجامعۃ القاہرۃ) کا مضمون چھپا ہے۔ یہ خلیجی بحران کے اسباب کے بارہ میں ہے۔ اس کا عنوان ہے: فلنتدبر الاسباب ونحن فی قلب العاصفۃ۔

وہ لکھتے ہیں کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم معاملات کو محض ان کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور جڑ کی اور گہرائی کی باتوں پر غور نہیں کرتے۔ ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس عقل سے مسلح کریں جو ہم کو اس قابل بنائے کہ ہم خلیج اور اس کی قوموں کے مسائل کا مقابلہ زیادہ گہرے انداز میں کر سکیں (اننا ناخذ الامور عادۃ بمظاھرھا ولانبحث فی الجذور والاعماق...... والمطلوب مناجمیعا ان نتسلح بالعقل الذی یمکننا من مواجہۃ مشاکل المنطقۃ وشعوبھا بشکل جوھری وجذری (صفحہ ۲۳)

اصولاً یہ بات نہایت اہم ہے۔ مگر موجودہ شکل میں وہ بالکل بے فائدہ ہے۔ قوم کے اندر مطلوبہ عقل پیدا کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ تنقید کی کھلی آزادی ہو۔ تنقید سے میری مراد المجلہ کے مذکورہ مضمون جیسی عمومی تنقید نہیں بلکہ متعین اور مشخص تنقید ہے۔ اور موجودہ مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز یہی تنقید ہے۔ جب تک متعین اور مشخص تنقید کے بارہ میں مسلمانوں کی غیر ضروری حساسیت کو ختم نہ کیا جائے، ان کے اندر عقلی بالیدگی پیدا ہونا ممکن نہیں۔

مثال کے طور پر خلیج کے معاملہ کو لیجئے۔ اس کی جڑ یہ ہے کہ آج پوری مسلم دنیا میں یہ مزاج بن گیا ہے کہ ظالمانہ کارروائی کی زد غیر پر پڑے تو اس کی مذمت نہیں کی جاتی۔ کسی ظالمانہ کارروائی کی مذمت صرف اس وقت کی جاتی ہے جب کہ اس کی زد خود اپنے آپ پر پڑ رہی ہو۔ صدام حسین نے ۷ ستمبر ۱۹۸۰ کو ایران پر بمباری کی تو عرب حلقہ نے اس کی مذمت نہیں کی۔ اسی صدام نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت پر حملہ کیا تو پورا عرب حلقہ چیخ اٹھا۔ یہ مزاج برائی کی جڑ ہے۔ لیکن اگر اس برائی کی کھلی نشاندہی کی جائے تو مقدس ترین لوگ بھی اس کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

اس مزاج کو باقی رکھتے ہوئے تسلح بالعقل کی بات کرنا محض ایک خوش خیالی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

۲۸ فروری ۱۹۹۱

ٹائم میگزین کا شمارہ جس میں ۴ مارچ ۱۹۹۱ کی تاریخ چھپی ہوئی ہے، وہ پیشگی طور پر مجھے آج ملا۔ اس شمارہ میں حکومت روس کے ایڈوائزر پرائماکوف (Yevgeni Primakov) کی ایک تازہ تحریر شائع ہوئی ہے جو صدام حسین اور خلیج کے مسئلہ سے متعلق ہے۔

مسٹر پرائماکوف لکھتے ہیں کہ میں صدام حسین سے بار بار ملا ہوں۔ سب سے پہلے صدام حسین سے میری ملاقات ۱۹۶۹ میں ہوئی جب کہ میں پراودا کا کرسپانڈنٹ تھا۔ اس وقت صدام حسین بعث پارٹی کے لیڈر تھے، مگر ابھی وہ عراق کے صدر نہیں بنے تھے۔ صدام حسین کے صدر بننے کے بعد ان سے میری بار بار ملاقاتیں ہوئیں، بغداد میں بھی اور ماسکو میں بھی۔ حتی کہ میرے اور ان کے درمیان بے تکلفانہ تعلقات ہوگئے۔ فروری ۱۹۹۱ میں وہ میخائیل گورباچوف کے نمائندہ کی حیثیت سے کئی بار صدام حسین سے ملے اور عراقی صدر کو کویت سے اپنی فوجیں واپس کرنے کے معاملہ میں بات کی۔

مسٹر پرائماکوف کہتے ہیں کہ صدام حسین سے قریبی تعلق کے بعد میں نے جانا کہ صدام حسین کو پوری بات سے واقفیت نہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے موافق رپورٹوں کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں، مثال کے طور پر، عرب دنیا میں عراق کی حمایت کے بارہ میں، مغرب میں جنگ کے مخالف مظاہروں کے بارہ میں، عراق کے خلاف اتحادی ملکوں میں اندرونی اختلاف کے بارہ میں۔ اور جہاں تک بری خبروں کا تعلق ہے تو ایسی خبر لانے والے کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے:

> I realized that it was possible Saddam did not have complete information. He gave priority to positive reports: for example, about the support Iraq was receiving in the Arab World, about the antiwar demonstrations in the West, about the first hints of differences between the allies in the anti-Iraqi coalition. And as for bad news, the bearer could pay a high price.

یہی کمزوری تمام مسلم رہنماؤں میں پائی جاتی ہے، حتی کہ مسلمانوں کے مقدس اکابر میں بھی۔ یہ لوگ اپنے فرضی تخیلات میں گم رہتے ہیں۔ ان کو ایسے ہی افراد پسند آتے ہیں جو ان کے مفروضات کی تصدیق کریں۔ جو شخص ان سے اختلافی بات کرے وہ ان کی نظر میں فوراً مبغوض ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ حقیقت حال سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ وہ ایسے غیر پختہ اقدامات کرتے ہیں جن کا نتیجہ بربادی کے سوا کسی اور صورت میں نکلنے والا نہ ہو۔

یکم مارچ ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ احمقانہ اقدام پر شروع ہوئی اور آخر کار بدترین شکست پر ختم ہوگئی۔ آج کے اخبارات عبرتناک خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (یکم مارچ) نے نہایت جلی حرفوں میں اپنے پہلے صفحہ پر یہ سرخی قائم کی ہے کہ خلیج کی جنگ ختم (Gulf war ends) اس کے ساتھ سات کالمی تصویر ہے جس پر عراق کے جنگی قیدی بڑی تعداد میں ٹرکوں میں بھرے ہوئے ہیں اور امریکی سپاہی ان کو مخصوص کیمپوں کی طرف لے جارہے ہیں۔ یہ تصویر اس بات کا اعلان ہے کہ یہ شکست بھی تھی اور اسی کے ساتھ ذلت اور رسوائی بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں "رسوا کن شکست" کا اتنا بڑا واقعہ اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جو ۵۸۶ ق م میں بنی اسرائیل کے اوپر بنوکد نضر (Nebuchadrezzar II) کے ہاتھوں گزرا تھا۔ اس کا ذکر قرآن (بنی اسرائیل ۵) میں مختصر طور پر اور بائبل میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اس سلسلہ میں بائبل کی کتاب یرمیاہ کا مطالعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔

امریکہ کے زیر قیادت اتحادیوں کے طاقتور جہازوں نے رات دن بمباری کرکے عراق کی اقتصادیات کو تباہ کر دیا۔ عراق کی زمین کے نیچے دنیا کے تیل کے ذخیرہ کا دس فی صد موجود ہے۔ تیل کے ذریعہ اس کی آمدنی ۵۴ بلین ڈالر سالانہ تھی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ عراق کے شہروں میں لوگ سڑکوں پر ٹوٹی پھوٹی چیزیں جمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تاکہ اس سے اپنے چولہے کو جلائیں۔ عراق کو تباہ کرنے کے بعد اتحادی فوجوں نے عراق اور کویت کے درمیان سپلائی لائن کاٹ دی۔ کویت میں مقیم عراقی فوج بالکل بے سہارا ہوگئی اور صرف دو دن کی زمینی کارروائی میں ہتھیار ڈال کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایک لاکھ سے زیادہ فوجی مارے گئے۔ ۳۰ ہزار قیدی بنائے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روایتی ہتھیاروں اور "ہائی ٹیک" کے درمیان مقابلہ تھا جس میں روایتی ہتھیاروں کو لازماً شکست کھانا تھا۔

جنگ میں تمام دنیا کے مسلمان صدام کے حامی بن گئے تھے۔ اس اعتبار سے صدام کی شکست ساری دنیا کے مسلمانوں کی شکست ہے۔ عراقی لیڈروں نے اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس نادانی کے ذریعہ اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں رسوا کر لیا ہے۔ اس واقعہ پر یہ حدیث صادق آتی ہے کہ: کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص خود اپنے کو کیوں کر ذلیل کرے گا۔ فرمایا کہ وہ ایسے فتنہ کا سامنا کرے جس سے نپٹنے کی طاقت اس کے اندر نہ ہو (مشکاۃ المصابیح ۲/۱۷۷)

جون ۱۹۹۱ □ شمارہ ۱۷۵

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSHIN ATT IC
Fax: 91-11-353318 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

حج اسپرٹ

حج بامقصد زندگی کا ریہرسل ہے۔ چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائی مشن کے لیے انتہائی بامقصد زندگی گزاری۔ حتیٰ کہ وہ اس بامقصد زندگی کا ایک مثالی نمونہ بن گئے۔ حضرت ابراہیم پر اس بامقصد زندگی کے سلسلہ میں جو مراحل گزرے، حاجی انھیں مراحل کا علامتی اعادہ کرتا ہے۔ وہ مقرر دنوں میں حضرت ابراہیم کی لمبی تاریخ کو دہرا کر اپنے اندر یہ عزم تازہ کرتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں حضرت ابراہیم کو اپنے لیے نمونہ بنائے گا۔ حضرت ابراہیم نے جو کچھ اپنے زمانہ میں اپنے حالات کے اعتبار سے کیا، اسی کو وہ دوبارہ اپنی زندگی میں اپنے حالات کے اعتبار سے ظہور میں لائے گا۔

حج کے تمام مراسم اپنی حقیقت کے اعتبار سے بامقصد زندگی کے مختلف مرحلے ہیں۔ مقصدی زندگی اختیار کرنے کے بعد جو کچھ ایک انسان پر گزرتا ہے، وہ حضرت ابراہیم پر اپنی کامل صورت میں گزرا۔ ہر زمانہ میں اہلِ ایمان کو بامقصد زندگی گزارنے کے لیے دوبارہ یہی سب کچھ کرنا ہے۔ سچا حاجی وہی ہے جو اس نیت اور اس حوصلہ کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرے۔

بامقصد زندگی سب سے پہلے شعوری فیصلہ چاہتی ہے، حاجی حج کی نیت کرکے اور احرام پہن کر یہی شعوری فیصلہ کرتا ہے۔ بامقصد زندگی مالی انفاق کی طالب ہوتی ہے، حاجی اپنی پاک کمائی سے سفرِ حج کے اخراجات اٹھا کر اسی مقصدیت کا اظہار کرتا ہے۔ مقصد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی متحرک ہو۔ حسب ضرورت وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف سفر کرے، حاجی اپنے وطن سے حجاز کا سفر کرکے اسی شرط کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے۔

بامقصد آدمی ایک مرکزی نقطہ مقرر کرتا ہے اور اسی کے گرد اپنی پوری زندگی کو منظم کرتا ہے، حاجی کعبہ کے گرد گھوم کر اسی مقصدی صفت کو اختیار کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتا ہے۔ بامقصد آدمی کو اپنے مقصد کی راہ میں سرگرم ہونا پڑتا ہے، حاجی صفا اور مروہ کے درمیان دوڑ کر اسی سرگرمی کو اپنانے کا اعلان کرتا ہے۔ بامقصد آدمی ہر وہ قربانی پیش کرتا ہے جو اس کا مقصد اس سے طلب کرے، حاجی زمانۂ حج میں جانور کو قربان کرکے اسی بات کا علامتی عہد کرتا ہے۔ بامقصد آدمی دوسرے ہم خیال لوگوں کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے تاکہ اس کا عمل زیادہ موثر اور طاقتور ہو سکے، حاجی عرفات کے میدان میں تمام لوگوں کے ساتھ

جمع ہو کر اسی جذبۂ اتحاد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وغیرہ

حج ابتدا ہے، وہ انتہا نہیں۔ اس کی ابتدا مقاماتِ حج میں ہوتی ہے، اور اس کی انتہا اور تکمیل وہاں سے لوٹنے کے بعد حاجی کی اپنی عملی زندگی میں۔

یہ ابراہیمی مقصد دعوت وتبلیغ کا مقصد ہے۔ حضرت ابراہیم کا مشن دعوت الی اللہ کا مشن تھا۔ اسی کے لیے انھوں نے اپنی پوری زندگی کو وقف کیا۔ حج دراصل حضرت ابراہیم کی اسی سنت کو زندہ کرنے کا عزم ہے۔ حقیقی حاجی وہی ہے جو حج کے سفر سے یہ عزم اور یہ حوصلہ لے کر اپنے وطن واپس آئے۔

حضرت ابراہیم نے عراق میں لمبی مدت تک دعوت دی۔ مگر وہاں کے لوگ مشرکانہ تمدن میں اتنا زیادہ غرق ہو چکے تھے کہ وہ توحید کے پیغام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ صدیوں تک مشرکانہ تمدن کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے وہاں کی پوری نسل کا ڈھانچہ بگڑ گیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ ایک نئی قوم بنائی جائے جو اپنی فطرت پر قائم ہو اور پھر توحید کے پیغام کو قبول کرکے اس کی علم برداری کر سکے۔

حضرت ابراہیم نے اسی قسم کی ایک نئی نسل بنانے کے لیے اپنے بیٹے اسماعیل کو عرب کے بے آب و گیاہ صحرا میں بسا دیا۔ جہاں تمدن سے دور اور فطرت کے ماحول میں پرورش پا کر وہ نسل بنی جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ یہی لوگ تھے جو پیغمبر آخر الزماں کے ہاتھ پر ایمان لائے اور ایک طاقت ور ٹیم بن کر ساری دنیا میں موحدانہ انقلاب برپا کیا۔

آج دوبارہ حضرت ابراہیم کی اسی سنتِ دعوت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ آج اسلام کو دوبارہ داعیانِ حق کی ایک ٹیم درکار ہے جو اسلام کے پیغام کو لے کر اٹھے اور اس کو عالمی سطح پر پھیلا دے۔ اب دوبارہ وہ وقت آگیا ہے کہ کچھ لوگ اپنے بیٹوں کو خدا کے دین کی خدمت کے لیے وقف کریں جس طرح حضرت ابراہیم نے اپنے زمانہ میں اپنے بیٹے کو خدا کے دین کی خاطر وقف کیا۔ اسی قربانی سے پہلے بھی خدا کے دین کی تاریخ بنی تھی، آج بھی اسی قسم کی قربانی سے خدا کے دین کی تاریخ دوبارہ ظہور میں آئے گی۔

آج ساری دنیا میں خدا کے دین کی اشاعت کے نئے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ مختلف اسباب کے تحت لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہوا ہے کہ وہ دینِ حق کو جانیں۔ اب ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اس مقصد کے لیے اٹھیں۔ وہ ہر ملک میں جائیں اور وہاں کے باشندوں کو خدا کے دین کا پیغام پہنچائیں۔ مگر یہ دعوتی مواقع عملاً استعمال نہیں ہو رہے ہیں۔ اور اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس تربیت یافتہ

کارکن نہیں جو دعوت کے اس کام کو موثر طور پر انجام دے سکیں۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ آج سنت ابراہیمی کو زندہ کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔ آج کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ بڑے پیمانہ پر ایک "تبلیغی درس گاہ" قائم کی جائے۔ اس میں مسلم نوجوانوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ مذکورہ کام کے لیے تیار کیا جائے۔ اس درس گاہ میں وہ عالمی زبانوں میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ ملکوں اور قوموں کی تاریخ پڑھیں اور تقابلی طور پر مذاہب کا مطالعہ کریں۔ اس طرح ضروری علوم میں واقفیت پیدا کر کے وہ سارے عالم میں اسی طرح پھیل جائیں جس طرح دور اول کے مسلمان خشکی اور تری میں پھیل گئے تھے۔

اس طرح کی ایک تبلیغی درس گاہ میں اپنے ذہین بیٹوں کو داخل کرنا بلاشبہہ والدین کے لیے ایک قربانی ہے۔ مگر آج ابراہیمی سنت کو زندہ کرنے کے لیے اسی قربانی کی ضرورت ہے۔ اس طرح کی ایک تبلیغی درس گاہ اگر قائم ہو تو گویا وہ دور جدید کی ایک وادیٔ غیر ذی زرع ہوگی جہاں ابراہیمی سنت پر عمل کا دعویٰ کرنے والے حاجی اپنی اولاد کو لے جا کر بسائیں گے (ابراہیم ۳۷)

آج کے حاجی کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ اپنی اولاد کو کسی ریگستان میں لے جا کر بسائے۔ آج اس کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو ذاتی خدمت کے دائرہ سے نکال کر دینی خدمت کے دائرہ میں بھیجے۔ وہ اپنے بیٹے کو اسلامیات کی تعلیم دے۔ اسی کے ساتھ وہ اس کو وقت کی زبان اور علوم سے واقف کرائے۔ اور پھر اس کو موقع دے کہ وہ اپنے ماحول سے نکل کر اقوام عالم کے درمیان پہنچے اور ان کو طاقت ور انداز میں خدا کے دین کا مخاطب بنائے۔

آج اسلامی دعوت کو دوبارہ تازہ دم کارکنوں کی ایک ٹیم درکار ہے۔ یہ ٹیم دوبارہ ابراہیمی قربانی ہی کے ذریعہ بن سکتی ہے۔ حج کے مناسک اسلام کی اسی ضرورت کا عالمی اعلان ہیں۔ کیا کوئی ہے جو حج کی اس پکار کو سنے، کیا کوئی ہے جو اس پکار کی طرف دوڑے، اور دوبارہ ابراہیمی سنت کو زندہ کر کے اسلام کی نئی تاریخ بنائے۔

یہی حج اسپرٹ ہے، اور اسی حج اسپرٹ کو زندہ کرنا حاجیوں کا سب سے بڑا کام۔

ایک پیغام

کشمیر کے کچھ نوجوانوں نے پوچھا کہ کشمیر کے لیے آپ کا پیغام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ کشمیر کے بارہ میں میری ایک ہی رائے ہے جس کو میں ۱۹۶۷ سے بار بار ظاہر کرتا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ ان کے مسئلہ کا حل حقیقت پسندی میں ہے نہ کہ جذباتی نعروں اور ٹکراؤ کی سیاست میں۔

ایک طرف قرآن و حدیث اور دوسری طرف تاریخ کے مطالعہ سے میں نے یہ بات پائی ہے کہ یہ دنیا ان لوگوں کے لیے ہے جو حقائق کو سمجھیں اور ان کی رعایت کرتے ہوئے سنجیدہ انداز میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ حقائق سے بے پروا ہو کر جذباتی اقدام کرنا صرف اپنی بربادی میں اضافہ کرنا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

موجودہ دنیا میں زندگی کی تعمیر کے لیے جن حقیقتوں کو سمجھنا ہے، ان میں سے ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ عمل کسی پُرجوش اقدام کا نام نہیں۔ عمل دراصل نام ہے مواقع کو جان کر انھیں استعمال کرنے کا۔ آپ ممکن سے آغاز کرکے ناممکن تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نے ناممکن سے آغاز کیا تو آپ ممکن کو بھی کھو دیں گے، اور ناممکن تو پہلے ہی سے آپ کے لیے کھویا ہوا تھا۔

دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز جو آدمی کو ملتی ہے، وہ اہلیت کی بنیاد پر ملتی ہے۔ یہاں کوئی بھی چیز مطالبہ یا توڑ پھوڑ کے ذریعہ حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس دنیا میں جس شخص یا قوم کو کچھ لینا ہے وہ پُرامن تعمیری جدوجہد کے ذریعہ اس کی اہلیت اپنے اندر پیدا کرے۔ اس کے بعد یقینی طور پر وہ اپنی مراد کو پالے گا۔ یہاں کسی کے لیے نہ پانا ابدی ہے اور نہ کھونا ابدی۔

اس دنیا میں کوئی کسی سے نہیں چھینتا، ہر ایک خود اپنے آپ کو محروم کرتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا، ہر ایک خود اپنی نادانی سے دھوکا کھاتا ہے۔ یہاں ناکامی یہ ہے کہ آدمی زندگی کے مقابلہ میں نااہل ثابت ہو، اور کامیابی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اہل ثابت کرکے آگے بڑھ جائے۔

اس دنیا میں صحیح اقدام وہ ہے جس کا ہر دن آدمی کو کچھ اور آگے بڑھاتا ہو۔ جو اقدام آدمی کو پیچھے لے جانے کا سبب بنے، وہ اقدام ہی نہ تھا۔ وہ خودکشی کی ایک چھلانگ تھی جس کو کم فہمی کی بنا پر اقدام سمجھ لیا گیا۔

(۲۹ اپریل ۱۹۹۱)

سیاست نہیں آخرت

یہ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۲ کا واقعہ ہے۔ مولانا سید اسعد مدنی، صدر جمعیۃ علماء ہند مصر اور سعودی عرب کے سفر سے واپس لوٹے تھے۔ مسجد عبدالنبی (نئی دہلی) میں ایک مجلس تھی۔ لوگ مولانا سے سوال کر رہے تھے اور مولانا لوگوں کو ان کے سوال کا جواب دے رہے تھے۔ سوالات کے دوران ایک صاحب نے پوچھا: مولانا موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ مولانا اسعد مدنی نے اس کے جواب میں کہا:

"مسلمان جب تک سیاست کے غم میں مبتلا رہے گا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کی نہایت غلط تشریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام سیاسی نظام قائم کرنے کے لیے آتے تھے۔ انبیاء کے سامنے اصلاً آخرت ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کو خدا کے غضب سے ڈراتے تھے۔ ان کا حال اس باپ کا سا ہوتا تھا جس کا لڑکا آگ کے شعلہ میں گر رہا ہو اور وہ اس کو اس سے کھینچنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا نقصان مسلم لیگ نے پہونچایا ہے۔ تقسیم کی تحریک نے نفرت کی جو آگ پھیلائی، اس نے ملک کے دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے اتنا دور کر دیا کہ اب ہماری کوئی بات صحیح روشنی میں دیکھی نہیں جاتی۔ تعصب کے جواب میں جو تعصب پیدا ہوا، اس نے ساری راہیں مسدود کر دیں۔ میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ (مولانا سید حسین احمد مدنی) سے سنا ہے کہ کلکتہ کی مسجد جو مسجد ناخدا کے نام سے مشہور ہے، صرف اس ایک مسجد میں تقسیم سے پہلے یہ حال تھا کہ ہر روز تقریباً ایک سو آدمی آکر اسلام قبول کرتے تھے (تقسیم سے پہلے کچھ دنوں تک مولانا حسین احمد مدنی مسجد ناخدا میں خطیب تھے) یہی کیفیت پہلے سارے ملک میں تھی۔ ہر روز لوگ سیکڑوں کی تعداد میں اسلام کے حلقہ میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ تقسیم کی منافرت کی پالیسی کے نتیجہ میں ختم ہو گیا" (الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۲۴ مارچ ۱۹۷۳، صفحہ ۳)

موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہر قیمت پر دعوت کے مواقع کو دوبارہ زندہ کریں۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو اندیشہ ہے کہ وہ خدا کے قانون کی زد میں آجائیں گے اور پھر کوئی چیز نہ ہوگی جو انھیں خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔

جنّت، جہنّم

عن ابی ھریرۃ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ما رأیتُ مثلَ النارِ نام ھاربُھا وما رأیتُ مثلَ الجنۃِ نام طالبُھا۔ (رواہ الترمذی)

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جہنّم جیسی چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والا سو گیا ہو۔ اور میں نے جنّت جیسی چیز نہیں دیکھی جس کا چاہنے والا سو گیا ہو۔

آدمی کو سب سے زیادہ جہنّم سے بھاگنا چاہیے۔ مگر آدمی جہنّم کے مسئلہ کو بالکل بھولا ہوا ہے۔ آدمی کو سب سے زیادہ جنّت کا طالب بننا چاہیے، مگر اس کے اندر جنّت کو حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ یہی دو لفظ میں تمام انسانوں کی کہانی ہے۔

انسانوں کا یہ حال کیسا عجیب ہے۔ لوگ احساس کے درجہ میں بھی جہنّم سے اندیشہ ناک نہیں۔ لوگ تمنّا کے درجہ میں بھی جنّتِ خداوندی کے طالب نہیں۔ ایسی حالت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جہنّم کی آگ سے نجات پائیں اور ان کے لیے جنّت کی نعمتوں کے دروازے کھولے جائیں۔

لوگوں کے اندیشے کسی اور چیز کے لیے ہیں۔ ان کے جذبات کسی اور بات پر بھڑکتے ہیں۔ ان کے اندر چھپے ہوئے خوف اور امید کے جذبات کسی اور چیز کے لیے وقف ہیں۔ ایسی حالت میں کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کی رحمتوں کے مستحق قرار دیے جائیں۔

مسئلہ دنیا کو لوگوں نے اپنا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ مسئلہ آخرت کو کسی نے اپنا مسئلہ نہیں بنایا۔ دنیا کی دولت، دنیا کی قیادت، دنیا کی مقبولیت، دنیا کی نیک نامی، یہی سب چیزیں لوگوں کی توجہات کا مرکز ہیں۔ آج کی دنیا میں کوئی نہیں جو آخرت کی بخشش اور آخرت کی نجات کے معاملہ میں فکرمند ہو۔ آخرت کے عذاب کا خوف اور آخرت کی جنّت کی حرص جس کو سراسیمہ بنا دے۔

آہ وہ دنیا، جہاں سب کچھ ہو، مگر وہی چیز نہ ہو جس کو سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔ آہ وہ انسان، جو سب کچھ جانے، مگر وہی بات نہ جانے جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہیے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی بھول ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ آدمی اپنی اس بھول کو جانے گا۔ مگر وہ جاننا صرف حسرت کے لیے ہوگا نہ کہ کھوئے ہوئے کی تلافی کے لیے۔

زیادہ صحیح اصول

ٹیپو سلطان ۱۷۸۲ سے لے کر ۱۷۹۹ تک ریاست میسور کے حکمراں تھے۔ اسی زمانہ میں انگریز ہندستان پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ٹیپو سلطان کا مقابلہ انگریزوں سے پیش آیا۔ ٹیپو سلطان تنہا اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ انگریز کی جدید فوجوں کا مقابلہ کر سکیں۔ انھوں نے کوشش کی کہ فرانس کو ایک انگریز مخالف معاہدہ میں شریک کریں، مگر فرانس راضی نہ ہو سکا۔ اس کے بعد انھوں نے عرب، کابل، قسطنطنیہ، ماریشس کی حکومتوں کے پاس اپنے وفود بھیجے تاکہ ان سے انگریز کے مقابلہ میں فوجی تعاون حاصل کریں، مگر اس میں بھی انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی طرح انھوں نے ہندستان کی اس وقت کی ریاستوں کو انگریز مخالف مہم میں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، مگر ریاستوں نے اس کو خودکشی کے ہم معنی سمجھا۔ چنانچہ کوئی ریاست اس کے لیے تیار نہ ہو سکی۔

آخر کار ٹیپو سلطان تنہا انگریزوں سے لڑ گیے۔ نتیجہ پہلے سے معلوم تھا۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ کو سرنگاپٹم میں انگریز کی گولی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ٹیپو کی یہ جنگ یقینی طور پر بے فائدہ تھی۔ تاہم ٹیپو سلطان نے یہ کہہ کر اس کو صحیح قرار دیا کہ: شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔

ٹیپو سلطان کا یہ جملہ مسلم شاعروں اور خطیبوں کو بہت پسند ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس جملہ میں بہادری ضرور ہے۔ لیکن اس میں بصیرت اور دانش مندی نہیں۔ اگر یہ کوئی مطلق طور پر اعلیٰ اصول ہو تو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب (مہاجرین) کو مکہ میں شیر کی طرح لڑ کر شہید ہو جانا چاہیے تھا، نہ کہ وہ ایک ایسا طرز عمل اختیار کریں جس نے اغیار کو یہ موقع دیا کہ وہ اس کو "فرار" سے تعبیر کرنے لگیں۔

اس کے برعکس مثال حیدرآباد کے نظام علی خاں کی ہے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ۱۷۶۸ میں انگریزوں سے صلح کا معاہدہ کر لیا۔ ان کی ریاست بدستور قائم رہی۔ اس طرح ریاست حیدرآباد کو موقع ملا کہ وہ ۱۷۶۸ سے لے کر ۱۹۵۶ تک مسلمانوں اور اسلامی اداروں کی غیر معمولی خدمت کر سکے۔

ٹیپو سلطان کے مذکورہ قول کے مقابلہ میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ایک دن کے لیے "گیدڑ" بن جانا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ سو سال تک "شیر" بن کر رہ سکے۔

سامانِ آزمائش

ایک طالب علم امتحان ہال میں داخل ہوتا ہے۔ وہاں اس کے لیے مکان ہے۔ میز اور کرسی ہے۔ خادم ہے۔ روشنی اور پانی ہے۔ اور دوسری بہت سی چیزیں ہیں۔ مگر طالب علم ان میں سے کسی چیز کا مالک نہیں۔ امتحان ہال کی تمام چیزیں اس کے لیے سامانِ امتحان ہیں نہ کہ سامانِ ملکیت۔ امتحان دینے کی مقرر مدت تک اس کو ان چیزوں پر تصرف کا اختیار ہے۔ امتحان کی مقرر مدت ختم ہوتے ہی اس کو یہاں سے رخصت کر دیا جاتا ہے۔

ایسا ہی معاملہ انسان کا پوری دنیا کی نسبت سے ہے۔ موجودہ دنیا کی کوئی چیز انسان کی ملکیت نہیں۔ یہاں کی تمام چیزیں اس کو سامانِ امتحان کے طور پر دی گئی ہیں۔ آدمی جس جسم کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ زمین و آسمان کے جس نظام سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ حتیٰ کہ جو چیزیں وہ بظاہر محنت کر کے حاصل کرتا ہے، سب کی سب خدا کی طرف سے ہیں، اور سب کی سب امتحان کے سامان کے طور پر اس کو دی گئی ہیں۔ وہ موت کے وقت تک ان کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ موت آتے ہی اس کا یہ حق مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔

امتحان ہال میں جو طالب علم داخل ہوتا ہے، اس کا امتحان یہ ہے کہ وہ پرچہ میں دیے ہوئے سوالات کو حل کرتا ہے یا نہیں۔ اگر اس نے ان سوالات کو حل کر دیا تو وہ کامیاب ہے۔ اور اگر اس نے ان سوالات کو حل نہیں کیا تو ناکام۔

دنیا کی نسبت سے جو امتحان ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا خالق یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم ان چیزوں کو پاکر ان کے درمیان کیسا عمل کرتے ہیں (یونس ۱۴) ہمارا خالق ہم کو سامانِ حیات دے کر اور ان میں ہم کو آزاد چھوڑ کر ہم کو آزما رہا ہے کہ آیا ہم اس کے شکر گزار بندے بنتے ہیں یا ناشکری کا رویہ اختیار کرتے ہیں (النمل ۴۰)

موت سے پہلے امتحان کا دور ہے، موت کے بعد جزا کا دور۔ موت سے پہلے کی زندگی میں جو آدمی شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرے گا، اس کے لیے موت کے بعد کے دورِ حیات میں ابدی جنت ہے۔ اور موت سے پہلے کی زندگی میں جو آدمی ناشکری کا طریقہ اختیار کرے گا، اس کے لیے موت کے بعد کے دورِ حیات میں ابدی جہنّم۔

آدھا آدمی

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا ——— موجودہ زمانہ میں جس آدمی کا بھی میں نے تجربہ کیا ، اس کو میں نے آدھا آدمی پایا ، کوئی پورا آدمی مجھ کو نہیں ملا ۔ ہر آدمی مسٹر ففٹی پرسنٹ تھا ، کوئی آدمی بھی مسٹر ہنڈرڈ پرسنٹ نہ تھا ۔

ہر آدمی اُس سچائی کو جاننے کا ماہر تھا جس کی زد دوسرے کے اوپر پڑرہی ہو ۔ جس سچائی کی زد خود اپنے آپ پر پڑے ، اس کو جاننے کے لیے کوئی ماہر نہیں ۔ ہر آدمی صرف اس وقت تک خوش اخلاق تھا جب تک اس کی پسند کے مطابق باتیں کی جائیں ، پسند کے خلاف باتیں کرنے کے بعد کوئی آدمی بھی خوش اخلاق نہیں ۔ اپنے انٹرسٹ کو سمجھنے کے معاملہ میں ہر آدمی ہوشیار تھا ۔ مگر دوسروں کے انٹرسٹ کو سمجھنے کے معاملہ میں ہر آدمی بیوقوف ۔

آج کی دنیا میں ہر آدمی اصول کی باتیں کرتا ہے ، مگر عملی اعتبار سے ہر آدمی بے اصول بنا ہوا ہے ۔ دوسروں کے سامنے ہر آدمی عزیمت کی تقریر کر رہا ہے ، مگر خود ہر آدمی رخصت کو اپنا مذہب بنائے ہوئے ہے ۔ باتوں کے میدان میں ہر آدمی آگے ہے ، اور عمل کے میدان میں ہر آدمی پیچھے ۔

ہر آدمی ظالم ہے ، مگر ہر آدمی اپنے کو مظلوم بتا رہا ہے ۔ ہر آدمی مفاد کے لیے دوڑ رہا ہے ۔ مگر ہر آدمی حق کا تاج اپنے سر پر رکھے ہوئے ہے ۔ ہر آدمی جھوٹ پر کھڑا ہوا ہے ، مگر ہر آدمی سچ کا لبادہ پہن کر لوگوں کے سامنے آتا ہے ۔ ہر آدمی غیر سنجیدہ ہے ، مگر ہر آدمی سنجیدگی کا مکھوٹا اپنے چہرہ کے اوپر ڈالے ہوئے ہے ۔ ہر آدمی اپنی ذات کے لیے سرگرم ہے ، مگر ہر آدمی اعلان کر رہا ہے کہ وہ صرف دین اور ملت کی خدمت کے لیے اٹھا ہے ۔

ہر آدمی اندھیرا بکھیر رہا ہے ، مگر ہر آدمی اُجالے کی باتیں کرتا ہے ۔ ہر آدمی خزاں کا نمائندہ ہے ، مگر ہر آدمی اپنے آپ کو بہار کا نقیب بتا رہا ہے ۔ ہر آدمی تخریب کاری کی اسکیم چلا رہا ہے ، مگر ہر آدمی تعمیر کا جھنڈا بلند کیے ہوئے ہے ۔ ہر آدمی لوگوں کو موت کے غار میں دھکیل رہا ہے ، مگر ہر آدمی اپنے آپ کو زندگی کا شہسوار بنائے ہوئے ہے ۔

اگر لوگ وہی کہیں جو انھیں کرنا ہے ، اور وہی کریں جو انھوں نے کہا ہے تو کم از کم وہ صاف گوئی کا کریڈٹ پالیں ۔ مگر موجودہ صورت میں تو لوگوں کو کسی بھی قسم کا کوئی کریڈٹ ملنے والا نہیں ۔

آہ وہ دنیا جہاں ہر آدمی آدھا ہو ، مگر ہر آدمی اپنے آپ کو پورا بتا رہا ہو ۔

پہچان کا فرق

مکی دور کے آخر میں جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک بار قریش مکہ کے سردار کعبہ کے اندر جمع ہوئے۔ انھوں نے باہمی مشورہ سے یہ طے کیا کہ محمدؐ کو بلا کر ان کے سامنے کچھ مطالبہ رکھے جائیں۔ اگر وہ ان مطالبوں کو پورا کر دیں تو ہم لوگ ان کا پیغمبر ہونا مان لیں۔ اور اگر وہ ان مطالبوں کو پورا نہ کریں تو ہمارے لیے ان کو رد کرنے کا معقول عذر ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا۔ اس موقع پر انھوں نے آپ سے جو مطالبے کیے، ان میں سے ایک مطالبہ یہ تھا:

ولیبعث لنا من مضیٰ من آبائنا۔ ولیکن فیما یبعث لنا منہم قصیّ بن کلاب فانہ کان شیخا صدوقا، فنسألہم عما تقول احقّ ھو ام باطل

(سیرۃ ابن کثیر، المجلد الاول، صفحہ ۴۸۰)

(اپنے رب سے کہیے) وہ ہمارے باپ دادا کو زندہ کر دے جو کہ گزر گئے۔ اور جن کو وہ زندہ کرے ان میں قصی بن کلاب بھی ضرور ہوں، کیوں کہ وہ بزرگ اور سچے تھے۔ پس ہم ان سے اس کی بابت پوچھیں جو تم کہتے ہو کہ وہ حق ہے یا باطل ہے۔

یہاں یہ سوال ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو تمام بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور تمام سچے لوگوں سے زیادہ سچے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قدیم مکہ کے لوگوں کو قصی بن کلاب کا بزرگ اور سچا ہونا سمجھ میں آیا، مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بزرگ اور سچا ہونا ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قصی بن کلاب کی شخصیت ایک گزری ہوئی شخصیت تھی۔ زمانہ کے ساتھ ان کی حیثیت لوگوں کی نظر میں مسلّم ہو چکی تھی۔ اس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ایک معاصر شخصیت تھی۔ آپ کی بزرگی اور سچائی، اپنی تمام تر رفعتوں کے باوجود، ابھی ایک شخص کے اندرونی جوہر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُس وقت تک وہ خارجی تاریخ کے ذریعہ معروف و مسلّم نہیں بنی تھی۔

اہل کفر صرف خارجی تاریخ کو دیکھ سکتے تھے، وہ پیغمبر کو پہچاننے میں ناکام رہے۔ اہل ایمان نے اندرونی جوہر کی سطح پر پہچانا، اس لیے وہ پیغمبر کو فوراً پہچان گئے، اور آپ پر ایمان لائے۔ آنکھ والا صرف وہ ہے جو کسی انسان کو اس کے جوہر کی بنیاد پر پہچانے۔ وہ شخص اندھا ہے جو کسی انسان کو صرف اس وقت پہچانے جب کہ اس کے گرد تاریخ کی تصدیقات جمع ہو چکی ہوں۔

ہدیۂ رحمت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین (ہم نے تم کو عالم والوں کے لیے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ سے کہا گیا کہ اے خدا کے رسولؐ، مشرکین کے خلاف بد دعا کیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (انی لم ابعث لعانا وانما بعثت رحمۃ)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کی رحمت ہوں جو ہدیہ کے طور پر بندوں کے پاس بھیجی گئی ہے۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن عمر قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ بعثنی رحمۃ مھداۃ بعثت برفع قوم وخفض آخرین (تفسیر ابن کثیر ۳/۲۰۱)

عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ نے مجھ کو رحمت اور ہدیہ بنا کر بھیجا ہے۔ میں ایک قوم کی بلندی اور دوسری قوم کی پستی کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے نمونہ ہیں۔ نیز ختم نبوت کے بعد آپ کی امت آپ کی نیابت کے مقام پر ہے۔ اب امت کو اقوام عالم کے لیے وہی کچھ بننا ہے جو آپ اپنی زندگی میں لوگوں کے لیے بنے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری اقوام کے لیے خدا کی طرف سے رحمت اور تحفہ تھے، اب آپ کی تبعیت میں آپ کی امت کو بعد کی قوموں کے لیے اسی طرح رحمت اور تحفہ بننا ہے۔ اس ذمہ داری کو ادا کیے بغیر اس امت کا امت محمدی ہونا متحقق نہ ہوگا۔

امت محمدی کو دوسروں سے مانگنا نہیں ہے بلکہ دوسروں کو دینا ہے۔ انھیں لوگوں کے لیے خدا کا ہدیۂ رحمت بننا ہے۔ انھیں اس طرح رہنا ہے کہ ان سے اہل عالم کو نفع بخشی کا تجربہ ہو نہ کہ ضرر رسانی کا۔

اس مقصد کے لیے امت کو صبر کرنا ہے تاکہ وہ چھننے کے باوجود دے۔ تاکہ وہ زیادتیوں کے باوجود لوگوں کی خیر خواہ بنے۔ تاکہ ظلم کے باوجود وہ اپنے آپ کو انتقام کے جذبہ سے پاک رکھے۔ صبر و برداشت کی صفت کے بغیر وہ امتحان کی اس دنیا میں دوسروں کے لیے ہدیۂ رحمت نہیں بن سکتی۔ اور جب تک وہ دوسروں کے لیے رحمت نہ بنے، خود اس کے اوپر بھی خدا کی رحمت کے دروازے بند رہیں گے۔

لوگ اپنے خلاف تنقید سے اتنا زیادہ برہم کیوں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تنقید کو توہین سمجھ لیتے ہیں۔ اگر وہ تنقید کو اختلاف رائے کے معنی میں لیں تو کبھی تنقید کو سن کر برہم نہ ہوں۔

آدمی کے اندر سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو باعزت دیکھنا چاہتا ہے وہ کسی حال میں اپنی بے عزتی کو پسند نہیں کرتا۔ جب وہ اپنے خلاف تنقید کو سنتا یا پڑھتا ہے تو مذکورہ نفسیا کی بنا پر تنقید اس کو اپنے عزت اور وقار پر حملہ معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید کو سنتے ہی فو مشتعل ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنا سارا غصہ ناقد کے اوپر انڈیل دے۔

تنقید بلاشبہ انسان کے لیے سب سے زیادہ کڑوی چیز ہے۔ اس میں عوام اور خواص کا کوئی فرق نہیں۔ صرف دو قسم کے انسان ہیں جو تنقید کے موقع پر غیر معتدل ہو جانے سے بچ سکتے ہیں۔

ایک وہ انسان جو بہت زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہو۔ یہ وہ انسان ہے جو خدا کی عظمتوں کو اتنی گہرائی کے ساتھ پاتا ہے کہ اپنا وجود اس کی نظر میں سراسر بے عظمت ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کو بڑا مان کر اپنے آپ کو چھوٹا بنا چکا ہوتا ہے۔ اُس کا یہ مزاج اِس میں رکاوٹ بن جاتا ہے کہ وہ تنقید کو سن کر بھڑک اٹھے تنقید اگر اس کو چھوٹا کرے تو وہ کیوں غضب ناک ہوگا، جب کہ اِس سے پہلے وہ خود اپنے آپ کو چھوٹا کر چکا ہے۔

دوسرا انسان جو تنقید سے برہم نہیں ہوتا، وہ انسان وہ ہے جس کے اندر حقیقی معنوں میں سائنسی مزاج پیدا ہو گیا ہو۔ سائنس نام ہے حقائق خارجی کے مطالعہ کا۔ سائنس داں کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ حقیقت وہ ہے جو خارج میں پائی جائے۔ نہ کہ وہ جو اس کے اپنے ذہن کے اندر موجود ہو۔ یہ سائنٹفک مزاج آدمی سے اس کی خود پسندی چھین لیتا ہے، اور اس کو پوری طرح واقعیت پسند بنا دیتا ہے۔ اس مخصوص مزاج کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب سائنس داں کے سامنے کوئی تنقیدی بات کہی جاتی ہے تو وہ اپنی ذات کو الگ کر کے اسے دیکھتا ہے۔ اس کا دھیان اس کی اصلیت کی طرف چلا جاتا ہے نہ کہ اِس طرف کہ وہ اُس کی ذات کو مجروح کر رہی ہے۔

جو شخص تنقید کو سن کر بھڑک اٹھے وہ صرف یہ ثابت کر رہا ہے کہ اس کے اندر نہ سچا تقویٰ ہے اور نہ سچا علمی مزاج۔ اگر اس پر تنقید کی گئی تو واقعۃً وہ اسی قابل تھا کہ اس پر تنقید کی جائے۔

مومن کا طریقہ

صحیح البخاری کی "کتاب التفسیر" میں قرآن سے متعلق بہت سی روایتیں جمع کی گئی ہیں۔ سورہ الحجرات کی تفسیر کے تحت ایک واقعہ دو واسطوں سے نقل کیا گیا ہے۔

ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ قریب تھا کہ دو اصحاب خیر ہلاک ہو جائیں۔ یعنی ابوبکر اور عمر۔ ان دونوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی آوازیں بلند کیں۔ یہ اس وقت ہوا جب کہ بنو تمیم کا وفد مدینہ آیا۔ ابوبکر نے کہا کہ القعقاع بن معبد کو ان کا امیر بنائیے۔ عمر نے کہا کہ الاقرع بن حابس کو ان کا امیر بنائیے۔ پھر ابوبکر نے عمر سے کہا کہ تم نے صرف میری مخالفت کے لیے ایسا کہا ہے۔ عمر نے جواب دیا کہ میرا مقصد تمہاری مخالفت نہیں۔ پھر دونوں بحث کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی آوازیں اونچی ہو گئیں۔ اس پر یہ آیت اتری کہ اے ایمان والو، تم اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو، تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اوپر مت کرو ...... ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو (الحجرات ۱-۲)

ابن الزبیر کہتے ہیں کہ اس کے بعد عمر کا یہ حال ہوا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس اس طرح بولتے کہ پوری طرح سنائی نہ دیتا اور رسول اللہ دوبارہ پوچھتے کہ تم نے کیا کہا (فما کان عمر یُسمع رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعد ھٰذہ الآیۃ حتی یَستفہمَہُ)

یہی مومن کا طریقہ ہے۔ مومن بے خبری میں خدا و رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کر سکتا ہے۔ مگر جیسے ہی اس کو بتایا جائے وہ فوراً اپنی آواز پست کر لیتا ہے۔ وہ اپنی آواز کو خدا و رسول کی آواز کے مقابلہ میں نیچا کر لیتا ہے۔

یہ صرف زمانۂ رسول کی بات نہیں۔ آج بھی اہلِ ایمان سے یہی مطلوب ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے براہِ راست رسولِ خدا کے ذریعہ اس کو متنبہ کیا جاتا تھا۔ آج قرآن و حدیث کے حوالے سے کوئی دوسرا متنبہ کرنے والا اس کو متنبہ کرے گا۔ آج بھی جب کسی کے سامنے خدا اور رسول کا حکم بیان کیا جائے تو اس کو اپنی آواز اسی طرح پست کر لینا چاہیے جس طرح دورِ اول کے اہلِ ایمان نے اس کے مقابلہ میں اپنی آواز کو پست کر لیا تھا۔

دو گواہ

حاجی امداد اللہ صاحب (۱۸۹۹ - ۱۸۱۷) دیوبند کے بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا طریقہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی کے بارہ میں کوئی بری بات کہتا تو وہ فوراً کہتے کہ دو گواہ لے آؤ۔ اور جب وہ دو گواہ نہ لاتے تو بات کو وہیں ختم کر دیتے اور کہتے کہ جب تمہارے پاس اپنی بات کے حق میں دو گواہ نہیں ہیں تو تمہاری بات قابلِ اعتبار نہیں۔

یہ عین شرعی طریقہ ہے۔ اسلام میں معاملات کے اثبات کے لیے شہادت کا اصول رکھا گیا ہے۔ یعنی کوئی شخص کوئی معاملہ کرے یا کسی بات کا دعوی کرے تو وہ اپنے دعوے کے حق میں معتبر گواہ پیش کرے۔ زنا کے معاملہ میں چار گواہ کا اصول ہے، اور بقیہ تمام معاملات میں دو گواہ کا اصول۔

ایک شخص کسی کے اوپر کوئی الزام لگائے تو البیّنۃ علی المدّعی کے شرعی اصول کے مطابق، اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا ثبوت پیش کرے۔ ضروری ثبوت پیش نہ کرنے کی صورت میں اس کی بات بالکل بے بنیاد قرار دی جائے گی۔

مگر موجودہ زمانہ میں مزاجوں کے بگاڑ کی وجہ سے یہ اصول عملاً ختم ہو گیا ہے۔ خاص طور پر جس شخص سے کسی وجہ سے شکایت یا تلخی ہو جائے اس کے بارہ میں تو کسی قسم کے ثبوت کی قطعاً ضرورت نہیں۔ جو بھی الٹی بات اس کے بارہ میں کہہ دی جائے اس کو سنتے ہی مان لیا جاتا ہے۔ نہ کوئی ثبوت مانگا جاتا اور نہ دو گواہ طلب کیے جاتے۔

یہ بیماری اتنی بڑھ گئی ہے کہ عوام تو درکنار خواص بھی اس میں ملوث ہیں۔ حتی کہ اکابر تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں کسی کے بارہ میں نہیں سنا یا جانا کہ اس کے سامنے اس کے "مخالف" پر کوئی الزام لگایا جائے اور وہ الزام لگانے والے سے کہے کہ اپنی بات کے ثبوت میں دو گواہ لاؤ، ورنہ تمہاری بات قبول نہیں کی جائے گی۔

قدیم زمانہ میں بزرگی کا مطلب وہ تھا جس کی مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔ مگر آج بزرگی کا مفہوم بالکل بدل گیا ہے۔ آج ایک آدمی گواہ اور ثبوت کے بغیر ایک الٹی بات کو مان لیتا ہے، اس کے باوجود اس کی بزرگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر بھی وہ اپنے معتقدین کے درمیان بدستور مقدس بنا رہتا ہے۔

تعلیم، تحریک

علی گڑھ کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی) کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک مسلمان نے اپنے لڑکے کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا۔ روانگی سے قبل انھوں نے اپنے صاحبزادے کو جو ضروری ہدایات دیں، ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ " دیکھو، رائڈنگ کلب کے گھوڑے پر وضو کے بغیر سوار نہ ہونا "

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں علی گڑھ کے بارہ میں مسلمانوں کے جذبات کیا تھے۔ وہ لڑکوں کو گھوڑے پر چڑھاتے ہوئے " بسم اللہ " اور " وضو " کی تاکید کرتے تھے۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ علی گڑھ میں وہ مسلم نسل تیار نہ ہوسکی جو دور جدید کی شہ سوار بن سکتی اور جدید چیلنج کا مقابلہ کرکے اسلام کو دوبارہ اس بلند مقام پر بٹھاتی جو دین فطرت ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے ابدی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے انسان تحریک سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ تعلیم سے۔ تعلیم گاہ میں صرف زبان اور علوم سکھائے جاتے ہیں۔ وہاں پروفیشنل سرٹیفکیٹ دیئے جاتے ہیں۔ اور ایک تعلیم گاہ کے ذریعہ صرف اتنا ہی ہو سکتا ہے۔ تعلیم گاہ آدمی کو واقف کار بنا سکتی ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ لکھنے اور پڑھنے لگے۔ مگر فکری انقلاب اور مقصدی حرکت اس سے الگ ایک چیز ہے، اور وہ کسی تعلیم گاہ کے ذریعہ کبھی پیدا نہیں کی جا سکتی۔

خود علی گڑھ میں اس کی ایک عملی مثال موجود ہے۔ طلبہ کے سرپرستوں کی مذکورہ تمناؤں یا یونیورسٹی میں تھیالوجی کے شعبہ سے وہاں کے طلبہ میں کبھی دینداری نہ آسکی۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب تبلیغی جماعت نے وہاں دعوتی اور تحریکی انداز میں محنت کی تو بہت سے طلبہ میں دینداری پیدا ہو گئی۔

ضرورت ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کے ساتھ تحریک کا اضافہ کیا جائے۔ تحریک سے میری مراد طلبہ کی یونین نہیں ہے۔ وہ تو میرے نزدیک صرف بگاڑ پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ میری مراد ایک ایسی تحریک سے ہے جو مکمل طور پر غیر سیاسی انداز کی ہو اور وقت کے فکری معیار پر اسلامی دعوت کا کام کرے۔ یہی تحریکی عمل اس بات کا ضامن ہوگا کہ علی گڑھ میں صرف ڈگری ہولڈر پیدا نہ ہوں بلکہ وہاں سے وہ انقلابی انسان تیار ہو کر نکلیں جو اسلام کی نئی تاریخ بنا سکیں۔

ردّ عمل کا نتیجہ

مسٹر جی ڈی برلا (۱۹۸۳-۱۸۹۴) ہندستان کے عظیم ترین صنعت کار ہونے کے علاوہ آزادی کی جدوجہد میں مہاتما گاندھی کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔

مسٹر برلا کے اندر قومی آزادی کے خیالات کس طرح پیدا ہوئے، اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں کہ "جب میری عمر سولہ سال تھی، میں نے کلکتہ میں دلال (broker) کی حیثیت سے اپنا ایک آزاد کاروبار شروع کیا۔ اس طرح میرا ربط انگریزوں سے بڑھا جو کہ اس وقت میرے گاہک یا میرے افسر تھے۔ ان سے ربط کے دوران میں نے ان کے اعلیٰ تجارتی طریقے دیکھے۔ ان کی تنظیمی صلاحیت اور ان کی دوسری بہت سی خصوصیات کا تجربہ ہوا۔ مگر ان کا نسلی غرور میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ مجھے یہ اجازت نہیں تھی کہ میں ان کے آفس میں جانے کے لیے لفٹ استعمال کروں۔ نہ مجھے اجازت تھی کہ انتظار کے وقت ان کی بنچ پر بیٹھوں۔ یہ توہین (insult) میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ اس کے نتیجہ میں میرے اندر سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی جو ۱۹۱۲ سے لے کر آخر تک پوری طرح قائم رہی۔

ہندستان ٹائمس (۱۲ جون ۱۹۸۳) کے اڈیٹر نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ان کی قوم پرستی کا آغاز تھا:

This was the beginning of his nationalism.

مسٹر برلا کا نیشنلزم نفرت انگریز کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کا اسلام ازم بھی کسی نہ کسی دشمن یا حریف کے خلاف نفرت کے تحت پیدا ہوا۔ دونوں اگرچہ الگ الگ الفاظ بولتے تھے۔ مگر دونوں ہی ردعمل کی پیداوار تھے۔ مثبت کیس نہ ایک کا تھا اور نہ دوسرے کا۔

ایک ہے ایجابی محرک کے تحت۔ دوسرا ہے منفی محرک کے تحت اٹھنا۔ ایجابی محرک کے تحت اٹھنے کا نام عمل ہے اور منفی محرک کے تحت اٹھنے کا نام ردّعمل۔ کوئی حقیقی نتیجہ ہمیشہ حقیقی عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ ردّعمل کوئی حقیقی عمل ہی نہیں۔ اس لیے اس کا کوئی حقیقی نتیجہ بھی ظاہر ہونے والا نہیں۔

تعمیر کا طریقہ

سینے کی سوئی جو بازار میں بکتی ہے، وہ اچانک نہیں بن جاتی۔ بلکہ بہت سے مرحلوں سے گزر کر تیار ہوتی ہے۔ سوئی کے کارخانہ میں لوہے کے ایک ٹکڑے کو تقریباً ۲۰ مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے، تب وہ سوئی بن کر تیار ہوتی ہے جس کو ایک آدمی سلائی کے کام میں استعمال کر سکے۔ سوئی بنانے والا ابتدائی لوہے کا تار، کچے لوہے سے اسٹیل کا تار بننے تک جن مراحل سے گزرتا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

یہ ایک سادہ چیز کی مثال ہے۔ اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دوسری مصنوعات اور پیچیدہ مشینوں کی تیاری میں کتنا زیادہ وقت لگتا ہوگا۔

مادہ کو مطلوبہ قالب میں ڈھالنے سے بہت زیادہ مشکل یہ کام ہے کہ انسان یا کسی انسانی گروہ کو مطلوبہ قالب میں ڈھالا جائے۔ مادہ اپنا ذاتی ارادہ نہیں رکھتا، مگر انسان کے اندر اپنا ذاتی ارادہ موجود ہے۔ اس لیے انسانی زندگی میں اصلاح کا کام بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان لیڈر اس حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہ اس طرح کام کرتے ہیں گویا ملت کی تعمیر کے معاملہ میں کوئی نتیجہ حاصل کرنے کے لیے کسی لمبے عمل کی ضرورت نہیں۔ یہاں محض نعروں اور تقریروں سے وہ شاندار نتائج حاصل ہو سکتے ہیں جو دوسرے معاملات میں صرف منصوبہ بند عمل ہی کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔

پچھلے سو برس کے اندر بے شمار سوئی کے کارخانے بنائے گیے، اور وہ کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ مگر اسی مدت میں رہناؤں کی دھواں دھار کوششوں کے باوجود ملت کی تعمیر ممکن نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوئی کا کارخانہ بنانے کے لیے قدرت کے قانون کی پوری رعایت کی جاتی ہے۔ مگر ملت کا کارخانہ بنانے کے لیے قدرت کے قوانین کی رعایت نہیں کی جا سکی۔ ملت کے معاملہ میں شاید لوگوں کا خیال ہے کہ محض نعرہ اور تقریر کا کرشمہ دکھانے سے نتیجہ برآمد ہو جائے گا۔

ملت کی تعمیر کا کام جلسوں اور مظاہروں سے شروع نہیں کیا جا سکتا۔ ملت کی تعمیر کا کام اصلاً افراد کی تعمیر کا کام ہے۔ اور افراد کی تعمیر کا کام خاموش محنت کے بغیر انجام پانا ممکن نہیں۔ یہی عقل اور تاریخ کا فیصلہ ہے۔

بزدلی نہیں اخلاق

ایک صاحب نے کہا کہ میں آپ کا الرسالہ پڑھتا ہوں۔ مگر اس کی ایک بات مجھے پسند نہیں۔ آپ مسلمانوں کو ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ تو بزدلی ہے۔ کیا آپ سارے مسلمانوں کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔

یہ صاحب ایک چھوٹے دکاندار ہیں۔ وہ عام ضرورت کی چیزیں بیچتے ہیں۔ ایک روز میں ان کی دکان پر گیا۔ میں وہاں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لڑکا آیا۔ اس کے ہاتھ میں دیاسلائی تھی، اس نے دیاسلائی کی ڈبیہ زور سے ان کی طرف پھینکی اور بگڑ کر کہا: اس پر آپ ۶۰ تیلی لکھے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ اس میں صرف ۵۰ تیلیاں ہیں۔ لڑکے نے گستاخی بھی کی تھی اور جارحیت بھی۔ مگر دکان دار نے اس کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی کے ساتھ دوسری ڈبیہ نکال کر اس کو دیدی۔ نرمی کے ساتھ صرف اتنا کہا: کوئی بات نہیں، دوسری لے جاؤ۔

لڑکا جب چلا گیا تو میں نے دکاندار سے پوچھا کہ لڑکے نے اتنی سخت بدتمیزی کی، مگر آپ کچھ نہیں بولے۔ دکاندار نے کہا کہ پہلے میں خوب بولتا تھا، بلکہ گاہکوں سے لڑائی کر لیتا تھا، مگر اس کے بعد کیا ہوا کہ میری دکانداری ختم ہو گئی۔ پھر میں نے ایک بنیا کو دیکھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اس کی دکان خوب چل رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ گاہکوں سے کبھی نہیں الجھتا۔ وہ گاہک کی ہر الٹی بات کو نظر انداز کر کے اس سے معاملہ کرتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی کرنے لگا۔ اب خدا کے فضل سے میری دکان چلنے لگی۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اچھی چل رہی ہے۔

دکاندار کی بات میں خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ آخر میں میں نے کہا: بھائی صاحب، مجھ میں اور آپ میں صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ آپ تجارتِ دنیا کے لیے بزدل بنے ہوئے ہیں، میں تجارتِ آخرت کے لیے بزدل بن جانا چاہتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا معاملہ "بزدلی" نہیں، وہ ایک اخلاقی اصول ہے۔ وہ بے عملی نہیں بلکہ عین عمل ہے۔ وہ ہار ماننا نہیں ہے بلکہ سب سے بڑی جیت کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ وہ کھونا نہیں بلکہ پانا ہے۔ وہ کسی آدمی کے سامنے جھکنا نہیں ہے بلکہ رب العالمین کے سامنے اپنے آپ کو جھکانا ہے۔

جو لوگ صبر کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، اس کا سبب صرف ان کی ناسمجھی اور کوتاہ بینی ہے نہ کہ ان کی معاملہ فہمی اور سمجھداری۔

زندگی کا سوال

گریٹا گاربو (Greta Garbo) ۱۸ ستمبر ۱۹۰۵ کو سویڈن میں پیدا ہوئی، ۱۵ اپریل ۱۹۹۰ کو امریکہ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کو شہرت اور دولت (fame and money) کی تمنا تھی۔ اس کے لیے وہ فلمی دنیا میں گئی۔ یہاں اس کو اتنی کامیابی ملی کہ وہ فلمی دیوی (screen goddess) کہی جانے لگی۔

فلم نے گریٹا گاربو کو دولت اور شہرت دی۔ مگر اس نے اس کی اپنی شخصیت کو اس سے چھین لیا۔ وہ پوری طرح فلم کمپنی کے کنٹرول میں تھی۔ ایسا بال کاٹو، ایسا کپڑا پہنو، اس طرح بولو، اس طرح چلو۔ اس کے چہرے کو میک اپ کے ذریعہ بار بار بدلا جاتا۔ اس کی مسلسل مالش کی جاتی تاکہ اس کی جسمانی نزاکت باقی رہے۔ وغیرہ۔ ان چیزوں سے وہ اتنا گھبرا اٹھی کہ اپنی تنہائیوں میں اکثر وہ روتی اور چیختی۔ مگر وہ فلمی ذمہ داروں کے ہاتھ میں بالکل بے بس تھی۔

آخر کار ۱۹۴۱ میں اس نے فلمی زندگی کو مکمل طور پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سے آخر عمر تک اس نے اپنے گھر کے اندر بالکل تنہا زندگی گزاری، یہاں تک کہ ۸۴ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔ شہرت کی زندگی گمنامی کی موت پر ختم ہوگئی۔

گریٹا گاربو گم نام مرجانا چاہتی تھی۔ اینٹونی گرونو ویز نے بمشکل اس کو تیار کیا کہ وہ اس کو اپنی زندگی کے حالات لکھنے کی اجازت دے اور اس کو اپنے حالات بتائے۔ گریٹا گاربو نے سخت اصرار کے بعد اس شرط پر اجازت دی کہ اس کے بارہ میں جو کتاب لکھی جائے وہ اس کے مرنے کے بعد چھپے۔ اس طرح ایک کتاب تیار ہوئی۔ مگر مصنف کا انتقال ۱۹۸۵ میں ۷۱ سال کی عمر میں ہوگیا جب کہ گریٹا گاربو ابھی زندہ تھی۔ گریٹا گاربو کے مرنے کے بعد ۱۹۹۰ میں یہ کتاب امریکہ سے شائع کی گئی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Garbo: Her Story by Antoni Gronowicz

ٹائمس آف انڈیا (۹ ستمبر ۱۹۹۰) میں اس کتاب کا ایک حصہ شائع ہوا ہے۔ اس کے مطابق گریٹا گاربو نے اپنی آخر عمر میں مصنف سے کہا:

I have lost a belief in people, in a God who put me in this situation without replying clearly to my questions. I am floating on the waters of life without direction, without a goal, without the knowledge of why and how long. (p. 15)

میں نے عوام میں اپنا یقین کھو دیا ہے ۔ میں نے خدا میں بھی یقین کھو دیا ہے جس نے مجھے اس حال میں رکھا، بغیر اس کے کہ وہ میرے سوالات کا واضح جواب دے ۔ میں زندگی کے پانی میں کسی سمت کے بغیر بہہ رہی ہوں ۔ میری کوئی منزل نہیں ۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ کیوں اور کب تک میرا یہ سفر جاری رہے گا ۔

یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس نے خدا کو چھوڑ کر غیر خدا کو اپنا مرکز توجہ بنایا، پھر اس کو اس میں تسکین نہ مل سکی ۔ یہاں تک پچاس سال بے چینی کی حالت میں رہ کر اس نے اپنی جان دیدی ۔

گریٹا گاربو کا واقعہ ایک انتہائی انداز کا واقعہ ہے ۔ مگر کم و بیش یہی واقعہ ہر ایک کے ساتھ پیش آرہا ہے ۔ ہر آدمی خدا کو چھوڑے ہوئے ہے ۔ ہر آدمی کسی نہ کسی غیر خدا کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ رہا ہے ۔ مگر جب وہ اس کو پالیتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی طلب کا جواب نہ تھا ۔ اس نے غلط فہمی میں ایک ایسی چیز کو اپنا مقصود و مطلوب بنا لیا جو حقیقۃً اس کا مقصود و مطلوب نہ تھا ۔

ہر آدمی اس حوصلہ کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے کہ وہ اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے ۔ مگر جب منزل آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ منزل نہ تھی بلکہ ایک کھڈ تھا جس میں وہ اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو لیے ہوئے جا گرا ۔

سائنس کی واپسی

ایک درخت جس کی جڑ کٹی ہوئی ہو، اس کو زمین میں لگائیں تو پہلے دن وہ بظاہر ہرا بھرا دکھائی دے گا۔ مگر اگلے ہی دن اس کی پتیاں مرجھانا شروع ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ وہ سوکھ کر ختم ہو جائے گا۔ یہی حال موجودہ زمانہ میں الحاد اور انکار مذہب کا ہوا ہے۔ ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مذہب کا دور ختم ہو گیا، اور اب انسانی تاریخ ہمیشہ کے لیے لامذہبیت کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ مگر جلد ہی یہ تمام خیالات بکھر گیے۔ مذہب نئی طاقت کے ساتھ دوبارہ انسانی زندگی میں لوٹ آیا۔

انیسویں صدی کے آخر تک علمی دنیا میں اس چیز کا زور تھا جس کو پر جوش طور پر علمی الحاد (Scientific atheism) کہا جاتا ہے۔ مگر بیسویں صدی میں سائنس میں جو نئی تحقیقات ہوئیں، انھوں نے علمی الحاد کو بے زمین کرنا شروع کر دیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں سر جیمز جینز نے اعلان کیا تھا کہ جدید سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے، وہ مشینی توجیہ (Mechanical interpretation) کو قبول کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ اب اس صدی کے آخر میں نظریاتی طبیعیات دانوں (Theoretical physicists)[1] کی بڑی تعداد ایسی پیدا ہو گئی ہے جو کائنات کی تشریح ایسے انداز میں کر رہی ہے جس کے مطابق، خدا کو ماننے بغیر کائنات کی توجیہ ممکن نہیں۔

اس سلسلہ میں ۱۹۸۸ میں ایک قابل ذکر کتاب چھپی ہے۔ یہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام اور مصنف کا نام حسب ذیل ہے:

Stephen W. Hawking, *A Brief History of Time*

بگ بینگ (Big bang) نظریہ کہتا ہے کہ کائنات اپنے آغاز سے اب تک ایک خاص رفتار سے مسلسل پھیل رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اسٹیفن ہاکنگ نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ کائنات کے پھیلنے کا یہ عمل نہایت سوچا سمجھا (Well-calculated) ہے۔

رفتار توسیع کی ابتدائی شرح حد درجہ صحت کے ساتھ مقرر کی گئی ہے۔ کیوں کہ رفتار توسیع کی یہ شرح اس نازک شرح (Critical rate) کے انتہائی قریب ہے جو کائنات کو دوبارہ انہدام (Recollapse)

سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گرم بگ بینگ کا ماڈل درست ہے اور اسی سے وقت کا آغاز ہوا ہے تو کائنات کی ابتدائی حالت حد درجہ احتیاط کے ساتھ منتخب کی گئی ہو گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک کائنات پھٹ کر ختم ہو چکی ہوتی۔

اس مظہر کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی جب تک یہ نہ مانا جائے کہ کائنات کی توسیع کی شرح رفتار (Rate of expansion) حد درجہ احتیاط کے ساتھ منتخب کی گئی ہے۔

اسٹیفن ہاکنگ نے اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ کائنات کیوں ٹھیک اس انداز پر شروع ہوئی، اس کا جواب دینا انتہائی مشکل ہوگا سوا اس کے کہ یہ مانا جائے کہ یہ خدا کا عمل ہے جس نے چاہا کہ وہ ہمارے جیسی مخلوق کو یہاں پیدا کرے:

> It would be very difficult to explain why the universe should have begun in just this way, except as the act of a God who intended to create beings like us (p. 134).

کائنات کی ایک حیرت ناک صفت یہ ہے کہ وہ خدائی تعبیر کے سوا کسی اور تعبیر کو قبول نہیں کرتی۔ کائنات ایک معلوم اور مشہود واقعہ ہے۔ اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں بہترین دماغ اس کی تشریح و تعبیر میں مصروف رہے ہیں۔

کسی نے کہا کہ کائنات ہمیشہ سے اسی طرح ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ اپنے آپ بنی اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے۔ کسی نے کہا کہ اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہے جس نے کائنات کی تمام چیزوں کو وجود دیا ہے۔ کسی نے اصول ارتقاء کو کائنات کا خالق ثابت کرنے کی کوشش کی۔ وغیرہ

مگر خود انسانی معلومات ان تمام تشریحات و توجیہات کو رد کرتی رہیں۔ کائنات کے نظام کے بارہ میں انسان جتنا زیادہ واقفیت حاصل کرتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ یہ بات بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک خدائے ذوالجلال کے سوا کوئی اور ہو۔

کائنات اپنے وجود کے ساتھ یہ گواہی دیتی ہے کہ اس کا خالق خدا ہے۔ خدا کے سوا کسی اور کو خالق کائنات بتانا صرف ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔ جس کے حق میں کوئی حقیقی ثبوت موجود نہیں۔ اس سلسلہ میں جتنے دعوے یا مخالفانہ نظریے پیش کیے گیے، وہ خود علم انسانی کی روشنی میں غلط اور بے بنیاد ثابت ہو گئے۔

غلط فہمی

کویت پر عراقی قبضہ کے بعد کویت کا حکمراں خاندان سعودی عرب چلا گیا تھا۔ دوبارہ جب کویت عراقی قبضہ سے آزاد ہوا تو کویت کے ولی عہد سعد الصباح ۴ مارچ ۱۹۹۱ کو اپنے وطن واپس آئے۔ کویت ایرپورٹ پر وہ اپنے ہوائی جہاز سے اترے تو ایک واقعہ ہوا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کے فوٹوگرافر نے فوراً اس کا فوٹو لے لیا۔ یہ فوٹو ٹائمس آف انڈیا، اور ہندستان ٹائمس (۶ مارچ ۱۹۹۱) کے صفحہ اول پر شائع ہوا ہے۔ مقابل کے صفحہ پر ہم اس کو نقل کر رہے ہیں۔

اس تصویر کے نیچے جو تشریحی الفاظ چھاپے گئے ہیں وہ یہ ہیں: "کویت کے ولی عہد سعد الصباح خلیج کی جنگ کے بعد ۴ مارچ کو جلاوطنی سے واپس آئے۔ ہوائی جہاز سے اترنے کے بعد کویت ایرپورٹ پر وہ اپنے وطن کی زمین کو چوم رہے ہیں۔" امریکی نیوز ایجنسی کے نمائندہ نے دیکھا کہ سعد الصباح سات مہینہ کے بعد اپنے وطن واپس آئے تو ہوائی جہاز سے باہر آنے کے بعد انھوں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی۔ اس نے اپنے ذہن کے تحت سمجھا کہ بچھڑے ہوئے وطن کو دوبارہ پاکر وہ اس کی زمین کو چوم رہے ہیں۔ حالاں کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ انھیں اللہ کا انعام یاد آیا اور وہ سجدۂ شکر کے طور پر زمین پر گر پڑے۔ سعد الصباح کے لئے وہ اللہ کے سامنے مومنانہ سجدہ تھا، مگر غیر مسلم اخبار نویس کے ذہن میں وہ زمین کا سجدہ بن گیا۔

انسانوں کے درمیان اکثر غلط فہمیاں اسی طرح پیدا ہوتی ہیں۔ غلط فہمی حقیقۃً غلط توجیہہ کا دوسرا نام ہے۔ آدمی دوسرے کے بارہ میں ایک بات سنتا ہے یا دوسرے کے کسی واقعہ کو دیکھتا ہے۔ اور پھر اپنے ذاتی ذہن کے مطابق بطور خود اس کو ایک معنی پہنا دیتا ہے۔

ایسے موقع پر صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی نے جو کچھ دیکھا یا سنا ہے، اس کے بارہ میں وہ مزید تحقیق کرکے پوری بات معلوم کرے۔ اور پھر پوری معلومات کی روشنی میں کوئی رائے قائم کرے۔ مگر آدمی ایسا نہیں کرتا۔ وہ پیش آمدہ معاملہ کے بارہ میں غیر ذمہ دارانہ طور پر ایک رائے قائم کر لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھیانک غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ "سجدۂ الٰہی" کو "سجدۂ زمین" سمجھ لیتا ہے۔ وہ ایک موحدانہ واقعہ کو مشرکانہ واقعہ بنا دیتا ہے۔

ایسا اگر جان بوجھ کر کیا جائے تو وہ بہتان ہے جو اللہ کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ تاہم اگر حقیقت حال آدمی کے علم میں نہ ہو تب بھی وہ یقینی طور پر قصور وار ہے۔ کیوں کہ شریعت میں اس قسم کی بات کی تحقیق کا لازمی حکم دیا گیا ہے۔ ایسے کسی معاملہ میں آدمی اگر اپنی زبان کھولنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ پہلے اس کی ضروری تحقیق کرے۔ اور اگر وہ کسی وجہ سے تحقیق نہیں کر سکتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس معاملہ میں چپ رہے، نہ کہ ناکافی معلومات کو لے کر اس پر بولنے لگے۔

Crown Prince Saad al-Sabah of Kuwait kisses the ground after alighting from the plane at Kuwait City international airport on Monday as he returned from exile following the war. — AP/PTI

اتحاد کی طاقت

ٹائیکو براہے (Tycho Brahe) ۱۵۴۶ میں پیدا ہوا، اور ۱۶۰۱ میں پراگ میں اس کی وفات ہوئی۔ جوہانس کیپلر (Johannes Kepler) ۱۵۷۱ میں پیدا ہوا، اور ورٹمبرگ میں ۱۶۳۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ دونوں فلکیات کے شعبہ میں تحقیق کر رہے تھے، مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس حیثیت میں نہ تھا کہ وہ عالم افلاک میں کوئی بڑی حقیقت دریافت کر سکے۔

ٹائیکو براہے اور کیپلر دونوں ہم عصر تھے۔ مگر ایک چیز دونوں کے لئے کسی بڑی فلکیاتی دریافت میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنے موضوع کے ہر گوشہ پر مہارت نہ رکھتا تھا۔ ٹائیکو براہے نے کثرت سے فلکیات کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ اپنے مشاہدات کو قلم بند کرتا رہتا تھا، فلکیاتی مشاہدات کے بارہ میں یہ تحریری ذخیرہ اس کے پاس کافی مقدار میں جمع ہو گیا تھا۔ مگر علم الافلاک کا دوسرا پہلو ریاضی سے تعلق رکھتا ہے، اور ٹائیکو براہے ریاضی میں کمزور تھا۔ اس بنا پر اس کو یہ قدرت حاصل نہ تھی کہ اپنے مشاہدات کو ریاضی کی کلیات میں مربوط کر سکے۔

دوسری طرف کیپلر کا معاملہ یہ تھا کہ وہ فلکیاتی مشاہدہ میں کوئی مہارت نہ رکھتا تھا۔ وہ بہت کم مشاہدہ کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں اگرچہ دوربین دریافت ہو چکی تھی، مگر عملاً وہ دوربین سے کام نہ لے سکا تھا۔ اس کی خصوصیت صرف یہ تھی کہ وہ ریاضیات کا ماہر تھا اور حسابی طور پر اس نے فلکیات کے بارہ میں بہت سے قیمتی نظریات وضع کئے تھے۔

یہاں ٹائیکو براہے کی فراخ دلی نے کام کیا۔ ٹائیکو براہے اور کیپلر میں اگرچہ ذاتی اختلافات تھے۔ حتی کہ کیپلر نے اپنے ایک خط میں ٹائیکو براہے پر منافقت کا الزام لگایا تھا اور اس کو بہت برا بھلا کہا تھا، مگر ٹائیکو براہے، اپنی تیز مزاجی کے باوجود، کیپلر پر غصہ نہیں ہوا۔ آخر وقت میں اس نے سوچا کہ میرے علمی ذخیرہ کا سب سے بہتر وارث کیپلر ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے کیپلر کی گستاخیوں کو بھلاتے ہوئے اس کو اپنے پاس بلایا اور ۱۶۰۱ میں

اپنی موت سے پہلے اپنا پورا تحریری ذخیرہ بلا معاوضہ کیپلر کے حوالہ کر دیا۔

جب ٹائیکو براہے کے مشاہدات کا سارا سرمایہ کیپلر کے پاس آگیا تو کیپلر کی کمی کی تلافی ہوگئی۔ اب اس نے اپنے دماغ کی تمام ریاضیاتی قوت کو ان مشاہدات کے ساتھ مربوط کرنے میں لگا دیا۔ اس کا نتیجہ ان تین کلیات کی صورت میں نکلا جو کیپلر کے سہ گانہ قوانین حرکت (Kepler's laws of planetary motion) کے نام سے مشہور ہیں۔ ان قوانین کو استعمال کرتے ہوئے بعد کو سر آئزک نیوٹن (۱۷۲۷ - ۱۶۴۳) نے قوت کشش (Gravitational force) کے بارہ میں اپنی دریافت مکمل کی۔

یہی موجودہ دنیا میں کسی بڑی کامیابی کا راز ہے۔ ہر آدمی کی اپنی محدودیت ہوتی ہے۔ اس بنا پر کوئی بھی شخص تنہا کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا۔ کوئی بڑا کام اس وقت انجام پاتا ہے جب کہ کئی لوگ اپنی صلاحیتوں اور اپنی کوششوں کو ایک رخ پر لگانے کے لئے راضی ہو جائیں۔ متحدہ کوشش کے بغیر اس دنیا میں کسی بڑے واقعہ کو ظہور میں لانا ممکن نہیں۔

مگر متحدہ کوشش کی ایک قیمت ہے۔ اور وہ قیمت ہے ـــــ اختلاف کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اتحاد کی بات پر ایک دوسرے سے جُڑنا۔ اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ متحد ہو جانا۔

انسان کے اندر اختلاف کا پایا جانا لازمی ہے۔ اس دنیا میں اخلاص کے باوجود لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اختلاف سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں عملی بات صرف یہ ہے کہ لوگ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا حوصلہ پیدا کریں۔ اجتماعی مفاد کے لئے انفرادی پہلوؤں کو بھلا دیں۔ بڑی چیز کی خاطر چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر دیں۔ مقصد کے تقاضے کے لئے اپنی ذات کے تقاضوں کو دفن کر دیں۔

اسی کا نام بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی ہے۔ اور اس بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کے بغیر اس دنیا میں کسی بڑے منصوبہ کو تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں۔

قومی مسئلہ

دسمبر ۱۹۹۰ میں امریکہ اور جاپان کے سفر پر تھا۔ تین ہفتہ کے اس سفر کے دوران میری ملاقات کویت کے ایک باشندہ سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کویت میں نہایت آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو جب عراقی صدر صدام حسین نے دو لاکھ مسلح فوج کویت میں داخل کر دی اور اس پر قبضہ کر لیا تو اچانک انھوں نے پایا کہ ان کی جان، مال، عزت، سب کچھ غیر محفوظ ہے۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر کویت سے بھاگے۔ طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرتے ہوئے وہ باہر کے ایک ملک میں پہنچ گئے جہاں انھیں پناہ گزیں کی حیثیت سے قیام کرنا پڑا۔

گفتگو کے دوران مذکورہ کویتی مسلمان نے کہا کہ آپ لوگ انڈیا میں ہم سے بہت بہتر ہیں۔ آپ ایک بڑے ملک کے شہری ہیں۔ آپ کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہیں آسکتا کہ کسی بیرونی ملک کی فوجیں اچانک آپ کے ملک میں گھس آئیں اور آپ کے اوپر زبردستی قبضہ کر لیں۔ جب کہ کویت ایک بہت چھوٹا ملک ہے۔ وہ کسی بھی وقت دوسروں کی دستبرد سے محفوظ نہیں۔

انھوں نے مزید کہا کہ دیکھئے۔ اسی صدام حسین نے اس سے پہلے ایران پر حملہ کیا اور آٹھ سال (۱۹۸۸-۱۹۸۰) تک اس سے لڑتا رہا۔ مگر وہ ایران کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ کیوں کہ ایران ایک بڑا ملک تھا۔ اور اب اسی صدام حسین نے صرف ایک دن کے اندر پورے کویت پر قبضہ کر لیا۔ کیوں کہ کویت ایک چھوٹا ملک ہے۔

مسئلہ کیا ہے

مجھے کویت کے باشندہ کی یہ بات بہت درست معلوم ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ جب ایسا ہے تو انڈیا کے سرحدی صوبوں ——— پنجاب، کشمیر، آسام، میں علیحدگی کی تحریکیں کیوں چل رہی ہیں۔ حالانکہ یہ صوبے اگر انڈیا سے الگ ہو جائیں تو وہ کویت سے بھی زیادہ کمزور اور بے سہارا ہوں گے۔ ایسی حالت میں علیحدگی کے پرشور مطالبہ کا کیا حاصل۔ جن لوگوں کو ایک بڑے ملک کا شہری ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ وہ اپنے کو چھوٹے ملک کا شہری بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔

اس سوال پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس نادانی کا اصل سبب وہ چیز ہے جس کو مذہب

:ں عدم قناعت کہا گیا ہے۔ یعنی ملی ہوئی چیز کو کم سمجھنا، اور جو چیز نہیں ملی اس کو زیادہ خیال کرنا۔
آسام اور پنجاب اور کشمیر والوں کو آج بھی بہت کچھ ملا ہوا ہے۔ مگر وہ اس پر قانع نہیں۔ وہ دیکھتے :ں کہ کچھ لوگوں کو بعض اعتبار سے ان سے زیادہ حاصل ہے۔ وہ نہ ملے ہوئے پر نظر جمانے کی وجہ سے ملے ہوئے کی قدر نہیں کر پاتے۔ وہ نہ ملے ہوئے کو لینے کی فکر میں اپنے ملے ہوئے کو بھی برباد کر رہے ہیں۔

شیخ محمد عبد اللہ یہ سوچتے تھے کہ انڈیا سے الحاق شدہ کشمیر میں وہ صرف "چیف منسٹر" بن سکتے ہیں۔ اور اگر کشمیر ایک علیحدہ ملک کی حیثیت حاصل کر لے تو وہ اس کے "پرائم منسٹر" کہے جائیں گے۔ اس تخیل نے ان کے اندر آزاد کشمیر کا نظریہ پیدا کیا۔ یہی نظریہ ہے جس نے دوبارہ زندہ ہو کر کشمیر میں موجودہ خوں ریز تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔

اسی قسم کے سنہرے خواب ہیں جو کشمیر، پنجاب، آسام، ہر جگہ کے لیڈروں کو علیحدگی کی تحریک پر اکسائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ صرف خام خیالی ہے۔ اگر بالفرض یہ علاقے انڈیا سے الگ ہو جائیں اور وہاں کے لیڈر اپنے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے پرائم منسٹر بن جائیں تو مسئلہ ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ وہ شدید تر صورت اختیار کر لے گا۔ کیوں کہ ان کے مفروضہ آزاد ملک میں بھی پرائم منسٹر صرف ایک ہی شخص بنے گا۔ بقیہ تمام لوگ بدستور غیر پرائم منسٹر بن کر رہنے پر مجبور ہوں گے۔ اس کے نتیجہ میں دوبارہ نئی صورت میں مفادات کا ٹکراؤ شروع ہو جائے گا۔

اس کے بعد یہ ہوگا کہ آج جو ٹکراؤ "صوبہ اور مرکز" کے درمیان ہے، وہ خود صوبہ (آزاد ملک) کے ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان شدید تر شکل میں پیدا ہو جائے گا۔ اس کے نتیجے میں طرح طرح کی خرابیاں جنم لیں گی۔ "آزاد ملک" ترقی کی طرف سفر کرنے کے بجائے آپس کی لڑائیوں اور بے شمار نئے نئے مسائل کے درمیان پھنس کر رہ جائے گا۔ اس کی ایک قریبی مثال آج بھی بنگلہ دیش کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاست کو نتیجہ رخی (result-oriented) ہونا چاہئے۔ سیاست کا صحیح ترین اصول یہ ہے کہ جو چیز حاصل ہونے والی نہیں اس میں مشغول ہو کر اپنی قوت کو ضائع نہ کرو۔ بلکہ حاصل ہونے والی چیز میں اپنی محنت کو لگاؤ۔ کیوں کہ سیاست دراصل ممکن کا

کھیل ہے:

Politics is the art of possible

اس دنیا میں تمام امنگوں کا پورا ہونا ممکن نہیں۔ یہاں آدمی کو امنگوں سے کم تر حالت پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو کم پر راضی ہو جائے۔ کم پر راضی ہو کر وہ ممکن کو پالیتا ہے۔ اور کم پر راضی نہ ہو کر وہ ممکن کو بھی کھو دیتا ہے۔ اور ناممکن تو پہلے ہی سے اس کے لئے کھویا ہوا ہے۔

ایک اور مثال

اسی طرح ایک اور سفر میں میری ملاقات بنگلہ دیش کے ایک مسلمان سے ہوئی۔ وہ کراچی جارہے تھے تاکہ وہاں اپنے لئے کوئی معاشی کام تلاش کریں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے پاکستان سے لڑکر اپنا ملک الگ بنایا تھا۔ اور اس کو آپ لوگ "سونار بنگلہ" کہتے تھے۔ پھر اب پاکستان میں کیوں آپ اپنا مستقبل بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ سب لیڈروں کے نعرے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بنگلہ دیش بننے سے پہلے ہم لوگ آج سے بہت زیادہ بہتر تھے۔

اس معاملہ پر غور کیجئے تو زندگی کی ایک اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ آزاد بنگلہ دیش کی تحریک کیوں چلی اور ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش پاکستان سے الگ کیوں ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ۱۹۴۷ میں جب تقسیم ہوئی اور مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی صورت میں ایک علیحدہ ملک بنا تو اس وقت پنجابی لوگ فوج اور دوسرے سرکاری عہدوں پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ صورت حال پاکستان بننے کے بعد بھی برقرار رہی۔ اس سے بنگلہ دیش والوں میں ناراضگی پیدا ہوئی۔ انھوں نے سمجھا کہ ہم انگریزوں کی غلامی سے نکل کر پنجابیوں کی غلامی میں آگئے ہیں۔ چنانچہ وہاں دوبارہ آزادی کی نئی تحریک چل پڑی۔

مگر یہ تحریک محض ایک جذباتی تحریک تھی۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بنگلہ دیش کے لوگوں کے پچھڑے پن کا سبب ان کا تعلیم میں پچھڑا پن تھا۔ یہ دوسروں کی غلامی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ خود اپنی کمی اور کوتاہی کا مسئلہ تھا۔ اس کا صحیح حل یہ تھا کہ وہ پاکستان میں شریک رہتے ہوئے اپنی تعلیمی کمی کو دور کرنے کے لئے محنت کرتے۔ مگر بنگلہ دیش کے سطحی لیڈروں نے ان کی اس بے چینی کا سیاسی استعمال کیا۔ اور اپنی کمزوریوں کا الزام پاکستان پر ڈال کر نفرت کی ایک دھواں دھار تحریک چلادی۔ اس

کے نتیجہ میں بنگلہ دیش نے سیاسی آزادی تو حاصل کر لی ۔ مگر اس سیاسی آزادی کے بعد جو ملک بنا وہ صرف ایک کمزور اور بدحال ملک تھا۔ عالمی نقشہ میں اس کی کوئی قیمت نہ تھی ۔ جب اصل سبب دور نہ کیا گیا ہو تو انقلاب صرف ایک نئی بربادی کے ہم معنی ثابت ہوتا ہے۔

اس وقت پنجاب ، آسام ، اور کشمیر میں علیحدگی پسندی کی جو تحریکیں چل رہی ہیں ، ان سب کی مشترک غلطی یہی ہے ۔ ان صوبوں کے لوگوں کو کچھ شکایتیں ہیں ۔ یہ شکایتیں بالفرض درست ہوں ، تب بھی ان کے اسباب کچھ اور ہیں ۔ مگر ان صوبوں کے لیڈروں نے ساری ذمہ داری " نئی دہلی " پر ڈال کر علیحدگی کی تحریک چلا دی ۔ اگر بالفرض یہ تحریکیں کامیاب ہو جائیں اور انھیں ان کی مطلوبہ آزادی مل جائے تو یہ ان کے لئے موجودہ صورت حال سے بھی زیادہ برا ہوگا۔ وہ ایک کمزور اور بدحال ملک کی حیثیت سے زندہ رہیں گے ۔ وہ صرف نیا بنگلہ دیش بنائیں گے ، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اس دنیا میں جب بھی کسی شخص یا گروہ کو کوئی محرومی پیش آتی ہے تو وہ خود اپنی کسی کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسروں سے لڑنے کے بجائے خود اپنی کمی کو دور کرے ۔ اگر اس نے اپنی داخلی کمی کو دور کر لیا تو اس کی خارجی کمی اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

اصل حقیقت

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کامپٹیشن کی دنیا ہے ۔ یہاں ہر وقت مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس مقابلہ میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آگے بڑھ جاتا ہے اور کوئی پیچھے رہ جاتا ہے ۔ کوئی زیادہ پر قابض ہو جاتا ہے اور کسی کو کم پر راضی ہونا پڑتا ہے۔

مگر اس قسم کی کوئی بھی صورت حال مستقل نہیں ۔ یہاں ہر پچھڑے ہوئے کے لئے موقع ہے کہ وہ ازسرنو محنت کرکے آگے بڑھ جائے ۔ اور ہر آگے جانے والے کے لئے اندیشہ ہے کہ وہ نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں کمزور ثابت ہو اور دوبارہ پچھلی صف میں پہنچ جائے۔

ایسی حالت میں زندگی کا اصل راز محنت ہے نہ کہ ٹکراؤ ۔ بنگلہ دیش والوں نے تعلیم اور معاشی سرگرمیوں میں محنت کی ہوتی تو ایک روز آتا جب وہ پنجابیوں سے بھی آگے بڑھ جاتے ۔ مگر منفی سیاست چلا کر وہ کچھ اور زیادہ برباد ہو گئے ۔ اسی طرح پنجاب اور آسام اور کشمیر کے لوگ اگر تعلیم اور اقتصادیات جیسے تعمیری میدانوں میں محنت کریں تو وہ سارے ملک میں اونچا

مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر موجودہ منفی تحریک کے ذریعہ وہ صرف اپنے مواقع کو ضائع کر رہے ہیں۔ وہ اپنے دورِ تحریک میں بھی برباد ہو رہے ہیں۔ اور اگر وہ اپنے خیال کے مطابق کامیابی کے مرحلہ میں پہنچ جائیں تو ایک کمزور اور تباہ شدہ ملک کے سوا ان کے حصہ میں کچھ اور آنے والا نہیں۔

"سونار بنگلہ" اس دنیا میں محنت کے ذریعہ بنتا ہے، وہ سیاسی تحریک چلا کر یا مار دھاڑ کے ہنگامے جاری کر کے نہیں بنتا۔ ہمارے پنجابی اور کشمیری اور آسامی بھائیوں کے لئے بہترین نمونہ وہ ہے جو جاپان کی جدید تاریخ میں ملتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان نے امریکہ کی "محکومی" پر راضی رہتے ہوئے محنت کے میدان میں عمل کیا۔ امریکہ سے ٹکراؤ کے میدان کو چھوڑ کر وہ اس میدان میں سرگرم ہوا جہاں ٹکراؤ کا کوئی امکان نہ تھا۔ یہ طریق کار انتہائی مفید ثابت ہوا۔ ۴۵ سال بعد آج جاپان اتنی زیادہ ترقی حاصل کر چکا ہے کہ وہ خود امریکہ کو چیلنج کر رہا ہے۔

مگر ہمارے یہ بھائی بدقسمتی سے "بنگلہ دیش" کو اپنے لئے نمونہ بنائے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ بنگلہ دیش کی حالت یہ ہے کہ اس نے خونیں جنگ لڑ کر ۱۹۷۱ میں نام نہاد سیاسی آزادی تو حاصل کر لی۔ مگر اس کے سوا ہر دوسری چیز کو اس نے کھو دیا۔ اور اس نے جو چیز کھوئی وہ اس سے بہت زیادہ قیمتی تھی جس کو اس نے زبردست قربانی کے بعد حاصل کیا تھا۔

انڈیا کے علٰحدگی پسند لیڈروں کا نعرہ یہ ہے کہ "پہلے سیاسی آزادی حاصل کرو، اس کے بعد اقتصادی آزادی حاصل کرو"۔ اس کے بجائے ان کے لئے صحیح بات یہ تھی کہ وہ کہتے کہ "پہلے اقتصادی ترقی حاصل کرو، اس کے بعد سیاسی حقوق اپنے آپ حاصل ہو جائیں گے"۔

"پہلے پھل لے لو، اس کے بعد درخت لگا لینا" ایک بے معنی جملہ ہے۔ اسی طرح یہ تصور بھی بے معنی ہے کہ پہلے سیاسی انقلاب برپا کر لو، اس کے بعد اقتصادی انقلاب برپا کرنا۔ یہ قدرت کی اسکیم کا معاملہ ہے، اور قدرت نے اپنی اسکیم میں چیزوں کی جو ترتیب قائم کر دی ہے، اس میں تبدیلی لانا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ جس طرح نباتات کی دنیا میں پہلے درخت بویا جاتا ہے، اس کے بعد پھل حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی سماج میں پہلے صلاحیت پیدا کی جاتی ہے، اس کے بعد اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے۔ اس ترتیب کو الٹنا فطرت سے لڑنا ہے، اور فطرت سے لڑنے والا شخص کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

آخری بات

ملک کے موجودہ حالات میں کچھ لوگ مایوسی کا شکار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں۔ وہ صرف تشویشناک ذہن کے ساتھ ملک کے غیر یقینی مستقبل کا انتظار کر رہے ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس کو پر امید طبقہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات ایک تخلیقی ابال (creative ferment) یا ایک تحویلی شورش (transitional turmoil) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ان کے پاس بھی کہنے کے لئے کوئی واضح اور مثبت بات نہیں۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ پہلا گروہ اگر مجہول ناامیدی میں مبتلا ہے تو دوسرا گروہ مجہول امید میں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ حالات لوگوں کی بے شعوری کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور لوگوں کو باشعور بنا کر ہی ان حالات کو درست کیا جا سکتا ہے۔ قوم کو باشعور بنانا ایک مستقل کام ہے۔ یہ کام ترقی یافتہ ملکوں (مثلاً امریکہ اور جاپان) میں بہت بڑے پیمانہ پر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ یہ ممالک موجودہ ترقی کے درجہ تک پہنچ سکیں۔

مگر ہندستان میں قوم کی شعوری تعمیر کا کام سرے سے انجام نہیں دیا گیا۔ سنہ ۱۹۴۷ سے پہلے اور سنہ ۱۹۴۷ کے بعد۔ مجھے پچھلے سو سال کے اندر کوئی ایک بھی ایسی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی جس کو حقیقی معنوں میں تعمیر شعور کی مہم کا عنوان دیا جا سکے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہماری قومی امیدیں ناکام ہوئی ہیں، اور یہی وہ مقام ہے جہاں عمل کر کے ہم اپنی قومی امیدوں کو دوبارہ اپنے حق میں واقعہ بنا سکتے ہیں۔

حج کا سفر خدا کی طرف سفر ہے۔ حج حق تعالیٰ سے ملاقات ہے۔ دوسری عبادتیں اللہ تعالیٰ کی یاد ہیں۔ جب کہ حج خود اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا ہے۔ عام عبادت اگر غیب کی سطح پر خدا کی عبادت ہے تو حج شہود کی سطح پر خدا کی عبادت کرنا ہے۔

(صفحات ۱۱۲، قیمت ۳۰، مختصر: صفحات ۴۸ قیمت ۵ روپیہ)

ایک سفر

جغرافی اعتبار سے کرۂ ارض کو دو نصف حصہ (Hemisphere) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک مشرقی نصف حصہ (Eastern Hemisphere) اور دوسرا مغربی نصف حصہ (Western Hemisphere) پہلے نصف میں یورپ، ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا شامل ہیں۔ دوسرے نصف میں امریکہ اور بحر الکاہل (Pacific ocean) واقع ہیں۔

پچھلے ۲۰ سال کے دوران مجھے بار بار بیرونی دنیا کے سفر پیش آئے ہیں۔ مگر میرے اب تک کے تمام سفر مشرقی نصف کرہ میں ہوئے ہیں۔ مغربی نصف کرہ میں سفر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ موجودہ سفر اسی مغربی نصف کرہ ارض میں ہوا۔ یعنی دہلی سے ٹوکیو، اور ٹوکیو سے لاس انجلیز۔ اور پھر اسی راستہ سے دہلی کے لئے واپسی۔ اس طرح اب میرے اسفار میں پورا کرۂ ارض طے ہوگیا۔ یہ انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب معاملہ ہے کہ وہ فضا کی بلندیوں میں اڑتے ہوئے پورے کرۂ ارض کا احاطہ کرلیتا ہے، بغیر اس کے کہ کوئی پہاڑ یا کوئی سمندر اس کی راہ میں حائل ہوا ہو۔

امریکی حکومت ویزا دینے کے بارہ میں بہت فراخ دل ہے۔ میرے سفر کے سلسلہ میں ایک مہینہ کے ویزا کی درخواست دی گئی تھی۔ مگر نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ نے بطور خود ایک سال کا ملٹی پل ویزا (Multiple visa) دے دیا۔ ۱۹۸۹ میں نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ نے 58500 ویزا جاری کئے تھے۔

مگر اسی کے ساتھ بے اصولی کرنے والوں کے لئے امریکی انتظامیہ بے حد سخت بھی ہے۔ جو لوگ ویزا کے لئے غلط قسم کے کاغذات پیش کریں۔ ان پر ساری عمر کے لئے امریکہ میں داخلہ بند کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً بعض لوگ اسٹوڈنٹ ویزا پر امریکہ گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے غیر قانونی طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح کے واقعات کی بنا پر یہ قاعدہ بنایا گیا ہے کہ جو شخص ویزا کی درخواست میں غلط اندراج کرے یا فرضی ڈاکومنٹ پیش کرے، اس کو ساری زندگی کبھی امریکہ میں داخلہ کا ویزا نہ دیا جائے (ہندستان ٹائمس ۱۳ جون ۱۹۹۰)

۱۸ اور ۱۹ نومبر ۱۹۹۰ کی درمیانی رات کو ۱۲ بجے گھر سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ

میں دو جگہ ٹرکوں کی لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ آجکل ڈیزل کی سپلائی کم کردی گئی ہے۔ نیزرات کو صرف چند پٹرول پمپ کھلے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ لمبی لائن ہے۔ ہر لائن میں سو کے قریب ٹرک کھڑے ہوئے نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ یہاں ٹرک ہے۔ انجن لگی ہوئی گاڑی ہے۔ ڈرائیور بھی اس کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ غرض ہر چیز موجود ہے، صرف ایک چیز "ایندھن" نہیں ہے، اس کی وجہ سے تمام گاڑیاں کھڑی ہو گئیں۔ ایک "ٹرک" ایندھن کے بغیر نہیں چل سکتا۔ پھر اتنی بڑی کائنات کس طرح ایندھن کے بغیر ۲۰ بلین سال سے چل رہی ہے۔ آدمی اگر اس پر سوچے تو اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

دہلی سے جاپان ایئر لائنز کی فلائٹ ۴۹۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں پڑھنے کے لئے ایئر کمپنی کا میگزین ونڈس (Winds) موجود تھا۔ میں فلائٹ میگزین بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مگر اس میں کوئی خاص چیز میرے پڑھنے کے لئے نہ تھی۔ تین سو صفحہ کا یہ رنگین چھپا ہوا میگزین زیادہ تر اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ چند معمولی قسم کے مضمون تھے۔ مثلاً ایک مضمون جاپان کی رسلنگ پر تھا۔ ایک مضمون کا عنوان تھا:

A day in the life of a salary man.

جاپان مکمل طور پر ایک تجارتی ملک ہے۔ دنیا کو دینے کے لئے اس کے پاس بہترین صنعتی چیزیں ہیں۔ مگر علمی اور فکری ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں۔

اشتہارات کے لئے بڑی پرکشش زبان استعمال کی گئی تھی۔ مثلاً کار بنانے والی ایک کمپنی کا اشتہار تھا۔ کار کی ایک خوب صورت تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا ـــــ تہذیب کے راستہ پر (on the road to civilization) ایک اشتہار میں ٹیلیویژن بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ تعارفی الفاظ لکھنے کے بعد یہ جملہ درج تھا کہ ٹکنالوجی انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے:

Technology for the benefit of mankind

میں نے سوچا کہ ایک مصلح بھی وہی زبان بولتا ہے جو ایک تاجر بولتا ہے۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے۔ تاجر کا اصل مقصد تجارت ہے۔ مگر وہ شخصی الفاظ نہ بول کر عمومی انسانی الفاظ بولتا ہے۔ مگر مصلح جو لفظ بولتا ہے وہی

اس کا اصل مقصد بھی ہوتا ہے۔ گویا تاجر کی شخصیت میں ثنویت ہوتی ہے اور مصلح کی شخصیت میں وحدت۔

قدیم زمانہ میں دو قسم کی سواریاں رائج تھیں۔ ایک بری اور دوسرے بحری۔ موجودہ زمانہ میں تیسری سواری وجود میں آئی ہے جو باعتبار نوعیت ابتدائی دونوں قسم کی سواریوں سے یکسر مختلف ہے۔ یہ ہوائی سواری ہے۔ آج ہوائی سواری اس سے بھی زیادہ عام ہے جتنا قدیم زمانہ میں بری یا بحری سواری عام تھی۔ قدیم سواریوں میں تکمیل سفر کے بعد آدمی "اندر سے باہر" آتا تھا۔ جدید سواری میں وہ "اوپر سے نیچے" اترتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اولاد آدم ایک دوسرے کی دشمن ہوگی۔ یہ دشمنی (عداوت) ایک اخلاقی برائی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی دشمنی (یا کامپٹیشن) دنیا کی تمام ترقیوں کا واحد سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئی۔ ابتدائی قسم کا ہوائی جہاز سب سے پہلے دو شخصوں نے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ کو اڑایا تھا۔ مگر اس فن کی ترقی صرف اس وقت شروع ہوئی جب کہ فرانس اور جرمنی نے اس میں جنگی افادیت (war potential) کو محسوس کیا۔ ان دونوں ملکوں نے اس "فلائنگ مشین" کو ترقی دینا شروع کیا۔ تاکہ وہ بوقت جنگ اس کو استعمال کر سکیں۔ اگست ۱۹۱۴ میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو فرانس نے تقریباً دو ہزار ہوائی جہاز تیار کر لئے تھے اور جرمنی کے پاس ایک ہزار جنگی جہاز تھے۔ ہوائی جہاز کی صنعت نے ابتداءً جنگ کی برکت سے ترقی کی۔ ۱۹۱۹ میں جب پہلی باقاعدہ کمرشیل فلائٹ کا آغاز ہوا تو وہ بھی زیادہ تر استعماری عزائم کے تحت تھا ——— جنگ پسندوں نے ابتداءً ہوائی جہاز کو ترقی دی، اس کے بعد امن پسندوں کو بھی اس کا ایک حصہ مل گیا۔

رابرٹ رنسی (Robert Runcie) ۱۹۲۱ میں پیدا ہوئے۔ وہ کیتھولک چرچ میں آرک بشپ آف کینٹربری کے منصب پر ہیں۔ سفر کی بابت انھوں نے ایک دلچسپ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ قرون وسطیٰ میں لوگ مذہب کے لئے سفر کرتے تھے۔ جب کہ آج وہ اس لئے سفر کرتے ہیں کہ سفر ان کا مذہب ہے:

> In the middle ages people were tourists because of their religion, whereas now they are tourists because tourism is their religion.

ہماری پہلی منزل بینکاک تھی جو تھائی لینڈ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں ایئرپورٹ پر تقریباً

ایک گھنٹہ گزرا۔ ایئرپورٹ بہت صاف ستھرا اور منظم تھا۔ ٹائیلٹ سے لے کر باہر کے مقامات تک کہیں کوئی تنکا یا دھبہ نظر نہیں آیا۔

طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا۔ مجھے ایک ٹکٹ ملا جس پر سیام لکھا ہوا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۳۹ کی بات ہے۔ اس وقت جو ملک "سیام" کہا جاتا تھا، اس کا موجودہ نام تھائی لینڈ ہے۔ پچاس برس پہلے یہ ٹکٹ صرف کاغذی ٹکڑے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج وہ ٹکٹ اگر موجود ہو تو وہ نہایت قیمتی شمار ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچاس برس پہلے وہ صرف ڈاک کا ایک ٹکٹ تھا، مگر آج وہ تاریخ کی ایک دستاویز بن چکا ہے۔

تھائی لینڈ کی راجدھانی بینکاک ہے۔ بینکاک کی آبادی پچاس لاکھ سے زیادہ ہے۔ یہی شہر تھائی لینڈ کی تمام سیاسی اور تمدنی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ چنانچہ تھائی لینڈ کے تمام روزنامے بینکاک سے نکلتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے بیشتر ہفت روزہ اور ماہنامہ پرچے بھی۔ یہ پرچے تھائی، انگلش اور چینی زبانوں میں ہوتے ہیں۔

جہاز بینکاک سے ٹوکیو کے لئے روانہ ہوا تو راستہ میں پڑھنے کے لئے تھائی لینڈ کا انگریزی اخبار نیشن (The Nation) تھا۔ اس کے شمارہ ۱۹ نومبر ۱۹۹۰ کا مطالعہ کیا۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ برما کی فوجی حکومت نے مخالف برمی طلبہ کی دارو گیر کی تو ۲۰۰۰ طلبہ وہاں سے بھاگ کر تھائی لینڈ آگئے ان میں سے تقریباً ۸۰۰ طلبہ اقوام متحدہ کے ادارہ مہاجرین: (UNHCR)

United Nations High Commissioner for Refugees

کے تحت رجسٹرڈ ہیں، ان کو ادارہ کی طرف سے پناہ گزیں کے طور پر ماہانہ الاؤنس (Bt. 3,000) ملتا ہے۔ مگر تھائی لینڈ کی حکومت ان برمی طلبہ کے خلاف ہوگئی ہے۔ حکومت کا کہنا ہے کہ بار بار کی تنبیہ کے باوجود یہ لوگ پرامن قیام پر راضی نہیں۔ وہ تھائی لینڈ کو بیس بنا کر برمی حکومت کے خلاف سرگرمیوں (anti-Rangoon political activity) میں مصروف ہیں۔ تھائی لینڈ میں مقیم برمی طلبہ دو جہازوں کو ہائی جیک کر چکے ہیں ایک اکتوبر ۱۹۹۰ میں دوسرا نومبر ۱۹۹۰ میں۔ انھوں نے کہا:

> They had made the move to publicize
> the Burmese people's struggle to democracy.

برمی طلبہ کی تنظیم (All Burma Students Democratic Front) کے لیڈر نے کہا کہ ہماری تنظیم کا کوئی تعلق ہائی جیکنگ کے اس قابل مذمت واقعہ سے نہیں ہے۔ وہ ہمارے کچھ برے افراد (few bad individuals) نے کیا تھا۔ اسی قسم کے جواب ہندستان میں مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر بھی دیتے ہیں۔ مگر یہ جواب ان کے لئے عذر نہیں۔ کیوں کہ "برے افراد" کا ہاتھ پکڑنے کی ذمہ داری سب سے پہلے ان کی قوم پر آتی ہے۔ جب کوئی قوم اپنے برے افراد کے ہاتھ نہ پکڑے تو خدائی قانون کے مطابق اُن افراد کی برائی کی قیمت پوری قوم کو بھگتنی پڑے گی۔

ایک امریکی جرنلسٹ سے ملے۔ ان سے خلیج کے بحران کی بابت گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ سفارتی ذرائع سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش مشکل ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر جنگ ہو تو اس میں بہت سی جانیں ضائع ہوں گی اور اس سے امریکہ کے مفادات کو نقصان پہنچے گا :

A diplomatic solution may be messy, but fighting would cost too many lives and damage America's interests.

اس جواب سے امریکی ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ خلیج کا مسئلہ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو پیدا ہوا۔ امریکی فوجیں اس کے فوراً بعد خلیج میں پہنچ گئیں۔ وہ جدید ترین سامان جنگ کے ساتھ عراق اور کویت کی سرحدوں پر موجود ہیں۔ مگر اب تک امریکہ نے کوئی جنگی اقدام نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کا مذہب "انٹرسٹ" ہے، اور انٹرسٹ کے نقطہ نظر سے جنگی کارروائی کا فائدہ مشتبہ نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی مسلم ملک اتنی بڑی طاقت کے ساتھ وہاں موجود ہوتا تو اب تک جنگ کا آغاز اور اختتام دونوں ہو چکا ہوتا۔ خواہ اس کے نتیجہ میں "شہیدوں" کی لاش کے سوا اور کوئی چیز مسلم دنیا کے حصہ میں نہ آئے۔ (۱۹ نومبر ۱۹۹۰)

ایک اور امریکی جرنلسٹ سے گفتگو ہوئی۔ وہ ہندستان کے سیاسی حالات سے واقف تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کے ملک میں منڈل کمیشن اور رام جنم بھومی کے مسائل پیش آئے۔ آپ کے سابق وزیر اعظم مسٹر وی پی سنگھ لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں انھیں عدم اعتماد کی تحریک کا سامنا کرنا پڑا جس میں انھیں ۳۴۶ کے مقابلہ میں صرف ۱۴۲ ووٹ ملے۔ انھوں نے ۷ نومبر کو اپنا استعفا صدر کے پاس بھیج دیا۔ امریکہ کے لوگوں میں بھی صدر بش کے خلاف ناراضگی (resentment)

ہے۔ مگر ہمارے صدر جارج بش خوش قسمت ہیں کہ وہ وزیر اعظم نہیں۔ اگر وہ وزیر اعظم ہوتے تو یقیناً آج انہیں بھی عدم اعتماد کی تحریک کا سامنا کرنا پڑتا:

Mr Bush is lucky that he is not a Prime Minister – he would surely have been facing a non-confidence motion.

اس سے ہندستان اور امریکہ کے نظام حکومت کے فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندستان میں وزیر اعظم اور صدر حکومت کا عہدہ الگ الگ ہے۔ امریکہ میں یہ دونوں عہدے ایک شخص کی ذات میں جمع ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ امریکی صدر دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور انسان ہوتا ہے۔

۱۹ نومبر کو دوپہر سے کچھ پہلے ٹوکیو پہنچا۔ یہاں جہاز بدلنا تھا، اس لئے چند گھنٹے ٹوکیو ایئرپورٹ پر گزرے۔ یہاں میں نے ایئرپورٹ کے ایک شخص سے "ٹوائلٹ" کے بارہ میں پوچھا۔ وہ غالباً انگریزی نہیں جانتا تھا، وہ مجھے بتائے بغیر آگے چلا گیا۔ اتنے میں ایک صاحب میرے قریب آئے۔ انھوں نے اردو میں بولتے ہوئے کہا کہ کیا آپ کو ٹوائلٹ جانا ہے۔ آیئے میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ ہم ایک سیڑھی سے نیچے اترے تو وہاں نہایت صاف ستھرا ٹوائلٹ موجود تھا۔

میں نے فراغت کے بعد وضو کیا۔ باہر نکلا تو مذکورہ صاحب دوبارہ ملے۔ انھوں نے بتایا کہ میرا نام محمد راشد ہے۔ میں دہلی میں رہتا ہوں اور اکسپورٹ کا کام کرتا ہوں۔ کئی بار جاپان آچکا ہوں۔ ٹوکیو میں ایک اردو داں کو پاکر خوشی ہوئی۔ میں نے کہا کہ مجھے نماز پڑھنا ہے۔ یہاں قبلہ کی سمت معلوم کرنا بے حد مشکل ہے۔ اندازہ کرکے ایک طرف پڑھ لیتا ہوں۔ انھوں نے فوراً اپنے بیگ سے ایک "قبلہ نما" اور ایک کتابچہ نکالا۔ اور اندازہ کرکے بتایا کہ یہ قبلہ کا رخ ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے مطابق ایئرپورٹ پر نماز ادا کی۔

میں نے سوچا کہ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کے لئے ایک مرکزی رخ مقرر کیا اور اسی کے ساتھ دنیا میں ایسے ذرائع پیدا کر دئے کہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں اور کسی بھی مقام پر اس مرکزی رخ کو بالکل ٹھیک ٹھیک معلوم کیا جاسکے۔ اتنے اعلیٰ اجتماعی انتظام کے بعد بھی اگر مسلمان متحد نہ ہوں تو یہ سادہ طور پر محض ایک کوتاہی نہیں ہے بلکہ یہ خداوند عالم کی ناقدری ہے۔

ٹوکیو ایئرپورٹ پر اور جاپانی جہاز میں بہت سے تجربات ہوئے جن کا ذکر میں سفرنامہ کے آخر میں کروں گا۔

ٹوکیو سے لاس اینجلز کے لئے جاپان ایئرلائنز کی فلائٹ نمبر ۶۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ دس گھنٹہ کی مسلسل پرواز تھی جو پوری کی پوری بحرالکاہل کے اوپر طے ہوئی۔ کرۂ ارض کا تقریباً ۷۱ فی صد حصہ سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ ان میں سب سے بڑا سمندر بحرالکاہل (Pacific Ocean) ہے۔ متصل سمندروں کو چھوڑتے ہوئے صرف بحرالکاہل تمام سمندروں کا ۴۵ فیصد حصہ ہے۔ اس کی اوسط گہرائی ۱۲۹۲۵ فٹ ہے۔ ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک اس کا فاصلہ تقریباً گیارہ ہزار میل ہے۔

اس عظیم سمندر کے مقابلے میں تمام انسانوں کی مجموعی تعداد ایک چیونٹی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ مگر یہی انسان اس کے اوپر فاتحانہ پرواز کرتے ہوئے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچتا ہے۔ انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ کیسا عجیب احسان ہے۔ میں نے نیچے سمندر کی لہروں کو دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ لہریں کہہ رہی ہوں کہ اے انسان، ان احسانات کو سوچ کر تیرے اندر شکر خداوندی کا سیلاب امنڈ پڑنا چاہئے۔ مگر دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ہو جس نے سمندر کی ان بیتاب لہروں میں اس کے ربانی پیغام کو سنا ہو۔

میں ہمیشہ صرف ایک ہینڈ بیگ کے ساتھ سفر کرتا ہوں۔ مگر اس بار میرے ساتھ کتابوں کے دو بڑے بنڈل تھے جس کی فرمائش امریکہ کی ایک تنظیم کی طرف سے کی گئی تھی۔ ۱۹ نومبر کی شام کو میں لاس اینجلز کے ہوائی اڈہ پر اترا تو سب سے پہلے مجھے ان دونوں بنڈلوں کو حاصل کرنا تھا۔ ایک جگہ ہوائی اڈہ کی مخصوص گاڑیاں کھڑی تھیں جن پر سامان رکھ کر لوگ باہر لے جاتے ہیں۔ میں نے ایک گاڑی لینا چاہا تو وہ ایک راڈ سے چپکی ہوئی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ اس کا کرایہ ایک ڈالر ادا کرنا ہے۔ میں نے ایک مخصوص مشین کے اندر ایک ڈالر کا نوٹ ڈالا۔ اس کے بعد گاڑی اپنے آپ چھوٹ کر باہر آگئی۔ جس دنیا میں اس طرح فی الفور نتائج نکلتے ہوں وہاں موت کے بعد نکلنے والے نتائج پر یقین کرنا کتنا مشکل کام ہے۔

کتابوں کا بنڈل لے کر ایئرپورٹ کے بیرونی گیٹ پر آیا تو وہاں جناب ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی موجود تھے۔ وہ اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاونٹی کے ڈائرکٹر ہیں اور بڑی عجیب خوبیوں کے آدمی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قسم کے ادارہ کے لئے آئیڈیل ڈائرکٹر ہیں۔ ان کے ساتھ بذریعہ روڈ گارڈن گروو پہنچا جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔

ایک شخص جو لاس اینجلیز کے شاندار ہوائی اڈہ پر اترے اور اس کے بعد پررونق سڑکوں

پر سفر کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف روانہ ہو، وہ مشکل سے یہ سوچ سکتا ہے کہ اس خوب صورت دنیا میں کچھ سیاہ دھبے بھی ہیں۔ مگر واقعہ یہی ہے۔

ایک رپورٹ (ٹائم ۱۸ جون ۱۹۹۰) کے مطابق، لاس اینجلز میں ماں باپ سے باغی یا بچھڑے ہوئے لڑکے بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ ان کے ۵۰۰ سے زیادہ گینگ ہیں جن سے تقریباً ۸ ہزار لڑکے وابستہ ہیں۔ ان لوگوں کے پاس پستول اور بندوق جیسے ہتھیار ہوتے ہیں۔ وہ قتل اور چوری اور منشیات جیسے جرائم میں مبتلا رہتے ہیں۔

ٹائم میگزین کے رپورٹر نے ایک پندرہ سالہ لڑکے سے پوچھا کہ تم نے فلاں آدمی کو کیوں قتل کیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک دشمن تھا۔ وہ دشمن کیوں تھا، لڑکا اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے کہا کہ مجھے اس قسم کے فعل پر کوئی ندامت نہیں۔ وقتی طور پر کچھ احساس ابھرتا ہے، اس کو ختم کرنے کے لئے میں قتل سے پہلے شراب پی لیتا ہوں (صفحہ ۲۰)

ٹائم نے اپنی تین صفحہ کی باتصویر رپورٹ ان الفاظ پر ختم کی ہے کہ لاس اینجلز کے اندرون شہر کے یہ نوجوان، زمین کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ سماج کے بیچ میں رہتے ہیں۔ وہ مصیبت زدگی اور محرومی کا جواب قدیم قبائل کی بھونڈی نقل کی طرف واپسی کے ذریعہ دے رہے ہیں:

> ...while inner-city youth of Los Angles, at the center of the most advanced society of earth, respond to adversity and deprivation by regressing to a primitive parody of tribes (p. 22).

امریکہ کے لئے میرا موجودہ سفر ایسے وقت میں ہوا جب کہ امریکی فوجیں اگست ۱۹۹۰ سے خلیج میں عراق کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ قدرتی طور پر آجکل یہاں کے اخبارات میں سب سے زیادہ اسی کا چرچا ہوتا ہے۔ ایک اخبار میں اس موضوع پر مفصل مضمون تھا۔ اس کے چند حصے یہ ہیں:

صدام حسین ایک غیر فوجی آدمی ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ امریکہ خلیج سے نو ہزار میل کی دوری پر ہے۔ اس کی فوجوں کو یہاں پہنچنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔ وہ امریکہ کی مدد پہنچنے سے پہلے کویت اور سعودی عرب دونوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں گے۔ مگر عراق کے اقدام کے بعد امریکہ نے انتہائی سرعت کے ساتھ ایک لاکھ سے زیادہ فوجیوں کو خلیج میں پہنچا کر تمام دنیا کو حیران کر دیا۔ امریکہ نے

نہ صرف عراق کو گھیر لیا ہے بلکہ اس کے خلاف کارروائی کے لئے اپنے ہدف مقرر کرلئے ہیں۔ امریکہ کا بمبار ۲ ۵ وہ فوجی طیارہ ہے جو چالیس ٹن وزنی بم اٹھا سکتا ہے۔ ایسے ۳۰ طیارے عراق کی تمام اہم تنصیبات کو چند گھنٹوں کے اندر تباہ کر سکتے ہیں۔ یہ ویت نام نہیں جہاں غیر موافق جغرافیہ کی وجہ سے امریکہ کو ہدف نہیں ملتا تھا یہ تو صحرا ہے جہاں ہدف خود طیارے کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔

صدام حسین کو معلوم ہو چکا ہے کہ امریکہ کے پاس اتنی طاقت ہے کہ وہ ان کے طیاروں اور میزائلوں کو فضا پر ابھرنے سے پہلے ہی تباہ کر سکتا ہے۔ اس لئے انھوں نے امریکہ کے "آپریشن ڈیزرٹ شیلڈ" کا مقابلہ "آپریشن ہیومن شیلڈ" سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ صرف صدام حسین کی انتہائی بے بسی کو ظاہر کرتا ہے (ٹائم میگزین ۳۱ دسمبر ۱۹۹۰ کے بیان کے مطابق، یکم فروری ۱۹۹۱ تک امریکی فوجیں چار لاکھ تیس ہزار کی تعداد میں خلیج میں پہنچ چکی ہوں گی)

امریکہ کو دریافت کرنے والے کی حیثیت سے کولمبس کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔ مگر امریکہ کا نام کولمبس کے نام پر نہیں۔ اس کا نام اٹلی کے ایک تاجر امریگو (Amerigo Vespucci) کے نام پر ہے۔ امریگو کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۴۹۷ میں امریکہ پہنچا تھا۔ جب کہ کولمبس اس سے کئی سال پہلے امریکہ کے ساحل پر اتر چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کولمبس کی دریافت کے باوجود امریکہ کو ایشیا ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ امریگو کی مہم نے یہ ثابت کر دیا کہ امریکہ ایک علیحدہ براعظم ہے:

He established that the newly discovered lands West of the Atlantic were not a part of Asia but constituted a separate land mass (19/97).

کولمبس کا نام مشہور ہے مگر امریکہ اس کے نام پر نہیں۔ امریگو کا نام مشہور نہیں مگر امریکہ کو اسی کی نسبت سے امریکہ کہا جاتا ہے۔ ایک کی ذات نے شہرت پائی اور دوسرے کے کام نے۔

امریکہ کا نقشہ آپ سامنے رکھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں ریاستوں کی حد بندی بالکل حسابی انداز میں سیدھی لکیروں کی صورت میں کی گئی ہے۔ نقشہ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔

اس کے برعکس ہندستان کا نقشہ دیکھئے۔ اس میں ریاستی سرحدوں کی تقسیم ٹیڑھی میڑھی (zig zag) صورت میں نظر آئے گی۔ ہندستان کے کچھ اہل علم کی رائے ہے کہ اس معاملہ میں انڈیا کے

نقشہ کو جدید معیار پر لایا جائے۔ مثال کے طور پر ٹائمس آف انڈیا (۲۲ جون ۱۹۹۰) میں مسٹر پردیپ شنائے (Pradeep Shenoy) کا مضمون چھپا تھا۔ انھوں نے ہندستان میں ریاستوں کا نقشہ امریکی انداز میں مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ان کا مجوزہ نقشہ نیچے درج کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کانگرس پارٹی نے عوام کو اپنے ساتھ لینے کے لئے جو وعدے کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ریاستوں کی تقسیم لسانی بنیاد پر کی جائے۔ یہ خالص مصلحت پرستانہ سیاست تھی۔ اس کی قیمت ہندستان کو یہ دینی پڑی کہ آزادی کے بعد لسانی ریاستوں کا مطالبہ نہایت شدت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ نہرو اب اس کے موافق نہ تھے۔ مگر انھوں نے محسوس کیا کہ اگر ہم نے اس مطالبہ کو نہ مانا تو کانگرس کے لئے ریاستوں میں الکشن جیتنا مشکل ہو جائے گا۔ دوبارہ مصلحت پرستانہ سیاست کے تحت ملک کی تقسیم زبان کی بنیاد پر کر دی گئی۔

امریکہ میں قیام کے دوران میں زیادہ تر جناب صغیر اسلم صاحب کے ساتھ رہا۔ ان کو میں نے الرسالہ کا ایک مضمون یاد دلایا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ اس طرح رہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے لئے کسی بھی اعتبار سے مسئلہ نہ بنوں بلکہ کامل طور پر "مسٹر نو پرابلم" بن کر رہوں۔ مثلاً کھانے میں آپ میرے
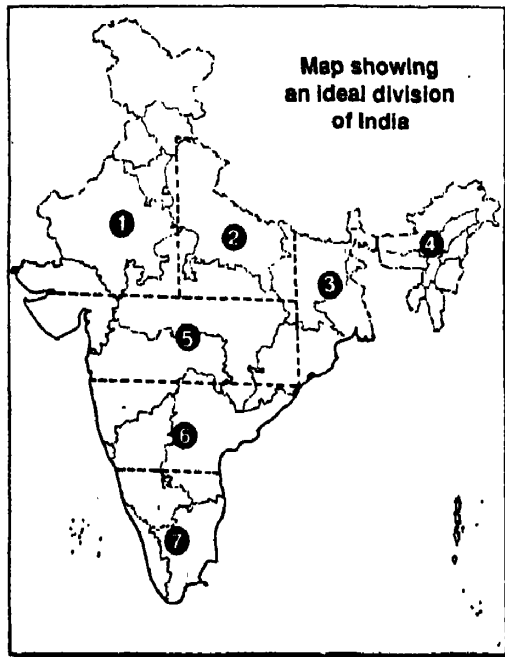
لئے کسی بھی قسم کا کوئی اہتمام نہ کریں۔ جو کچھ آپ روزمرہ کھاتے تھے، بس وہی مجھ کو کھلائیں۔ ان کی اہلیہ خوش قسمتی سے نہایت سادہ مزاج کی ہیں، اس لئے اس شرط پر عمل کرنے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔

صغیر اسلم صاحب کے ساتھ لمبی مدت تک رہ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے مزاج میں اور میرے مزاج میں بہت زیادہ مطابقت ہے۔ یہاں کے لوگوں میں وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک منفرد انسان نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ایک روز کہا :

After the Almighty God made me, He threw the mould away.

میں نے کہا کہ اس میں اتنی تبدیلی کر لیجئے کہ اس مولڈ سے اللہ تعالیٰ نے دو انسان بنائے۔ ایک آپ کو اور دوسرے مجھ کو۔ آپ اس مولڈ کا (finished product) ہیں اور میں اس مولڈ کا (unfinished product) ہوں۔

یہاں پہلے دن میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ اس کے بعد آخر وقت تک میرا قیام جناب صغیر اسلم صاحب کے یہاں رہا۔ یہ دونوں صاحبان بہت زیادہ میرے ہم مذاق ہیں۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ نہایت سنجیدہ اور متواضع انسان ہیں۔ ان سے گفتگو کرکے بہت خوشی ہوتی ہے۔ وہ یہاں اسلامک سوسائٹی کے ڈائرکٹر ہیں۔ اس کے ساتھ اپنے گھر پر بھی انھوں نے اسلامی ماحول بنا رکھا ہے۔ وہ اس بات کی ایک مثال ہیں کہ کس طرح آدمی ہر ماحول کے اندر اپنا ماحول بنا سکتا ہے۔ ایک صاحب جو " اسلامی حکومت " قائم کرنے کے علمبردار ہیں، انھوں نے ڈاکٹر صاحب پر نقد کرتے ہوئے کہا کہ آپ اتنے دنوں سے امریکہ میں ہیں۔ آپ نے یہاں کیا کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا : آپ میرے کام کو میرے معیار سے جانچئے نہ کہ اپنے بنائے ہوئے معیار سے۔ میں نے تو الحمدللہ بہت کچھ کیا ہے۔ یہ آپ کو بتانا ہے کہ آپ اتنے دنوں سے اسلامی حکومت کی تحریک چلا رہے ہیں۔ آپ نے کیا کیا۔

صغیر اسلم صاحب بزنس کرتے ہیں۔ وہ بہت خوبیوں کے آدمی ہیں۔ ان کا ایک اصول مجھے بہت پسند آیا۔ اس کو میں اپنے لفظوں میں " چلو یہ بھی ٹھیک ہے ، پرنسپل " کہتا ہوں۔ جب بھی کسی سے کوئی اختلافی بات پیدا ہو تو فوراً وہ یہ کہہ کر بات کو وہیں ختم کر دیتے ہیں کہ " چلو یہ بھی ٹھیک ہے "۔ یہ اصول وہی ہے جس کو اعراض کہا جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

۱۔ مسٹر شاہد چودھری نے ۱۴ فروری ۱۹۹۱ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ان کا تعلق جس پرچہ سے ہے وہ بیک وقت دو زبانوں میں چھپتا ہے۔ ہندی میں اس کا نام ملاپ ہے اور انگریزی میں اس کا نام پروب انڈیا ہے۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر خلیج کے مسئلہ سے تھا۔

۲۔ اندر دھنش ویڈیو میگزین (نئی دہلی) کی ٹیم ۱۵ فروری ۱۹۹۱ کو اسلامی مرکز میں آئی اور اپنے ویڈیو میگزین کے لئے صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ پندرہ منٹ کا انٹرویو تھا۔ سوال وجواب زیادہ تر بابری مسجد کے مسئلہ کے بارہ میں تھے۔

۳۔ "خاتون اسلام" کا عربی ترجمہ اضافہ کے ساتھ تیار ہو گیا ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں اور مولانا رئیس احمد ندوی نے کیا ہے۔ اس میں کچھ اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ انشاءاللہ عنقریب اس کو چھپوایا جا سکے گا۔

۴۔ نئی دہلی کے ایک انگریزی ماہنامہ (Indian Indications) نے مسلم مسائل پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو دو صفحات پر اس کے شمارہ فروری ۱۹۹۱ میں شائع ہوا ہے۔

بنگلور کے حلقہ الرسالہ نے "انسان اپنے آپ کو پہچان" اور "حقیقت کی تلاش" کا ترجمہ کنڑا زبان میں چھپوایا۔ بنگلور میں غیر مسلم حضرات کا ایک کتابوں کا بڑا اسٹور ہے جس کا نام سپنا بک اسٹور ہے۔ ان کو یہ کتابیں دکھائی گئیں۔ انھوں نے پسند کرکے کچھ کتابیں اپنے یہاں رکھیں۔ یہ کتابیں جلد ہی فروخت ہو گئیں۔ خود صاحب اسٹور نے بھی ان کو پسند کیا۔ چنانچہ انھوں نے سارا اسٹاک لے لیا۔ انھوں نے بتایا کہ لوگوں نے ان کتابوں کو بہت پسند کیا۔ اور بہت کم مدت میں ساری کتابیں فروخت ہو گئیں۔

۵۔ ملیالم پرچوں میں برابر الرسالہ کے مضامین ترجمہ کرکے شائع کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملیالم زبان میں مرکز کی کئی کتابوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً: مذہب اور جدید چیلنج، حقیقت کی تلاش، اسلام کا تعارف، پیغمبر انقلاب، اسلام اور عصر حاضر، تاریخ کا سبق۔

وغیرہ

۶۔ پندرہ سال پہلے الرسالہ کی حقیقت پسندانہ پکار بالکل اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ مگر آج تمام لوگ اسی کی بولی بولنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا علی میاں پہلے جذباتی اقدام کے وکیل تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے رہنمائی اقبال کے اس شعر میں تھی کہ :

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اب مولانا علی میاں کا بیان خلیج کے المیہ کے ذیل میں تعمیر حیات (۱۰ مارچ ۱۹۹۱) میں چھپا ہے۔ وہ موجودہ مسلمانوں کی ناکامی کا سبب بتاتے ہوئے کہتے ہیں : صدام حسین کے اقدام کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ اسلام کی شہرت اور دعوت کو نقصان پہنچا۔ اسلام کا تعارف کرانے والوں کو آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا۔ حالیہ واقعات سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ مسلمانوں میں شعور کی کمی ہے اور جذباتیت بہت بڑھی ہوئی ہے۔ یہاں تحریکوں کو چلانے میں جذبات کو برانگیختہ کرنے سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ پورے برصغیر میں یہ کمزوری ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مغربی طاقت کے خلاف زوردار لفظ بول دے تو وہ ہیرو بن جاتا ہے۔ ہر لفظ جس میں خطر پسندی ہو اسے سن کر مسلمان دیوانے ہو جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ نفع و نقصان کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور احتساب کیا جائے (صفحہ ۱۳)

مولانا علی میاں کے یہ الفاظ بلا اعلان اپنی غلطی کا اعتراف اور الرسالہ کے پیغام کی بالواسطہ تصدیق ہیں۔

۷۔ دعوتی جذبہ کے تحت الحمدللہ بہت سے لوگ دوسروں کے نام اپنی طرف سے الرسالہ جاری کراتے رہتے ہیں۔ مثلاً ناگپور کے جناب ایم شیخ نے اپنی طرف سے دس آدمیوں کے نام الرسالہ اردو، انگریزی، ہندی ایک سال کے لئے جاری کرایا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کار خیر ہے۔ اور دوسروں کے لئے بہترین مثال بھی ہے۔

۸۔ الرسالہ کے قارئین خاموشی سے ہر جگہ اسلامی پیغام کی اشاعت میں مشغول ہیں۔ مثلاً جناب بدر الدین احمد مراد آبادی نے بتایا کہ ایک ہندو فرم کے ساتھ ان کے کاروباری

تعلقات ہیں۔ وہاں انھیں اکثر جانا ہوتا ہے۔ جب وہ جاتے ہیں تو فرم کے مالک (مسٹر ونود کملا)
کو الرسالہ کا ایک دو مضمون ضرور سناتے ہیں۔ وہ اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں
لوگ پورے ملک میں کر رہے ہیں۔

۹۔ نئی دہلی کے ہندی میگزین راشٹریہ وشواس (۳۱ مارچ ۱۹۹۱) نے الرسالہ کا ایک مضمون اپنے
کالموں میں نقل کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ہندو واد : پنر جاگرن میں وردوہ بھاس۔ یہ اس مضمون
کا ہندی ترجمہ ہے جو الرسالہ (ستمبر ۱۹۹۰) میں صفحہ ۴۱ پر "ایک مشورہ" کے عنوان سے چھپا تھا۔

۱۰۔ حکومت ہند کے منسٹری آف ایجوکیشن کی طرف سے معیاری قومی کتابوں پر دو ضخیم جلدیں چھپی ہیں
جو بذریعہ ڈاک ہمیں ملی ہیں :

National catalogue of international standard
books number title 1985-1986
National Catalogue of ISBN titles 1986-1087

ان دونوں مجلدات میں اسلامی مرکز کی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ اول الذکر میں
اس کو صفحہ ۲۴۴ پر دیکھا جا سکتا ہے اور ثانی الذکر میں صفحہ ۱۸۷ سے ۱۹۰ تک۔

۱۱۔ انووبھا آرگنائزیشن کی طرف سے اودے پور (راجستھان) میں ۱۷۔ ۲۱ فروری ۱۹۹۱ کو
ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کی تھیم (Peace & non-violent action) تھی۔ اس
موقع پر اسلامی مرکز کو مدعو کیا گیا تھا۔ مرکز کی طرف سے ڈاکٹر ثانی اثنین خاں نے شرکت کی۔
اور اسلامی نقطۂ نظر پر ایک مقالہ پیش کیا۔ مقالہ کافی پسند کیا گیا۔

۱۲۔ روم کا ایک ادارہ Comunità di Sant Egidio جو ویٹیکن کے ماتحت ہے۔
اس کے ایک ذمہ دار (Father Paolo Dall'oglio) اسلامی مرکز میں ۲۰ مارچ
۱۹۹۱ کو تشریف لائے انھوں نے اسلام اور مسیحیت کے موضوع پر تبادلۂ خیال کیا بعد میں ان
کو اسلامی مرکز کا انگریزی لٹریچر پیش کیا گیا۔ انھوں نے اسلامی مرکز کی بعض
کتابوں کا اطالوی زبان میں ترجمہ کرنے کی خواہش کی جس کی ان کو اجازت
دے دی گئی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے ([illegible])		([illegible])
ایک سال	۹۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۶۰ روپیہ	دو سال	۴۰ " "	۱۸ " "
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ " "	۲۵ " "
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ " "	۴۰ " "
خصوصی تعاون (سالانہ)	۲۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ "	— —

[illegible] ثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSM IN ATT IC
Fax: 91-11-353318, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

ہدایت کا قانون

صحیح البخاری (کتاب التفسیر) میں سورہ القصص کے تحت یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ جب ابوطالب کی وفات کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے۔ آپ نے دیکھا کہ ابوجہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ بن المغیرہ وہاں موجود ہیں۔ آپ نے ابوطالب سے کہا کہ اے چچا، لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجئے، تاکہ اس کلمہ کی بنا پر میں اللہ کے یہاں آپ کے لیے حجت کر سکوں۔

ابوجہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ نے ابوطالب سے کہا، کیا تم عبد المطلب کے دین کو چھوڑ دو گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار ابوطالب کے سامنے اپنی بات کہتے رہے اور وہ دونوں بار بار اپنی بات دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں ابوطالب نے کہا کہ عبد المطلب کے دین پر۔ اور انھوں نے لا الٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کیا (حتیٰ قال ابوطالب آخرَ ما کلّمَھُم: علیٰ مِلّۃِ عبد المطّلب وأبیٰ ان یقولَ لا الٰہ الا اللّٰہ)

روایت کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے ابوطالب کے بارہ میں آیت اتاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ تم جس کو چاہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے۔ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کو ہدایت دیتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں (القصص ۵۶)

اس سے وہ قانون معلوم ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے مقرر کیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ دعوت خواہ کتنی ہی زیادہ طاقت ور دلیلوں کے ساتھ بیان کر دی جائے، بہر حال شبہہ کا ایک عنصر (element of doubt) پھر بھی اس میں موجود رہے گا۔ دلیل کی کوئی بھی مقدار شبہہ کے اس عنصر کو ختم نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ پیغمبر کی شخصیت اور اس کے برتر دلائل بھی ایسا نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی دعوت سے شبہہ کے اس عنصر کا خاتمہ کر دیں۔

شبہہ کے اس پردہ کو پھاڑنا مدعو کا کام ہے، وہ داعی کا کام نہیں۔ یہ اللہ کی سنت ہے، اور اللہ کی سنت کبھی بدلتی نہیں۔ یہ ہر حال میں انسان کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ شبہہ کے اس پردہ کو پھاڑے تاکہ وہ اس حقیقت کو بے نقاب کو دیکھ سکے۔ شبہہ کا پردہ پھاڑنے کے اس امتحان میں جو شخص پورا اترے، وہ اللہ کے قانون کے مطابق ہدایت کو پالے گا۔ اور جو شخص شبہہ کے اس پردہ کو پھاڑنے میں ناکام رہے، وہ ہدایت کو پانے میں بھی ناکام رہے گا۔

• الرسالہ جولائی ۱۹۹۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ذریعہ ابوطالب کے سامنے دعوت پوری طرح آچکی تھی۔ مگر شبہہ کا ایک عنصر پھر بھی ان کے لیے باقی تھا۔ وہ یہ کہ کیا یہ میرا بھتیجا اور عبد اللہ کا بیٹا حق پر ہے اور سارے اکابر قوم بشمول عبد المطلب غلطی پر تھے۔ ابوطالب شبہہ کا یہ پردہ پھاڑ نہ سکے، اس لیے وہ ہدایت کو قبول کرنے سے بھی محروم رہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جنت ایک خدائی سودا ہے، اور وہ بہت مہنگا سودا ہے (الا ان سلعة اللہ غالیة الا ان سلعة اللہ الجنة)

جو شخص جنت کے اس مہنگے سودے کا خریدار بننا چاہے، اس کو اس کی مطلوبہ قیمت دینی پڑے گی۔ اس قیمت کی ادائیگی کے بغیر وہ جنت کا مالک نہیں بن سکتا۔ وہ قیمت یہی "شبہہ کے عنصر" کو عبور کرنا ہے، وہ شبہہ کے اسی پردہ کو پھاڑنا ہے۔ اسی نازک عمل کی ادائیگی پر آدمی کو دنیا میں ہدایت ملتی ہے اور آخرت میں ابدی جنت۔

جنت ان نفیس اور لطیف روحوں کی آبادی ہے جو تمام ظاہری بڑائیوں سے گزر کر خدا کی چھپی ہوئی بڑائی کو پالیں۔ جو جوہر کی بنیاد پر چیزوں کو پہچاننے کا ثبوت دیں۔ جو ہنگامہ کی دنیا سے نکل کر خاموشی کی بزم میں پہنچ سکیں۔ جو ظواہر سے آگے بڑھ کر حقائق کو دیکھ سکیں۔ جو "اکابر" کے گنبدوں سے اوپر اٹھ کر سچائی کو وہاں دریافت کرلیں جہاں وہ بے گنبد حالت میں ظاہر کی گئی ہے۔

جنت بینا انسانوں کے لیے ہے، وہ اندھے انسانوں کے لیے نہیں۔ وہ اصحاب معرفت کے لیے ہے، وہ ظاہر پرستوں کے لیے نہیں۔ وہ ارباب الکشاف کے لیے ہے، وہ جامد مقلدوں کے لیے نہیں۔ جنت ربانی لوگوں کے لیے ہے، اور بلاشبہہ ربانی لوگوں ہی کو جنت میں داخلہ دیا جائے گا۔

عظمتِ صحابہ

الرسالہ ستمبر ۱۹۹۱ کا شمارہ انشاء اللہ خصوصی شمارہ ہوگا۔ وہ "عظمتِ صحابہ" نمبر کے طور پر شائع کیا جائے گا۔ صاحبان ایجنسی تعداد میں اضافہ کرنا چاہیں تو پیشگی طور پر مطلع فرمائیں۔ (قیمت ۵ روپیہ)

غلط فہمی

عن عائشة ، انها فقدته صلی اللہ علیہ وسلم ذات ليلة۔ فظنت أنه ذهب الى بعض نسائه فتحسسته فإذا هو راكع او ساجد يقول : سبحانك اللهم وبحمدك لا إله الا انت ۔ فقالت بابي انت و امي، اني لفي شأن وانك لفي شأن آخر

(رواہ احمد ومسلم والنسائی)

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک رات کو میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو گھر کے اندر نہیں پایا۔ انھوں نے گمان کیا کہ آپ اپنی کسی بیوی کے پاس چلے گیے ہیں۔ انھوں نے آپ کو تلاش کیا تو انھوں نے پایا کہ آپ مسجد میں رکوع (یا سجدہ) کی حالت میں ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ اسے اللہ، تو پاک ہے اور ساری تعریف تیرے ہی لیے ہے ۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر قربان ہوں ، میں کسی اور حال میں ہوں اور آپ کسی دوسرے حال میں ہیں ۔

حضرت عائشہ نے آپ کو نہ پاکر گمان کیا کہ آپ اپنی کسی بیوی کے گھر گیے ہیں ، حالاں کہ آپ خدا کے گھر گیے تھے ۔ انھوں نے سمجھا کہ آپ کو کسی بیوی کی یاد آگئی ، حالاں کہ آپ کو خدائے ذو الجلال کی یاد آئی تھی۔ اسی طرح انسان ظاہر حالات کے اعتبار سے دوسرے شخص کے بارہ میں ایک گمان کر لیتا ہے ۔ ابتدائی معلومات کے مطابق وہ اپنے آپ کو درست سمجھتا ہے ۔ مگر تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خیال محض ذاتی گمان کی بنیاد پر تھا، حقیقتِ واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا ۔

غلط فہمی ایک ایسی چیز ہے جس میں صحابی کے درجہ کا ایک انسان بھی مبتلا ہو سکتا ہے ۔ پھر عام انسان کے لیے تو اس کا امکان اور بھی زیادہ ہے ۔ اس لیے ہر انسان پر یہ لازم ہے کہ اگر کسی کے بارہ میں اس کو غلط فہمی ہو جائے تو وہ اس کی تحقیق کرے ۔ تحقیق کے بغیر ہرگز اپنی رائے پر اعتماد نہ کرے

تحقیق نہ کرنے والا بلا شبہ گنہ گار ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے آدمی کا کوئی عذر ہرگز سنا نہ جائے گا ۔ وہ اپنے اس جرم میں پکڑا جائے گا کہ جب تم کو معاملہ کا پورا علم حاصل نہ تھا تو تم نے کسی بندۂ خدا کے بارہ میں ایک برا خیال کیسے قائم کر لیا ۔

قرآن خدا کی کتاب

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اُس کی بابت یہ اعلان کیا تھا کہ ـــــ جن لوگوں نے نصیحت کی اس کتاب کا انکار کیا جب کہ وہ ان کے پاس آگئی، اور بے شک یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ اس میں باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ حکیم وحمید کی طرف سے اتاری گئی ہے (حم السجدہ ۴۱-۴۲)

تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب قرآن اترا، اس وقت ان الفاظ کی حیثیت ایک پیشین گوئی کی تھی۔ آج یہ پیشین گوئی ایک تاریخی واقعہ بن چکی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک استثنائی نوعیت کی کتاب ہے۔ وہ ایک ایسے خدا کی طرف سے بھیجی گئی ہے جو تمام طاقتوں سے زیادہ بڑی طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کے مخالفانہ حالات کے باوجود یہ ممکن نہ ہو سکا کہ اس میں کوئی دخل اندازی یا بگاڑ واقع ہو، نہ براہ راست اور نہ بالواسطہ۔

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں، یہ ایک انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ اس قسم کے ایک واقعہ کو اسباب کی دنیا میں ظہور میں لانے کے لیے کائناتی طاقتیں درکار ہیں۔ اس کو صرف خداوند عالم ہی ظہور میں لا سکتا ہے۔ اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خداوندِ عالم کی کتاب ہے۔

اس پیشین گوئی کو عالم اسباب میں واقعہ بننے کے لیے ضروری تھا کہ ایک طاقتور انسانی گروہ مستقل طور پر اس کی پشت پر موجود رہے۔ پچھلے نبیوں کی تعلیمات اور اس کی تعلیمات میں غیر مطابقت پیدا نہ ہو۔ کوئی ادیب یا مفکر قرآن کا جواب لکھنے پر قادر نہ ہو۔ کوئی نئی نبوت نبوتِ محمدی کی حریف بن کر نہ ابھر سکے۔ علومِ انسانی کا ارتقاء اس کی کسی بات کو کبھی غلط ثابت نہ کرے۔ تاریخ کا اتار چڑھاؤ کبھی اس پر اثر انداز نہ ہونے پائے۔ قرآن کی زبان (عربی) ہمیشہ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے باقی رہے۔ وغیرہ

قرآن کے نزول کے بعد سے اب تک کی لمبی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تمام اسباب حیرت انگیز طور پر اس کے حق میں جمع رہے ہیں۔ قرآن کے سوا کوئی بھی دوسری کتاب ایسی نہیں جس کے حق میں یہ غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہو۔

قرآن کا یہ استثنائی معاملہ اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے، وہ کسی جن یا کسی انسان کی تصنیف نہیں۔

کائناتی امکانات

لوہے کا ایک ٹکڑا مقناطیس کے پاس لے جائیں تو لوہا اپنے آپ مقناطیس کی طرف کھنچ اٹھے گا۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے کچھ خاص صفات (properties) رکھ دی ہیں۔ انھیں صفات کی وجہ سے یہ ممکن ہوا ہے کہ آدمی ان چیزوں کو مختلف صورتوں میں تبدیل کر کے انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرے۔ اور اپنے لیے ایک شاندار تمدن کی تعمیر کر سکے۔ آخرت کا عقیدہ اسی کائناتی امکان کی ایک توسیع ہے۔ کائنات کے امکانات آج "تمدن" کی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ یہی امکانات جب "جنت" کی صورت اختیار کرلیں تو اسی کا نام آخرت ہے۔

تمدن وہ تعمیری نتیجہ ہے جو انسان کی کوششوں سے ظہور میں آتا ہے۔ جنت وہ تعمیری دنیا ہے جو خدا کے فرشتوں کے ذریعہ آخری معیاری صورت میں بنائی جائے گی۔ کائناتی امکانات آج خوبصورت مکان، متحرک مشین، شاندار شہر، پُر راحت سامان کی صورت میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ ان امکانات سے آئندہ اسی قسم کی چیزیں زیادہ کامل اور زیادہ معیاری صورت میں بنائی جائیں گی۔ پہلا واقعہ موجودہ دنیا میں ہو رہا ہے، دوسرا واقعہ آنے والی آخرت کی دنیا میں ہوگا۔

ہزار سال پہلے انسان نے جو گھوڑا گاڑی بنائی، وہ بھی کائناتی امکانات کا ایک استعمال تھا۔ آج کا انسان جو آٹومیٹک موٹر کار بناتا ہے، وہ بھی کائناتی امکانات کا ایک استعمال ہے۔ حالاں کہ دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اسی طرح ان امکانات کا ایک اور زیادہ بڑا استعمال ابھی باقی ہے، اور وہ جنتی دنیا کی تعمیر ہے۔ یہ آخری دنیا موت کے بعد آنے والی زندگی میں بنائی جائے گی۔ یہ ان خوش نصیب افراد کا حصہ ہوگی جنھوں نے موجودہ امتحان کی زندگی میں اس کا استحقاق پیدا کیا ہو۔

فطرت کے امکانات کا بار بار بہتر دنیاؤں میں ڈھل جانا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا تجربہ آج ہی انسان کو ہو رہا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ فطرت کے یہ امکانات مزید اور زیادہ بہتر دنیا میں ڈھل سکتے ہیں۔ وہ ایک نئی شاندار تر دنیا کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ اس معلوم امکان کو جب مذہب کی زبان میں بیان کیا جائے تو اسی کا نام جنت ہے۔

اسلامی انقلاب کا اثر

مغل شہنشاہ جہانگیر (۱۶۲۷ - ۱۵۶۹) کا واقعہ ہے جس کو مولانا شبلی نعمانی نے نہایت موثر انداز میں نظم کیا ہے۔ ان کی یہ تاریخی نظم "عدل جہانگیری" کے عنوان سے ان کے مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ اس واقعہ کے مطابق جہانگیر کی محبوب ملکہ نور جہاں نے ایک شخص کو بلا سبب طپنچہ مار کر قتل کر دیا۔ یہ معاملہ شرعی مفتی کے سامنے پیش ہوا۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں :

مفتیِ شرع نے بے خوف و خطر صاف کہا شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن

مفتی کے اس فتوی کے بعد نور جہاں، جہانگیر اور تمام درباری اپنے کو بے دست و پا محسوس کرنے لگے۔ بظاہر اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ نور جہاں کو اس جرم کی سزا دی جائے اور مقتول کے بدلے اس کو قتل کر دیا جائے۔ آخر کار مقتول کے ورثار دیت لینے پر راضی ہو گئے اور اس طرح نور جہاں کی جان بچ گئی۔ کیوں کہ :

خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امر حسن

بعد کے زمانہ میں جب کہ اسلام کی تاریخ میں بادشاہوں کا دور شروع ہو گیا، اس قسم کے واقعات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے سلطانوں کے دربار میں وقت کے علما ان کی مرضی کے خلاف اسلام کے مسائل بیان کرتے تھے اور کسی سلطان کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس کے مقابلہ میں انکار اور سرکشی کا مظاہرہ کر سکے۔

اس کی وجہ اسلامی انقلاب کی شدت ہے۔ رسولؐ اور اصحاب رسول کے ذریعہ تاریخ میں جو انقلاب آیا وہ اتنا گہرا اور اتنا شدید تھا کہ ظاہری سطح پر تبدیلیوں کے باوجود مسلم معاشرہ سے کبھی اس کی چھاپ ختم نہ ہو سکی۔ ظالم سلاطین کو بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ کھلے طور پر وہ اسلام اور قرآن کے حکم کی خلاف ورزی کریں۔

تاہم ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ حکمرانوں کے اندر اس مزاج کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے سامنے کلمۂ حق کہا جائے مگر ان کے اقتدار سے ٹکراؤ نہ کیا جائے۔ کلمۂ حق کی حد پر رہنے سے یہ روایت باقی رہتی ہے اور سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کرنے سے یہ روایتی حد ٹوٹ جاتی ہے۔

ایک خبر

۱۲ فروری ۱۹۹۱ کے ٹائمس آف انڈیا اور دوسرے اخبارات میں واشنگٹن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ پی ٹی آئی کی ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۱۱ فروری کو دو آدمیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے سے خلیج کے مسئلہ پر بات چیت کی۔ حالاں کہ دونوں کے درمیان نصف کرۂ ارض کا فاصلہ تھا۔ ان میں سے ایک شخص واشنگٹن میں تھا اور دوسرا شخص عمان میں۔ واشنگٹن میں اے بی سی ٹیلی ویژن کا نمائندہ تھا اور عمان میں بیٹھا ہوا شخص وہ تھا جس کو دنیا اردن کے شاہ حسین کے نام سے جانتی ہے۔ یہ گفتگو اور ملاقات جدید ٹیلی ویژن سسٹم پر ہوئی جو سٹلائٹ کے ذریعہ دونوں کی تصویریں اور ان کی گفتگو ایک دوسرے کو بلا تاخیر پہنچا رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا میں یہ امکان اس لیے رکھا ہے تاکہ انسان یہ سوچے کہ جس دنیا میں انسان اور انسان کے درمیان اس قسم کی بعید ملاقات ممکن ہے، کیا وہاں خود خدا اور انسان کے درمیان اس قسم کی ملاقات ممکن نہ ہوگی۔ قرآن اور حدیث میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ ایسی ملاقات ممکن ہے اور بلا شبہہ ممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ آدمی اس کے ضروری تقاضوں کو پورا کرے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سجدہ کرو اور اپنے رب سے قریب ہو جاؤ (واسجد واقترب) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور بندے کی نزدیکی کے لیے "سجدہ" وہی کام کرتا ہے جو انسان اور انسان کی نزدیکی کے لیے سٹلائٹ اور ٹیلی ویژن کرتا ہے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو (کانک تراہ) اسی طرح ایک اور حدیث میں بتایا گیا ہے کہ بندہ جب عبادت اور دعا میں مشغول ہوتا ہے تو وہ اس وقت اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے (یناجی ربہ) اس سے معلوم ہوا کہ بندہ اپنے رب کو اس طرح پا سکتا ہے گویا کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

حتیٰ کہ اس پر یہ تجربہ بھی گزر سکتا ہے کہ وہ محسوس کرے کہ وہ اپنے رب سے ہم کلام ہے۔ تاہم یہ قربت اور مشاہدہ اور ہم کلامی تمام تر ایک روحانی تجربہ ہے نہ کہ کوئی مادی واقعہ۔ خدا سے ملنا حدیث کے الفاظ میں، گویا کہ خدا سے ملنا ہے، اور خدا کو دیکھنا گویا کہ خدا کو دیکھنا۔

بھلانے کی ضرورت

خارش کو کھجانے سے خارش بڑھتی ہے۔ مگر جس آدمی کو خارش ہو وہ کھجائے بغیر نہیں رہتا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ تلخ تجربات کا ہے۔ تلخ تجربات کو یاد کرنا صرف نقصان میں اضافہ کرنا ہے۔ مگر اکثر لوگ تلخ تجربات کو اپنی یادوں سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

اس دنیا میں ہر آدمی کو تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ زندگی ایک اعتبار سے، ناخوش گوار واقعات کا دوسرا نام ہے۔ ایسی حالت میں تلخیوں کو اور ناخوش گواریوں کو یاد رکھنا اپنے ذہن پر غیر ضروری بوجھ ڈالنا ہے۔ جو قصہ ماضی میں پیش آیا اس کو حال میں یاد رکھنا صرف اپنے دکھ کا تسلسل جاری رکھنا ہے۔ اس کو کسی طرح عقل مندی نہیں کہا جا سکتا۔

آپ کے ساتھ برا سلوک دوسرا شخص کرتا ہے، مگر اس برے سلوک کی یاد خود آپ کے اختیار کی چیز ہے۔ پھر جو کچھ آپ کے دشمن نے کیا، وہی آپ خود اپنے خلاف کیوں کریں۔

ماضی کی تلخیوں کو یاد رکھنا آدمی کے ذہن کو منتشر کرتا ہے۔ وہ آدمی کی صحت کو برباد کرتا ہے۔ وہ آدمی سے اس کا حوصلہ چھین لیتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ دل جمعی کے ساتھ اپنا کام کر سکے۔ پھر آدمی کیوں اپنے آپ کو اس دہرے نقصان میں مبتلا کرے۔

اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کی یہ لازمی شرط ہے کہ آدمی بھلانے کی عادت ڈالے۔ وہ گزرے ہوئے تلخ تجربات کو بھول جائے۔ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کے غم میں اپنے آپ کو نہ گھلائے۔ لوگوں کی اشتعال انگیز باتوں کو سن کر وہ اپنے سکون کو برہم نہ ہونے دے۔ اس قسم کی تمام چیزوں سے غیر متاثر رہ کر اپنا کام کرنا، یہ زندگی کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ اور جو لوگ اس راز کو جانیں وہی اس دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

کھوئے ہوئے کی تلافی اپنے اختیار میں نہیں، مگر کھوئے ہوئے کو بھلا دینا اپنے اختیار میں ہے۔ ناخوش گوار الفاظ کو فضا سے نکالنا اپنے اختیار میں نہیں، لیکن یہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ ناخوش گوار الفاظ کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ پھر آپ کیوں نہ ایسا کریں کہ ناممکن سے اپنی توجہ کو ہٹا لیں اور ممکن کے حصول کے لیے اپنی ساری توجہ لگا دیں۔

فاصلہ پر رہو

سڑک پر بیک وقت بہت سی سواریاں دوڑتی ہیں۔ آگے سے پیچھے سے، دائیں سے بائیں سے۔ اس لیے سڑک کے سفر کو محفوظ حالت میں باقی رکھنے کے لیے بہت سے قاعدے بنائے گئے ہیں۔ یہ سڑک کے قاعدے (Traffic rules) سڑک کے کنارے ہر جگہ لکھے ہوئے ہوتے ہیں تاکہ سڑک سے گزرنے والے لوگ انھیں پڑھیں اور ان کی رہنمائی میں اپنا سفر طے کریں۔

دہلی کی ایک سڑک سے گزرتے ہوئے اسی قسم کا ایک قاعدہ بورڈ پر لکھا ہوا نظر سے گزرا۔ اس کے الفاظ یہ تھے ——— فاصلہ برقرار رکھو :

Keep Distance

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ ان دو لفظوں میں نہایت دانائی کی بات کہی گئی ہے۔ یہ ایک مکمل حکمت ہے۔ اس کا تعلق سڑک کے سفر سے بھی ہے اور زندگی کے عام سفر سے بھی۔

موجودہ دنیا میں کوئی آدمی اکیلا نہیں ہے۔ ہر آدمی کو دوسرے بہت سے انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنا کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر آدمی کے سامنے اس کا ذاتی انٹرسٹ ہے۔ ہر آدمی اپنے اندر ایک انا لیے ہوئے ہے۔ ہر آدمی دوسرے کو پیچھے کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔

یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ ہم زندگی کے سفر میں "فاصلہ پر رہو" کے اصول کو ہمیشہ پکڑے رہیں۔ ہم دوسرے سے اتنی دوری پر رہیں کہ اس سے ٹکراؤ کا خطرہ مول لیے بغیر ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔

اسی حکمت کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ اگر آپ اعراض کی اس حکمت کو ملحوظ نہ رکھیں تو کہیں آپ کا فائدہ دوسرے کے فائدہ سے ٹکرا جائے گا۔ کہیں آپ کا ایک سخت لفظ دوسرے کو مشتعل کرنے کا سبب بن جائے گا۔ کہیں آپ کی بے احتیاطی آپ کو غیر ضروری طور پر دوسروں سے الجھا دے گی۔

اس کے بعد وہی ہوگا جو سڑک پر ہوتا ہے۔ یعنی حادثہ (accident) سڑک کا حادثہ آدمی کے سفر کو روک دیتا ہے۔ بعض اوقات خود مسافر کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح زندگی میں مذکورہ اصول کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی ترقی کا سفر رک جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ خود اپنی زندگی سے محروم ہو جائیں۔ آپ تاریخ کے صفحہ سے حرف غلط کی طرح مٹا دیے جائیں۔

اللہ کی ضمانت

دعوت الی اللہ کا کام جب بھی کسی پیغمبر نے کیا، اس کی قوم نے اس کو ستایا۔ یہی معاملہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ آپ نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تو وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ مکہ میں بھی آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ستایا جاتا رہا اور مدینہ میں بھی مزید شدت کے ساتھ آپ کی مخالفت جاری رہی۔ اس سلسلہ میں اللہ کی طرف سے آپ کو واضح ضمانت دی گئی۔ ایک آیت یہ ہے :

یا ایھا الرسول بلّغ ما أنزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته واللّٰہ یعصمك من الناس۔ ان اللّٰہ لایھدی القوم الکافرین (المائدہ ۶۷)

اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً انکار کرنے والوں کو راہ نہیں دیتا۔

دعوت کا کام خالص خدائی کام ہے۔ یہ اللہ کے منصوبہ کی تکمیل کے طور پر انجام دیا جاتا ہے (النساء ۱۶۵) اس لیے یہ بالکل فطری ہے کہ اس معاملہ میں داعی کو اللہ کی مدد حاصل ہو۔ اس مشکل کام میں اللہ کی مدد کا نہ آنا تعجب خیز ہے نہ کہ اللہ کی مدد کا آنا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس دعوتی کام کی ذمہ داری اہل اسلام پر ہے۔ آپ کے بعد آپ کی امت کو وہ کام انجام دینا ہے جو آپ نے اپنی زندگی میں انجام دیا تھا۔ (الحج ۷۸) ذمہ داری کی اس توسیع کا قدرتی تقاضا تھا کہ حق میں بھی توسیع کی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اعلان فرمایا کہ وہ تمام لوگ جو اس معاملہ میں پیغمبر اسلام کی پیروی کریں گے وہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ کی حفاظت میں رہیں گے :

یا ایھا النبی حسبك اللّٰہ ومن اتبعك من المومنین (الانفال ۶۴)

اے نبی، اللہ تمہارے لیے کافی ہے اور مومنین کے لیے جنھوں نے تمہارا ساتھ دیا ہے۔

اس آیت کے دو مطلب بتائے گئے ہیں۔ دوسرا مطلب یہی ہے کہ اللہ تمہارے لیے کافی ہے اور ان کے لیے جنھوں نے تمہارا اتباع کیا (والمعنی حسبك وحسب من اتبعك اللّٰہ) التفسیر المظہری ۴/۱۱۰

مومنین کے لیے اس نصرت کا ذکر قرآن میں مختلف مقامات پر مختلف انداز سے کیا گیا ہے

ایک سنّت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اہل اسلام کے لئے ایک معیاری نمونہ ہے۔ اس سنت کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے، خواہ وہ مسواک جیسا انفرادی معاملہ ہو یا جہاد جیسا اجتماعی معاملہ۔ خواہ وہ آج کا مسئلہ ہو یا ہزاروں برس بعد کا کوئی مسئلہ۔

سنت کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک سنت وہ ہے جو اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے مطلوب ہوتی ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ صلّوا کما رأیتمونی أصلّی (مشکوٰۃ المصابیح، ۱/۲۱۵) اس حدیث کا تعلق اصلاً نماز کی ظاہری صورت (form) سے ہے۔ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور خود بھی اسی طرح نماز ادا کی۔ اسی طرح اس کے بعد صحابہ کو دیکھ کر تابعین نے اور تابعین کو دیکھ کر تبع تابعین نے نماز پڑھی۔ یہ سلسلہ نسل در نسل امت میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ آج ہم جو نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی بالواسطہ طور پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی نقل ہوتی ہے۔

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے اونٹ پر بیٹھ کر حج کے مراسم ادا کئے تاکہ لوگ آپ کو دیکھ سکیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، مجھ کو حج کرتے ہوئے دیکھو اور اسی کے مطابق تم حج کے مناسک ادا کرو (خذوا عنّی مناسککم)

یہ سنت کی پہلی قسم ہے۔ اس میں یہ مطلوب ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی فعل کو جس شکل میں کیا ہے، عین اسی شکل میں اس کو ادا کیا جائے۔ اس کو سنت ظاہری کہا جا سکتا ہے۔

دوسری سنت سنتِ معنوی ہے۔ یعنی وہ سنت جو اپنی روح (Spirit) کے اعتبار سے مطلوب ہوتی ہے۔ اس دوسری سنت میں ظاہری شکل اضافی ہے، اور اس کی معنوی روح حقیقی اور اصل مطلوب کی حیثیت رکھتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں اترا۔ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ اترتا تو اسی وقت آپ کسی کاتب کو بلا کر اس کو لکھواتے۔ آپ کی خدمت میں ہر وقت کوئی نہ کوئی کاتب موجود رہتا۔ اس طرح کاتبان وحی کی تعداد ۴۰ سے زیادہ شمار کی گئی ہے۔ آپ کو اس کا اتنا زیادہ اہتمام

تھا کہ ہجرت کے نازک سفر میں بھی قلم اور کاغذ آپ کے ہمراہ تھا اور ایک کاتب وحی (ابوبکر صدیق) آپ کے ساتھ چل رہے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پورا قرآن اس زمانہ کے اوراق اور کاغذات پر لکھا جا چکا تھا۔ بہت سے صحابہ (مثلاً زید بن ثابت انصاری) پورے قرآن کے حافظ تھے۔ آخر عمر میں آپ نے ایک بار پورے قرآن کو سلسلہ وار پڑھا اور صحابہ کی ایک جماعت نے اس کو براہ راست آپ سے سنا۔ اس کو حدیث کی کتابوں میں العرضة الاخيرة کہا گیا ہے۔

اس طرح کے مختلف اہتمام کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو ایک جلد کی صورت میں جمع نہیں فرمایا۔ آپ کی وفات کے وقت قرآن یا تو لوگوں کے سینہ میں تھا، یا متفرق ٹکڑوں اور اوراق پر لکھا ہوا تھا۔ وہ ایک واحد کتاب کی صورت میں مرتب نہیں ہوا تھا جیسا کہ آج وہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقینی طور پر اس سے باخبر تھے کہ اس صورت حال کو بعد کے لوگ کتاب اللہ کے بارے میں شوشے بنائیں گے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں مستشرقین نے اس واقعہ کو لے کر طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر مستشرقین کی مرتب کردہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) کی پانچویں جلد میں اس مسئلہ کو اٹھایا گیا ہے اور اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک توجیہہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا خیال تھا کہ قیامت کا وقت قریب آگیا ہے اور جلد ہی یہ دنیا ختم ہو جائے گی، اس لئے قرآن کو ایک جلد میں مرتب کرنے کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوا:

ان الرسول كان يتوقع قرب قيام الساعة ونهاية العالم في زمن قريب - فكان لا داعى الى جمع القرآن (الوحى الاسلامى، كويت، رمضان ١٤١٠ھ)

ان امکانی خطرات کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل کہ آپ نے قرآن کو ایک صحیفہ کی صورت میں مجلد نہیں کرایا، یہ کوئی بھول یا غلطی کی بات نہیں ہے، یہ خود آپ کی ایک سنت ہے۔ ایسا آپ نے قصد و ارادہ کے تحت کیا۔ کیوں کہ اس سے ایک اہم دینی فائدہ وابستہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن دین کو کامل کرنا تھا، اس لئے ناممکن تھا کہ آپ کسی دینی کام کو غیر کامل حالت میں

چھوڑدیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ایسا کرتے کہ اپنی زندگی ہی میں قرآن کو ایک صحیفہ کی صورت میں مرتب کرکے اس کی بہت سی جلدیں بنواتے اور اس کو تمام ملکوں کی مسجدوں میں رکھوا دیتے تو آپ کے بعد قرآن کا تقریباً وہی انجام ہوتا جو آج امت کے اندر نظر آرہا ہے۔ لوگ بنے بنائے قرآن کو لے کر بس اس کی تلاوت کرنے میں لگ جاتے۔ قرآن کے سلسلہ میں انھیں اس کے سوا کوئی اور کام نظر نہ آتا جس میں وہ اپنے آپ کو مشغول کریں۔ قرآن کی تدوین کو ناتمام چھوڑ کر آپ نے اپنے بعد امت کو ایک بہت بڑی مشغولیت عطا کردی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں ۱۲ھ میں یمامہ (سعودی عرب) میں ایک جنگ ہوئی۔ اس میں ۷۰ ایسے مسلمان شہید ہوگئے جو پورے قرآن کے حافظ تھے۔ اس سے حضرت عمر فاروق کو اندیشہ ہوا کہ قرآن کے حافظ اگر اسی طرح ختم ہوتے رہے تو قرآن کا علم چلا جائے گا۔ انھوں نے حضرت ابوبکر سے کہہ کر قرآن کی تدوین کرائی۔

تاہم یہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ اولاً خلیفہ اول کو اس میں تردد ہوا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ اس کو ہم کیسے کریں۔ کافی بحث کے بعد وہ راضی ہوئے۔ اب ایک مستقل سرگرمی جاری ہوگئی۔ مثلاً حضرت عمر اور حضرت زید روزانہ مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جاتے اور لوگوں سے کہتے کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی حصہ لکھا ہوا موجود ہو، وہ یہاں لاکر مسجد میں جمع کرے۔

حضرت زید بن ثابت انصاری اپنی مختلف صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے لئے موزوں سمجھے گئے کہ وہ اس عظیم کام کے ذمہ دار اعلیٰ مقرر کئے جائیں۔ انھوں نے تمام جمع شدہ مکتوب اجزا کو پڑھا۔ ان کو حافظہ کی مدد سے جانچا۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار کسی کتاب کے لئے Double checking (دہرا جانچ) کا نظام قائم کیا گیا۔ یعنی کتابت کو حافظہ سے جانچا گیا اور حافظہ کو کتابت سے۔ تاہم حضرت زید بن ثابت (م ۴۵ھ) کے لئے یہ اتنا سخت کام تھا کہ انھوں نے کہا:

فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علیّ مما امرنی بہ من جمع القرآن (المصاحف لابن ابی داؤد)

خدا کی قسم، اگر وہ مجھ پر یہ ذمہ داری ڈالتے کہ پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کو میں اپنی جگہ سے ہٹا دوں تو وہ میرے لئے اس حکم سے زیادہ سخت نہ ہوتا جو ابوبکر و عمر

نے قرآن کو جمع کرنے کے لئے مجھے دیا۔

ایک سرگرم اور پر از واقعات جد وجہد کے بعد جب قرآن ایک کتاب کی صورت میں مدون ہوگیا تو اب یہ سوال تھا کہ کثیر تعداد میں جو لکھے ہوئے اجزا جمع ہوئے ہیں، ان کو کیا کیا جائے۔ اب دوبارہ بحث شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ متفقہ فیصلہ کے تحت ان سب کو جلا کر ختم کر دیا گیا۔

یہ لمبا طرح طرح کے واقعات سے بھرا ہوا کام جس کی تفصیل کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کو ایک نئی زبردست مشغولیت دے دی۔ اس مشغولیت کے دوران ان کے اوپر دین کے بہت سے نئے نئے پہلو واضح ہوئے۔ حتی کہ انھوں نے قرآن کو ازسر نو دریافت (rediscover) کیا۔ انھوں نے قرآن کے ساتھ ازسر نو اپنے زندہ تعلق کو استوار کیا۔ قرآن ان کے لئے محض ایک تقلیدی کتاب نہ رہا، بلکہ ایک ایسی کتاب بن گیا جس کو انھوں نے گویا اپنی تلاش اور محنت کے دوران دوبارہ نئے شعور کے ساتھ دریافت کیا تھا۔

یہ سنت جس کو ہم نے سمجھنے کی خاطر معنوی سنت کا نام دیا ہے، وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ جس طرح آپ کی دوسری سنتیں ہمیشہ کے لئے مطلوب ہیں، اسی طرح یہ معنوی سنت بھی ہمیشہ کے لئے مطلوب ہے۔ مزید یہ کہ وہ بے حد اہم سنت ہے، کیوں کہ اسی کے ذریعہ سے امت کا احیاء ہوتا ہے۔ وہ امت کے افراد کو مسلسل طور پر زندہ اور سرگرم عمل رکھنے کا سب سے زیادہ طاقت ور ذریعہ ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے اس لئے اتاری ہے کہ اس کے ذریعہ سے تمام دنیا والوں کو آگاہ کیا جائے (الفرقان ۱) جیسا کہ معلوم ہے، قرآن عربی زبان میں ہے، جب کہ دنیا کی قوموں میں ہزاروں مختلف زبانیں رائج ہیں۔ ایسی حالت میں تمام قومیں کس طرح قرآن سے آگاہی لے سکتی ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہوتا کہ ہر قوم براہ راست اسی منزّل قرآن سے ہدایت حاصل کرے تو وہ قرآن کو کسی بین اقوامی زبان (Lingua franca) میں اتارتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ مومنین قرآن اس کتاب کو تمام قوموں کی زبانوں میں ترجمہ کریں اور اس طرح اس کو تمام لوگوں تک ان کی قابل فہم صورت میں پہنچائیں۔

یہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معنوی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو موجودہ زمانہ میں ضرورت تھی کہ اس سنت نبوی پر عمل کیا جاتا۔ مثلاً اس کی ایک صورت یہ تھی کہ موجودہ زمانہ میں پریس کی ایجاد اور مواصلات کے جدید ذرائع کے ظہور نے اس کا امکان پیدا کر دیا تھا کہ قرآن کو بآسانی تمام قوموں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ اب اگر ہمارے رہنماؤں نے اس سنت کو زندہ کیا ہوتا۔ اور وہ قوم کو ابھارتے کہ قرآن کا ہر زبان میں مستند ترجمہ کرو۔ اس کو چھپواؤ۔ اور اس کو ساری دنیا میں پہنچاؤ تو یہ اتنا بڑا کام ہوتا کہ امت پوری کی پوری اس کام میں مشغول ہو جاتی۔ اس رخ پر عمل شروع کرنے کے بعد اس کے بے شمار پہلو نکلتے۔ ہر آدمی اس میں اپنے لئے کرنے کا کام پا لیتا۔

اس طرح گویا مسلمان قرآن کو موجودہ زمانہ کے لحاظ سے ازسرنو دریافت (Rediscover) کرتے۔ قرآن دوبارہ ان کے لئے ایک زندہ کتاب بن جاتا جو ان کی پوری زندگی میں دینی بھونچال پیدا کر دیتا۔ مگر بروقت اس قسم کی رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے پوری ملت سیاست کی چٹان پر بے فائدہ طور پر اپنا سر پٹک رہی ہے اور نتیجۃً دین سے بھی محروم ہے اور دنیا سے بھی۔

خون کے بجائے پانی

محمد افضل لادی والا (۵۳ سال) بمبئی کے رہنے والے ہیں۔ ۲۴ جنوری ۱۹۹۱ کی ملاقات میں انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۹۱ کو رنگ بھون (دھوبی تلاؤ) میں ایک کلچرل پروگرام تھا۔ افضل صاحب نے اس میں شرکت کی۔ ساڑھے گیارہ بجے رات کو یہ پروگرام ختم ہوا۔ اس سے فارغ ہوکر وہ بمبئی وی ٹی آئے اور ٹرین کے ذریعہ کرلا پہنچے۔ اس وقت تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہوچکا تھا۔ اسٹیشن سے رہائش گاہ (ہلاؤ پل) تک تقریباً دو کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ انھوں نے چاہا کہ تھری وھیلر کے ذریعہ گھر کے لیے روانہ ہوں۔ تھری وھیلر کے انتظار میں وہ سڑک پر کھڑے ہوگئے۔ اتنے میں ایک تھری وھیلر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس وقت ان کے منہ میں پان تھا۔ تھری وھیلر کو آواز دینے کے لیے انھوں نے جلدی میں پان کو تھوکا۔ اتفاق سے عین اسی وقت ایک مسافر سائڈ میں آگیا اور افضل صاحب کا پان پورا کا پورا اس کے پاؤں پر جا گرا۔

مسافر فوراً آگ بگولا ہوگیا۔ طیش میں آکر اس نے کہا کہ پان کھاتے ہو اور پان کھانے کی تمیز بھی نہیں۔ مگر افضل صاحب، جو الرسالہ کے مستقل قاری ہیں، انھوں نے گرم الفاظ کا جواب ٹھنڈے الفاظ سے دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں۔ پان کھانا بھی غلط، اور پان کھاکر میں نے جو کچھ کیا وہ بھی غلط۔ وہ آدمی تیز ہوتا گیا۔ مگر افضل صاحب نے اس کی اشتعال انگیز باتوں کا جواب دینے کے بجائے کہا کہ مجھے معاف کیجئے۔ اس نے کہا کہ یہ اچھا ہے کہ کسی کے ساتھ کچھ بھی کر دو، اس کے بعد کہو کہ معاف کر دو۔

افضل صاحب نے کہا کہ بھائی میں رسمی معافی نہیں مانگ رہا ہوں۔ میں دل سے معافی مانگ رہا ہوں اب آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے پاؤں دھوؤں۔ افضل صاحب نے جب پاؤں دھونے کی بات کہی تو آدمی کچھ نرم پڑا۔ کچھ اور باتوں کے بعد آخر کار وہ راضی ہوا کہ افضل صاحب اس کا پاؤں دھو دیں۔ قریب ہی ایک آدمی پینے کا پانی بیچ رہا تھا۔ افضل صاحب فوراً اس کے پاس گئے اور کہا کہ "چچا، ایک گلاس پانی دینا" افضل صاحب گلاس لے کر آئے تو آدمی بالکل ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھ کو دیجئے، میں خود اپنے ہاتھ سے دھولیتا ہوں۔

آدمی نے اپنے ہاتھ میں گلاس لے کر دھویا۔ ایک گلاس سے پوری صفائی نہیں ہوئی تو افضل صاحب دوڑ کر گئے اور ایک گلاس مزید پانی لے آئے۔ یہاں تک کہ اس کا پاؤں پوری طرح صاف ہوگیا۔ یہ واقعہ

ریلوے اسٹیشن کے باہر پیش آیا۔ گفتگو کے دوران افضل صاحب نے اس آدمی سے کہا : بھائی صاحب، آپ تو "میم" ہیں، اگر آپ "کاف" ہوتے تب بھی مجھے یہی کرنا تھا، کیوں کہ اسلام نے ہم کو ایسا ہی حکم دیا ہے۔ یہ سن کر وہ آدمی افضل صاحب سے لپٹ گیا۔ اس نے کہا کہ بھائی صاحب، میں کاف ہی ہوں۔ اور آپ جیسا مسلمان مجھے اپنی زندگی میں پہلی بار ملا ہے۔ اور اگر دوسرے مسلمان بھی آپ جیسے ہو جائیں تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے۔

اب وہ آدمی بالکل بدل گیا۔ پہلے اس کے اندر غصہ اور انتقام بھڑک اٹھا تھا۔ اب وہ شرمندہ ہو کر افضل صاحب سے کہنے لگا کہ بھائی، مجھ کو معاف کرنا۔ آپ کو میں نے بڑی تکلیف دی۔ میری وجہ سے آپ کو پانی لانا پڑا۔ آپ کا تھری وھیلر بھی چھوٹ گیا۔ افضل صاحب نے کہا کہ مجھ کو شرمندہ نہ کیجئے۔ اس معاملہ میں اصل غلطی تو میری تھی۔ اور میں جو پانی لایا، وہ میرا فرض تھا جو میں نے کیا۔ واقعہ کے شروع میں جو آدمی دوسرے کو غلط بتا رہا تھا۔ واقعہ کے آخر میں وہ خود اپنی غلطی مان کر شرمندہ ہو گیا اور معافی مانگنے لگا۔

جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت بمبئی کے علاقہ جوگیشوری میں زبردست فرقہ وارانہ کشیدگی موجود تھی۔ یہ مقام کرلا سے تقریباً ۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ ان حالات میں اگر افضل صاحب اشتعال کے جواب میں اشتعال کا انداز اختیار کرتے تو وہی ہوتا جو اس طرح کے مواقع پر دوسری بہت سی جگہوں میں ہو چکا ہے۔ یعنی فرقہ وارانہ فساد اور جان و مال کی تباہی۔ اس کے بعد شاید ایسا ہوتا کہ افضل صاحب خدانخواستہ گھر پہنچنے کے بجائے اسپتال لے جائے جاتے اور علاقہ میں ہندو مسلم فساد برپا ہو کر سیکڑوں خاندانوں کو برباد کر دیتا۔

افضل صاحب نے یہ واقعہ بتانے کے بعد کہا : اس وقت مجھے الرسالہ کی بات یاد آئی۔ یہ الرسالہ کے دیے ہوئے ذہن کا نتیجہ تھا کہ میں اشتعال کے موقع پر مشتعل ہونے سے بچ گیا، اور نتیجۃً اس کے برے انجام سے بھی۔ میرے گلاس بھر پانی نے سیکڑوں لوگوں کو اس بھیانک انجام سے بچا لیا کہ ان کا خون سڑکوں پر بہایا جائے۔ ایک قسم کے الفاظ بول کر آپ آدمی کے ذہن کو غصہ کا تنور بنا سکتے ہیں۔ اور دوسرے قسم کے الفاظ بول کر آدمی کے بھڑکتے ہوئے غصہ کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ الفاظ آگ کا کام بھی کرتے ہیں اور برف کا کام بھی۔ یہ بولنے والے کے اپنے اوپر ہے کہ وہ دونوں میں سے کس چیز کا اپنے لیے انتخاب کرتا ہے۔

جاپان میں دعوت

۲۶ اپریل ۱۹۹۱ کو جناب عبدالقادر خاں صاحب (پیدائش ۱۹۳۶) سے ملاقات ہوئی وہ بمبئی میں رہتے ہیں (Tel. 2615016) انھوں نے بتایا کہ وہ بین اقوامی نمائش (Expo 70) کو دیکھنے کے لئے ۱۹۷۰ میں جاپان (ٹوکیو) گئے تھے۔ وہاں وہ ایک ہفتہ تک رہے۔

وہ اپنے گروپ کے ساتھ ٹوکیو ایرپورٹ پر اترے تو وہاں کچھ جاپانی باشندے پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے پیش کش کی کہ آپ میں سے جو صاحب ہمارے ساتھ قیام کرنا پسند کریں، ان کو ہم اپنے گھر لے جانے کے لئے تیار ہیں۔ عبدالقادر خاں صاحب جاپانیوں کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے وہ ایک جاپانی کے ساتھ چلے گئے۔

عبدالقادر صاحب کو ایک ہفتہ تک اس جاپانی خاندان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ دن کا بیشتر وقت باہر نمائش وغیرہ دیکھنے میں گزرتا۔ شام کو وہ جاپانی کے گھر آجاتے اور رات اس کے یہاں گزارتے تھے۔ چوں کہ جاپانی نے اپنے گھر ٹھہرانے کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا تھا، ان کو خیال ہوا کہ وہ انھیں کوئی تحفہ دیں۔ چنانچہ انھوں نے ٹوکیو میں جاپانی ساخت کا ایک کیمرہ خریدا اور اس کو اپنے میزبان کے بچہ کو بطور تحفہ پیش کیا۔

جاپانی میزبان نے تحفہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ یہ کیمرہ آپ نے جہاں سے خریدا ہے، اس نے آپ کو اس کی رسید دی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ جاپانی نے بہت نرمی اور شرمندگی کے ساتھ کہا کہ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ وہ رسید ہم کو دے دیں۔ چنانچہ عبدالقادر صاحب نے وہ رسید انھیں دے دی۔

تاہم عبدالقادر صاحب کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ جاپانی نے کیوں ایسا کیا۔ آخر رسید کو لے کر وہ اس کو کیا کرے گا۔ انھوں نے معافی مانگتے ہوئے اپنے جاپانی میزبان سے کہا کہ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو آپ مجھے یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ کیمرہ کی رسید کیوں آپ نے طلب فرمائی۔

جاپانی نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ آپ یہاں ٹورسٹ (سیاح) کے طور پر آئے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ قاعدہ ہے کہ ٹورسٹ لوگوں کو جاپانی مصنوعات خصوصی رعایت پر دی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کیمرہ

آپ کو چالیس فی صد کم قیمت پیدیا گیا ہوگا۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ کیمرہ ملک کے باہر جارہا ہو۔ مگر اب یہ کیمرہ ملک کے اندر رہے گا اس لئے اب اس پر رعایت کا حق باقی نہیں رہتا۔ آپ سے یہ رسید ہم نے اس لئے لی ہے کہ ہم اس کو لے کر دکان پر جائیں گے اور وہاں اس کی بقیہ قیمت ادا کریں گے۔ تاکہ ہماری وجہ سے جاپان کا قومی نقصان نہ ہونے پائے۔

اس قسم کے واقعات بار بار الرسالہ میں آتے رہے ہیں۔ وہ جاپانیوں کے قومی کیرکٹر کو بتاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاپانی لوگ کتنے زیادہ با اصول اور باکردار ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جاپان کے باشندے اپنی فطرت پر ہیں۔ وہ اپنے فطری اوصاف پر قائم ہیں۔ اور فطری اوصاف جب شرعی اوصاف کی صورت اختیار کرلیں تو اس کا نام اسلام ہے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا ہے کہ جاہلیت میں جو لوگ بہتر ہوں وہی اسلام میں بھی بہتر ہوتے ہیں (خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام)

ایک سفر میں میری ملاقات ایک جاپانی نومسلم سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ جاپانی لوگ اپنی فطری استعداد کی بنا پر اسلام سے بہت قریب ہیں۔ جاپانی قوم بالقوہ طور پر مسلمان ہی ہے:

Japanese people are potentially Muslims.

آج سخت ترین ضرورت ہے کہ جاپانیوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی جائے۔ مگر اس کے لئے جاپانی زبان کو جاننا بہت ضروری ہے۔ کاش ہمارے کچھ نوجوان اس مقصد کے لئے اپنے آپ کو وقف کرسکیں۔ وہ جاپانی زبان سیکھ کر اس میں بخوبی واقفیت حاصل کریں اور پھر جاپان جاکر وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت پہنچائیں۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ ان لوگوں کو فوراً اپیل کرتا ہے جنھوں نے اپنی فطرت کو بچایا ہو، جنھوں نے اپنی فطرت کو بگڑنے سے محفوظ رکھا ہو۔ □

مشترک کمزوری

دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کی طرف سے ایک ماہانہ جرنل نکلتا ہے۔ اس کا نام منتھن (Manthan) ہے۔ اس کے شمارہ دسمبر ۱۹۹۰ میں شری ناناجی دیش مکھ کا آرٹیکل چھپا ہے۔ اس کا موضوع ہے ——— ہندستانی سیکولرزم پر نظرثانی کی ضرورت:

Our brand of secularism needs a second look.

اس آرٹیکل میں موصوف یہ شکایت کرتے ہیں کہ اس ملک کے ہندو تو تقسیم کے بعد سیکولرزم کے اصولوں پر قائم رہے۔ مگر مسلمان اس پر قائم رہنے کا ثبوت نہ دے سکے۔ اس ذیل میں وہ کہتے ہیں کہ یقیناً مسلمانوں میں کچھ ایسے افراد موجود ہیں جو واقعی سیکولر احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر وہ اپنے آپ کو اپنے فرقہ میں تقریباً غیر موثر اور مکمل طور پر علحدہ پا رہے ہیں:

Of coarse there are some well-meaning Muslim friends who display genuine secular feelings, but they find themselves almost ineffective and totally isolated within their own community (p. 10)

ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں مذکورہ ریمارک سے مجھے اختلاف نہیں۔ مگر میں کہوں گا کہ یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں، یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک مسئلہ ہے۔ اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی اکثریت کا مسئلہ ان کی بے شعوری ہے۔ اس بے شعوری کی بنا پر ایسا ہو رہا ہے کہ جو شخص جوش و جذبات کی باتیں کرے وہ دونوں فرقوں میں مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ اور جو شخص سنجیدگی اور حقیقت پسندی کی بات کرے، وہ دونوں فرقوں میں غیر مقبول ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہندوؤں کی اسی کمزوری کا یہ نتیجہ تھا کہ آزادی کے بعد سردار پٹیل کو ملکی سیاست میں بڑا مقام ملا۔ مگر راج گوپال اچاری جیسا لائق آدمی ان کے درمیان عام قبولیت حاصل نہ کر سکا۔ وغیرہ

آج دونوں فرقوں کی یہی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کمزوری کو دور کرنے ہی پر ملک کی ترقی کا انحصار ہے۔ اور اگر یہ کمزوری دور نہ ہوئی تو ملک کو بربادی سے بچانے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوگی۔

عیدالاضحیٰ

اسلامی شریعت میں سال کے اندر دو تیوہار مقرر کیے گئے ہیں۔ ایک عید الفطر۔ دوسرے عیدالاضحیٰ۔ اصل اسلامی تیوہار یہی دو ہیں۔ ان کے علاوہ اور جو تیوہار مسلمانوں میں رائج ہیں اور جن کو وہ مختلف تاریخوں میں مناتے ہیں، وہ سب مسلمانوں کے اپنے قومی رواج ہیں۔ ان کا اسلام کی اصل تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔

عیدالفطر کا تیوہار روزہ کا مہینہ ختم ہونے کے فوراً بعد شوال کی پہلی تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے افطار کی عید۔ یعنی مہینہ بھر کا روزہ رکھنے کے بعد کھانے پینے کی عید۔ اس دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ مسلمان اس دن شکرانہ کی دو رکعت نماز پڑھتے ہیں۔ آپس میں مل کر خوشی مناتے ہیں۔ کھانے پینے اور ملنے جلنے کے پروگرام کرتے ہیں۔

عیدالاضحیٰ کا مطلب ہے قربانی کی عید۔ عوام میں اس دوسری عید کو بقرعید کہا جاتا ہے۔ مگر یہ نام غلط ہے۔ اس تیوہار کا نام بقرعید نہیں ہے۔ اس کا صحیح اسلامی نام عید اضحیٰ ہے۔ اس کا مطلب ہے قربانی کی عید۔ یہ دوسری عید قمری سال کے آخری مہینہ میں ذوالحجہ کی دس تاریخ کو منائی جاتی ہے۔ اس دن مسلمان دو رکعت اجتماعی نماز پڑھتے ہیں۔ قربانی کرتے ہیں اور کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ اور اللہ کی بڑائی کا چرچا کرتے ہیں۔

اسلامی اصول کے مطابق، ان دونوں تیوہاروں میں سے کوئی بھی تیوہار کھیل تماشے یا قومی ہنگاموں کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ دونوں تیوہار انتہائی سنجیدہ عمل کی یاددہانی کے لئے ہیں۔ رمضان کا مہینہ صبر اور برداشت کی تربیت کا مہینہ ہے۔ اس پرمشقت تربیتی کورس سے گزرنے کے بعد عیدالفطر آتی ہے جو گویا اس بات کی خوشی کے لئے ہے کہ مسلمانوں نے صبر و برداشت کی تربیت کا مہینہ کامیابی کے ساتھ گزار لیا۔ عیدالفطر کا دن صابرانہ زندگی گزارنے کے عہد کا دن ہے نہ کہ بے صبری کے مظاہرے کرنے کا دن۔

عید اضحیٰ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ عید اضحیٰ دراصل قربانی کا سبق ہے۔ یہ عید مسلمانوں کو یہ بتاتی ہے کہ تمہیں زندگی کے امتحان میں اپنی ذات کی قربانی کا ثبوت دینا ہوگا۔ قربانی کے بغیر تم اپنی زندگی

کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے۔ قربانی کے بغیر تم اللہ کے مطلوب بندے نہیں بن سکتے۔

عید اضحیٰ یا عید قرباں حضرت ابراہیم کی زندگی کی یادگار ہے۔ وہ آپ کے ایک تاریخی عمل کی علامتی یاددہانی کے طور پر منایا جاتا ہے۔ عید اضحیٰ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے حضرت ابراہیم کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ حضرت ابراہیم نے وہ عمل آخری مثالی صورت میں کیا جس کو اپنی زندگی میں دہرانے کا عہد عید اضحیٰ کے دن ہر سال کیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم ایک پیغمبر تھے۔ وہ چار ہزار سال پہلے عراق میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے لوگوں کو خدا پرستی اور انسانیت کی طرف پکارا۔ مگر آپ کے بھتیجے کے سوا کسی نے آپ کی بات نہ مانی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمدن کی مصنوعی زندگی نے لوگوں سے فطری انسانی اوصاف چھین لئے تھے۔ لوگ سطحی باتوں میں مشغول ہو گئے تھے اور گہری باتوں سے انھیں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

اس وقت اللہ کی ہدایت پر حضرت ابراہیم نے ایک نئی نسل تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ آپ نے اپنے بیٹے اسماعیل کو عرب کے صحرا میں لے جا کر بسا دیا۔ وہاں اس وقت انسانی آبادی نہ تھی۔ ہر طرف صرف فطرت کا سادہ ماحول تھا۔ پہاڑ۔ صحرا۔ کھلے میدان، سورج۔ چاند۔ آسمان، رات اور دن بس اسی قسم کے فطری مناظر تھے جن کے درمیان اسماعیل کو اور ان کی اولاد کو رہنا پڑا۔

اس صحرائی زندگی میں رہنا اپنے آپ کو ذبح کرنے کے ہم معنی تھا۔ کیوں کہ اس وقت وہاں ہر طرف موت کا منظر تھا۔ وہاں اس وقت زندگی کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ حضرت ابراہیم نے بے آب وگیاہ صحرا میں اس طرح بسا کر اپنے بیٹے کو ذبح کیا۔ وہاں کے مشکل ترین ماحول میں دو ہزار سال تک توالد وتناسل کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک نئی نسل بن کر تیار ہو گئی جس کو تاریخ میں بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ یہ نسل تمدن سے کٹ کر خالص فطرت کے ماحول میں تیار ہوئی تھی۔

بنو اسماعیل اس زمانہ میں بالکل نئے قسم کے انسان تھے۔ مورخین کے بیان کے مطابق، ان میں سے ہر شخص گویا ہیرو تھا۔ ان کے اندر تمام فطری انسانی اوصاف پوری طرح زندہ تھے۔ وہ سچ بولتے تھے، وہ جھوٹ بولنا نہیں جانتے تھے۔ وہ وعدہ پورا کرتے تھے۔ وعدہ خلافی ان کے لئے ناقابل تصور چیز تھی۔ وہ فیاض تھے۔ بخیل کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ کمزور کی مدد کرتے تھے، کمزور کو ستانا یا لوٹنا ان کے نزدیک بہت بڑا جرم تھا۔ وہ جو کچھ کہتے وہی کرتے، اور وہی کہتے جو انھوں

نے اپنی زبان سے کہا ہے۔

یہی وہ اعلیٰ انسانی گروہ تھا جس نے بعد کو پیغمبر اسلام کا ساتھ دیا۔ اسی سے وہ انسانی ٹیم بنی جس نے دنیا میں پہلی بار آزادی اور مساوات کا انقلاب برپا کر دیا۔ سوامی ویویکانند نے اپنے لیٹرز میں لکھا ہے انسانی برابری (equality) کا نظام اگر کبھی قابل لحاظ درجہ میں کسی مذہب نے قائم کیا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے:

Mr experience is that if ever any religion approached to this equality, it is Islam and Islam alone. (p.379).

اسلام نے انسانی مساوات کا جو نظام اپنے دور اول میں قائم کیا، وہ اسی نے اسی مذکورہ نسل کے ذریعہ قائم کیا جو عرب کے صحرا میں عظیم الشان قربانی کے ذریعہ تیار کی گئی تھی۔ اس کے اندر فطری انسانی اوصاف زندہ تھے۔ اسی لئے وہ اس قابل بنی کہ وہ اعلیٰ مقصد کو اپنائے اور قربانی دے کر اس کو عملاً قائم کرے۔ یہ تاریخی کارنامہ ایک عظیم قربانی کا کرشمہ تھا۔

عید اضحیٰ کے موقع پر جانور کی جو قربانی کی جاتی ہے، وہ مذکورہ ابراہیمی واقعہ کی یادگار ہے۔ حضرت ابراھیم نے ایک نئی جاندار نسل تیار کرنے کے لئے اپنے بیٹے کو قربان کیا۔ عید اضحیٰ کا دن اسی قربانی کی یاد دلاتا ہے۔ عید اضحیٰ کا دن بتاتا ہے کہ زندگی میں کوئی بڑا کام قربانی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ ایک نسل تیار کرنا، ایک سماج بنانا، ایک ملک کو آگے بڑھانا، ہر کام اس وقت انجام پاتا ہے جب کہ کچھ لوگ اس کو اس طرح اپنا مقصد بنائیں کہ اس کے لئے وہ ہر قربانی دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

عید اضحیٰ کے موقع پر جانور کا ذبح کرنا اسی ذاتی قربانی کا فدیہ ہے۔ اصل قربانی تو اپنی ذات کی ہے۔ عید اضحیٰ کے دن جو جانور ذبح کیا جاتا ہے وہ ذاتی قربانی کی علامت ہے۔ وہ ذاتی قربانی کا عملی یا علامتی عہد ہے۔ چنانچہ قربانی کرنے والا اگرچہ بظاہر جانور ذبح کر رہا ہوتا ہے مگر اس وقت وہ اپنی زبان سے جو دعا پڑھتا ہے اس کے الفاظ یہ ہوتے ہیں:

"بے شک میری عبادت اور میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا جینا سب کا سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ خدایا تجھی نے دیا ہے اور تجھی کو میں لوٹاتا ہوں"

جانور کی قربانی دراصل ذاتی قربانی کا سبق ہے۔ یہ ذاتی قربانی حضرت ابراھیم نے ایک خاص صورت میں دی۔ حالات کے اعتبار سے وہ مختلف صورتوں میں ہر زمانہ میں مطلوب ہوتی ہے۔ کبھی

ایک لیڈر کو قوم کی ترقی کی خاطر ذاتی مقبولیت کو قربان کرنا ہوتا ہے۔ کبھی کچھ افراد کو سماج کی مجموعی بہتری کے لئے ذاتی تقاضوں کو دبانا پڑتا ہے۔ کبھی کسی قوم کی حال کی نسل کو قربان ہونا پڑتا ہے تاکہ اس کی مستقبل کی نسل کامیابی کی منزل تک پہنچ سکے۔ کبھی ایک گروہ کو اپنی خوشیوں سے محروم ہونا پڑتا ہے تاکہ وسیع تر انسانیت کو خوشیوں کی نعمت مل سکے۔

عید اضحیٰ کا پیغام یہ ہے کہ ——— قربانی کے لئے تیار رہو۔ جب کبھی کسی بڑے مقصد کے لئے اپنے آپ کو قربان کرنے کا موقع آئے تو فوراً اپنے آپ کو اس کے لئے قربان کر دو جس طرح آج تم نے ایک جانور کو قربان کیا ہے۔ جانور کی قربانی حقیقۃً ذاتی قربانی کا ایک مقدس عہد ہے۔ اور اللہ کے یہاں قربانی دینے والا وہ ہے جو اپنے اس عہد کو اپنی زندگی میں پورا کر دکھائے۔

عید اضحیٰ دراصل حج کی عظیم عبادت کا ایک جزء ہے۔ حج کی صورت میں ہر سال جو مراسم عرب میں ادا کئے جاتے ہیں وہ سب کے سب حضرت ابراہیم کی تاریخ کا علامتی اعادہ ہیں۔ حضرت ابراہیم کو ایک خدا پرستانہ انقلاب لانا تھا۔ اس کے لئے انھوں نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں دے دیا۔ اس عمل کے دوران ان پر یا ان کے اہل خانہ پر جو احوال گزرے، انھیں کو حاجی دہراتا ہے۔ حج دراصل حضرت ابراہیم کے حقیقی واقعات کا علامتی اعادہ ہے۔

اسی حج کے عمل کا ایک جزء نماز اور قربانی ہے جس کو انھیں دنوں میں ساری دنیا کے مسلمان مناتے ہیں۔ معروف حج بڑا حج ہے اور عید اضحیٰ گویا چھوٹا حج۔

الرسالہ سمپوزیم

پٹنہ کے الرسالہ ریڈرس فورم کی طرف سے پٹنہ میں ایک سمپوزیم ۲۸ جولائی ۱۹۹۱ کو کیا جارہا ہے۔ اس میں زندگی کی تعمیر میں الرسالہ کے رول پر مذاکرہ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ دوسرے مقامات کے قارئین الرسالہ بھی وقتاً فوقتاً اپنے یہاں اس قسم کے مذاکرات کا اہتمام کریں۔ پٹنہ کے مذکورہ سمپوزیم کے لیے مقامی لوگ حسب ذیل پتہ پر رابطہ قائم فرمائیں :

ایم ٹی خان ، سی ۔ ۳۰ عدالت گنج ، پٹنہ ۱ ۔ ٹیلی فون : ۲۲۳۹۸۱

ایک غلطی بھی

ایک بار میں ایک دیہات میں گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک شخص نے نیم کا درخت کاٹا اور اس کے بعد اس کے تنہ کا چھلکا اتارنے لگا۔

"آپ اس کا چھلکا کیوں اتار رہے ہیں" میں نے دیہات کے اس آدمی سے پوچھا۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا: "اگر چھلکا نہ اتارا جائے تو اس کے اندر کیڑے لگ جائیں گے اور لکڑی کو خراب کر دیں گے۔"

یہ ۱۹۶۵ کی بات ہے۔ اگست ۱۹۷۵ میں دوبارہ مجھے ایک اور دیہات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ نیم کا ایک کٹا ہوا تنہ پڑا ہے۔ ایک شخص نے اپنے گھر کے پاس نیم کا ایک درخت کاٹ دیا تھا مگر اس کا چھلکا نہیں اتارا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے دس سال پہلے والی بات یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ تجربہ کر کے دیکھوں کہ اس کی بات صحیح تھی یا نہیں۔ میں نے اس کے گھر کے ایک آدمی سے کہا کہ کوئی اوزار لاؤ اور اس کا چھلکا اتارو۔ جب اس نے چھلکا اتارا تو میں نے دیکھا کہ چھلکے کے نیچے ایک انچ کے موٹے موٹے کیڑے ہیں۔ یہ کیڑے نہایت نرم تھے مگر انھوں نے تنہ کی سطح کو جگہ جگہ اس طرح کاٹ ڈالا تھا جیسے اس کے اوپر نالیاں بنائی گئی ہوں۔

یہ قدرت کا نظام ہے۔ قدرت اس طرح سبق دیتی ہے کہ اس دنیا میں تم کو نہایت محتاط رہ کر زندگی گزارنا ہے۔ کیوں کہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں ایک غلطی تمہاری ساری خوبیوں پر پانی پھیر سکتی ہے۔ ایک غفلت تمہارے سارے امکانات کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔ قدرت یہ کر سکتی تھی کہ چھلکا اتارے بغیر نیم کے تنہ کو محفوظ رکھتی۔ مگر اس نے یہ قانون بنا دیا کہ اس کا مالک اس کا چھلکا اتارے۔ اس کے بعد ہی اس کا تنہ اس دنیا میں محفوظ رہ سکے گا۔

اس قانون قدرت کا انطباق اب انسانی زندگی میں دیکھئے۔ کیوں کہ انسان کی دنیا میں بھی وہی قانون رائج ہے جو فطرت کی دنیا میں پایا جاتا ہے۔

۱۹۴۴ میں جون پور (یوپی) کے دو آدمیوں نے مل کر کاروبار شروع کیا۔ ابتدائی سرمایہ

ان لوگوں کے پاس چند سو سے زیادہ نہیں تھا۔ مگر ان کے مشترکہ کاروبار میں خدا نے برکت دی اور چھ سال میں ان کے کاروبار کی حیثیت ۳۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ اب دونوں میں اختلاف شروع ہوگیا اور نتیجۃً علاحدگی تک پہنچا۔ ایک ثالث کے مشورہ سے طے ہوا کہ کاروبار تقسیم نہ کیا جائے، بلکہ اس کی مالیت کا اندازہ کرکے اس طرح بٹوارہ ہو کہ ایک شخص نصف کے بقدر رقم لے لے اور دوسرے کو اثاثہ سونپ دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک شخص کو مال و اسباب اور دوسرے کو نقد پندرہ ہزار روپے دے دئے گئے۔

۱۹۴۹ میں پندرہ ہزار روپے آج کی قیمت کے لحاظ سے کئی لاکھ روپے کے برابر تھے۔ جس شخص نے نقد رقم لی تھی، اس نے جون پور کے ایک بازار میں کپڑے کی دکان کھول لی۔ انھیں شروع ہی سے بڑا اچھا میدان ملا اور ایک سال میں ان کا سرمایہ دگنا ہوگیا۔ اپنے کاروبار کے دوسرے سال میں وہ اس طرح داخل ہوئے کہ ان کے سامنے ترقی اور کامیابی کا ایک نہایت وسیع دروازہ کھلا ہوا تھا۔

مگر اب ایک کمزوری نہایت آہستگی سے ان کے اندر داخل ہوگئی۔ وہ خرچ کے بارے میں لاپروا ہوگئے۔ اپنی ذات پر، بیوی بچوں اور دوستوں پر ان کا خرچ بے حساب بڑھ گیا۔ وہ بھول گئے کہ دن بھر کی بکری سے ایک ہزار روپے جو ان کے گلہ میں آئے ہیں، ان میں سے صرف ۱۰ فیصد ان کا ہے۔ باقی ۹۰ فی صد مہاجن کا ہے۔ وہ اپنے گلہ کی رقم اس طرح خرچ کرنے لگے گویا یہ سارا روپیہ ان کی آمدنی ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے وکیل کی جیب میں فیس کی جو رقم آتی ہے وہ سب اس کی آمدنی ہوتی ہے۔

دکان داری کے ساتھ اس قسم کی شاہ خرچی نہیں چل سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں وہ دیوالیہ ہوگئے۔ ان کے پاس پندرہ ہزار میں سے ایک روپیہ بھی باقی نہ رہا۔

اس واقعہ کے بعد وہ تقریباً پندرہ سال تک زندہ رہے۔ مگر دوبارہ کوئی کام نہ کرسکے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ تم ایک "چلہ" دے دو تو تمہارا کام بن جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کیا۔ مگر قانون قدرت کی خلاف ورزی کی تلافی چلہ کے ذریعہ نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ان کی حالت بگڑتی رہی۔ یہاں تک کہ پریشانی کے عالم میں وہ ۱۹۷۱ میں ایک جیپ سے ٹکرا گئے اور سڑک ہی پر ان کا

انتقال ہوگیا۔

زندگی میں ایک غلطی بھی سارے امکان کو برباد کر دیتی ہے اور آدمی کو ناکامی کے آخری کنارے پہنچا دیتی ہے۔

یہی قاعدہ زندگی کے تمام معاملات کا ہے۔ یہاں ہر "نیم" کے ساتھ ایک کیڑا ہے۔ یہاں ہر معاملہ کے ساتھ اس کی ایک کمزوری لگی ہوئی ہے۔ آدمی کو ان کمزوریوں سے آخری حد تک محتاط رہنا ہے۔ وہ جس معاملہ میں بھی غفلت برتے گا، اس کی کمزوری اپنا کام کرے گی اور اس کے سارے معاملہ کو بگاڑ کر رکھ دے گی۔

نیم کے درخت کا مالک اگر کیڑے کے خلاف احتجاج کرے تو کبھی ایسا ہونے والا نہیں کہ نیم کے تنہ میں کیڑے نہ لگیں۔ اس کیڑے کا وجود قانون قدرت کے اذن کے تحت ہے۔ اور جس چیز کے پیچھے قانون قدرت کا اذن شامل ہو، اس کو ختم کرنا کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

اسی طرح انسانی زندگی کے معاملات میں جو "کیڑے" لگتے ہیں، وہ بھی قانون قدرت کی بنا پر ہیں۔ وہ بہر حال باقی رہیں گے۔ ان کے خلاف احتجاج اور شکایت کا طوفان برپا کرنا سراسر لاحاصل ہے۔ ان کے مقابلہ میں ہم کو بچاؤ کی تدبیر تلاش کرنا ہے نہ کہ ان کے خلاف احتجاجی نعرے لگانا۔

بچاؤ یا تحفظ اس دنیا کا ایک مستقل اصول ہے۔ اس دنیا میں وہی لوگ زندہ رہ سکتے ہیں جو اپنے بچاؤ کا اہتمام کرتے ہوں۔ جو لوگ اپنے بچاؤ کی طرف سے غافل ہو جائیں، ان کے لئے خدا کی اس دنیا میں ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں۔

الرسالہ کا قاری وہ ہے
جو الرسالہ کو ایک سے زیادہ بار پڑھے

الرسالہ کو پسند کرنے والا وہ ہے
جو الرسالہ کی ایجنسی لے کر اس کو پھیلائے

اتوار کی صبح کو میں اور صغیر اسلم صاحب فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آئے تو ان کے مکان کے گیٹ پر اخباروں کا ایک بڑا بنڈل پڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ کیسا اخبار ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک اخبار ہے۔ اتوار کو خاص طور پر وہ لوگ بہت زیادہ صفحات شامل کرتے ہیں۔ پھر انھوں نے لطیفہ سنایا کہ میرے بھائی وطن سے آئے۔ صبح کو اسی طرح انھوں نے اخبار کا بنڈل دیکھا تو کہنے لگے غلطی سے وہ سارے محلہ کا اخبار یہیں چھوڑ گیا۔

ایک سفید فام امریکی نے بتایا کہ وہ ایک جاب کے سلسلے میں کچھ دنوں مصر میں رہا ہے۔ اس نے کہا کہ وہاں مسلمانوں کو مجھے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھ کو اسلام کا طریقہ بہت اچھا لگا۔ "اسلام کی کون سی بات آپ کو اچھی لگی"۔ اس سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ وہاں میں نے دیکھا کہ مسلمان اپنے والدین کو عزت کے ساتھ ابی (میرے باپ) اور اُمّی (میری ماں) کہتے ہیں۔ ہم لوگ امریکہ میں اپنے والدین کو عام آدمیوں کی طرح صرف ان کے نام سے پکارتے ہیں۔ مجھ کو امریکی طریقہ کے مقابلہ میں اسلام کا طریقہ زیادہ پسند ہے۔

امریکہ میں آزادانہ تہذیب کے نتیجہ میں وہ رشتہ بالکل ٹوٹ گیا ہے جو فطری طور پر والدین کے ساتھ اولاد کا ہوتا ہے۔ انسان اب بھی اپنی سابقہ فطرت پر پیدا ہو رہے ہیں، مگر عملی ماحول فطرت کی اس آواز کے مطابق نہیں۔ اس طرح فطرت اور معاشرتی ماحول کے درمیان عدم مطابقت پیدا ہوگئی ہے۔ انسان اپنے آپ کو ایک مصنوعی قید میں محسوس کرنے لگا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کی دعوت کے زبردست مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر یہ مواقع اسلام کی دعوت کو روحانی انداز میں پیش کرنے کے لئے ہیں نہ کہ اسلام کی دعوت کو سیاسی انداز میں پیش کرنے کے لئے۔

۲۱ جون ۱۹۹۰ کو شمالی ایران میں جو زلزلہ آیا تھا اس کا مرکز دیلم تھا، مگر اس کے ہلکے جھٹکے سوویت یونین کے اندر آذربائیجان تک محسوس کئے گئے۔ اس زلزلہ میں تقریباً ۶۰ ہزار آدمی مر گئے۔ اور اس سے کئی گنا زیادہ تعداد میں زخمی ہوئے۔ اس طرح کے زلزلوں میں موت کا زیادہ بڑا سبب مکانوں کا گرنا ہوتا ہے۔ اگر مکانات نہ گریں تو بہت کم موتیں واقع ہوں۔ امریکہ میں بھی زلزلے آتے ہیں۔ مگر یہاں اتنا زیادہ جانی نقصان نہیں ہوتا جتنا ایران اور روس میں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

یہاں مکانات بالکل دوسرے انداز سے بنائے جاتے ہیں۔

ارضیاتی سائنس میں غیر معمولی ترقیوں کے باوجود، زلزلہ کی پیشین گوئی ابھی تک ایک مایوس کن شعبۂ علم (Frustrating Science) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے اس کا امکان نہیں کہ لوگوں کو زلزلہ کی آمد کی پیشگی اطلاع دے دی جائے اور لوگ گھروں سے باہر نکل آئیں۔ البتہ ایک چیز بڑی حد تک ممکن ہے، اور وہ ہے مکانات کو اس طرح بنانا کہ وہ زلزلہ کے جھٹکے کو سہ لیں اور گرنے سے بچ جائیں۔

اس مقصد کے لئے موجودہ زمانہ میں ارتھ کوئیک انجینیرنگ وجود میں آئی ہے۔ اس کے مطابق اب ترقی یافتہ ملکوں میں ایسے مکانات بنائے جاتے ہیں جن کا ڈھانچہ (Floating foundations) (فلوٹنگ فاؤنڈیشن) کے اصول پر بنایا جاتا ہے۔ زلزلہ کے جھٹکے آتے ہیں تو یہ مکانات زیادہ تر ہلتے ہیں، وہ گرتے نہیں پڑتے۔

امریکہ میں سان فرانسسکو بھی اسی طرح زلزلہ کا علاقہ ہے جس طرح ایران کا شمالی حصہ زلزلہ کا علاقہ ہے۔ ۱۹۸۹ میں سان فرانسسکو میں تقریباً اسی شدت کا زلزلہ آیا جیسا کہ ایران کا مذکورہ زلزلہ تھا، مگر سان فرانسسکو کے اس زلزلہ میں صرف ۲۷۵ موتیں ہوئیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ سان فرانسسکو کے مکانات جدید ٹکنیک کے مطابق بنائے گئے ہیں۔

ایران کے زلزلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اخبار نے لکھا تھا کہ ایران ایک زلزلہ والے علاقہ میں واقع ہے۔ اس کو چاہئے کہ وہ اپنے تیل کی دولت کا ایک حصہ خطرہ والے مقامات پر زلزلہ روک مکانات کی تعمیر پر لگائے جو فطرت کے غضب کا شکار ہوتے رہتے ہیں:

> Iran, sitting on a veritable seismic volcano, must divert part of its oil-rich economy to building quake-resistant structures at places which have been subjected to nature's fury.

ایران کا نام نہاد اسلامی انقلاب امریکہ سے نفرت کی بنیاد پر آیا۔ ایران کی طاقت کا سب سے بڑا حصہ یہ ثابت کرنے پر صرف ہو رہا ہے کہ امریکہ شیطان اکبر ہے، ایسی حالت میں اگر وہ امریکہ سے کوئی مفید سبق نہ لے سکا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کا

حال عام طور پر یہی ہے۔ موجودہ زمانہ کا مسلمان اقوام غیر کی نفرت میں جیتا ہے، اس لئے وہ ان سے تعمیری سبق نہیں لے پاتا۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ اصلاً ہندستانی ہیں، مگر عرصہ سے امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیوں آپ نے انڈیا کو چھوڑ کر امریکہ میں رہنا پسند کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں پیس (امن) ہے، جبکہ انڈیا میں پیس نہیں۔

میں نے کہا کہ بات یوں نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ لوگ امریکہ میں پیس کی قیمت ادا کر رہے ہیں، اس لئے یہاں آپ لوگوں کو پیس حاصل ہے۔ انڈیا میں آپ پیس کی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں، اس لئے وہاں آپ کو پیس بھی حاصل نہیں۔

انھوں نے کہا کہ اس کا کیا مطلب۔ میں نے ان کو منارہ (The Minaret) کا شمارہ (Fall 1989) دکھایا۔ یہ امریکہ کا ایک اسلامک میگزین ہے جو لاس اینجلیز سے شائع ہوتا ہے۔ مذکورہ شمارہ میں ایک مسلمان کا انٹرویو چھپا ہے۔ وہ کیلی فورنیا کے اسلامک سنٹر کے ترجمان ہیں۔ نیز امریکہ کی مسلم پبلک افیرس کے اگزیکیٹو ڈائرکٹر ہیں۔ انٹرویو کا ایک سوال و جواب یہ تھا :

Q. What about cases of discrimination and violence against Muslims during the decade?

A. Such incidents multiplied in the 80's. Mosques were the target of vandalism. Muslim leaders were attacked verbally and physically. People like Ismail Farooqi and Yusuf Bilal were killed. In a pluralistic society where several interest groups work to outdo each other, these kinds of brutal acts are not uncommon. What was sad was that the Muslim community did not pursue these cases vigorously. Farooqi is almost forgotten. So is Bilal.

سوال : پچھلے دہے میں امریکی مسلمانوں کے خلاف امتیاز اور تشدد کی حالت کیسی رہی۔

جواب : اس دہے کے دوران ہر قسم کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ امریکہ میں مسجدیں غارت گری کا نشانہ بنیں۔ وہاں مسلم رہنماؤں پر زبانی اور جسمانی حملے کئے گئے۔ اسماعیل فاروقی اور یوسف بلال جیسے لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ مشترک سماج جس میں مفادات رکھنے والے گروہ ایک دوسرے کے خلاف سرگرم ہوں، وہاں اس قسم کے وحشیانہ واقعات غیر معمولی نہیں ہیں۔ مگر جو بات رنج کی ہے وہ یہ کہ یہاں کے مسلمانوں نے ان کے لئے زوردار طور پر کچھ نہیں کیا۔ فاروقی کو تقریباً بھلا دیا گیا ہے، اور اسی طرح بلال کو بھی۔

میں نے کہا کہ اس قسم کے واقعات انڈیا میں ہوتے ہیں تو وہاں کے مسلمان ان کے خلاف جلسے جلوس اور ہنگامے کھڑے کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں کش مکش بڑھتی ہے جو عمومی فساد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے برعکس امریکہ کے مسلمان، ان واقعات کو نظر انداز کرتے ہیں، اس لئے یہاں عمومی فسادکی نوبت نہیں آتی۔

اشالی ورما ایک ہندستانی نوجوان ہیں۔ وہ پچھلے ایک سال سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ ہندستان میں انھوں نے انگلش اسکول میں تعلیم پائی۔ انگریزی لٹریچر کا کثرت سے مطالعہ کیا۔ اب وہ کافی اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ امریکی ان کی باتیں سن کر کہتے ہیں کہ تم تو ابھی ایک سال سے امریکہ میں ہو اور تم اتنی اچھی انگریزی بول رہے ہو :

You've only been here a year and you speak English so well!

انھوں نے کہا کہ عام امریکی بیرونی دنیا کے بارہ میں بہت کم جانتا ہے۔ مجھے یہ جان کر سخت دھکا لگا کہ اگرچہ ہم امریکہ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ مگر خود امریکی بقیہ دنیا کے بارہ میں کچھ نہیں جانتے :

It came as a shock to me that, though we knew everything about America, the Americans knew next to nothing about the rest of the world.

امریکیوں کا یہی حال اسلام کے بارہ میں ہے۔ عام امریکی اسلام کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا۔ ایک امریکی نے گفتگو کے دوران کہا کہ ہم نے اسلام کے بارہ میں پہلی بار اس وقت جانا جب ہم نے سنا کہ ایران میں اسلامک ریولیوشن آگیا ہے اور وہاں کی اسلامی گورنمنٹ نے امریکی سفارت خانہ میں کام کرنے والے امریکیوں کو یرغمال (hostage) بنا لیا ہے، اور جو لوگ ان کے مخالف ہیں ان کو پکڑ پکڑ کر انھیں گولی ماری جا رہی ہے۔

مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ مغربی میڈیا مسلم دنیا کے صرف برے واقعات کو نمایاں کرتا ہے۔ مگر یہ شکایت بالکل بے معنی ہے کیوں کہ موجودہ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوگا۔ خود مسلمانوں کے اخبار اور رسالے اور کتابوں میں مغربی دنیا کے صرف برے واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ پھر ایسی شکایت سے کیا فائدہ۔

اس مسئلہ کا حل شکایت نہیں۔ اس کا حل صرف دو میں سے ایک ہے۔ یا تو مسلمان ایک

عالمی میڈیا پیدا کریں اور اس کو اتنا ترقی یافتہ بنائیں کہ دوسری قومیں اس کو دیکھنے اور پڑھنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور اگر مسلمان ایسا نہیں کر سکتے تو دوسری ممکن صورت یہ ہے کہ وہ ان واقعات سے آخری حد تک اپنے آپ کو بچائیں جن کو مغربی میڈیا "دہشت گردی" کا عنوان دے کر اپنے یہاں پیش کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور صورت اس بدنامی سے بچنے کی نہیں ہو سکتی۔

امریکہ میں حال ہی میں ایک کتاب جاپان کے بارہ میں چھپی ہے۔ اس کے مصنف ۵۰ سالہ امریکی عالم معاشیات پیٹ کوٹ ہیں اور اس کا نام ہے اثر ورسوخ کے ایجنٹ :

Pat Choate, *Agents of Influence*.

اس کتاب پر دو صفحہ کا تبصرہ امریکی جریدہ ٹائم (۸ اکتوبر ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔ اس تبصرہ کا عنوان ہے ــــــ کیا واشنگٹن جاپان کی جیب میں ہے :

Is Washington in Japan's Pocket?

یہ ایک معلوماتی کتاب ہے۔ اس میں بہت سے اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں۔ اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ امریکہ میں جاپان کی تجارتی کامیابی کا خاص راز جاپان کی تجارتی لابی ہے۔ جاپان کی تجارتی کمپنیاں امریکہ کے بڑے بڑے سابق افسران کو بھاری قیمت دے کر خرید لیتی ہیں اور ان کے ذریعہ امریکہ میں اپنے تجارتی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ جاپان تقریباً ایک سو ملین ڈالر (\$ 100 million) سالانہ خرچ کرتا ہے۔ حتی کہ امریکہ کے سابق صدر رونالڈ ریگن کو جاپان بلایا گیا تاکہ وہ وہاں لیکچر دیں۔ اس کے لئے ریگن کو ۲ ملین ڈالر ادا کئے گئے۔

اس قسم کے اعداد و شمار بظاہر صحیح ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ ایک مبالغہ آمیز بات ہے کہ صرف اس چیز کو جاپان کی اقتصادی کامیابی کا سبب بتایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جاپان کے اندر اگر ذاتی صلاحیت نہ ہوتی تو محض "لابی" کی تدبیر اختیار کر کے وہ کبھی کامیابی کا مقام حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کی بیشتر تعداد وہ ہے جس کی دلچسپیوں کا مرکز صرف "ڈالر" ہے۔ تاہم ایک تعداد وہ ہے جو اسلام کے بارے میں لکھتی اور بولتی ہے۔ ان لوگوں سے آپ بات کریں تو وہ متفقہ طور پر کہیں گے کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن امریکہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہمارے بزرگ رہنما ۱۹۴۷ سے پہلے یہ کہا کرتے تھے کہ برطانیہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

میں دونوں ہی گروہوں کو نادان سمجھتا ہوں۔ یہ ایک سطحی طرز فکر ہے کہ کسی شخص یا کسی قوم کو نامزد کرکے کہا جائے کہ بس یہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ تاہم دونوں گروہوں میں ایک فرق ہے۔ ماضی کے بزرگوں نے جس برطانیہ کو اسلام کا دشمن سمجھا، اس سے انھوں نے مکمل طور پر قطع تعلق کر لیا۔ مگر حال کے اسلام پسند جس امریکہ کو دشمن بتاتے ہیں وہ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو ڈالر کے عوض عین اسی دشمن کے ہاتھ فروخت کئے ہوئے ہیں۔

ہماری قیادت کا دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے "ہندو دشمن" سے بچنے کے لئے پاکستان بنایا مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ ترقی کے تمام اعلیٰ ذرائع باہر کے "اسلام دشمن" ملکوں میں ہیں۔ چنانچہ پاکستان بننے کے بعد وہاں کے تمام بہترین دماغ مملکت خداداد سے نکل کر امریکہ جیسے ملکوں میں پہنچ گئے۔ آج پاکستان کے پاس اپنی قوم کا صرف "بھس" ہے۔ اس کا "گندم" تقریباً سب کا سب امریکہ کی سرزمین میں اتر چکا ہے اور اسی طرح دوسرے مغربی ملکوں میں۔

امریکی آدمی اگر آپ کو کسی پارک میں، ہوائی جہاز میں، ایر پورٹ پر یا اور کسی مقام پر ملے تو بظاہر وہ آپ سے بالکل غیر متعلق دکھائی دے گا۔ لیکن اگر آپ اس سے کہیں کہ "معاف کیجئے، کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں" تو وہ فوراً آپ کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور پوری دلچسپی کے ساتھ آپ کے سوال کا جواب دے گا۔

ایک امریکی سے میں نے پوچھا کہ کیا امریکی لوگوں کا کیس کھوئی ہوئی روح (Lost souls) کا کیس ہے۔ وہ ہنسا۔ اس نے کہا کہ مشرق کے لوگ ہمارے بارہ میں ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقۃً ایسا نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ مگر حال میں نیو واشنگٹن پوسٹ نے اے بی سی (ABC) کے ذریعہ جو اوپینین پول کرایا ہے، اس کی رپورٹ بتاتی ہے کہ امریکہ اس وقت بڑے پیمانہ پر ایک قومی مایوسی (national pessimism) میں مبتلا ہے۔ اس پول کے مطابق، ستر فی صد، یعنی ہر پانچ میں سے چار امریکی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا ملک غلط راستہ پر چلا گیا ہے:

Seventy per cent, or four out of five Americans, feels that their country has gone off on the wrong track.

یہ سن کر وہ دیر تک چپ رہا۔ پھر سنجیدگی کے ساتھ بولا کہ ——— اس مادی دنیا میں خوشی ہمیشہ

ایک نہ ملنے والی چیز بنی رہے گی۔ مگر اس کی تلاش کی خوشی بھی بہت قیمتی ہے جس میں آدمی ساری عمر لگا رہے۔ اکثر امریکیوں کا یہی خیال ہے:

Happiness must ultimately remain an elusive commodity in this mortal world but the pleasures of its pursuit are well worth spending a lifetime on. Most Americans seem to believe this.

یہ مجبوری بھی کیسی عجیب ہے کہ آدمی خوشی کو تلاش کرنے پر مجبور ہو مگر وہ خوشی کو کبھی پا نہ سکے۔

۳۰ نومبر کو صغیر اسلم صاحب کے گھر والے نہیں تھے۔ دوپہر کو انھوں نے خود کھانے کا انتظام کیا۔ جدید طرز کے باورچی خانہ میں کھانے کی میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ انھوں نے فریج سے سالن نکال کر اس کو پلیٹ میں رکھا اور اس کو گرم کرنے کے لئے مائکرو ویو اوون (microwave Oven) کے خانہ میں ڈال کر بند کر دیا۔ اس کے بعد ۶۰ سکنڈ پر ایڈجسٹ کرکے اس کا سوئچ دبا دیا۔ اب اوون کے اوپر روشن حروف میں الٹا شمار (count down) ہونے لگا۔ ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، اس طرح ایک ایک سکنڈ گھٹتا رہا۔ یہاں تک کہ زیرو پر پہنچ کر خاص آواز میں ایک سیٹی بجی اور پھر وہاں روشن حروف میں ختم (end) لکھ اٹھا۔

میں نے کہا کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انتہائی قطعیت کے ساتھ دنیا کی عمر مقرر کرکے اس کا سوئچ دبا دیا ہے۔ اب ہر لمحہ اس کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے۔ جیسے ہی یہ کاونٹ ڈاؤن اپنی آخری گنتی پر پہنچے گا فوراً صور کا خدائی بگل بج جائے گا۔ یہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کا اعلان ہوگا۔ اس کے بعد آخرت کی دنیا شروع ہوگی۔ اور پھر خدا کے وفادار بندے کامیاب قرار دئے جائیں گے اور جن لوگوں نے سرکشی کی وہ ناکامیوں کے غار میں دھکیل دئے جائیں گے تاکہ ابد تک اس میں حسرت و الم کے ساتھ پڑے رہیں۔

صغیر اسلم صاحب (پیدائش ۱۹۵۱) اس بات کی مثال ہیں کہ ایک شخص اپنے کردار سے اغیار کی نظر میں بھی کتنا زیادہ قابل قدر بن سکتا ہے۔ یہاں میں نے صغیر اسلم صاحب کی ایک فائل دیکھی۔ اس سے ایک بڑی سبق آموز بات معلوم ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں۔

امریکہ میں کپڑے کی ایک بہت بڑی ریٹیل کمپنی ہے۔ اس کے بہت سے اسٹور ہیں۔ اس کا نام مروین (Mervyn) ہے۔ اس کو ملک میں پھیلے ہوئے اپنے اسٹوروں کو کپڑا فراہم کرنے کے لئے بڑے پیمانہ

پر کپڑے کی خریداری کرنی پڑتی ہے۔ یہ خریداری امریکہ کے علاوہ بہت سے باہر کے ملکوں سے بھی ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے اس کمپنی کو ایک بائر (Fabric Buyer) درکار تھا۔ مروین نے لائق آدمی کی تلاش کے لئے جیک ایچ لین کے ایک بڑے کنسلٹنٹ (Jack H. Lane Agency) کو بائر کیا۔

اس کمپنی نے ملک بھر میں تحقیق کرکے معلوم کیا کہ کون شخص ہے جو اس کام کے لئے موزوں ہے۔ اس کو معلوم ہوا کہ صغیر اسلم صاحب اس کام کے لئے موزوں ترین آدمی ہیں۔ اس کے بعد اس نے ان کمپنیوں کے پتے معلوم کئے جن سے صغیر اسلم کا اپنے کپڑے کی بزنس کے سلسلہ میں بار بار سابقہ پیش آتا ہے۔ جیک لین نے ان کمپنیوں سے ربط قائم کرکے ان کی رائے صغیر اسلم صاحب کے بارہ میں معلوم کی۔ ان کے جوابات کی فوٹو کاپی صغیر اسلم صاحب کو بھیجتے ہوئے جیک لین نے صغیر اسلم صاحب کو یہ پیش کش کی کہ وہ مروین کمپنی کے اس عہدہ کو قبول کرلیں۔ امریکی تاجروں نے صغیر اسلم صاحب کے بارہ میں جو رائیں دیں، ان میں سے چودہ رایوں کو میں نے پڑھا۔ چند خطوط کے بعض الفاظ یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

1. One of the most astute buyers. Integrity without question. Works hard and intelligently. Far above average. Well organized. World recommend him 101%.
2. Aslam is the Number one buyer in the country.
3. He is knowledgeable, well informed and most important – uncorruptible.
4. He is fair and honest. He gets the last drop of blood for his company.
5. If he says something, you can believe him.
6. Never in my experience in the agency business have I had references that were as outstanding as the ones I received on you.

آخری ریمارک جیک لین کا ہے جس نے مختلف لوگوں سے رائیں طلب کی تھیں ـــــ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شخص اگر لیاقت کا ثبوت دے تو وہ کس طرح ہر ملک اور ہر قوم میں اپنے لئے اعلیٰ مقام حاصل کرسکتا ہے۔ لائق آدمی کے لئے اس دنیا میں کوئی بھی دروازہ بند نہیں۔

نومبر کے آخری دو جمعہ کی نمازیں اسلامک سوسائٹی آرنج کاونٹی کی مسجد میں پڑھیں۔ میں وہاں پہنچا

تو لوگ منتشر نظر آرہے تھے۔ اذان ہوتے ہی تمام لوگ باقاعدہ صف کی صورت میں جمع ہوگئے۔ اس طرح صف بندی کے ساتھ انھوں نے سنتیں پڑھیں۔ خطبہ کے بعد جب جماعت کھڑی ہوئی تو ہر آدمی اپنی اپنی جگہ کھڑا ہوگیا اور کسی انتشار کے بغیر اپنے آپ صفیں قائم ہوگئیں۔ صف بندی کا یہ طریقہ مجھے پسند آیا۔

دونوں جمعہ میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی صاحب (پیدائش ۱۹۴۳) نے انگریزی میں خطبہ دیا۔ یہاں جمعہ کی امامت انھیں سے متعلق ہے۔ مزاج اور علمی لیاقت دونوں اعتبار سے وہ اس عہدہ کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ پہلے خطبہ میں انھوں نے آخرت کی جواب دہی کے موضوع پر تقریر کی۔ دوسرے جمعہ کے خطبہ میں ان کی تقریر کا موضوع توحید تھا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان کے نزدیک سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز صرف اللہ ہے:

The ultimate concern of a Muslim is Allah.

صفی قریشی صاحب نہایت ذہین اور اسی کے ساتھ نہایت سنجیدہ آدمی ہیں۔ ان سے گفتگو کرنا میرے جیسے آدمی کے لئے ایک نہایت خوش گوار تجربہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ نہ زیادہ بولتے اور نہ غیر ضروری بات کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو ہمیشہ منطقی حدود کی پابند ہوتی ہے۔ اور ایسے آدمی ہمیشہ بہت کم پائے جاتے ہیں۔

صفی قریشی صاحب نے ایک ملاقات میں ایک انگریزی کتاب کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس کتاب کو پڑھ کر بہت متاثر ہوا، اور اس کتاب کے کئی نسخے خرید کر میں نے مختلف لوگوں کو بطور تحفہ دیا:

Islam and the Destiny of Man, by Gai Eaton George Allen & Unwin, London 1985, pp-242

میں نے اس کتاب سے دلچسپی ظاہر کی تو انھوں نے اس کا ایک نسخہ مجھے بھی دیا۔ گائی ایٹن ایک انگریز ہیں۔ وہ برٹش ڈپلومیٹک سروس میں تھے۔ اس سلسلہ میں وہ دوسرے ملکوں کے علاوہ مصر اور ہندستان میں بھی رہے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Eliot) کی فرمائش پر انھوں نے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کا موضوع یہ تھا:

Eastern religions and their influence upon Western Thinkers.

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران وہ اسلام سے متاثر ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۱ میں انھوں نے مصر میں اسلام قبول کر لیا۔

اس کتاب کو میں نے دیکھا۔ میں اس کے تمام مندرجات سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ تاہم کتاب میں ایک نیا پن ہے اور وہ قابل مطالعہ ہے۔ مصنف کے نزدیک، اسلام کا خلاصہ دو چیزیں ہیں: حق اور رحمت (Truth and Mercy) تقوی کی تشریح انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے:

...the awe-struck consciousness of God as the supreme Reality (p. 202)

۲ دسمبر کی صبح کو ایک صاحب کے یہاں ناشتہ پر کئی آدمی جمع تھے۔ ایک صاحب نے خلیج کے مسئلہ کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ اس مسئلہ میں میری وہی رائے ہے جو عام طور پر علماء کی رائے ہے۔ علماء کی رائے نہایت تفصیل کے ساتھ آچکی ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ تذکیری باتوں پر گفتگو کریں جن کے بارہ میں بہت کم گفتگو کی جاتی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ ابھی ہم لوگوں نے ایک کھانا ختم کیا ہے۔ کھانے کے بعد کے لئے ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ الحمد للہ الذی اطعمنی وسقانی وجعلنی من المسلمین (اس اللہ کا شکر اور تعریف ہے جس نے مجھے کھانا کھلایا اور جس نے مجھے پانی پلایا اور جس نے مجھے مسلمانوں میں سے بنایا)

اس دعا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اس کے الفاظ کو یاد کر لے اور کھانے کے بعد اسے اپنی زبان سے دہرا دے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعا اپنے مفہوم کے اعتبار سے مطلوب ہے نہ کہ محض اپنے الفاظ کے اعتبار سے۔ آپ اگر کسی سے کہیں کہ میرا فلاں ٹیلی فون نمبر ہے، تم اس نمبر پر مجھے کال کر لینا، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ اس گنتی کو یاد کر کے اسے اپنی زبان سے دہراتا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ٹیلی فون کے اوپر اس نمبر کو ڈائل کر کے آپ سے ربط قائم کرے۔

یہی دعا کا معاملہ ہے۔ آپ کو چاہئے کہ جب آپ دعا کے یہ الفاظ پڑھیں تو آپ کا ذہن

ان کے معانی کی طرف چلا جائے۔ آپ سوچیں کہ خدا نے کس طرح وہ کھانا اور پانی بنایا جو میری بھوک اور پیاس کو مٹائے اور میری زندگی کی طاقت بنے۔ جب آپ اس طرح سوچیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عظیم تخلیق کا معاملہ ہے۔ خدا نے کائناتی انتظام کے تحت نان فوڈ کو فوڈ میں کنورٹ کیا، اس نے نان واٹر کو واٹر میں کنورٹ کیا، اس کے بعد یہ ممکن ہوا کہ آپ اس کو کھائیں اور پئیں اور وہ آپ کے جسم میں داخل ہو کر آپ کا گوشت اور خون بنے۔

اسی طرح خدا نے آپ کو یہ توفیق دی کہ آپ اپنے نان اسلام کو اسلام میں کنورٹ کریں، اس کے بعد ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ آپ کے اندر ایک اسلامی شخصیت ایمرج کرے۔ ان عظیم انعامات کا احساس جب لفظوں میں ڈھلتا ہے تو وہ مذکورہ کلمہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

لاس اینجلیز میں افرو امریکی مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے۔ اس کا نام مسجد السلام ہے۔ اس کی طرف سے لاس اینجلیز میں ۲۳ - ۲۵ نومبر ۱۹۹۰ کو بڑے پیمانے پر ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کی تھیم یہ تھی ـــــ مسلم خاندان کس طرح بنایا جائے :

The making of a Muslim family

اس کانفرنس کے شرکاء میں امریکہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ممتاز افراد کے نام بھی شامل تھے۔ مثلاً امام وارث دین محمد، پرنس محمد بن فیصل، دکتور جمال بدوی، وغیرہ۔ میں بھی اس کانفرنس میں مدعو تھا۔ اس سلسلہ میں دو دن (۲۴ - ۲۵ نومبر) لاس اینجلیز میں قیام رہا۔ قیام کا انتظام اور کانفرنس کا اجلاس دونوں کا نظم یہاں کے مشہور ہوٹل اسٹوفرس (Stouffers Hotel) میں کیا گیا تھا۔

اپنے کمرہ نمبر ۳۶۴ میں ایک روز میں نے خبریں سننے کے لئے ٹی وی کھولا۔ ایک خبر صدر بش کی خلیج سے واپسی کی تھی۔ مسٹر بش اور مسز بش ہوائی جہاز سے ہنستے ہوئے اترے تو ان کے ساتھ ایک کتا بھی اترا جو ان کے پیچھے چلنے لگا۔ مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آئی جس میں بتایا گیا ہے کہ انسان تجارت اور لہو میں مشغول رہتا ہے، اور خدا کی یاد کو چھوڑ دیتا

ہے (الجمعہ) آج کا انسان اس کا مکمل مصداق ہے۔ آج کے انسان کی دلچسپی کی چیز صرف دو ہے۔ مفاد یا تفریح۔ اصل یہ ہے کہ انسان اپنے خالق اور مالک کی یاد میں مشغول ہو، مگر اس اصل مشغولیت کے لئے کسی کے پاس کوئی وقت نہیں۔

پروگرام کے مطابق ۲۵ نومبر کی شام کو میری تقریر ہوئی۔ میں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ امریکہ کی مسلم نسلوں کے لئے تہذیبی ارتداد (cultural conversion) کا مسئلہ درپیش ہے۔ ترکی اور ہندستان اور روس میں بھی یہی مسئلہ پیدا ہوا، لیکن وہاں عملاً ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ملکوں میں یہ مسئلہ جارحانہ چیلنج کی صورت میں پیش آیا۔ اور جب کسی کو جارحانہ انداز میں چیلنج کیا جائے تو اس کے اندر مدافعانہ جذبات جاگ اٹھتے ہیں جو اس کی حفاظت کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ امریکہ میں یہ مسئلہ اس لئے شدید ہے کہ یہاں کا چیلنج جارحانہ چیلنج نہیں۔ جارحانہ چیلنج بظاہر ایک تکلیف کی چیز ہے۔ مگر وہ زحمت میں رحمت (blessing in disguise) ہے۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا حل وہی ہے جس کا مشورہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اسی قسم کی صورت حال میں بنی اسرائیل کو دیا گیا تھا: اجعلوا بیوتکم قبلۃ واقیموا الصلوٰۃ۔ یعنی اپنے گھروں کو دینی مرکز بنالو، جو کچھ ملکی سطح پر حاصل نہیں ہے، اس کو اپنے گھر کی سطح پر حاصل کرو۔ میں نے کہا کہ اس خداوندی تدبیر کا فائدہ آپ کو صرف اس وقت مل سکتا ہے جب کہ آپ اپنا زیادہ وقت اپنے گھر اور اپنے بچوں کو دیں۔ امریکہ کے مسلم والدین عام طور پر اپنے بچوں کو ضروری وقت نہیں دے پاتے، اس لئے ان کے بچے یہاں کے کلچر میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو اپنی آوٹنگ بس کمی کرنا ہوگا۔ اور اگر آپ دو شفٹ میں کام کرتے ہوں تو ایک شفٹ میں کام کرنا ہوگا تاکہ آپ اپنی اگلی نسلوں کو بچا سکیں۔

اس وقت امریکہ کی عام صورت حال یہ ہے کہ ماں باپ اپنا زیادہ وقت گھر کے باہر گزارتے ہیں۔ وہ کام میں مصروف ہوتے ہیں یا تفریح میں۔ بچوں کے لئے ان کے پاس وقت نہیں۔ اس سلسلہ میں جو اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکی ماں باپ اپنے بچوں کے

لئے جو وقت دے پاتا ہے وہ ۲۴ گھنٹہ میں صرف سات منٹ ہوتا ہے۔ اور امریکی ماں جو وقت دیتی ہے وہ ۲۴ گھنٹے میں صرف تیس منٹ۔ بچے بڑے ہونے کے بعد خود بھی اپنا وقت باہر گزارنے لگتے ہیں اور چھوٹے بچے گھر میں ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں، کیوں کہ ایک امریکی کے الفاظ میں، ٹی وی ان کے لئے کبھی اتنا زیادہ مصروف نہیں ہوتا:

Because the T.V. is never too busy for them.

بچوں کی تربیت کا فطری طریقہ یہ ہے کہ گھر کے اندر اس کا نظام موجود ہو۔ لیکن گھر کے اندر چوں کہ یہاں اس کا نظام موجود نہیں، اس لئے تجارتی لوگ اس کے نام پر ادارے قائم کر رہے ہیں۔ امریکہ کے ایک میگزین میں ایک اشتہار تھا۔ یہ یوٹا (Utah) کا ایک تربیتی ادارہ ہے۔ اس کا نام ہیریٹج اسکول (The Heritage School) ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــ پریشان بچوں کی مدد کرو (Help for troubled teens) اس اسکول کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خاندانی زندگی کا ہنر (family living skills) سکھاتا ہے۔

مذاہب کی انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس) تقریباً ۶۰ سال پہلے تیار کی گئی تھی۔ وہ اگرچہ کافی مستند ہے۔ مگر اب وہ قدیم ہو چکی تھی، نیز بہت باریک لیٹر میں ہونے کی وجہ سے اس کو پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ اب مذاہب پر ایک نئی اور ہر لحاظ سے بہتر انسائیکلو پیڈیا تیار ہو گئی ہے:

The Encyclopadia of Religion, edited by Mircea Eliade Macmillan publishing company, New York, 1987, 16 volumes.

یہ انسائیکلو پیڈیا یہاں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مذاہب کے میدان میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے نہایت مفید ہے۔

• ۲۷ نومبر کو بعد دوپہر میں اپنی قیام گاہ (ویسٹ منسٹر، کیلی فورنیا) سے ٹہلنے کے لئے باہر نکلا۔ قیام گاہ اس وقت خالی تھی۔ کیوں کہ عورت اور مرد اپنے کام پر گئے ہوئے تھے اور بچے اسکول میں تھے۔ خالی سڑک سے تنہا گزرتے ہوئے میں ایک پارک (فارسٹ ایوینو) پہنچا۔ وسیع پارک میں کچھ بڑے اور کچھ بچے دکھائی دئے۔ یہاں کوئی انسانی آواز سننے کے لئے موجود

تھی۔ دور سے کسی مکان سے کتا بھونکنے کی آواز آرہی تھی اور بھی کوئی کار قریبی سڑک سے گذر جاتی تھی۔

پارک نہایت خوبصورت تھا۔ ہندستان کے پارکوں سے وہ اتنا ہی مختلف تھا جتنا خود امریکہ ہندستان سے۔ اس کو دیکھ کر مجھے وہ خوب صورت ترپارک یاد آیا جو پچھلے میں نے ٹی وی میں دیکھا تھا۔ صدر امریکہ مسٹر جارج بش یہاں کا خصوصی تیوہار تھینکس گونگ (Thanksgiving) اپنے فوجیوں کے ساتھ منانے کے لئے خلیج عرب گئے تھے۔ واپسی میں ان کا خصوصی جہاز واشنگٹن میں اترا۔ جہاز سے نکل کر وہ ایک نہایت خوب صورت پارک سے خراماں خراماں چلتے ہوئے ایک شاندار مکان میں داخل ہو گئے۔

ٹی وی پر یہ منظر دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ موت کا فرشتہ اسی طرح ایک روز آدمی کے پاس آئے گا۔ اس کے ساتھ ایک سواری ہو گی۔ وہ آدمی کو سواری پر بٹھا کر دنیا سے آخرت کی طرف روانہ ہوگا۔ عالم آخرت میں یہ سواری یا تو ایک سرسبز پارک کے کنارے اترے گی، آدمی سواری سے نکلے گا اور خوشی خوشی اس پارک سے گذرتا ہوا اپنے جنتی مکان میں داخل ہو جائے گا۔ یا پھر اس کی سواری ایک خشک بیابان میں اترے گی، وہ سواری سے باہر آئے گا تو وہ پائے گا کہ وہاں اندھیروں اور خاردار وادیوں کے سوا کوئی اور چیز اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود نہیں۔

اس وقت آسمان مکمل طور پر صاف تھا۔ سورج کی سنہری روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ پارک کے چاروں طرف سرسبز درختوں سے ڈھکے ہوئے خوبصورت مکانات دل کش منظر پیش کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ دنیا بے حقیقت ہونے کے باوجود اتنی زیادہ حسین ہے کہ خدا کی خاص توفیق ہی سے کوئی شخص اس کے مسحور کن فتنہ سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس وقت مجھے بے ساختہ فانی بدایونی کا یہ شعر یاد آگیا:

فریب جلوہ اور کتنا مکمل اے معاذ اللہ — بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھا پایا

اس کے بعد میں تقریباً روزانہ پارک میں جانے لگا۔ یہاں مختلف قسم کے سبق آموز تجربے ہوئے۔ ۲۸ نومبر کی سہ پہر کو میں ایک پارک میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک حصہ میں بچوں کے کھیل

کا سامان لگا ہوا ہے۔ ایک سفید فام بچہ (تقریباً تین سال کا) آیا اور ایک جھولے پر چڑھ گیا۔ یہ جھولا ایسا تھا جس کو ہلانے کے لئے کوئی دوسرا آدمی درکار تھا۔ بچہ نے مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ کہا۔ ابتداءً میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے کئی بار کہا تو میری سمجھ میں آیا کہ وہ کہہ رہا ہے — چچا، مجھے دھکا دو :

Uncle, push me.

میں اس کے قریب گیا اور اس کو جھولا جھلانے لگا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد اس نے میرا نام پوچھا۔ اس نے کچھ اور کہا جو لہجہ کے فرق کی وجہ سے میری سمجھ میں نہ آسکا۔

پارک میں جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، میرے ہاتھ میں امریکہ کے ایک منتخب میگزین سن سٹ (Sunset) کا شمارہ دسمبر ۱۹۹۰ تھا۔ اس کے ٹائٹل پر لکھا ہوا تھا — مغربی طرز زندگی کا میگزین :

The magazine of Western living

۱۹۰ صفحہ کے اس انگریزی میگزین کا بیشتر حصہ اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا چار صفحہ (۵۴-۵۷) بگڑے ہوئے بچوں کے اسکول (Schools for troubled teens) کے بارہ میں تھا۔ ان صفحات میں تقریباً چار درجن ایسے اسکولوں کے اشتہارات درج تھے۔ اس وقت امریکی خاندانوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ والدین کے پاس اپنے بچوں کی تربیت اور نگہداشت کے لئے کوئی وقت نہیں۔ ان کا بیشتر وقت یا تو دفتروں میں گزرتا ہے یا اگر چھٹی ہو تو "آوٹنگ" میں۔ چنانچہ بچے خودرو پودے کی طرح اگ رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بچوں کی پوری نسل خراب ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ اسکول ان بچوں کی پروفیشنل رہنمائی (professional guidance) کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ایک اشتہار کا مضمون یہاں نقل کیا جاتا ہے :

We Rescue Teenagers: The most effective option for parents who need help with teens who are – out of control, irresponsible, depressed, during and alcohol dependent, failing school, irresponsible, depressed, drug and alcohol dependent, failing school, running with the wrong friends, unmotivated, undisciplined and who lack real self-esteem.

اس قسم کے اشتہارات پڑھتے ہوئے مجھے مذکورہ سفید فام امریکی بچے کے الفاظ Uncle, push me یاد آئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا بچہ کے ان الفاظ میں نئی امریکی نسل کی روح پکار رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ میں دلدل میں پھنس گیا ہوں ، مجھے دھکا دے کر یہاں سے نکالو۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے اس سنگین مسئلہ کا حل پروفیشنل اسکول نہیں ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ امریکہ کے معاشرہ کو دوبارہ یہاں لایا جائے کہ اس کا طرز فکر بدلے۔ والدین دوبارہ بچوں کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ بچوں کی تربیت کا حقیقی کام صرف گھر کے اندر ہو سکتا ہے۔ وہ پروفیشنل اسکولوں میں کبھی انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ خاتون اسلام جلد ہی انگریزی میں شائع کی جائے گی۔ ایک روز میں پارک میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک سفید فام امریکی بنچ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے پاس جا کر میں نے کہا کہ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔ اس نے خوش دلی کے ساتھ میرے لئے جگہ خالی کر دی۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ ابتدائی رسمی باتوں کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ اسلام کے بارہ میں کچھ جانتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں اسلام کے بارہ میں بہت کم جانتا ہوں۔ شاید یہ کوئی مخالف امریکہ نظریہ ہے :

I have little knowledge of Islam.
Perhaps it is a form of anti-Americanism.

میں نے کہا کہ اسلام اینٹی امریکی نظریہ نہیں ، اسلام تو پرو امریکی نظریہ ہے۔ میری زبان سے یہ جملہ سن کر وہ چونک پڑا۔ اس کے دریافت کرنے پر میں نے مزید بتایا کہ اسلام کی بنیاد کسی قوم کی دشمنی یا کسی حکومت کی مخالفت پر نہیں۔ اسلام تو یہ ہے کہ ہر آدمی کو اس کے خالق سے متعارف کرے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ ہر آدمی کو اپنی زندگی میں اس خدائی طریقہ کو اختیار کرنے کی تلقین کرے جو اس کو ابدی جنت میں لے جانے والا ہے۔ اسلام آپ کا دشمن نہیں ، اسلام آپ کا دوست اور خیر خواہ ہے۔ اگر آپ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں تو آپ پائیں گے کہ اسلام اینٹی امریکن ازم کا نام نہیں ، اسلام پرو امریکن ازم کا نام ہے۔ کیونکہ وہ آپ کو جنت میں لے جانا چاہتا ہے۔ (باقی)

۱ ٹائمس آف انڈیا کے تحت آنکھ کا ادارہ (ٹائمس آئی ریسرچ فاؤنڈیشن) قائم ہے۔ اس کا ایک انگریزی نیوز لیٹر چھپتا ہے جس کا نام (Nigah) ہے۔ اس کے شمارہ جنوری ۱۹۹۱ میں الرسالہ انگریزی کا ایک مضمون نقل کیا گیا ہے۔ اس کو اس کے صفحہ ۸ - ۱۰ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مختلف عمومی قسم کے پرچے الرسالہ کے مضامین نقل کرتے رہتے ہیں۔

۲ خواجہ کلیم الدین صاحب نیو یارک میں مقیم ہیں۔ انھوں نے خط اور ٹیلیفون کے ذریعہ مطلع کیا ہے کہ وہاں وہ انگریزی الرسالہ اور انگریزی لٹریچر پھیلانے میں مصروف ہیں۔ خدا کے فضل سے لوگ کافی پسند کر رہے ہیں۔ لوگ کتابیں حاصل کرکے دعوتی طور پر ان کو امریکیوں تک پہنچا رہے ہیں۔ خواجہ کلیم الدین صاحب کا خیال ہے کہ جلد ہی وہ ان شاء اللہ الرسالہ انگریزی کا امریکی اڈیشن نیو یارک سے چھاپنا شروع کر دیں گے۔

۳ ولی محمد انصاری صاحب نے جناب ہاشمی صاحب کے تعاون سے گاڈ ارائزز کا مراٹھی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اب اس کی چھپائی کا مرحلہ ہے۔ ان کا منصوبہ ہے کہ کتاب کے اس مراٹھی اڈیشن کو "نہ فائدہ نہ نقصان" کے اصول پر شائع کیا جائے۔ اب ان کے سامنے کتاب کی چھپائی کا مسئلہ ہے۔ اور اس کے لئے ضروری فنڈ درکار ہے۔ اس سلسلہ میں جو صاحبان تعاون کرنا چاہیں، وہ حسب ذیل پتہ پر خط وکتابت فرمائیں :

Wali Muhammad Ansari, Jawhari Manzil, Maulvigunj, Dhulia 424 001

۴ مارچ ۱۹۹۱ کو آل انڈیا ریڈیو سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ تقریر کا موضوع تھا : رمضان کی برکتیں۔ اس تقریر میں سادہ اور مختصر انداز میں رمضان کے مہینہ کی خیر و برکت کو بتایا گیا۔

۵ بنگلور کے حلقہ الرسالہ نے مقامی دکانداروں کو تیار کیا ہے۔ وہ مرکز کی چھوٹی کتابیں

اپنے یہاں رکھتے ہیں اور ان کو اپنے خریداروں کو بطور تحفہ پیش کرتے ہیں۔ یہ طریقہ دوسرے مقامات پر بھی اختیار کرنا چاہئے۔

۶ ۲۰۰ حدیثوں پر مشتمل احادیث کا ایک منتخب مجموعہ تیار کیا گیا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ کمانڈر یوسف خاں صاحب نے کیا ہے۔ یہ مجموعہ انشاء اللہ اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع کیا جائے گا۔

۷ بعض مقامات پر لوگ اس طریقہ کا تجربہ کر رہے ہیں کہ وہ اتوار کی صبح کو بریف کیس میں مرکز کی کتابیں لے کر لوگوں کے گھروں پر جاتے ہیں اور ان کو کتابیں دکھاتے ہیں۔ اس طرح کتابیں نئے نئے حلقوں میں پھیل رہی ہیں۔ یہ طریقہ ہر جگہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

۸ "انقلاب" بمبئی کا کثیر الاشاعت روزنامہ ہے۔ جناب محمد افضل لادی والا نے اس کے بہت سے شمارے بھیجے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ انقلاب میں ہر روز الرسالہ کا ایک مضمون نمایاں طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعہ سے الرسالہ کا پیغام وسیع تر حلقوں میں پہنچ رہا ہے۔ ادارہ انقلاب کا یہ تعاون قابل ستائش ہے۔

۹ ایک خاص حلقہ کے کچھ "اصاغر" صدر اسلامی مرکز کے خلاف تنقیدی مضامین اور کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ یہ لوگ یہ تاثر دے رہے ہیں کہ اس مہم میں انھیں اپنے "اکابر" کی تائید وحمایت حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں صدر اسلامی مرکز نے بعض استفسارات کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ تنقیدیں موجودہ حالت میں قابل اعراض ہیں۔ تاہم یہ ناقدین اگر اپنے دعوے میں صحیح ہیں تو وہ اپنے حلقہ کے بزرگ محترم کی تصدیق اپنے حق میں شائع کریں۔ اگر مولانا محترم نے ان تنقیدوں کی واضح تصدیق کر دی تو انشاء اللہ ان کا تجزیہ کیا جائے گا۔ بصورت دیگر ان کو نظر انداز کیا جائے گا۔

۱۰ ایک صاحب لکھتے ہیں : خالق کائنات کا عظیم احسان ہے کہ آپ کی تحریروں کے ذریعہ اسلام کا صحیح اور بغیر آمیزش تصور ملا۔ الرسالہ پڑھنے سے زبان پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ اور دل کھل جاتے ہیں۔ دل آخرت آخرت کہتا ہے اور زبان دوسروں کے لئے سلامتی سلامتی۔

الرسالہ اور آپ کی کتابوں نے مجھے شک وشبہات کے اندھیرے غار سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ مجھے آپ کی یہ لائن یاد ہے کہ ہمیں پروگرام نہیں بننا ہے بلکہ پروگرام ساز افراد بنانا ہے۔ مجھے یہ لکھنے میں جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ آپ کی تحریروں کو سمجھنے کے لئے انٹلکچول برین ہونا چاہئے۔ (الطاف حسین انجنیئر، کشمیر)

۱۱ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں الرسالہ کا تین سال سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ اللہ پاک کے کرم سے اس مشن کے ذریعہ میری زندگی خاص انداز میں ڈھل گئی۔ اعراض کے معاملہ میں وہ کچھ پایا جس کی امید نہ تھی کیوں کہ اعراض کا معاملہ پہلے سے معلوم نہ تھا۔ جو لوگ حقیقی طور پر اس خدائی پیغام کو قبول کرتے ہیں ان کی زندگی دنیاوی خوف وخطرسے خالی ہو جاتی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھ سے کشمیر میں اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ الرسالہ کے مطالعہ سے روز بروز میرے اندر صبر و اعراض کی قوت بڑھ رہی ہے۔ یہ تو ایک دنیاوی طور پر فائدہ مند ثابت ہوا اور دوسرے ایمان اور یقین کے بقا کے لئے نہایت اہم ہے (حاجی رفیق احمد، کشمیر)

۱۲ "اقوال حکمت" کا ہندی اور انگریزی ترجمہ ہوگیا ہے۔ اس وقت وہ زیر طباعت ہے۔

۱۳ الرسالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص اس کا قاری بنتا ہے اس کے اندر یہ جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس کو پھیلائے۔ ہزاروں لوگ اس طرح الرسالہ کو خود پڑھتے ہیں اور دوسروں کو بھی پڑھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بی امان اللہ صاحب (بنگلور) الرسالہ کے پیغام سے متاثر ہوئے تو انھوں نے اپنے حلقہ میں تقریباً تین درجن لوگوں کو الرسالہ کا خریدار بنایا۔ اس میں انگریزی ریڈر اور اردو ریڈر دونوں شامل ہیں۔

۱۴ عبد اللہ حسن چودھری صاحب (احمد نگر) لکھتے ہیں: اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ کے مضامین نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہی علاقوں میں بھی ذہنوں کو اپیل کر رہے ہیں۔ اور ایک نئی ذہنی اور اخلاقی بیداری میں معاون بن رہے ہیں۔ ایک تازہ مثال یہ ہے کہ رمضان کے اوقات سحر و افطار کا ایک ہزار پمفلٹ ہمارے ادارہ کی جانب سے چھپوایا گیا۔ اس میں "اسلامی تعلیمات" سے اقتباس ہندی زبان میں شائع کیا گیا ہے۔ آپ کی تحریر کو اتنا پسند کیا گیا کہ دوسرے اداروں اور اشخاص نے بھی اپنی طرف سے جو سحر و افطار کے پمفلٹ چھپوائے، انھوں نے بھی اس میں یہی تحریر چھپوائی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	۶۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ 〃 〃	۱۸ 〃 〃
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ 〃 〃	۲۵ 〃 〃
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ 〃 〃	۴۰ 〃 〃
خصوصی تعاون (سالانہ)	۲۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ 〃	— —

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

AL-RISALA (Urdu) Monthly

The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India

Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSH IN ATT IC

Fax: 91-11-353318, 3312601

Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

ایک سنّت

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے۔ مفسرین نے اس واقعہ کو معوذتین کی تشریح کے تحت تفسیر کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ میں ایک شخص لبید بن اعصم نام کا تھا۔ وہ اپنے زمانہ کا ایک ماہر جادوگر تھا۔ ۷ھ میں خیبر کے کچھ یہودیوں نے اس آدمی کو تین سنہری سکے دے کر اس پر راضی کیا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی طاقت ور جادو کرے۔ اس شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال اور آپ کی کنگھی کے کچھ دندانے حاصل کیے۔ اس پر اس نے جادو کا عمل کیا اور اس کو ایک نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں لپیٹ کر بنو زُریق کے کنویں کی تہ میں رکھ دیا۔ اس کنویں کا نام ذروان تھا۔ یہ سارا معاملہ اس نے نہایت راز داری کے ساتھ کیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اوپر چند دن تک اس جادو کے کچھ اثرات رہے۔ آپ کو اس سے شدید تکلیف بھی محسوس ہوئی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ اس کے بعد فرشتہ نے آکر آپ کو پورے معاملہ کی خبر کر دی۔ آپ نے مذکورہ کنویں میں سے جادو کا سامان نکلوایا اور اس کو ضائع کر دیا۔ اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعلیم کی کہ آپ قرآن کی دو سورہ (معوذتین) پڑھا کریں۔ اس سے آپ اس قسم کے تمام فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس فتنہ کا استیصال کرنے پر اکتفا فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے اس کا عمومی تذکرہ نہیں کیا۔ کیوں کہ اندیشہ تھا کہ اگر اس شرارت کو عام مسلمانوں نے جان لیا تو وہ لبید بن اعصم کے ساتھ نہایت برا معاملہ کریں گے۔ راوی کہتے ہیں:

فقلتُ افلا تنشّرتَ۔ فقال امّا اللہ فقد شفانی واکرہ ان اُثیر علیٰ احدٍ من الناسِ شرّاً (اخرجہ البخاری ورواہ مسلم واحمد بمثلہ)

میں نے کہا کہ آپ نے اس بات کا چرچا کیوں نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جہاں تک جادو کا تعلق ہے تو اللہ نے مجھے اس سے شفا دیدی اور میں اس کو ناپسند کرتا ہوں کہ لوگوں میں سے کسی شخص کے خلاف شر بھڑکاؤں۔

مومن کی دلچسپی مسئلہ کو ختم کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ مسئلہ پیدا کرنے والے شخص کو بدنام کرنے سے۔

امامت کا مسئلہ

ایک صاحب اپنی بستی کی مسجد کے امام کے خلاف زبردست مہم چلائے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ امام بدعتی ہے، اس لیے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ وہ صاحب اپنی تمام کوشش کے باوجود امام کو مسجد سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے بجائے جو ہوا وہ صرف یہ تھا کہ بستی کے مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے۔ بستی میں مسجد کی رحمتیں اور برکتیں تو نہیں پھیلیں، البتہ پوری بستی نفرت اور اختلاف اور تشدد کا اکھاڑا بن گئی۔ ایک مثبت عمل منفی نتیجہ پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔

ان صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ یہ مسئلہ کیوں کھڑا کیے ہوئے ہیں کہ امام کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ جب کہ حدیث میں آیا ہے کہ صلوا خلف کل بر وفاجر (ہر نیک اور بد کے پیچھے نماز پڑھو) میں نے کہا کہ امامت تنظیم کے لیے ہوتی ہے۔ ورنہ نماز کا تعلق آدمی کی اپنی نیت سے ہے۔ جیسی آپ کی نیت ہوگی ویسی آپ کی نماز ہوگی۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے اخلاص کو ٹٹولیں نہ کہ امام کی برائیوں کو۔

انھوں نے کہا کہ آپ عالم ہو کر غلط مسئلہ بتا رہے ہیں۔ جو حدیث آپ نے بتائی، اس میں فاجر کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت ہے، مگر بدعتی کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ کیونکہ بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ دوسری حدیث میں ہے کہ لا تصلوا خلف محدث (بدعتی شخص کے پیچھے نماز نہ پڑھو)

میں نے کہا کہ کسی حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف اس کے الفاظ جاننا کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ تفقہ بھی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسری روایت میں محدث (بدعتی) کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ انتخاب (choice) محدث اور متبع سنت کے درمیان ہو۔ مگر آپ کے حالات بتاتے ہیں کہ آپ کے لیے محدث اور متبع سنت کے درمیان انتخاب کا موقع نہ تھا، بلکہ آپ کو محدث امام اور مسلمانوں کے باہمی جدال وقتال کے درمیان انتخاب کرنا تھا۔ اور جب حالات کی نوعیت یہ ہو تو محدث امام کو برداشت کیا جائے گا تاکہ مسلمانوں کو باہمی اختلاف کے شدید تر فتنہ سے بچایا جا سکے۔

اسلام ایک نتیجہ رخی (result oriented) مذہب ہے۔ اسلام میں آخری حد تک نتیجہ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اسلام میں صرف وہی اقدام جائز ہے جو بہتر نتیجہ تک پہنچانے والا ہو۔ بہتر نتیجہ پیدا کرنے والا اقدام جتنا ضروری ہے، اتنا ہی ضروری یہ ہے کہ برا نتیجہ پیدا کرنے والے اقدام سے اپنے آپ کو باز رکھا جائے۔

انسان درکار ہیں

ستمبر ۱۹۸۹ کا واقعہ ہے۔ ایک بیرونی سفر کے دوران میری ملاقات کچھ عرب نوجوانوں سے ہوئی۔ مجلس میں الجزائر کے ایک نوجوان تھے۔ وہ پہلے اخوانی طرز فکر سے متاثر تھے۔ اس کے بعد انھوں نے راقم الحروف کی تحریریں پڑھیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ آپ کی باتوں سے مجھے اتفاق ہے۔ مگر میری سمجھ میں اب تک یہ نہ آسکا کہ آپ کا عملی پروگرام کیا ہے۔

مذکورہ نوجوان کی بات سن کر میں نے کہا: برنامجنا هو اعداد المبرمجين (ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہم پروگرام بنانے والے انسان تیار کریں) الرسالہ فروری ۱۹۹۰، صفحہ ۴۰

موجودہ زمانہ اسلام کے احیاء کا زمانہ ہے۔ آج ضرورت ہے کہ اسلام کو دوبارہ ایک زندہ اور غالب طاقت کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ اس احساس کے تحت موجودہ زمانہ میں سیکڑوں بڑے بڑے رہنما اٹھے۔ ہر ایک کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے ہر ایک کی کوششیں صفر ہو کر رہ گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے "عملی پروگرام" سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ مگر عملی پروگرام سے کام کا آغاز کرنا ایسا ہی ہے جیسے باغ لگانے کا آغاز پھل کاٹنے سے کیا جائے۔

اسلام کا احیاء ایک بے حد سنجیدہ اور بے حد دور رس کام ہے۔ یہ کام دھواں دھار جلسوں اور پُرشور اقدامات کے ذریعہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے سب سے پہلے افراد کار مطلوب ہیں۔ اس کے لیے ایسے باشعور افراد کی ضرورت ہے جو خود اپنی ذات میں پروگرام ساز ہوں۔ جو اپنے حالات کو سمجھ کر خود کام کا منصوبہ بنائیں۔ جب تک ایسے افراد تیار نہ ہو جائیں، عملی پروگرام یا عملی اقدام کی حیثیت بے فائدہ چھلانگ کے سوا اور کچھ نہیں۔

سطحی لوگ مظاہرہ کو کام سمجھتے ہیں۔ اس لیے جب بھی کوئی شخص مظاہراتی ہنگامے کرتا ہے تو لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ کام کر رہا ہے۔ حالانکہ اس قسم کا کام بے فائدہ اچھل کود ہے۔ اس کا کوئی حقیقی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ زندگی میں اصل اہمیت افراد کی ہوتی ہے۔ اس لیے اصل کام یہ ہے کہ افراد تیار کیے جائیں۔ اسلام کے احیاء کا کام اس سے زیادہ وسیع ہے کہ وہ کسی لگے بندھے پروگرام کے ذریعہ انجام پاسکے۔ اس کے لیے ایسے ذہن درکار ہیں جو خود اپنی ذات میں پروگرام ساز ہوں، جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ حالات کے مطابق خود صحیح فیصلہ لیں اور اس کو بروئے کار لانے کی تدبیر اختیار کریں۔

حسد اعتراف

حضرت یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں نے ابتدا میں یہ کیا کہ آپ کو کنویں میں ڈال دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کی۔ آپ کو نبوت عطا ہوئی اور آپ کو مصر کے اعلیٰ سیاسی عہدہ پر پہنچا دیا گیا۔ آپ کے بھائی پہلے اس معاملہ سے بے خبر تھے۔ مگر جب ان پر حقیقت کھلی تو وہ کہہ پڑے: تاللہ لقد آثرک اللہ علینا (خدا کی قسم، اللہ نے تم کو ہمارے اوپر فضیلت دے دی)۔ یوسف ۹۱

اس کے برعکس مثال بنی اسرائیل کی ہے۔ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دو بھائیوں کی اولاد تھے۔ ابتداءً زیادہ تر پیغمبر بنی اسرائیل میں آئے۔ مگر آخری پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بنی اسماعیل میں پیدا ہوئے۔ بنی اسرائیل آپ کے مخالف ہو گئے۔ انھوں نے آپ کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا (النساء ۵۴)

یہ دو مختلف مثالیں ہیں۔ پہلی مثال اعتراف کی مثال ہے اور دوسری مثال انکار اور حسد کی مثال۔ یہی اس دنیا میں سب سے بڑا امتحان ہے، اور یہ امتحان آغاز حیات سے لے کر قیامت تک جاری رہے گا، یہاں تک کہ خدا ظاہر ہو کر تمام حقیقتوں کا آخری اعلان کر دے، اور اس کے بعد کسی کے لیے انکار اور حسد کا موقع ہی باقی نہ رہے۔

یہ امتحان سب سے پہلے آدم کی پیدائش کے وقت ہوا جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اور ابلیس کو آدم کے آگے جھکنے کا حکم دیا۔ اس وقت فرشتوں نے اعتراف کا طریقہ اختیار کیا اور ابلیس نے حسد اور انکار کا۔ اس کے بعد یہی معاملہ آدم کے بیٹے ہابیل اور قابیل کی زندگی میں پیش آیا۔ ہابیل کی قربانی اللہ نے قبول کی اور قابیل کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ہابیل نے عجز اور اعتراف کا انداز اختیار کیا اور قابیل حسد اور انکار کا طریقہ اختیار کر کے خسران میں پڑ گیا (المائدہ ۳۰)

اس دنیا میں جو شخص بھی پیدا ہوتا ہے، ہر ایک کو اس امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ہر آدمی کے سامنے کسی نہ کسی اعتبار سے یہ صورت حال آتی ہے کہ اس کے لیے ایک روش اعتراف کی ہوتی ہے اور دوسری روش حسد اور انکار کی۔ جو لوگ اعتراف کا طریقہ اختیار کریں وہ امتحان میں پورے اترے۔ اور جو لوگ حسد اور انکار کا طریقہ اختیار کریں وہ امتحان میں ناکام ہو گئے۔ اعتراف نہ کرنا خدا کے فیصلہ پر راضی نہ ہونا ہے، اور اس سے بڑا مجرم کون ہے جو خدا کے فیصلہ پر راضی نہ ہو۔

دورِ اوّل کا طریقہ

قرآن میں حضرت مریم کے بارہ میں اُخت ہارون (مریم ۲۸) کا لفظ آیا ہے ۔ اس سلسلہ میں مختلف روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل کی گئی ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں :

قال کعب الاحبار بحضرۃ عائشۃ رضی اللہ عنھا۔ ان مریم لیست باخت ھارون، اخی موسیٰ ۔ فقالت لہ عائشۃ کذبت۔ فقال لھا یا ام المومنین، ان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قالہ فھو اصدق و اخبر۔ والا فانی اجد بینھما من المدۃ ستمائۃ سنۃ۔ قال فسکتت۔

حضرت کعب نے حضرت عائشہ کی موجودگی میں کہا کہ مریم ، موسیٰ کے بھائی ہارون کی بہن نہ تھیں۔ عائشہ نے ان سے فرمایا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ انھوں نے عائشہ سے کہا کہ اے ام المومنین ، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کہا ہو تو وہ سب سے زیادہ سچے اور سب سے زیادہ باخبر تھے ۔ ورنہ میں مریم اور ہارون کے درمیان چھ سو سال کا فرق پاتا ہوں ۔

(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۱/ ۱۰۰)

اس واقعہ پر غور کیجئے ۔ حضرت عائشہ ایک جلیل القدر صحابی پر تنقید کرتی ہیں اور تنقید میں نہایت سخت لفظ استعمال کرتی ہیں ۔ مگر صحابی نہ ان کی تنقید پر غصہ ہوتے اور نہ ان کے سخت لفظ پر انھیں ملامت کرتے ۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تاریخ کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں ۔ اب آپ اگر کسی زیادہ طاقت ور دلیل (مثلاً قول رسول) سے میری بات رد کر دیں تو میں اپنی رائے سے رجوع کر لوں گا ۔ حضرت عائشہ حضرت کعب کی بات کے وزن کو محسوس کرتی ہیں اور فوراً خاموش ہو جاتی ہیں (اس سلسلہ میں حضرت کعب کی تائید میں ایک قول رسول موجود ہے ۔ مگر اس وقت غالباً دونوں میں سے کسی کو اس کا علم نہ تھا)

اسلام کے دور اول میں تنقید کا عام رواج تھا ۔ لوگ سخت زبان میں تنقید کرتے تھے ، تب بھی اس کو برا نہیں مانا جاتا تھا ۔ اس زمانہ کا طریقہ یہ تھا کہ تنقید کو سن کر غصہ نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ دیکھتے تھے کہ کہنے والے نے کیا بات کہی ہے ، اور یہ کہ وہ بات صحیح ہے یا غلط ۔ اسی طریقہ میں دورِ اول کے لوگوں نے خیر کو پایا تھا ، اور موجودہ زمانہ کے لوگ بھی اسی طریقہ میں خیر کو پا سکتے ہیں ۔ اس کے سوا کوئی اور طریقہ خیر کو پانے کا نہیں ۔

فرضی خطرہ

قدیم مکہ میں ایک شخص تھا۔ اس کا نام روایات میں الحارث بن عثمان بن نوفل بن عبد مناف بتایا گیا ہے۔ اس کے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کی دعوت پیش کی تو اس نے کہا:

اِنّا لنعلم ان الذی تقولُ حقّ۔ ولکنّا ان اتّبعناکَ خِفنا ان تُخرجنا العربُ من ارض مکّۃ (التفسیر المظہری)	ہم جانتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ بلاشبہ حق ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے کہ عرب ہم کو مکہ کی سرزمین سے نکال دیں گے۔

اس کا جواب دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ اس ہدایت کا اتباع کریں تو ہم کو ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا (وقالوا ان نتّبع الھدیٰ معک نتخطّف من ارضنا (القصص ۵۷)

مکہ کے لوگوں کی سرداری اور معاش دونوں کا خاص ذریعہ یہ تھا کہ مکہ کے تمام قبیلوں کا بُت انھوں نے کعبہ میں رکھ دیا تھا۔ اس طرح انھیں تمام قبائل عرب کی سرداری حاصل ہو گئی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اپنے اپنے بتوں پر نذر چڑھانے کے لیے مکہ آتے تھے۔ یہ تمام نذرانے مکہ والوں کو ملتے تھے۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کیا تو ان کی فطرت نے اس کے برحق ہونے کی تصدیق کی۔ مگر ان کا ذہن اس سوال میں اٹک گیا کہ اگر وہ کہیں کہ خدا صرف ایک ہے۔ بقیہ تمام دیوتا فرضی ہیں تو وہ اچانک تمام قبائل سے کٹ جائیں گے۔ اس کے بعد ان کی سرداری بھی چھن جائے گی اور ان کی معاش بھی۔

ٹھیک یہی صورت موجودہ زمانہ میں ہندستانی مسلمانوں کی ہے۔ ان کے سامنے قرآن کی بات رکھی جائے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کے مطابق یہی صحیح بات ہے۔ مگر فوراً ہی کچھ سوالات سامنے آکر انھیں اس کی طرف سے شبہ میں ڈال دیتے ہیں —— اگر ہم صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو ہندو ہمارے اوپر دلیر ہو جائے گا۔ اگر ہم سیاسی شور وغل نہ کریں تو ملک میں ہونے والے سیاسی عمل سے ہم کٹ جائیں گے، اگر ہم مطالبہ اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ دیں تو ہم اپنے دستوری حقوق سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ وغیرہ

اس قسم کی تمام باتیں بلاشبہ شیطانی وسوسہ ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

دوگروہ

جنت خدا کے نیک بندوں کی رہائش گاہ ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کے دو بڑے طبقے ہوں گے۔ ایک، السابقون (سبقت کرنے والے) اور دوسرے، اصحاب الیمین (دائیں طرف والے) پہلے گروہ کے لیے آخرت میں شاہانہ انعامات ہیں، اور دوسرے گروہ کے لیے عام انعامات (الواقعہ، رکوع اول)

درجہ اول اور درجہ دوم میں، یہ فرق کس بنیاد پر ہوگا۔ قرآن کے مطابق، اس کی وجہ فتح (الحدید ۱۰) ہے۔ جو لوگ فتح سے پہلے کے دور میں حق کو مانیں اور اس کا ساتھ دیں وہ السابقون کا درجہ پائیں گے۔ اور جو لوگ فتح کے بعد کے دور میں حق کو قبول کریں اور اس کے ساتھی بنیں وہ اصحاب الیمین کے گروہ میں جگہ دیے جائیں گے۔ یہ محض زمانہ کا فرق نہیں بلکہ نوعیت کا فرق ہے۔ اور نوعیتِ ایمان کا یہی فرق دونوں گروہوں کے انجام میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔

حق جب ظاہر ہوتا ہے تو ابتداءً وہ مجرد صورت میں ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسی نظری حقیقت کی ہوتی ہے جس کی پشت پر دلائل کی طاقت کے سوا کوئی اور طاقت موجود نہ ہو۔ بعد کے زمانہ میں جب حق کی دعوت فتح وغلبہ کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے تو اس وقت حق کی حیثیت صرف عقلی صداقت کی نہیں ہوتی بلکہ اب اس کی حیثیت مرئی واقعہ کی بن جاتی ہے۔ اب ہر آنکھ والے کو وہ ایک ٹھوس واقعہ کی صورت میں دکھائی دینے لگتا ہے۔

پہلے دور میں حق کو لفظی دلیل سے پہچاننا پڑتا تھا، دوسرے دور میں اس کی اہمیت کو منوانے کے لیے کھلے ہوئے واقعات موجود ہوتے ہیں۔ پہلے دور میں حق کو مانتے ہی آدمی اپنے ماحول کے اندر اجنبی بن جاتا تھا، دوسرے دور میں حق کے ساتھ وابستہ ہونا آدمی کو عزت اور مقبولیت کا مقام دے دیتا ہے۔ پہلے دور میں حق کا ساتھ دینے والا صرف کھوتا تھا، دوسرے دور میں حق کا ساتھ مزید پانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ پہلے دور میں بنیاد کے نیچے دفن ہونا پڑتا تھا، دوسرے دور میں گنبد کی بلندیاں مل جاتی ہیں جن کے اوپر آدمی کھڑا ہو سکے۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر پہلے مرحلہ میں حق کا ساتھ دینے والے کے لیے درجۂ اول کا مقام ہے اور دوسرے مرحلہ میں حق کا ساتھ دینے والے کے لیے درجۂ ثانی کا مقام۔

ایک تقابل

پرنسپل نرنجن سنگھ ایم ایس سی (۱۸۹۳-۱۹۷۸) ماسٹر تارا سنگھ کے بھائی تھے۔ وہ نئی دہلی (ایسٹ پٹیل نگر) میں رہتے تھے۔ ۱۱ اگست ۱۹۷۳ کو ان سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی روداد الجمعیۃ ویکلی (۳۱ اگست ۱۹۷۳) میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا ایک جزء یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

امرتسر میں ۱۹۱۹ میں آل انڈیا کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ پرنسپل نرنجن سنگھ اس میں شریک تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس اجلاس میں بال گنگا دھر تلک، موتی لال نہرو، اینی بسنٹ، اور دوسرے بڑے بڑے قومی لیڈر موجود تھے۔ مہاتما گاندھی بھی اگرچہ اس اجلاس میں شریک تھے۔ مگر بظاہر وہ اتنے غیر اہم دکھائی دیتے تھے کہ اسکول کے لڑکوں نے جب دوسرے شاندار لیڈروں کے ساتھ انھیں اسٹیج پر بیٹھا ہوا دیکھا تو کہا: یہ گھاس کاٹنے والا کہاں سے آگیا۔

تلک نے اس اجلاس میں کامل آزادی کا رزولیوشن پیش کیا۔ دوسرا رزولیوشن گاندھی جی کا تھا۔ اس میں ڈومینین اسٹیٹس کی تجویز رکھی گئی تھی۔ دونوں کی تقریروں کے بعد ووٹنگ ہوئی تو گاندھی جی کو ۱۲۷ ووٹ اور تلک کو ۱۲۳ ووٹ ملے۔ گاندھی جی کا رزولیوشن کثرت رائے سے منظور ہو گیا۔

پرنسپل نرنجن سنگھ نے یہ قصہ بتانے کے بعد کہا کہ تلک کے مقابلہ میں گاندھی جی کی یہ جیت اس وقت بڑی حیرت ناک تھی۔ اسٹیج سے جب نتیجہ کا اعلان کیا گیا تو لڑکوں نے دوبارہ نعرہ لگایا: وہ گھسیارہ جیت گیا، وہ گھسیارہ جیت گیا۔

بال گنگا دھر تلک ایک انقلابی ذہن کے آدمی تھے۔ وہ ہمیشہ بلند بانگ انداز (high-profile) میں بولتے تھے۔ گاندھی جی اس کے برعکس ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ وہ دھیمے انداز (low-profile) میں کلام کرتے تھے۔ چنانچہ تلک (اور مسلمانوں کے اکثر لیڈر) پہلے ہی مرحلہ میں یہ چاہتے تھے کہ انگریزوں سے کامل آزادی کی مانگ کریں۔ جب کہ گاندھی جی حالات کی رعایت کرتے ہوئے تدریجی انداز میں آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ابتدائی مرحلہ میں بہت سے لوگوں کو تلک جیسے افراد عظیم معلوم ہوتے تھے اور گاندھی بظاہر حقیر دکھائی دیتے تھے۔ مگر جب تاریخ نے آخری فیصلہ کیا تو دنیا نے دیکھا کہ گاندھی قائد کے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں اور تلک جیسے لوگوں کو صرف پچھلی صف میں جگہ ملی ہے۔

رد و قبول

۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ ایک ہندستانی لڑکا ملک کے ایک گورنمنٹ کالج میں داخلہ کی درخواست دینے کے لیے گیا۔ اس کو جو ایڈمیشن فارم دیا گیا، اس میں دوسری باتوں کے علاوہ ریلیجن اور کاسٹ کا خانہ بھی موجود تھا۔ لڑکے نے فارم کے تمام خانے بھرے مگر ریلیجن اور کاسٹ کا خانہ اس نے سادہ چھوڑ دیا۔ اس نے جب اپنا فارم دفتر میں دیا تو کاؤنٹر کلرک نے دیکھنے کے بعد اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس کی وجہ، کلرک کے الفاظ میں یہ تھی کہ اس کا فارم نامکمل (incomplete) ہے۔ خبر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ——————

(ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۰، صفحہ ۱۰)

لڑکے کی درخواست داخلہ کو رد کرنے کا یہ سبب بالکل ٹکنکل تھا، وہ کوئی حقیقی سبب نہ تھا۔ مگر موجودہ دنیا میں ہر روز یہی قصہ پیش آرہا ہے۔ یہاں روزانہ بے شمار لوگ صرف اس لیے رد کر دیے جاتے ہیں کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے "ٹکنکل" معیار پر پورے نہیں اترے تھے۔ اس دنیا میں رد و قبول کے فیصلے حقیقی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ صرف مصنوعی بنیاد پر تمام فیصلے کیے جارہے ہیں۔

یہ معیاری دنیا میں ایک غیر معیاری صورت حال ہے جو آج ہر طرف دکھائی دے رہی ہے۔ یہ خدا کے تخلیقی منصوبہ کے سراسر خلاف ہے۔ خدا صرف مصلحتِ امتحان کی بنا پر اس کو گوارا کر رہا ہے۔ جیسے ہی خدا کی مقرر کی ہوئی مدتِ امتحان پوری ہوگی، خدا اچانک سارے نقشہ کو بدل دے گا۔ اس کے بعد خدا کی عدالت قائم ہوگی۔ یہ عدالت تمام لوگوں کے بارہ میں حقیقی بنیادوں پر فیصلے کرے گی۔

جس طرح آج کوئی رد کیا جارہا ہے اور کوئی قبول کیا جارہا ہے۔ اسی طرح آخرت میں کوئی قبول کیا جائے گا اور کسی کو رد کر دیا جائے گا۔ مگر فرق یہ ہے کہ آج کا فیصلہ انسان کے بنائے ہوئے مصنوعی معیار پر کیا جارہا ہے، اور آخرت کا فیصلہ خدا کے مقرر کیے ہوئے حقیقی معیار پر ہوگا۔

اس وقت کتنے لوگ جن کو "داخلہ" دے دیا گیا تھا، وہ نکال کر باہر کر دیے جائیں گے۔ اور کتنے لوگ جو داخلہ سے محروم کر دیے گئے تھے، ان کی بابت حکم ہوگا کہ ان کے لیے ابدی رحمتوں کے دروازے کھول دو اور پھر کبھی ان کے اوپر انھیں بند نہ کرو۔

یہ دن بہر حال آنے والا ہے، اس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔

حقیقی عمل

میکسم گورکی (Maksim Gorky) ایک روسی ادیب ہے۔ وہ ۱۸۶۸ میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے ایک جگہ بتایا ہے کہ محنت ہی کلچر کی بنیاد ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ ـــــ اگر ہر آدمی اپنی تھوڑی سی زمین میں پوری محنت کرے تو ہماری دنیا کتنی حسین ہو جائے۔

یہ بات صدفی صد درست ہے۔ ہر آدمی کے قریب اپنے عمل کا ایک ممکن دائرہ ہوتا ہے۔ اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ یہاں وہ اپنی پوری محنت صرف کرے اور اس کو آخری نتیجہ تک پہنچائے۔ اگر ہر آدمی اپنے اس ممکن دائرہ میں محنت کرنے لگے تو بیک وقت ساری دنیا میں بہت سے نتیجہ خیز عمل شروع ہو جائیں گے۔ اور جب یہ تمام عمل اپنے انجام کو پہنچیں گے تو تعمیر و ترقی کی ایک پوری دنیا ہر طرف کھڑی ہوئی نظر آئے گی۔

مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی "تھوڑی زمین" پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کی "بڑی زمین" کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ وہ خود اپنی عملی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بجائے یہ کرتا ہے کہ دوسروں کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا ہے کہ وہ اپنی عملی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

اس قسم کا عمل انسانیت کو بربادیوں کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔ جس سماج میں لوگ ایسا کریں وہاں لوگوں کے الفاظ سے تو ساری فضا گونج رہی ہوگی۔ مگر عمل کا سارا میدان صحرا کی طرح بے فصل پڑا رہے گا۔

ایک ایک کے مجموعہ ہی کا نام بڑی گنتی ہے۔ اجزاء کے جمع ہونے سے ہی ایک کل بنتا ہے۔ اس لیے اشخاص کا انفرادی طور پر عمل کرنا، نتیجہ کے اعتبار سے، سب کا عمل کرنا ہے۔ انفرادی سرگرمی، اپنے انجام کے لحاظ سے اجتماعی سرگرمی ہے۔

جزء پر عمل کی بات کرنا پروگرام ہے، کُل پر عمل کی بات کرنا صرف نعرہ ہے۔ کیوں کہ جزء اپنے قبضہ میں ہوتا ہے۔ جزء پر محنت کرنا ہر شخص کے لیے ہمیشہ ممکن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کُل وہ چیز ہے جو کسی آدمی کے قبضہ میں نہیں۔ کل پر محنت کرنا عملی طور پر ممکن نہیں۔ پروگرام وہ ہے جو ممکن ہو۔ جو ممکن نہیں وہ پروگرام بھی نہیں۔

غور کرو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کی تو ان کی ایک تعداد آپ کی مخالف ہوگئی۔ لوگ آپ پر طرح طرح کے عیب لگانے لگے۔ اس سلسلہ میں جواب دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا:

کہو، میں تم لوگوں کو ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ یہ کہ تم خدا کے واسطے کھڑے ہو جاؤ، دو دو اور ایک ایک۔ پھر سوچو کہ تمہارے ساتھی (پیغمبر) کو جنون نہیں ہے۔ وہ تو بس ایک سخت عذاب سے پہلے تم کو ڈرانے والا ہے۔ کہو کہ میں نے تم سے کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تمہارا ہی ہے۔ میرا معاوضہ تو بس اللہ کے اوپر ہے۔ اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے (سبا ۴۶ - ۴۷)

مطلب یہ کہ تم جو اس دعوت کا انکار کر رہے ہو اور اس کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہو، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے جو چیز ہے وہ صرف ضد اور تعصب ہے۔ اگر تم لوگ ضد اور تعصب سے خالی ہو کر سوچو، خواہ اکیلے اکیلے انفرادی طور پر سوچو، یا کئی آدمی مل کر اجتماعی طور پر غور کرو تو تمہاری غلطی خود تمہارے اوپر واضح ہو جائے گی۔ اگر تم نے واقعی طور پر کھلے ذہن سے سمجھنے کی کوشش کی تو تم پاؤ گے کہ جس شخص کو تم دیوانہ بتا رہے ہو، وہ دیوانہ نہیں، وہ خدا کا سچا داعی ہے۔

تم دیکھو گے کہ داعی حق کی سابقہ زندگی اس کی سنجیدگی کی گواہی دے رہی ہے۔ اس کا دردمندانہ انداز تم کو بتائے گا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہی اس کے دل کی آواز ہے۔ اس کے کلام کا حکیمانہ اسلوب تم کو اس کی صحت کی گواہی دیتا ہوا نظر آئے گا۔ اس کا تم سے کسی معاوضہ کا طالب نہ ہونا ظاہر کرے گا کہ اس نے اس کام کو صرف اللہ کی خاطر شروع کیا ہے نہ کہ کسی ذاتی مفاد کی خاطر۔

اگر تم غیر جانب دارانہ انداز میں غور کرو تو تم جان لو گے کہ اللہ کے داعی کی بے قراری جنون کی بے قراری نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ جس خطرہ سے ڈرانے کے لیے اٹھا ہے، اس کو وہ خود اپنی آنکھوں سے آتا ہوا دیکھ رہا ہے۔

جو لوگ سنجیدہ ہوں، ان کے لیے یہ حقیقتیں آنکھ کھولنے والی ثابت ہوں گی۔ وہ داعی کو پہچان کر اس کے ساتھی بن جائیں گے۔ مگر جو لوگ حق کی دعوت اور اس کے داعی کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہوں، وہ ان حقائق کو دیکھ نہیں سکتے، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ واضح اور کھلے ہوئے کیوں نہ ہو۔

ایسا کیوں

عن ابی هریرة قال : ان رجلا شتم ابابکر، والنبی صلی الله علیه وسلم جالس یتعجب ویتبسم ، فلما اکثر رد علیه بعض قوله ، فغضب النبی صلی الله علیه وسلم، وقام، فلحقه ابوبکر، وقال : یارسول الله کان یشتمنی وانت جالس ، فلما رددت علیه بعض قوله غضبت وقمت قال : کان معک ملک یرد علیه ، فلما رددت علیه وقع الشیطان

(رواه احمد)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت ابوبکر کو برا کہا (حضرت ابوبکر چپ رہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں بیٹھے ہوئے تھے ، آپ تعجب کر رہے تھے اور مسکرا رہے تھے ۔ پھر جب اس شخص نے بہت زیادہ کہا تو حضرت ابوبکر نے اس کی بعض باتوں کا جواب دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آگیا۔ آپ وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر چل کر آپ سے ملے اور کہا کہ اے خدا کے رسول وہ آدمی مجھ کو برا کہہ رہا تھا اور آپ وہاں بیٹھے ہوئے تھے (اور خوش تھے) لیکن جب میں نے اس کی بعض بات کا جواب دیا تو آپ غصہ ہو گئے اور وہاں سے اٹھ گئے ۔ آپ نے فرمایا کہ (جب تم چپ تھے) تو تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو اس کا جواب دے رہا تھا۔ مگر جب تم نے خود اس کی بات کا جواب دیا تو فرشتہ چلا گیا اور شیطان آگیا۔

ایک آدمی آپ کو برا کہے ۔ اس کے جواب میں آپ بھی اس کو برا کہیں تو بات بڑھتی ہے۔ جس آدمی نے پہلے صرف ایک سخت لفظ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ سب و شتم پر اتر آتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں پتھر اٹھا لیتا ہے۔ آپ کا جواب نہ دینا اس کو ابتدائی حد پر روک دیتا ہے ، اور آپ کا جواب دینا اس کو اس کی آخری حد پر پہنچا دیتا ہے ۔

اس کے بجائے اگر ایسا ہو کہ ایک شخص آپ کو برا کہے یا گالی دے مگر آپ خاموش ہو جائیں۔ آپ اشتعال انگیز کلام کے باوجود مشتعل نہ ہوں ، تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا لہجہ آہستہ آہستہ دھیما ہو رہا ہے۔ اس کے غبارے کی ہوا نکلنا شروع ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ اپنے آپ چپ ہو جائے گا۔ آپ کا بولنا دوسرے کو مزید بولنے پر آمادہ کرتا ہے، اور اگر آپ چپ ہو جائیں تو آپ کا

چپ ہونا آخر کار دوسرے شخص کو بھی چپ ہونے پر مجبور کر دے گا۔

دونوں صورتوں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب برا کرنے والے کا جواب برائی سے دیا جائے تو اس کے اندر ردعمل کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ اب شیطان کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اس کی انا کو جگائے۔ وہ اس کے غصہ کو بڑھا کر اس کو آخری درجہ تک پہنچا دے۔ وہ برائی جو اس کے اندر سوئی ہوئی تھی، وہ پوری طرح جاگ کر آپ کے بالمقابل کھڑی ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس جب برا کرنے والے کے ساتھ اعراض کا معاملہ کیا جائے تو اس کے اندر خود احتسابی کی نفسیات جاگتی ہے۔ اب فرشتہ کو موقع ملتا ہے کہ وہ آدمی کی فطرت کو بیدار کرے۔ وہ اس کے ضمیر کو متحرک کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اس کے اندر شرمندگی کا جذبہ پیدا کرے۔ وہ اس کو اپنی اصلاح پر ابھارے۔

پہلی صورت میں آدمی شیطان کے زیر اثر چلا جاتا ہے اور دوسری صورت میں فرشتہ کے زیر اثر۔ ایک واقعہ کی صورت میں دوسرے کو ملزم ٹھہرا کر اس سے انتقام لینے کے جذبات بھڑکتے ہیں اور دوسرے واقعہ کی صورت میں اپنے کو ذمہ دار ٹھہرا کر اپنی اصلاح کرنے کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔

ہر آدمی کے سینہ میں دو طاقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ایک طاقت آپ کی موافق ہے جس کی نمائندہ آدمی کا ضمیر ہے۔ دوسری طاقت آپ کی مخالف ہے۔ اس کی نمائندہ آدمی کی انا ہے۔ اب یہ آپ کے اپنے اوپر ہے کہ آپ دونوں میں سے کس طاقت کو جگاتے ہیں۔ آپ اپنے قول وعمل سے جس طاقت کو جگائیں گے وہی آپ کے حصہ میں آئے گی۔

ایک طاقت کو جگانے کی صورت میں فریق ثانی آپ کا دشمن بن جائے گا۔ اور اگر آپ نے دوسری طاقت کو جگایا تو خود فریق ثانی کے اندر ایک ایسا عنصر نکل آئے گا جو آپ کی طرف سے عمل کر کے اس کو آپ کے مقابلہ میں مغلوب ومفتوح بنا دے۔

مذکورہ واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی پر غصہ نہیں ہوئے جو بدکلامی کر رہا تھا۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق کی زبان سے برا کلمہ نکلا تو آپ غصہ ہو گئے۔ گدھے کے لیے شریعت میں اعراض کا اصول ہے اور انسان کے لیے امر بالمعروف کا اصول۔

صبر کا ہتھیار

۶ ستمبر ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ مسز کملیش (۲۲ سال) شاہدرہ کی ایک سڑک پر چل رہی تھیں۔ ان کے گلے میں سونے کی زنجیر تھی۔ اچانک اشوک نامی ایک شخص جس کی عمر ۲۵ سال تھی جھپٹا اور مسز کملیش کی زنجیر کھینچ کر بھاگا۔ پولیس کانسٹبل کشن چند تیاگی (۲۴ سال) اس وقت ڈیوٹی پر گھوم رہے تھے۔ کسی نے ان کو واقعہ کے بارہ میں بتایا۔ وہ تلاش کرتے ہوئے ایک بالمیکی مندر میں پہنچے جہاں مجرم موجود تھا۔ پولیس کی وردی دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کشن چند نے اس کا پیچھا کیا۔ مجرم کے پاس ایک ریوالور تھا۔ اس نے فائر کیا تو اس کی گولی کشن چند کی آنکھ کے نیچے ان کے چہرہ اور گردن کو زخمی کرتی ہوئی گزر گئی۔ انھوں نے چلا کر کہا "ایک بار تو نے مجھے مار دیا۔ پر دوبارہ تو نہیں مار سکتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا تیرے پاس ریوالور ہے" اب وہ چوکنا ہو گئے۔ مجرم نے دو بار اور گولی چلائی۔ مگر ہر بار وہ نہایت پھرتی کے ساتھ بیٹھ گئے اور اس کے وار کو خالی کر دیا۔ کشن چند کسی خوف کے بغیر تنہا مجرم کا پیچھا کرتے رہے جب کہ "دشمن" کے پاس ریوالور تھا اور ان کے اپنے پاس لاٹھی بھی نہیں تھی۔ دوڑتے دوڑتے آخر کار ساڑھے چار فٹ کی ایک چہار دیواری سامنے آگئی۔ مجرم اس پر کود گیا۔ کشن چند نے بھی فوراً چھلانگ لگائی اور دوسری طرف جا کر اس کو پکڑ لیا۔

" ایک مسلح مجرم کو دوڑاتے ہوئے آپ کو ڈر نہیں لگا" ایک اخبار نویس نے کشن چند سے پوچھا " نہیں " انھوں نے جواب دیا " میں جانتا تھا کہ جب اس کا ریوالور خالی ہو چکا ہو گا تو میں اس کو پکڑ لوں گا" مجرم کے پاس تین گولی تھی۔ کشن چند نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کی تینوں گولیاں خالی کرا دیں۔ اب مجرم کا ہتھیار ناقابل استعمال ہو چکا تھا۔ کشن چند نے اس کو پکڑ لیا (ہندستان ٹائمز، ۷ ستمبر ۱۹۸۰)

اس چھوٹے سے واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اکثر حالات میں حریف سے مقابلہ کا بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں اس کے وار کو خالی کر دیا جائے، یہاں تک کہ اس کے ہتھیار کی "تین گولی" ختم ہو جائے۔ پھر اس سے مقابلہ کرنا نہایت آسان ہو گا۔ مثلاً ایک

شخص آپ سے طاقت ور ہے اور وہ آپ کی کسی بات پر برھم ہو جاتا ہے۔ جب وہ آپ کو ڈانٹنا اور بگڑنا شروع کرے تو ابتداءً آپ اس کے وار کو خالی کر دیں ، یعنی بالکل چپ ہو کر اس کی بات کو سنتے رہیں۔ یہاں تک کہ جب اس کے الفاظ ختم ہو جائیں اور اس کی بھڑاس نکل جائے ، اس وقت سنجیدگی کے ساتھ صورت حال کے بارہ میں اس کو بتائیں۔ اگر آپ ابتداء میں اس قسم کا صبر دکھائیں تو آپ یقیناً کامیاب رہیں گے۔ کیوں کہ اب وہ اپنے ہتھیار کی " تین گولیاں " ختم کر چکا ہے اور اب بہت آسانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ ہیں جو آپ کے خلاف متحد ہو کر آ گئے ہیں اور آپ کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ غور کیجئے تو یہ اتحاد صرف اس بنیاد پر ہو گا کہ آپ ان کے سامنے ان کے حریف بن کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ حکمت عملی کا طریقہ اختیار کریں اور کچھ دیر کے لئے اپنے کو نشانہ سے ہٹا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا اتحاد ٹوٹ رہا ہے۔ ان کے اتحاد کے ہتھیار کی گولی آپ کا حریف بن کر کھڑا ہونا تھا۔ جب آپ نے اپنے کو حریف کے مقام سے ہٹا دیا تو گویا آپ نے ان کی "تینوں گولیاں" خالی کرا دیں۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ منتشر ہو جائیں گے اور جو گروہ اختلاف اور انتشار میں پڑ جائے اس کو ختم کرنے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا گروہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے کو ختم کر لیتا ہے۔

کوئی حریف جب سامنے آتا ہے تو آدمی جوش میں آکر اس سے لڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں وہ حریف کی طاقت کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اگر آدمی صبر اور دانشمندی سے کام لے اور مقابلہ کے ابتدائی مرحلہ میں حریف کے وار کو خالی جانے دے تو بہت جلد ایسا ہو گا کہ حریف خود اپنی کارروائیوں کے نتیجہ میں اپنے کو غیر مسلح کر چکا ہو گا۔ یاد رکھئے ، کوئی بھی شخص جو آپ کے مقابلہ میں آتا ہے اس کے پاس ہمیشہ "تین" ہی گولیاں ہوتی ہیں۔ لاتعداد گولیاں کسی کے پاس نہیں ہوتیں۔ اگر آپ یہ ہوشیاری دکھائیں کہ مقابلہ کے آغاز میں کسی طرح اپنے کو نشانہ سے ہٹا لیں تو اس کے بعد یقینی طور پر ایسا ہو گا کہ دشمن اپنی " تین گولیوں " کو ختم کر کے خالی ہاتھ ہو چکا ہو گا۔ اب زیادہ بہتر طور پر وہ وقت آ جائے گا کہ آپ اس کو زیر کر سکیں۔ یہ کامیابی ہر ایک حریف کے اوپر حاصل کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ مقابلہ پیش

آنے کے بعد آدمی اپنے حواس کو نہ کھوئے۔

خدا جلدی نہیں چاہتا

ایک شخص اپنے عیسائی دوست سے ملنے گیا۔ جب وہ دوست کے یہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے سامنے بے تابی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ "آج میں آپ کو پریشان دیکھ رہا ہوں، آخر کیا بات ہے"۔ اس نے پوچھا۔ عیسائی دوست اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا :

I am in hurry, but God isn't

میں جلدی چاہتا ہوں۔ مگر خدا جلدی نہیں چاہتا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے صحن میں ایک مرجھائے ہوئے آم کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا : میں نے اس کو بڑی امیدوں کے ساتھ پچھلے ہفتہ لگایا تھا۔ مگر اب وہ سوکھ کر ختم ہو چکا ہے۔

"یہ درخت تو کافی بڑا ہے، پھر ایک ہفتہ پہلے کیسے آپ نے اس کو لگایا تھا" آدمی نے پوچھا۔ "یہی تو اصل بات ہے" عیسائی دوست نے کہا" میں نے چاہا کہ میں اچانک ایک بڑا درخت اپنے یہاں کھڑا کر دوں۔ مگر خدا کی اس دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ میں نے آم کا چھوٹا پودا بونے کے بجائے یہ چاہا کہ پانچ سال کا درخت لاکر اپنے صحن میں لگاؤں اور اس طرح پانچ سال کا سفر ایک دن میں طے کر لوں۔ میں نے درخت تو کہیں نہ کہیں سے لاکر لگالیا۔ مگر وہ اگلے ہی دن سوکھ گیا۔ اور اب اس کی جو صورت ہے وہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

اس کے بعد عیسائی دوست نے کہا : اس دنیا میں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے خدا کا ایک قانون ہے۔ ہم اس قانون کی پیروی کر کے ہی اس چیز کو اپنے لئے وجود میں لا سکتے ہیں۔ اگر ہم قدرت کے اصول کی پیروی نہ کریں اور اپنی خواہشوں پر چلنے لگیں تو ہمارے حصہ میں "سوکھا درخت" آئے گا نہ کہ "ہرا بھرا باغ"۔

لکڑی کی ایک کشتی کی تاریخ اگر چھوٹے پودے سے شروع کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر کشتی والا انتظار کرتا ہے کہ قدرت ایک درخت اگائے۔ زمین و آسمان کے تمام انتظامات

اس کو پروان چڑھانے کے لئے وقف ہوں۔ یہ کام سو برس تک ہوتا رہے۔ یہاں تک کہ جب مسلسل عمل کے نتیجہ میں ننھا پودا پختہ درخت کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، اس وقت کشتی والا اس کو کاٹتا ہے۔ اس کے تختے بناتا ہے اور پھران تختوں کو لوہے کی کیلوں سے جوڑ کر وہ کشتی تیار کرتا ہے جو انسانی قافلوں کو پانی کے اوپر سفر کرنے کے قابل بنائے۔

ذاتی معاملات میں ہر آدمی اس بات کو جانتا ہے۔ مگر جب ملت کا معاملہ ہو تو وہ چاہتا ہے کہ فی الفور ایک عظیم الشان کشتی دریا میں اتار دے۔ خواہ اس کے پاس کشتی کے نام سے کاغذ کی ناؤ ہی کیوں نہ ہو۔

یاد رکھئے، یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ اس کو خدا نے بنایا ہے۔ اور وہ اسی خدا کے قانون کے تحت چل رہی ہے۔ ہم اس سے موافقت کرکے اپنی زندگی کی تعمیر کرسکتے ہیں۔ اگر ہم اس کے ساتھ موافقت نہ کریں تو ہمیں اس دنیا میں کچھ ملنے والا نہیں۔

جس طرح درخت تدریج کے ساتھ اگتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے معاملات بھی تدریج کے ساتھ درست ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے قدرت کے اس تدریجی قانون کو جانئے اور اس کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے اپنا سفر شروع کیجئے۔ اس کے سوا اس دنیا میں کامیابی کا کوئی اور راستہ نہیں۔ بقیہ تمام راستے کھڈ کی طرف جاتے ہیں نہ کہ کسی منزل کی طرف۔

قرآن میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ صبر کا مطلب بے عملی نہیں، صبر دراصل منصوبہ بند عمل کا دوسرا نام ہے۔ بے صبر آدمی فوری ردعمل کے تحت بے سوچے سمجھے کارروائی کرتا ہے۔ اس کے برعکس صبر والا آدمی اپنے جذبات کو روک کر پورے معاملہ پر غور کرتا ہے۔ وہ اپنی طاقت اور دوسرے کی طاقت کا اندازہ کرتا ہے۔ وہ حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ قانون قدرت کو سمجھتا ہے جس کے دائرہ میں اس کو اپنا عمل کرنا ہے۔

اسی طرح سوچ بچار کے بعد عمل کا نقشہ بنانے کے لیے اپنے جذبات کو تھامنا پڑتا ہے، اس لیے اس کو شریعت میں صبر کہا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسی کو منصوبہ بند عمل کہتے ہیں۔ اس دنیا میں صابرانہ عمل ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور غیر صابرانہ عمل ہمیشہ ناکام۔

برتر حل

سوچنا (thinking) ہماری دنیا کا ایک ناقابل فہم حد تک عجیب عمل ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان تحقیقات نے انسان کے علم میں اضافہ کرنے سے زیادہ انسان کی حیرانگی میں اضافہ کیا ہے۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں :

Dr Rapaport, *Toward a Theory of Thinking*, 1951
W.E. Vinacke, *The Psychology of Thinking*, 1952
F.C. Bartlett, *Thinking*, 1958
Max Wertheimer, *Productive Thinking*, 1959

ان تحقیقات کے ذریعہ بے شمار نئی معلومات سامنے آئی ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ انسانی ذہن کے اندر ہمیشہ ایک نہایت اہم عمل جاری رہتا ہے۔ علماء نفسیات اس کو ذہنی طوفان سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ عمل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ذہن کسی نئے چیلنج سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں وہ خود اپنی فطرت کے زور پر مسائل کے نئے حل تلاش کرنے لگتا ہے۔ یہ عمل اس امکان کو بڑھا دیتا ہے کہ پیش آمدہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کچھ برتر حل آدمی کے سامنے آجائیں :

> A process called brainstorming has been offered as a method of facilitating the production of new solutions to problems... These unrestricted suggestions increase the probability that at least some superior solutions will emerge (18/357).

یہ ریسرچ بتاتی ہے کہ آدمی جب کسی بحرانی حالت سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر چھپی ہوئی فطری صلاحیت کے تحت اس کے اندر ذہنی طوفان (brainstorming) کی ایک کیفیت جاگ اٹھتی ہے۔ یہ طوفان اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ پیش آمدہ مسئلہ کا ایک برتر حل (Superior solution) دریافت کرلے۔ اور مسئلہ کا برتر حل معلوم ہوجانے کے بعد کامیابی اتنی ہی ممکن ہوجاتی ہے جتنا شام کے بعد صبح کا آنا۔

اللہ کا یہ معاملہ کیسا عجیب ہے کہ اس نے مشکلات کو ہماری ترقی کا زینہ بنادیا۔ اس نے

اپنی قدرت خاص سے ہمارے نہیں کو ہمارے ہے میں تبدیل کر دیا۔

چیلنج کا جواب

انگریز مورخ ٹوائن بی (Arnold Toynbee) نے عالمی تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد اپنی مشہور کتاب مطالعہ تاریخ (A Study of History) لکھی جو ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۱ تہذیبوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ٹوائن بی کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ چیلنج اور اس کا جواب (Challenge-response) میکانزم وہ چیز ہے جو قوموں کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے۔

ٹوائن بی کے مطابق، خارجی چیلنج ہی وہ لازمی عمل ہے جو افراد یا قوموں کے امکانات کو جگا دیتا ہے۔ تہذیب کا ابتدائی اور بنیادی مرحلہ ماحول کے ایسے چیلنج سے ظہور میں آتا ہے جو نہ اتنا سخت ہو کہ ترقی کو روک دے، نہ اتنا موافق ہو کہ وہ تخلیقیت کو معطل کر دے۔ قوم کی ایک تخلیقی اقلیت اس چیلنج کا جواب دیتی ہے اور قوم کے لئے رہنمائی فراہم کرتی ہے:

> The initial stage of a civilization is its growth, brought about by an environmental challenge, neither too serve to stifle progress nor too favourable to inhibit creativity, which finds a response among a creative minority that provides leadership to the passive majority. (X/76).

اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی مصیبتیں (troubles) لوگوں کی صلاحیتوں کو جگاتی ہیں بشرطیکہ وہ اتنی زیادہ نہ ہوں کہ آدمی اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مومن سب سے زیادہ تخلیقی انسان ثابت ہو سکتا ہے، کیوں کہ مومن کے اندر سہنے اور تاب لانے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

عام انسان صرف اپنے آپ میں عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ صرف اپنی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ دوسری طرف مومن کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ خدائے برتر میں عقیدہ رکھتا ہے اور خدا کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ انسان کی قوتیں محدود ہیں، خدا کی قوتیں لامحدود۔ اس بنا پر عام انسان کے لئے کسی نہ کسی مقام پر حد آجاتی ہے۔ جب کہ مومن کے لئے کبھی حد نہیں آتی۔ جہاں

مومن کی اپنی حد ختم ہو جائے، وہاں اس کا خدا اس کی کمی کی تلافی کے لئے موجود ہوتا ہے۔
۔من دوسروں کے مقابلہ میں مصیبت اور مشکلات کو زیادہ برداشت کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ تخلیقی ثابت ہوتا ہے۔

مصیبتیں کیوں آدمی کو تخلیقی بناتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصیبتیں انسان کے دماغ کے اجزار (particles) کو جگاتی ہیں۔ وہ اس کی خوابیدگی کو بیداری بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آدمی کے اوپر مشکلات آتی ہیں تو اس کی سوچنے اور کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اس واقعہ کے پیش نظر یہ کہنا صحیح ہے کہ عام انسان کے دماغ کے اجزاء صرف محدود طور پر جاگتے ہیں، جب کہ مومن کے دماغ کے اجزاء لامحدود طور پر جاگ اٹھتے ہیں۔ عام انسان کی تخلیقیت کی ایک حد ہے، مگر مومن کی تخلیقیت کی کوئی حد نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے (الطلاق ۳) ارشاد ہوا ہے کہ تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو (المائدہ ۳) اسی طرح فرمایا گیا ہے کہ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو، اللہ تمہارے اعمال درست کر دے گا (الاحزاب ۷۰ ـ ۷۱)

اس قسم کی آیتوں کا مطالعہ کیجئے، اور پھر فطرت کے مذکورہ قانون کو سامنے رکھئے تو اس سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ اہل ایمان پر جب بھی مشکلات و مصائب کا لمحہ آئے تو اس وقت جو ضروری کام کرنا ہے وہ یہ کہ ان کے اندر اعتماد علی اللہ کی کیفیت کو ابھارا جائے۔ اللہ پر توکل اور اعتماد ان کے اندر برداشت کا مادہ پیدا کرے گا۔ اور جن لوگوں کے اندر سہارنے اور برداشت کرنے کی صفت ابھر آئے وہ مشکلات کے وقت ہیرو بن جاتے ہیں۔ وہ مشکلات کو اپنے لئے نفسیاتی ٹانک بنا لیتے ہیں۔

اس دنیا میں مشکل کا پیش آنا بذات خود کوئی مسئلہ نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ مشکل پیش آنے کے وقت آدمی اس کو سہارنے کی طاقت کو دے۔ اس لئے مشکل پیش آنے کے وقت شکایت اور احتجاج میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ یہ کوشش کرنا چاہئے کہ آدمی کے اندر سہارنے اور برداشت کرنے کی طاقت جاگ اٹھے۔ مشکل کے وقت آدمی اگر پست ہمت ہونے سے بچ

رسالہ ۱۴۹

جائے تو اس کے بعد اس کا ذہن مزید طاقت کے ساتھ متحرک ہو کر اپنے آپ مسئلہ کو حل کرلے گا

عسر کے ساتھ یسر

ایک بار کا واقعہ ہے۔ میں مسلمانوں کے ایک اجتماع میں شریک ہوا۔ یہ اجتماع شہر کے ایک شاندار ہال میں کیا گیا تھا۔ بے ریش اور باریش مسلمانوں سے ہال کی کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ اجتماع کا پروگرام قرأت سے شروع ہونے والا تھا۔ مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ کوئی قاری یا حافظ اجتماع میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ کالج کے ایک استاد اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے پارہ عم سے دو سورتیں سادہ طور پر پڑھ کر سنائیں۔ سورہ والضحیٰ اور سورہ الم نشرح۔

اس ابتدائی کارروائی کے بعد تقریریں شروع ہوئیں۔ ایک کے بعد ایک لوگ اسٹیج پر آنا شروع ہوئے۔ لوگوں کی پرجوش تقریروں سے ہال گونجنے لگا۔ تمام تقریروں کا خلاصہ صرف ایک تھا ــــــ اسلام آج مخالفانہ سازشوں سے گھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے دشمن ان کو فنا کر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کو آج ہر طرف تعصب، ظلم، سازش اور عناد کا سامنا ہے۔ اسی قسم کی باتوں پر اجتماع شروع ہوا اور اسی قسم کی باتوں پر آخر کار وہ ختم ہو گیا۔

آخر میں میں مائک پر آیا۔ میں نے کہا کہ آپ حضرات نے اغیار کے خلاف تقریریں کی ہیں، مگر مجھے خود آپ کے خلاف بولنا ہے۔ آپ کو دوسروں سے شکایت ہے، مجھے خود آپ سے شکایت ہے۔

آپ نے اپنا یہ اجتماع اگرچہ قرآن کی تلاوت سے شروع کیا۔ مگر یہ تلاوت محض رسمی تھی، بلکہ وہ قرآن کی نفی کے ہم معنی تھی۔ آپ لوگوں نے قرآن کو پڑھ کر قرآن کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

آپ نے اپنے اجتماع کے آغاز میں سورہ الم نشرح کی تلاوت کی۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے تکرار کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ مشکل کے ساتھ ہمیشہ آسانی ہوتی ہے، مشکل کے ساتھ ہمیشہ آسانی ہوتی ہے (فان مع العسر یسراً، ان مع العسر یسرا)

قرآن کی اس آیت کے مطابق لازماً ایسا ہونا چاہئے کہ موجودہ حالات میں اگر کچھ باتیں ہمارے خلاف ہوں، تو اسی کے ساتھ کچھ باتیں ہمارے موافق بھی ہوں۔ قرآن کے لفظوں میں، عسر کے ساتھ یسر بھی ہو۔ مگر آپ سب لوگوں نے صرف غیر موافق باتوں (عسر) کا اعلان کیا۔ آپ میں سے کسی نے موافق باتوں (یسر) کا انکشاف نہیں کیا۔ اس طرح آپ نے قرآن کے ایک جزء کا تو خوب ذکر کیا، مگر قرآن کے دوسرے جزء کو آپ نے یکسر حذف کر دیا۔

یہودی یا اور کوئی فرقہ اگر قرآن کا ایسا نسخہ چھاپے جس میں قرآن کی ایک آیت کو نکال دیا گیا ہو تو ساری دنیا کے مسلمان اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے سرگرم ہو جائیں گے۔ مگر خود مسلمان عملاً یہی کام کر رہے ہیں۔ آج ہر جگہ کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ "عسر" کے واقعات کا خوب چرچا کرتے ہیں، مگر وہ "یسر" کے پہلوؤں کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

دوسرے لوگ اگر قرآن میں کمی بیشی کریں تو مسلمان اس کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر خود مسلمان یہی کام زیادہ بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں تو اس کا غلط ہونا کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

لوگ قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں مگر وہ قرآن سے بے خبر ہیں۔ لوگ اپنے جلسوں کا آغاز قرآن سے کرتے ہیں، مگر وہ صرف رسمی تبرک کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اس سے رہنمائی لینے کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے چرچا کے باوجود قرآن کا فائدہ لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

قرآن بلاشبہہ قوموں کو اٹھانے والی کتاب ہے۔ مگر قرآن کا یہ معجزہ اس قوم کے حق میں ظاہر ہوتا ہے جو قرآن کو اپنا رہنما بنائے نہ کہ ان لوگوں کے لئے جو قرآن کے الفاظ خوش الحانی کے ساتھ دہرائیں اور اس کے بعد اس کو بند کر کے طاق پر رکھ دیں۔

مفتاح عظیم

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا: المفتاح العظیم (عظیم کنجی) اس میں بتایا گیا تھا کہ دعوت اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ ماضی میں اسلام نے دعوت کے ذریعہ عالمی فتح حاصل کی تھی، آج بھی ہم دعوت کے ذریعہ دوبارہ اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

اسی کے ساتھ اسی پرچہ میں ایک اور چھ صفحات کا مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا: الاقلیات المسلمة تواجہ خطر الذوبان (مسلم اقلیتوں کو بھیڑیوں کے خطرہ کا سامنا) اس مضمون میں، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، یہ دکھایا گیا تھا کہ جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اکثریتی فرقہ اور اکثریتی فرقہ کی حکومت ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کر رہی ہے، وہ ان کے ساتھ وحشی بھیڑیوں جیسا سلوک کر رہی ہے۔

یہ دونوں باتیں مذکورہ جریدہ کے ایک ہی شمارہ میں چھپی ہوئی تھیں، حالاں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وہ قومیں جن کو اس مضمون میں بھیڑیا (ذوبان) کہا گیا ہے، وہ کون ہیں۔ وہ وہی غیر مسلم قومیں ہیں جن کے اوپر ہمیں دعوت کا کام کرنا ہے۔ وہ ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ گویا "مسلم اقلیتیں" داعی ہیں اور ان کی پڑوسی غیر مسلم اکثریتیں مدعو۔ اب اگر داعی کے دل میں یہ بٹھایا جائے کہ مدعو تمہارے لئے ظالم بھیڑیا ہے تو کیا وہ سچے داعیانہ جذبہ کے ساتھ اپنے مدعو کے اوپر دعوت کا عمل جاری کر سکتا ہے۔ کیا وہ انی لکم ناصح کی نفسیات کے ساتھ اس سے معاملہ کر سکتا ہے۔

دعوت سرتاسر محبت کا ایک عمل ہے۔ داعی کو آخر حد تک اپنے مدعو کی ہدایت کا حریص بننا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی دعوت کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ مدعو اگر زیادتی کرے تب بھی داعی اس کی زیادتیوں کو بھلا کر یک طرفہ طور پر اس کو اپنی دلچسپی کا موضوع بناتا ہے۔ وہ اپنے دل کو مدعو کی شکایات سے اتنا زیادہ خالی کرتا ہے کہ اس کے دل سے مدعو کے حق میں دعائیں نکلنے لگیں۔

لوگ دعوت کی باتیں کرتے ہیں مگر وہ اس کے آداب نہیں جانتے۔ لوگ داعی کا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ اس کے تقاضے کو پورا کریں۔ لوگ شہادت علی الناس کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ انھوں نے اس کی قیمت ادا کی ہو۔

یہ صرف ان ملکوں کا معاملہ نہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ ٹھیک یہی نفسیات ان ملکوں کے مسلمانوں کی بھی ہے جہاں انھیں اکثریت حاصل ہے۔ یا جہاں پوری کی پوری آبادی مسلمان ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اقلیتی علاقہ کے مسلمانوں کو مقامی غیر مسلم طاقت سے شکایت ہے۔ اور اکثریتی علاقہ کے مسلمانوں کو عالمی غیر مسلم طاقتوں سے۔ مثلاً یہودی، عیسائی، اشتراکی مستعمرین، مستشرقین وغیرہ۔

اسلام میں دعوت کی مصلحت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے۔ دعوت کے مفاد کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ بذات خود کتنی ہی زیادہ سنگین اور کتنی زیادہ اہم کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس معاملہ میں اتنی واضح رہنمائی کرتی ہے کہ طالب حق کے لئے ادنیٰ شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف گئے۔ وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ حد درجہ توہین و تذلیل کا سلوک کیا جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ حتی کہ آپ نے خود حضرت عائشہ سے فرمایا کہ طائف کے دن سے زیادہ سخت دن میرے اوپر کوئی اور نہیں گزرا۔ روایات بتاتی ہیں کہ جب آپ غم اور تکلیف کے ساتھ طائف سے واپس ہوئے تو راستہ میں اللہ کے حکم سے ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) آپ کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اللہ نے آپ کی قوم کی باتیں سنیں۔ میں ملک الجبال ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کے ذریعہ اس بستی کو کچل ڈالوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی اگلی نسلوں سے ایسا شخص پیدا کرے گا جو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے (ارجو ان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبد اللہ لا یشرک بہ شیئا، السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، المجلد الثانی، صفحہ ۱۵۳)

دعوت بلا شبہہ مفتاح عظیم ہے۔ مگر اس مفتاح عظیم کو استعمال کرنے کے لئے قلب عظیم درکار ہے۔ اس کے لئے وہ کردار مطلوب ہے جس کو قرآن میں بلند اخلاق (خلق عظیم) کہا گیا ہے۔ قلب عظیم کے بغیر کوئی آدمی نہ تو وقت کے امکانات کو جان سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر وہ اس قابل ہو سکتا کہ وہ ان امکانات کو استعمال کر سکے۔

اسلامی طریقہ

قرآن میں جن گھریلو مسائل کا ذکر ہے، ان میں سے ایک نشوز ہے۔ نشوز کا لفظی مطلب ہے سر اٹھانا نشو
اظہار مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ہوسکتا ہے۔ اس فعل کا ظہور مرد کے مقابلہ میں عورت کی طرف سے
تو اس کا مطلب شوہر کی نافرمانی ہوتا ہے۔ اور اگر وہ عورت کے مقابلہ میں مرد کی طرف سے ہو تو اس کا مطلب
ہوگا کہ شوہر اپنی بیوی کا حق ادا نہیں کر رہا ہے۔

نشوز کی صورت پیش آنے کے بعد عورت اور مرد کے باہمی تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔ جب ایسا ہو جا
تو کیا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں ہدایت دی گئی کہ سب سے پہلے دونوں آپس میں بات چیت کے ذر
اصلاح کی کوشش کریں (النساء ۱۲۸)

اگر آپس کی بات چیت سے تعلقات درست نہ ہوں تو دوسرے مرحلہ میں یہ کرنا چاہیے کہ دونوں خاندا
سے ایک ایک شخص کو بطور حکم مقرر کیا جائے۔ دونوں خیر خواہی کے انداز میں کوشش کر کے معاملہ کو داخلی سطح پر
کرنے کی کوشش کریں (النساء ۳۴) اگر یہ دوسری کوشش بھی ناکام ہو جائے تو تیسرے مرحلہ میں معاملہ کو بیرونی مدا
ادارہ (قضا) کے سپرد کر دیا جائے۔

اس تعلیم کا براہ راست تعلق شوہر اور بیوی کے نزاع سے ہے۔ مگر اس سے شریعت کا مزاج معلوم ہ
ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب دو انسان یا دو گروہ کے درمیان کوئی جھگڑے کی صورت پیدا ہو
اس وقت جھگڑے کو حل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

اس طریق عمل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاملہ کو محدود دائرہ میں رکھ کر اسے حل کرنے کی کوشش کی جا
اولاً یہ کوشش ہونی چاہیے کہ جن چند آدمیوں کے درمیان مسئلہ پیدا ہوا ہے، انھیں کے درمیان اس کو با
رکھا جائے اور اس کے دائرہ کو آخری حد تک محدود رکھتے ہوئے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اگر بالفرض ساری تدبیروں کے باوجود یہ ابتدائی کوشش ناکام ہو جائے تب بھی معاملہ کو پھیلایا نہ جا
اس کے بعد بھی صرف قریبی افراد کو شریک کر کے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر قریبی اور متعلق افرا
کی کوشش بھی اس کو حل کرنے میں ناکام ثابت ہو تو اس وقت جائز ہے کہ اس کو عدالت یا اور کسی خار
ادارہ کے سپرد کیا جائے۔

قول سدید

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی (الاحزاب ۷۰ - ۷۱)

اس آیت میں اہل ایمان کو قول سدید کا حکم دیا گیا ہے۔ قول سدید سے مراد ہے بالکل ٹھیک بات، عین مطابق واقعہ بات۔ ایسے کلام کا انجام یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے تم کو اصلاح اعمال کا فائدہ ہوگا۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایک شخص کو دوسرے آدمی کے بارہ میں کوئی بیان دینا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر آدمی اگر وہی بات کہے جو نفس الواقع ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کہنے والے کے اندر سنجیدہ مزاج بنے گا۔ نفسیاتی تضاد سے پاک شخصیت اس کے اندر پرورش پائے گی۔ اس کے سینہ کے اندر دوسروں کے بارہ میں خیر خواہی کے جذبات ابھریں گے۔ اور جب کہنے والے کا یہ حال ہوگا تو دوسرے لوگ بھی اس کا مثبت اثر لیں گے۔ اس طرح پورا سماج صحت مند سماج بن جائے گا۔ بغض، حسد، کینہ، انتقام، نفرت، عیب جوئی جیسی برائیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ حقیقت پسندی اور صدق بیانی کا ماحول ہر طرف قائم ہو جائے گا۔

اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ لوگ غیر سدید قول اپنی زبان سے نکالیں تو سارا معاملہ بالکل الٹا ہو جائے گا۔ اب کہنے والے کے اندر منفی مزاج پرورش پائے گا۔ وہ دہرا شخصیت کا انسان بن جائے گا۔ ذاتی معاملات کے لئے اس کی سوچ کچھ ہوگی اور دوسروں کے معاملات کے لئے اس کی سوچ کچھ۔ اس کے اندر سازشی ذہنیت بنے گی۔ اس کا سینہ جھوٹے افکار کی تخلیق کا کارخانہ بن جائے گا۔ اور جب فرد کے اندر ایسا ہوگا تو پورا معاشرہ بھی اسی ڈھنگ پر بننا شروع ہو جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں ہر طرف منافقت کی فضا پیدا ہوگی۔ انصاف پسندی کے بجائے تعصب اور حقیقت بیانی کے بجائے غیر سنجیدہ کلام کا عام رواج ہو جائے گا جو آخر کار پورے معاشرہ کو فاسد معاشرہ بنا دے گا۔

سدید کلام اور غیر سدید کلام کی ایک مثال وہ ہے جو زید بن حارثہ کے واقعہ کے ذیل میں سامنے آئی۔ زید بن حارثہ کی حیثیت مدینہ میں غلام کی تھی، اور زینب بنت جحش بنو ہاشم کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے درمیان نکاح کر دیا۔ مگر مذکورہ فرق کی بنا پر دونوں میں نباہ نہ ہو سکا اور آخر کار طلاق ہو گئی۔ طلاق کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب سے نکاح فرمالیا۔

اس واقعہ کو بتانے کے لئے "قول سدید" کا انداز یہ تھا کہ یہ کہا جائے کہ زینب جو کہ مطلقہ ہو چکی تھیں، ان سے عدت گزرنے کے بعد پیغمبر اسلام نے نکاح کر لیا اور ان کو شرعی طور پر اپنی ازواج میں شامل کر لیا۔ مگر مدینہ کے منافقین نے اس واقعہ کو غیر سدید انداز میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ پیغمبر اسلام کو زینب پسند آگئی تھیں۔ اس لئے انھوں نے تدبیر کر کے ان کو طلاق دلوایا اور پھر پیشگی منصوبہ کے مطابق خود ان سے نکاح کر لیا۔

مدینہ کے منافقین نے اس واقعہ کو جس طرح پیش کیا وہ ایک صحیح واقعہ کو غلط شکل میں بیان کرنا ہے۔ یہ غیر سدید کلام اپنی زبان سے نکالنا ہے۔ اور غیر سدید کلام اپنی زبان سے نکالنا بلاشبہ بہت بڑا جرم ہے۔ ایسا ایک کلام آدمی کے تمام اعمال کو حبط کر سکتا ہے۔ اس سے آدمی کی اپنی روح بھی گندی ہوتی ہے اور اگر ایسی بات سماج میں پھیل جائے تو وہ سماج کو بھی فساد اور بگاڑ کی طرف لے جانے کا سبب بن جائے گی۔

قول سدید (الاحزاب ۷۰) کے معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک اور مثال لیجئے۔ ابو الفداء الحافظ ابن کثیر نے معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے:

قد روی عن الحسن البصری انہ کان ینقم علی معاویۃ اربعۃ اشیاء۔ قتالہ علیاً وقتلہ حجر بن عدی واستلحاقہ زیاد بن ابیہ ومبایعتہ لیزید ابنہ (البدایۃ والنہایۃ ۸/۱۳۰)

حسن بصری کے بارہ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ چار چیزوں کے لئے معاویہ پر سخت کراہت کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا علی سے لڑنا، ان کا حجر بن عدی صحابی کو قتل کرنا، ان کا زیاد بن ابیہ کو اپنے نسب میں ملانا، اور ان کا اپنے بیٹے یزید کے لئے بیعت لینا۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کا ایک انداز یہ ہے کہ اس کو بتانے کے لئے وہی الفاظ بولے جائیں جو

ابن کثیر نے نقل کئے ہیں۔ یعنی یہ کہا جائے کہ امام حسن بصری نے امیر معاویہ رضؓ کی چار باتوں سے عدم اتفاق کا اظہار کیا ہے۔ یہ قول سدید کا انداز ہے۔ اگر ایسا کہا جائے تو اس سے کسی قسم کی کوئی خرابی واقع نہ ہوگی۔

اس کے برعکس دوسرا انداز یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ "حسن بصری صحابۂ کرام پر جارحانہ تنقید کرتے تھے" یہ دوسرا کلام غیر سدید قول کی مثال ہے۔ کیوں کہ وہ ایک واقعہ کی تعمیم ہے۔ وہ ایک سادہ بات کو سنگین بات بنا کر پیش کرنا ہے۔ ایسا قول خود کہنے والے کے لئے بھی جرم کی حیثیت رکھتا ہے اور سننے والوں کے اندر بھی وہ غلط اثرات پیدا کرنے والا ہے۔

دونوں جملوں میں بظاہر صرف چند الفاظ کا فرق ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ حتیٰ کہ ایک جملہ بولنا پوری طرح جائز ہے، اور دوسرا جملہ بولنا پوری طرح ناجائز۔

آدمی کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کی پوری شخصیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ مذکورہ دونوں جملوں کا ہے۔ پہلا جملہ سنجیدہ ذہن کا پتہ دیتا ہے اور دوسرا جملہ غیر سنجیدہ ذہن کا۔ پہلے جملہ میں احتیاط کی نفسیات جھلکتی ہے اور دوسرے جملہ میں بے احتیاطی کی نفسیات۔ پہلے جملہ میں معاملہ کو جیسا ہے ویسا ہی بیان کیا گیا ہے اور دوسرے جملہ میں اس کو خود ساختہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلا جملہ حقیقت پر مبنی کلام ہے اور دوسرا جملہ حقیقت سے ہٹا ہوا کلام۔

پہلا جملہ خدا سے ڈرنے والے انسان کا کلام ہے اور دوسرا جملہ خدا سے نہ ڈرنے والے انسان کا کلام۔ پہلا جملہ منصفانہ قول کا نمونہ ہے اور دوسرا جملہ ظالمانہ قول کا نمونہ۔ پہلا جملہ بولنا شرعی اعتبار سے کوئی جرم نہیں، مگر دوسرا جملہ بولنے والا یقینی طور پر شریعت کی نظر میں اپنے آپ کو مجرم ثابت کرتا ہے۔ حسن بصری نے تو کبھی ایسا نہیں کیا کہ وہ صحابۂ کرام کی جماعت پر جارحانہ تنقید کریں۔ انھوں نے صرف ایک صحابی کی بعض روش سے اظہار اختلاف کیا، جو ان کے نزدیک، دوسرے صحابہ کی روش سے ہٹی ہوئی تھی۔

مگر جب ایک شخص اس طرح کہے کہ "حسن بصری صحابۂ کرام پر جارحانہ تنقید کرتے ہیں۔" تو خود یہ کہنے والا یقینی طور پر "جارحانہ تنقید" کا مجرم بن گیا۔ کیوں کہ جو الزام مخاطب کے اوپر چسپاں نہ ہو وہ خود متکلم کی اپنی طرف لوٹ آتا ہے۔

ارکان اسلام

عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بنی الاسلام علی خمسٍ شہادۃِ اَنْ لا الٰہ اِلّا اللہ و اَنّ محمداً عبدُہ ورسولہ واِقام الصلاۃِ وایتاءِ الزکاۃِ والحجِّ وصومِ رمضانَ (متفق علیہ)

حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

اس حدیث کے مطابق ، اسلام میں پانچ چیزیں ستون (pillars) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح عمارت کچھ ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے، اسی طرح اسلامی زندگی پانچ ارکان پر قائم ہوتی ہے۔ یہ پانچ ارکان بظاہر پانچ شکلی چیزوں کے نام ہیں۔ یعنی کلمۂ ایمان کے الفاظ کو دہرانا۔ صلاۃ کے ڈھانچہ کو قائم کرنا ، زکوٰۃ کی مقررہ رقم نکالنا ، حج کے مراسم کو ادا کرنا۔ رمضان کے صوم کا اہتمام کرنا ۔ مگر اس کا مطلب شکل برائے شکل نہیں بلکہ شکل برائے اسپرٹ ہے۔ یعنی ان شکلی احکام کی ایک حقیقت ہے اور ان کی وہی ادائگی معتبر ہے جس میں اس کی حقیقت پائی جائے۔

اس دنیا میں ہر چیز کا معاملہ یہی ہے ۔ مثلاً ٹیلیفون کو لیجئے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ٹیلیفون کی ایک ظاہری صورت ہوتی ہے۔ مگر یہی ظاہری صورت وہ چیز نہیں ہے جو اصلاً ٹیلیفون سے مطلوب ہو۔ ٹیلیفون برائے ٹیلیفون مطلوب نہیں ہوتا بلکہ ٹیلیفون برائے رابطہ مطلوب ہوتا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ میرے پاس ٹیلیفون ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ٹیلیفون کی صورت آپ کے پاس موجود ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ٹیلیفون کی حقیقت آپ کے پاس موجود ہے۔ یعنی ایک ایسی مشین جس کے ذریعہ دنیا کے ہر حصہ سے ربط قائم کیا جاسکے۔ جس کے ذریعہ دور کے لوگوں سے گفتگو کی جاسکے۔

یہی معاملہ اسلام کے مذکورہ پانچ ارکان کا بھی ہے۔ یہ ارکان اسی وقت ارکان اسلام ہیں جب کہ ان کو اس طرح اختیار کیا جائے کہ ان کی شکل کے ساتھ ان کی معنوی روح بھی آدمی کے اندر پائی جا رہی ہو روح کو جدا کرنے کے بعد شکل کا موجود ہونا ایسا ہی ہے جیسے اس کا موجود نہ ہونا۔

ایمان اسپرٹ ——— سب سے پہلا رکن ایمان ہے۔ اس کی ظاہری صورت کلمۂ اسلام کی زبان سے ادائگی ہے۔ اور اس کی معنوی اسپرٹ اعتراف ہے۔ اس کلمہ کے ذریعہ ایک انسان خدا کا اس کے تمام صفات کمال کے ساتھ اعتراف کرتا ہے۔ وہ محمد عربی کی اس حیثیت کا اعتراف کرتا ہے کہ خدا نے ان کو میرے لئے اور تمام انسانوں کے لئے ابدی رہنما بنایا۔ یہ حقیقت جس کے دل میں اتر جائے وہ اس کی پوری نفسیات میں شامل ہو جاتی ہے۔ ایسے آدمی کا سینہ سچائی کے اعتراف کے لئے کھل جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جس کے لئے کوئی بھی چیز کبھی حق کے اعتراف میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

صلاۃ اسپرٹ ——— صلاۃ کی ظاہری صورت پنج وقتہ عبادت ہے اور اس کی معنوی اسپرٹ تواضع ہے۔ صلاۃ کا عمل کرنے والا آدمی اپنے رب کے آگے جھکتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اندر تواضع کی نفسیات پیدا کرتا ہے۔ جس آدمی کے اندر صلاۃ اسپرٹ پیدا ہو جائے وہ گھمنڈ اور انانیت جیسی چیزوں سے یکسر خالی ہو جائے گا۔ اس کا رویہ ہر معاملہ میں تواضع کا رویہ بن جائے نہ کہ فخر اور کبر کا رویہ۔

زکاۃ اسپرٹ ——— زکاۃ کی ظاہری صورت سالانہ ایک مخصوص رقم کی ادائگی ہے اور اس کی معنوی اسپرٹ خدمت ہے۔ جو آدمی زکاۃ کا عمل کرے اس کے اندر خلق کے لئے خدمت اور خیر خواہی کا عمومی جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ چاہے گا کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکے۔

حج اسپرٹ ——— حج اپنے ظاہر کے اعتبار سے سالانہ مراسم کی ادائگی ہے اور اس کی معنوی اسپرٹ اتحاد ہے۔ جو آدمی صحیح کیفیت کے ساتھ حج کے فرائض ادا کرلے اس کے اندر اختلافی نفسیات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ اتحاد و اتفاق کے مزاج کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہنے لگے گا، حتی کہ اس وقت بھی جب کہ دوسروں کے ساتھ اس کا اختلاف پیش آگیا ہو۔

صوم اسپرٹ ——— صوم کی ظاہری صورت رمضان کے مہینہ کا روزہ ہے اور اس کی معنوی اسپرٹ صبر ہے۔ صوم کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کے اندر صبر کی اسپرٹ پیدا ہو۔ جو آدمی صوم کا عامل ہو، اس کے اندر یہ عمومی مزاج پیدا ہو جائے گا کہ وہ ناخوش گوار باتوں کو برداشت

کرے ، وہ لوگوں کی قابل شکایت باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے زندگی گزارے۔

جو لوگ اسلام کے ان پانچ ارکان کو محض ان کی شکل کے اعتبار سے اختیار کریں، وہ مخصوص شکل کی حد تک تو ان کو اپنائیں گے، مگر ان شکلوں کے باہر ان کی زندگی ان ارکان سے بالکل آزاد اور غیر متعلق ہوگی۔

مثلاً وہ کلمۂ ایمان کے الفاظ کو اپنی زبان سے دہرائیں گے، مگر ان مخصوص الفاظ کے باہر جب ان کے سامنے کوئی حق آئے گا تو وہ اس کا اعتراف نہ کر سکیں گے۔ کیوں کہ ان کی روح کلمہ کی اسپرٹ سے خالی ہے۔ وہ نماز کی شکل کو مسجد میں کھڑے ہو کر دہرائیں گے۔ مگر مسجد کے باہر جب لوگوں کے ساتھ ان کا سابقہ پیش آئے گا تو وہاں وہ تواضع کا انداز اختیار نہ کر سکیں گے، اور اس کی وجہ یہ ہوگی نماز کی جو اسپرٹ ہے وہ ان کے اندر موجود نہیں۔

اسی طرح وہ زکوٰۃ کے نام پر ایک رقم نکال کر کسی کو دیدیں گے۔ مگر اس کے بعد جب وہ لوگوں کے ساتھ معاملات کریں گے تو اس میں وہ خیر خواہی کا ثبوت نہ دے سکیں گے، کیوں کہ زکاۃ اسپرٹ سے ان کا سینہ خالی تھا۔ وہ اہتمام کے ساتھ حج کا سفر کریں گے اور اس کے مراسم ادا کر کے واپس آجائیں گے مگر وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں گے کہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے ساتھ اتحاد و اتفاق کا معاملہ کریں۔ کیوں کہ انھوں نے حج کے باوجود حج اسپرٹ اپنے اندر پیدا نہیں کی۔ رمضان کا مہینہ آئے گا تو وہ موسمی عبادت کے طور پر ایک مہینہ کا روزہ رکھ لیں گے۔ مگر وہ صبر کے موقع پر صبر نہیں کریں گے۔ وہ ہر اشتعال پر مشتعل ہو کر لڑنے لگیں گے۔ اور اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ظاہری طور پر انھوں نے روزہ تو رکھ لیا، مگر ان کے دل و دماغ میں روزہ کی اسپرٹ پیدا نہ ہو سکی۔

جو آدمی اسلام کے پانچ ارکان کو اختیار کر لے وہ مومن و مسلم ہو گیا۔ وہ اس کا مستحق ہو گیا کہ دنیا میں اس کو اللہ کی رحمت ملے اور آخرت میں اس کو جنت میں داخل کیا جائے۔ مگر اسلام کے پانچ ارکان اپنی شکل اور روح دونوں کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ ان کی ادائگی پر جن انعامات کا وعدہ ہے اس کا تعلق کامل ادائگی پر ہے نہ کہ ادھوری ادائگی پر۔

اسلام کے بارہ میں اس غلط فہمی کی ذمہ داری تمام تر نااہل مسلم رہنماؤں پر ہے۔ موجودہ
.مانہ کے مسلم رہنماؤں نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے قومی مسائل کو دی ۔ چنانچہ جو قومیں
نھیں ان کے قومی حوصلوں میں رکاوٹ نظر آئیں ، وہ ان کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے
ہو گئے ۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام اینٹی امریکن ازم ، یا اینٹی ویسٹرن ازم کے ہم معنی بن گیا۔
گر یہ رہنما دوسرے انسانوں کی نجات آخرت کے لئے تڑپتے تو وہ دوسرے انسانوں کے
سامنے واللہ یدعوا الی دارالسلام (یونس ۲۵) کا پیغام لے کر کھڑے ہوتے۔ یہ چیز
نھیں دوسری قوموں کا خیرخواہ بناتی۔ دوسری قومیں ان کے لئے محبت کا موضوع بن جاتیں۔
ور پھر لوگوں کو نظر آتا کہ اسلام ہمارا موافق مذہب ہے نہ کہ ہمارا مخالف مذہب۔

یہ بلاشبہ اسلام کے حق میں سب سے بڑا نقصان ہے ، اور اسلام کو یہ نقصان
س کے دشمنوں نے نہیں پہنچایا بلکہ اسلام کے نادان دوستوں نے اسلام کو یہ سب سے
ڑا نقصان پہنچایا ہے۔

امریکہ کے شہر پلین فیلڈ (Plainfield) سے ایک میگزین نکلتا ہے۔ اس کا نام اسلامک
ورائزن (Islamic Horizons) ہے۔ اس کا شمارہ جولائی ۔ اگست ۱۹۹۰ دیکھنے کا
تفاق ہوا۔ اس کے صفحہ ۳۹ پر " انڈین مسلم ریلیف کمیٹی " کا اشتہار تھا۔ اس میں اپیل
ی گئی تھی کہ فلاں پتہ پر اپنے عطیات (donations) روانہ کریں۔ اس اشتہار میں یہ
لفاظ درج تھے کہ چوں کہ ہندستان کے مسلمان کہتے ہیں کہ صرف اللہ ہمارا رب ہے ، اس لئے
بے رحمانہ اور وحشیانہ ظلم ان پر ٹوٹ پڑا ہے ، مکمل گرہن کی مانند :

Because Muslims in India say, "Allah is our Lord," ruthless and brutal oppression has come upon them like a full eclipse.

یہ الفاظ نہ صرف واقعہ کے خلاف ہیں بلکہ وہ قرآن و حدیث کی نفی کے ہم معنی ہیں ۔
ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد ۲۰۰ ملین بتائی جاتی ہے۔ یہ تعداد دور اول کے صحابہ و
تابعین کی مجموعی تعداد سے بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر واقعۃً مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کو
صرف اس لئے وحشیانہ طور پر ستایا جائے کہ وہ اللہ کو اپنا رب کہتے ہیں تو ناممکن ہے کہ کوئی ستانے

والا ان کو ستانے میں کامیاب ہو۔ ایسی صورت میں یقیناً اللہ کی غیرت جوش میں آئے گی اور پھر ظالموں کو زیر کر دیا جائے گا اور حق کی خاطر مظلوم ہو جانے والوں کو غلبہ عطا ہوگا۔

کیسے بے خبر ہیں وہ لوگ جو مخلوق کے ظلم کو جانیں مگر وہ خالق کے انصاف کو نہ جانیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو انسان کی طاقت کو جانیں مگر وہ خداوند ذوالجلال کی طاقت سے بے خبر بنے ہوئے ہوں۔

صغیر اسلم صاحب کی یہاں کپڑے کی ایک بڑی دکان (اسٹور) ہے۔ اس میں کپڑے کو رکھنے کے لئے انھیں خاص طرح کی الماریوں کی ضرورت تھی۔ اس سلسلہ میں ایک بڑھئی (Bobbie) ان کی دکان میں کام کر رہا تھا۔ ۲۹ نومبر کی شام کو میں ان کے اسٹور میں گیا۔ میں نے بڑھئی کو کام کرتے ہوئے دیکھا تو بے ساختہ میری زبان سے نکلا: امریکی بڑھئی ہونا ایک ایڈوانچ ہے۔

ہر قسم کی تیار شدہ لکڑی، ہر قسم کا عمدہ لوہے کا سامان، ان کو کاٹنے اور جوڑنے کے لئے ہر قسم کی دستی مشین۔ اسکریوگن (screw gun) وغیرہ بڑھئی کے پاس موجود تھیں۔ وہ ان کے ذریعہ اس طرح فینسی الماریاں بنا رہا تھا جیسے کہ یہ کوئی خشک کام نہ ہو بلکہ ایک تفریحی عمل ہو۔ ترقی یافتہ ملکوں میں شراب اور جنسی آزادی جیسی خرابیاں بہت افسوسناک ہیں۔ مگر تکنیک کے اعتبار سے ان ملکوں میں اور ہندستان جیسے ملکوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں ہم لوگ ابھی پتھر کے دور میں رہ رہے ہیں۔

ہندستان میں بے شمار تحریکیں ہیں جو تخریب کے کارنامے انجام دے رہی ہیں۔ مگر کوئی ایک بھی ایسی تحریک نہیں جو حقیقی معنوں میں تعمیری مقاصد کے لئے سرگرم ہو، جو ملک کو آگے لے جانے کی کوشش کرے۔ تحریکوں کے ہجوم میں تحریک کے فقدان کی یہ کیسی عجیب مثال ہے جو ہندستان میں پائی جاتی ہے۔

یہ ایک جدید طرز کا اسٹور تھا۔ یہاں میز پر نہایت شاندار چھپے ہوئے بہت سے کیٹلاگ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ملبوس مردوں اور عورتوں کی رنگین تصویروں کے ذریعہ کپڑوں کی نمائش کی گئی تھی۔ ایک صفحہ پر کپڑوں کی نمائش کرتے ہوئے یہ الفاظ درج تھے —— سنسنی خیز، تمام نگاہیں تمہارے اوپر:

Sensational... all eyes on you.

عام لوگ پرکشش کپڑے پہن کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ لیڈروں کا طبقہ بھی یہی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ خوشنما کپڑوں کے ذریعہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں قابل توجہ بناتے ہیں اور لیڈر لوگ خوشنما تقریروں کے ذریعہ۔

مردوں اور عورتوں کے ایک مشترک اجتماع میں خطاب کا موقع ملا۔ خطاب کے بعد کچھ سوالات سامنے۔ ایک خاتون کی طرف سے ایک تحریری سوال آیا، اس کا خلاصہ یہ تھا: جب کسی کے برے سلوک سے دل کو سخت رنج پہنچتا ہے تو اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

میں نے سوچا کہ اس سوال کا جواب تو قرآن وحدیث میں انتہائی واضح ہے۔ قرآن وحدیث میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر معافی اور درگذر سے کام لو، تم اگر بندوں سے درگذر کرو تو خدا قیامت کے دن تم سے درگذر کا معاملہ فرمائے گا۔ ان واضح ہدایات کے باوجود کیوں ایک دیندار اور تعلیم یافتہ خاتون ایسا سوال پوچھ رہی ہیں۔

میری سمجھ میں آیا کہ اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ زمانہ کے نااہل لیڈروں پر ہے۔ ان لیڈروں نے موجودہ زمانہ میں جو سب سے بڑی دھوم مچائی وہ غیر اقوام کے "برے سلوک" پر فریاد واحتجاج کا مظاہرہ تھا۔ اسی قسم کی سطحی تقریروں اور تحریروں پر انھوں نے پوری قوم کو اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن وحدیث کی مذکورہ تعلیم پوری قوم کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ مسلمانوں کو صرف یہ سکھایا گیا کہ تمھیں اشتعال انگیزی پر مشتعل ہونا ہے۔ رنج کا تجربہ ہونے پر تم کو شدت کے ساتھ اس کے خلاف ردعمل کا اظہار کرنا ہے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ قوم کے افراد قرآن کی ان تعلیمات کی اہمیت کو سمجھیں جن میں عفو ودرگذر اور صبر واعراض کی تلقین کی گئی ہے۔

روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (۳۰ نومبر ۱۹۹۰) کے پہلے صفحہ پر یہ سنسنی خیز خبر تھی ـــــ صدام حسین کو کویت سے نکل جانے کے لئے صرف ۴۷ دن:

Saddam has 47 days to get out

اقوام متحدہ کی سیکوریٹی کونسل نے تقریباً متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس کیا ہے کہ عراق کے صدر صدام حسین ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک بلا شرط کویت کا علاقہ خالی کر دیں، ورنہ امریکہ کو حق ہوگا کہ وہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کرے۔

اس خبر کو میں نے پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہی معاملہ ہر انسان کا ہے، حتی کہ خود مذکورہ الٹی میٹم دینے والوں کا بھی۔ ہر انسان جو اس دنیا میں اپنی زندگی بنا رہا ہے، اس کو خدا کی طرف سے قطعی آگاہی دے دی گئی ہے کہ تمہارے لئے صرف "۶۴ دن" کا موقع ہے۔ یا تو تم اس مدت میں اپنی سرکشی چھوڑ دو، ورنہ تم کو خدا کی دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد تمہارے لئے بربادی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہوگا۔ لوگ دوسروں کے خلاف الٹی میٹم دینے میں مشغول ہیں، خود اپنے خلاف الٹی میٹم کی کسی کو خبر نہیں۔

امریکہ میں "پیپر ردی والا" جیسی آواز کہیں سنائی نہیں دیتی۔ کیونکہ یہاں اخباروں کو ردی میں بیچنے کا کوئی رواج نہیں۔ یہاں اخبارات کا واحد استعمال یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد انھیں کوڑے میں ڈال دیا جائے۔ جب کہ ہندستان میں آدمی اخبارات کو ردی میں بیچ کر ان کی تقریباً نصف لاگت واپس حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود امریکہ میں اخبارات اور میگزین نہایت عام ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قیمتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ یہاں اخبار والے صرف یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے اخبار کو پڑھیں۔ کیوں کہ ان کی قیمت تو انھیں ان کے مشتہرین ادا کر چکے ہوتے ہیں۔

یہاں میں روزانہ اخبار پڑھتا تھا۔ مگر پوری مدت میں یہاں کے اخبارات میں ہندستان کی کوئی خبر پڑھنے کو نہیں ملی۔ سنگاپور جیسے چھوٹے ملکوں کی خبریں تھیں۔ مگر ہندستان کی کوئی خبر نہیں۔ البتہ ہندستان میں کوئی بڑا فساد ہو جائے تو اس کی خبر ضرور یہاں کے اخباروں میں چھپتی ہے۔ اس طرح کی خبریں یہاں کے لوگوں کو یہ تسکین فراہم کرتی ہیں کہ صرف ہمارا سماج مہذب سماج ہے۔ بقیہ دنیا میں وحشت و بربریت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہندستان کی انتہاپسند تحریکیں صرف ملک دشمنی کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ کیوں کہ وہ ایسی خبریں تخلیق کرنے میں مشغول ہیں جن کا دوسری قوموں کو نہایت شدت کے ساتھ

انتظار ہے۔

۲۹ نومبر کو دوپہر کا وقت تھا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے یہاں کی گھڑی میں دیکھا تو وہ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ اس کے بعد میری نظر اپنے ہاتھ کی گھڑی پر گئی تو اس میں ایک بجے کا وقت تھا۔ ایک لمحہ کے لئے یہ فرق عجیب لگا۔ پھر خیال آیا کہ میری گھڑی میں دہلی کا وقت ہے۔ اور کیلی فورنیا اور دہلی کے وقت میں ساڑھے دس گھنٹہ کا فرق پایا جاتا ہے۔ اس وقت جب کہ میں کیلی فورنیا میں ساڑھے گیارہ بجے دن کی روشنی میں بیٹھا ہوا ہوں، دہلی کے لوگ ایک بجے رات کے اندھیرے میں اپنے گھروں کے اندر سو رہے ہوں گے۔ کیلی فورنیا میں آج ۲۹ نومبر کی تاریخ ہے، مگر دہلی کا انسان اس وقت نومبر کی ۳۰ تاریخ میں داخل ہو چکا ہے۔ کیلی فورنیا میں اس وقت تمام سرگرمیاں اپنے شباب پر ہیں، جب کہ دہلی میں تمام انسانی سرگرمیاں رات کے سناٹے میں روپوش ہو چکی ہیں۔

زمین کی سطح پر رات اور دن کا یہ فرق سورج کے سامنے زمین کی گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ خلائے بسیط میں زمین کی یہ گردش اتنی حیران کن ہے کہ اس کے بارہ میں سوچ کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آدمی بے اختیار ہو کر سجدہ میں گر پڑے۔

انوار حسن صاحب (۵۴ سال) ایک امریکی کمپنی (GHG) میں کام کرتے ہیں۔ اتوار کے دن وہ رضاکارانہ طور پر ایک اسلامک سنٹر میں "سیکوریٹی" کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ اتوار کے دن اس سنٹر میں کافی مسلمان آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں کہا کہ انڈیا اور پاکستان کے جو مسلمان یہاں آتے ہیں، وہ امریکیوں کے درمیان تو بہت بااصول طور پر رہتے ہیں۔ "سر" کہے بغیر ان سے بات نہیں کرتے۔ مگر جب وہ اسلامک سنٹر میں آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی جنگل میں آگئے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیجئے۔ انھوں نے کہا کہ مثال کے طور پر جب وہ امریکی دفتروں میں جاتے ہیں تو وہاں وہ گاڑیوں کے قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں۔ مگر اسلامک سنٹر میں آتے ہی ان کا انداز بدل جاتا ہے۔ پچھلے سنڈے کو میں سنٹر کے گیٹ پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ ایک مسلمان اپنی مرسیڈیز پر آئے اور نکلنے والے دروازہ (exist)

سے داخل ہونے لگے۔ میں نے روکا تو مجھ سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اگر یہ بیان صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ موجودہ مسلمان (کم از کم ان کی اکثریت) اصول کے تحت باقاعدگی اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ صرف ڈر کے تحت باقاعدہ بننا جانتی ہے۔

امریکہ کے مختلف شہروں میں اس وقت اسلامک سنٹر کے نام سے ایک ہزار سے زیادہ ادارے قائم ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے کہ عملی حالت کے اعتبار سے یہ ادارے مسلم کلچرل سنٹر ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامک سنٹر۔ یہ مسلمانوں کی سماجی اور ثقافتی ضرورت کا اظہار ہیں نہ کہ اسلام کے اصولی اور دعوتی تقاضے کا اظہار۔

امریکہ کے شہروں میں آپ کو بس اور ٹرام اور ریلوے دکھائی نہیں دیں گی۔ اس کے برعکس ان سڑکوں پر ہر وقت کاروں کا مشینی سیلاب بہتا رہتا ہے۔ بظاہر یہ ترقی کی علامت ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا یہ سرمایہ دارانہ استحصال ہے۔ یہاں کے سرمایہ دار منظم طور پر یہ کوشش کرتے رہتے ہیں یہاں پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام قائم نہ ہونے پائے تاکہ ان کی کاریں زیادہ سے زیادہ فروخت ہوں۔ یہاں رہنے والا ایک شخص نہایت آسانی سے قسط وار ادائگی کی بنیاد پر ایک یا زیادہ کار خرید سکتا ہے (اور اسی طرح دوسری تمام چیزیں بھی) اس طرح یہاں کا تقریباً ہر آدمی اپنی کمائی کا بہترین حصہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے اکاونٹ میں پہنچاتا ہے، سامان کی ادھار خریداری کی صورت میں، نیز اس کے اوپر مستقل سود کی ادائگی کے ذریعہ۔

قرض پر مبنی اس اقتصادیات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ لوگوں کے پاس دین کی مدیں دینے کے لئے بہت کم رقم باقی رہتی ہے۔ بظاہر یہاں کا ہر مسلمان کافی کمارہا ہے مگر دین کی مدوں میں تعاون دینے کے لئے وہ اپنے آپ کو عاجز پاتا ہے۔

۲ دسمبر کو سین گیبریل (San Gabril Valley) کے اسلامک سنٹر میں تقریر کا پروگرام تھا۔ جناب عبدالقادر النجار کے ساتھ یہ سفر طے ہوا۔ موصوف کا خاندان طائف سے آکر حلب (شام) میں آباد ہو گیا۔ ۲۷ سال پہلے وہ حلب سے امریکہ آگئے۔ اب وہ یہاں کے شہری ہو چکے ہیں۔ وہ پر جوش حد تک دین پسند آدمی ہیں۔ جاتے اور آتے ہوئے مجموعی طور پر ۷۰

کیلو میٹر کا راستہ ان کے ساتھ گزرا۔

انھوں نے ایک واقعہ کے بارہ میں بتاتے ہوئے کہا: قل الحق و لو علی نفسك (حق بات کہو، خواہ، وہ تمہارے اپنے خلاف کیوں نہ ہو) ایک اور واقعہ کے ذیل میں انھوں نے کہا: ان اللہ یُمہِلُ ولا یُہمِلُ (اللہ مہلت دیتا ہے مگر اللہ کبھی چھوڑتا نہیں)

روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (۴ دسمبر ۱۹۹۰) میں صفحہ اول پر ایک باتصویر خبر ہے۔ تصویر میں ایک جہاز (DC-9) ٹوٹا ہوا پڑا ہے۔ اس کو شعلے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ہوائی حادثہ کا قصہ ہے جو امریکہ کی ریاست مشی گان میں ڈیرائٹ کے ہوائی اڈہ پر پیش آیا۔ آٹھ مسافر فوراً مر گئے۔ بقیہ ۱۸ مسافروں میں کچھ زخمی ہوئے، اور کچھ پریشانی کی حالت میں باہر آئے۔

اس واقعہ کی رپورٹ دیتے ہوئے اخبار نے لکھا تھا کہ یہ واقعہ اس لئے پیش آیا کہ ایک جہاز (727) ایئر پورٹ کے کہر آلود رن وے (foggy runway) پر چلتے ہوئے دوسری طرف سے آنے والے جہاز کے راستہ میں داخل ہو گیا جو اڑنے والا تھا۔ اس کے بعد ایک جہاز کا پر دوسرے جہاز کے پر میں ٹکرا گیا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ اس وقت ایئر پورٹ پر گہرا کہر چھایا ہوا تھا:

> One Northwest Airlines jet strayed into the path of another that was streaming toward takeoff and the two collided in heavy fog on a runway at Detroit Metropolitan Airport.

اس خبر کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ "کہر" کا مسئلہ ہر سفر میں پیش آتا ہے، خواہ وہ مادی سفر ہو یا کوئی ذہنی سفر۔ آدمی اگر صرف روشن راہوں میں چلنا جانتا ہو، وہ کہر کے راستوں میں چلنے کے آداب نہ جانتا ہو تو اس کا یہی انجام ہوگا کہ وہ مخالف سمت سے آنے والی کسی "سواری" سے ٹکرا جائے گا۔ ایسا آدمی اپنی آخری منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔

۶ دسمبر کو جب کہ کیلی فورنیا میں صبح سویرے کا وقت تھا اور دہلی میں شام کا، مجھے دہلی سے بات کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے جناب صغیر اسلم صاحب سے کہا۔ انھوں نے

اپنے ٹیلیفون پر حسب ذیل نمبروں کے بٹن دبائیے:

011-91-11-611128

اس کے فوراً بعد دہلی میں ہمارے دفتر میں گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سوچا کہ جس دنیا میں یہ ممکن ہے کہ کیلی فورنیا کا ایک انسان دہلی کے ایک انسان سے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں رابطہ قائم کرلے، اس دنیا میں کیا یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنے خالق سے رابطہ قائم کرسکے۔ دل نے کہا یقینی طور پر ممکن ہے۔ مگر اس کے لئے اسی طرح صحیح تدبیر اختیار اختیار کرنی ہوگی جو کیلی فورنیا اور دہلی کے درمیان ربط قائم کرنے کے لئے اختیار کی گئی۔ اس ربط کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ ہم مذکور نمبروں کا اہتمام نہ کرتے بلکہ دوسرے غیر متعلق نمبروں پر اپنی انگلیاں مارنے لگتے۔ ایسی حال میں ہماری کوشش بے فائدہ ہو جاتی۔ اس کے بجائے ہم نے یہ کیا کہ صحیح ترین نمبر معلوم کرکے عین اسی نمبر کے ذریعہ ربط قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایسا کرتے ہی فوراً ربط قائم ہو گیا۔

اسی طرح خدا سے ربط قائم کرنے کا بھی ایک "صحیح نمبر" ہے اور ایک "غلط نمبر" جو شخص خدا سے ربط قائم کرنے کی سنجیدہ خواہش رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ پہلے اس کا "صحیح نمبر" معلوم کرے۔ ایسا کرنے کے بعد خدا سے اس کا ربط قائم ہونا اتنا ہی ممکن ہو جائے گا جتنا کیلی فورنیا اور دہلی کے درمیان ربط قائم ہونا۔ یہ صحیح نمبر اپنی ذات کو حذف کرنا ہے۔

جناب صفی قریشی صاحب نے ایک مجلس میں بہت اچھی مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ آجکل مصنوعی سٹلائٹ خلا میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہ سٹلائٹ اوپر جا کر ۲۰۰ میل یا اس سے کم و بیش دوری پر زمین کے گرد گھومنے لگتے ہیں۔ مگر ان کی عمر کی ایک مدت ہے۔ ایک مدت گزرنے کے بعد وہ زمین کی کشش کے دائرہ میں آکر زمین کی طرف کھنچنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ آتے آتے ایک روز زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح انسان ایک مقرر مدت کے لئے اس دنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد اس کا واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ دوبارہ خدا کی طرف چلا جاتا ہے۔

۶ دسمبر کو ظہر کی نماز کے بعد آخری بار میں یہاں کے پارک میں گیا۔ پارک کے پاس پہنچا دیکھا کہ ملی ہوئی سڑک سے ایک بہت بوڑھا امریکن جوڑا خاص طرح کی کھلی ہوئی چھوٹی گاڑی کو آ

چلاتا ہوا گزر رہا ہے۔ میری نظر ان لوگوں کی طرف گئی تو مرد نے ہاتھ اٹھا کر ہائی (ہیلو) کہا۔ میں پارک کے اندر داخل ہو رہا تھا اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے دوسری طرف جا رہے تھے۔

اس واقعہ میں مجھے خود اپنا وداعی سفر دکھائی دینے لگا۔ میں نے کہا: کل مجھے یہاں سے جانا ہے اسی طرح ایک اور کل آئے گا جب کہ میں اس دنیا کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ پہلے سفر کی منزل معلوم ہے، مگر دوسرے سفر کی منزل معلوم نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ دوسرے سفر میں میرے اوپر کیا بیتنے والا ہے۔

کچھ دیر تک میں پارک میں بیٹھا۔ خوبصورت پارک، سرسبز درختوں سے ڈھکے ہوئے مکانات، ہوا کے خوش گوار جھونکے، سڑک پر پھسلتی ہوئی کاریں، سورج کی سنہری روشنی میں اڑتے ہوئے ہوائی جہاز، اس طرح کے مختلف مناظر کے درمیان میں نے سوچا کہ خدا نے کتنی زیادہ نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں۔ لوگ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں جو ان بے پایاں نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا: خدایا، میں ساری انسانیت کی طرف سے تیرا شکر ادا کرتا ہوں تاکہ ان کے اوپر تیرا غضب نازل نہ ہو جائے۔

۴ دسمبر کو ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی صاحب کے ساتھ لاس اینجلیز گیا۔ وہاں کے اسلامک سنٹر میں چند گھنٹے گزرے۔ امریکی فوج کے تحت کیلی فورنیا میں ایک نشریاتی ادارہ (Armed Forces Radio & Television Broadcast Centre) عرصہ سے قائم ہے۔ اس کے نمائندہ کے طور پر مسٹر رچرڈ ڈیون پورٹ (Richard Davenport) وہاں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا ادارہ مختلف قسم کے ویڈیو کیسٹ تیار کرتا ہے جو امریکی فوج کے لئے ٹیلیویژن پر دکھایا جاتا ہے۔ یہ پروگرام امریکہ کی تمام فوجی تنصیبات (bases) پر دیکھا جاتا ہے۔

اس وقت امریکہ کی تقریباً چار لاکھ فوج خلیج عرب کے علاقہ میں ہے۔ مزید فوج بھی وہاں بھیجی جا سکتی ہے۔ چنانچہ امریکی فوجی اسلام اور عرب کلچر کے بارہ میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی سے ایک اچھی چیز یہ

برآمد ہوئی ہے کہ بہت سے لوگ اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں :

The one good thing that came out of this armed forces presence in the Gulf is that many people are now interested to know more about Islam and Muslim people.

یہاں پر اسلامک انفارمیشن سروس کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے۔ وہ ہر ہفتہ ایک ویڈیو ٹیپ تیار کر کے ٹیلیویژن کمپنی کو دیتا ہے اور اس کو ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے۔ مجھ سے انھوں نے ویڈیو پر ایک مفصل انٹرویو لیا۔ اس میں اسلام کے موجودہ مسائل اور امریکی مسلمان اور ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں سوالات تھے۔ میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ نااہل لیڈروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں ملک میں لینے والے گروہ (taker-group) بن گئے۔ ان کی حیثیت دینے والے گروہ (giver-group) کی نہیں۔ ان کے مسئلہ کا حقیقی حل صرف یہ ہے کہ انھیں دوبارہ دینے والے گروہ کے مقام پر لایا جائے۔

مسٹر اسلم عبد اللہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ محمد مسلم صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ یہاں وہ انگریزی میگزین (The Minaret) کے اڈیٹر ہیں۔ انھوں نے جو باتیں کہیں، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ " ہندستانی مسلمانوں کے لئے صحیح ڈائرکشن یہ ہے کہ وہ کنفرنٹیشن کو اوائڈ کرتے ہوئے کام کریں۔"

۵ دسمبر کی شام کو اسلامک سوسائٹی آرنج کاونٹی کے ہال میں ایک اجتماع میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ یہ مسلم، مسیحی اور یہودی سیمینار (Trialogue) تھا۔ پہلے ایک یہودی عالم نے تقریر کی اور اپنے مذہب کی تعلیمات کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ایک عیسائی عالم کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے مذہب کے بارہ میں تفصیل سے بتایا۔ آخر میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائرکٹر اسلامک سوسائٹی آرنج کاؤنٹی) کھڑے ہوئے، انھوں نے اسلام کا تعارف پیش کیا۔

ڈاکٹر صدیقی کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیت عطا کی ہے۔ انھوں نے اسلام کا تعارف

ایا تو ان کی تقریر پچھلی دونوں تقریروں پر بھاری ہوگئی۔ لوگوں نے نہایت پسند کیا۔ میرے
یب کی سیٹوں پر چند امریکی نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ Comparative religion
قابلی مذہب) کے طلبہ تھے۔ وہ اگرچہ مسیحی تھے اور امریکہ کی سفید فام نسل سے تعلق رکھتے
، مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر سننے کے بعد ایک نوجوان بے اختیار کہہ اٹھا کہ میں مسیحی ہوں۔ مگر ڈاکٹر
یقی کی تقریر نے مجھے اپنے عقیدہ کے بارہ میں شک میں ڈال دیا ہے اور میں دوبارہ سوچنے پر
ر ہوگیا ہوں۔ مجھے اسلام کے بارہ میں اور زیادہ جاننے کی ضرورت ہے۔ وہ واقعۃً غیر معمولی
کے لائق آدمی ہیں :

I am a Christian. But Dr. Siddiqi's presentation make me think twice. I have to learn more about Islam. He was terrific real genius.

ڈاکٹر صدیقی نے اپنی تقریر میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا تعارف کراتے ہوئے آخر میں
ں کہا تھا کہ اگرچہ تمام مذاہب خدا کی طرف سے آئے۔ مگر آج تمام مذاہب میں محفوظ مذہب
(Preserved religion) صرف ایک ہے، اور وہ اسلام ہے۔ یہی اسلام کو پیش
نے کا صحیح ترین طریقہ ہے۔ اسلامی دعوت میں ہمیں فروعی یا سیاسی باتوں کو چھوڑتے ہوئے
ف بنیادی تعلیمات کو پیش کرنا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ دیگر مذاہب کے مقابلہ
ں اسلام کی ترجیح بتانے کے لئے یہ نہیں کہنا ہے کہ اسلام افضل مذہب ہے۔ ہمیں ترجیح
نے کے لئے صرف ایک بات کہنا ہے اور وہ یہ کہ اسلام ہی آج محفوظ مذہب ہے۔ دوسرے
اہب تاریخی اعتبار سے محفوظ مذہب نہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر صدیقی جیسے افراد کی رہنمائی میں اس قسم کی سنجیدہ کانفرنسیں
ِپ اور امریکہ میں کی جائیں تو ان کے ذریعہ زبردست دعوتی فائدہ حاصل ہوگا۔ پروگرام
ہ مطابق آخر میں اختتامی کلمات مجھے کہنا تھا۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر کے بعد سوال وجواب کا
سلہ شروع ہوا۔ بعض وجوہ سے میں آخر وقت تک ٹھہر نہ سکا۔ میں خاتمہ سے پہلے
لا آیا۔

نیویارک سے جناب کلیم الدین صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے یہ خوشی کی بات بتائی

کہ وہ وہاں الرسالہ مشن کو پھیلا رہے ہیں۔ ۴ دسمبر کی شام کو دوبارہ نیویارک سے جناب محمد ابراہیم صاحب (۴۲ سال) کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کمپیوٹر انجنیئر ہیں اور ۱۸ سال سے نیویارک میں مقیم ہیں۔ وہ ۱۹۸۹ میں حج کے لئے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے دعا کی کہ خدایا، مجھے دین کا علم عطا فرما۔ واپسی پر ان کی ملاقات کلیم الدین صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے محمد ابراہیم صاحب کو الرسالہ پڑھنے کے لئے دیا۔ الرسالہ کو پڑھتے ہی انھیں محسوس ہوا کہ ان کی دعا قبول ہوگئی۔ الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کی صورت میں انھوں نے اس علم دین کو پالیا جو ان کی روح طلب کر رہی تھی۔ اب دونوں مل کر نیویارک میں الرسالہ مشن کا کام کر رہے ہیں۔

میرے نزدیک مغربی دنیا میں سب سے بڑا اسلامی مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کی زبان میں صحیح اسلامی لٹریچر موجود نہیں۔ یہاں میں نے ۵۰ صفحہ کی ایک انگریزی کتاب دیکھی۔ وہ خاص طور پر غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کے لئے چھاپی گئی ہے۔ اس کا نام تھا:

Introducing Islam to non-Muslims

اس کتاب میں جہاد کے عنوان کے تحت کہا گیا تھا کہ جہاد مقدس جنگ (Holy War) نہیں ہے۔ مقدس جنگ کا تصور ایک مسیحی تصور ہے۔ اس کے بعد جہاد کی تشریح کرتے ہوئے درج تھا کہ جہاد صرف دفاعی جنگ بھی نہیں۔ بلکہ وہ کسی بھی غیر منصفانہ حکومت کے خلاف جنگ کا نام ہے۔ اگر ایسی حکومت موجود ہے تو اس کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ یہ جنگ لیڈروں کے خلاف ہوگی نہ کہ ملک کے عوام کے خلاف۔ عوام کو نامنصفانہ حکومت کے قبضہ سے نکالا جائے گا تاکہ وہ آزادانہ طور پر اللہ پر ایمان لاسکیں:

Jihad is not also a defensive war only, but a war against any unjust regime. If such a regime exists, a war is to be waged against the leaders, but not against the people of that country. People should be freed from the unjust regimes and influences so that they can freely choose to believe in Allah.

(باقی آئندہ)

خبرنامہ اسلامی مرکز ۴۷

۱ سیرت رسول پر سادہ واقعاتی انداز کی ایک کتاب زیر تیاری ہے۔ یہ کتاب ہجرت تک لکھی جا چکی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کی کتابت بھی ہو رہی ہے۔ ونگ کمانڈر یوسف خاں صاحب اس کا انگریزی ترجمہ کر رہے ہیں۔

۲ ڈاکٹر برن اسٹارف (Dr Dagmar Bernstorff) جرمنی کی ہیڈل برگ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ موصوفہ ۱۰ اپریل کو اسلامی مرکز میں آئیں۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں بات چیت کی۔ انھوں نے بتایا کہ الرسالہ انگریزی کے کچھ شمارے انھوں نے پڑھے ہیں۔ اس کے مزید شمارے وہ اپنے ساتھ لے گئیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ مجھے بہت پسند ہے۔ چنانچہ میں نے اگست ۱۹۹۰ میں جرمنی کے ریڈیو پر اپنی جرمن تقریر میں الرسالہ کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ الرسالہ انڈیا کا واحد پرچہ ہے جو ہندستانی مسلمانوں کو حقیقت پسندی کا سبق دے رہا ہے۔ اس کا پیغام ہے کہ مسلمانوں کو ماضی کی گلوری میں گم رہنے کے بجائے اپنے مستقبل کی تعمیر میں سرگرم ہونا چاہئے۔

۳ آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے رمضان کے مہینہ میں " سحر گاہی " کا پروگرام چلایا گیا۔ اس کے تحت ہر روز قرآن کی تلاوت اور اس کا ترجمہ سنایا جاتا تھا۔ اس موقع پر آل انڈیا ریڈیو کے عملہ نے تذکیر القرآن کا انتخاب کیا۔ چنانچہ تلاوت کے بعد اس کا ترجمہ تذکیر القرآن سے سنایا جاتا رہا۔

۴ بھارتیہ شکشن منڈل (نئی دہلی) کے زیر اہتمام ۶ اپریل ۱۹۹۱ کو جھنڈے والان (نئی دہلی) میں ایک سیمنار ہوا۔ اس سیمنار کا عنوان یہ تھا:

Constitutional rights to minorities and national integration

اس سیمنار میں صدر اسلامی مرکز کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور مقررین میں ان کا نام بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے وہ اس میں شرکت نہ کر سکے۔ البتہ مرکز کا کچھ ہندی

۵ ایک برطانی مسلمان کے خط سے معلوم ہوا کہ بی بی سی کے اردو شعبہ میں الرسالہ باقاعدہ طور پر پڑھا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

You will be pleased to know that Al-Risala is very popular in the Urdu section of the BBC. Next time I am there, I will ask Asif Jilani and Obaid Siddiqi, both of whom are avid readers of Al-Risala, if they are receiving their monthly copies. If you are in England sometime, perhaps you could inform me in advance so that an interview might be arranged for one of the Urdu programmes. (J.M. Butt)

۶ "اقوال حکمت" کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس وقت وہ چھپائی کے مرحلہ میں ہے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ اس کتاب کا ہندی ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا۔

۷ تذکیر القرآن کا ایک نیا اڈیشن تیار کیا جا رہا ہے۔ اس میں صرف عربی متن اور اردو ترجمہ ہوگا۔ پوری کتاب ایک جلد میں ہوگی۔

۸ الرسالہ کا ایک خاص نمبر زیر تیاری ہے۔ اس کا نام "رہنمائے حیات" ہوگا۔ اس کا ہر مضمون ایک صفحہ کا ہوگا۔ اس میں بتایا جائے گا کہ زندگی کی تعمیر کامیاب طور پر کس طرح کی جائے۔

۹ حافظ عبد الرزاق صاحب احمد آبادی تراویح سنانے کے لئے شکاگو (امریکہ) گئے۔ وہاں سے وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں : آپ نے تذکیر القرآن کے نام سے قرآن کا جو ترجمہ شائع کیا ہے، یہاں ایک مسجد میں اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اکثر لوگ اہتمام سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میں نے بھی مطالعہ کیا۔ بہت فرحت ہوئی، بہت آسان ہے۔

۱۰ تذکیر القرآن کو آڈیو ٹیپ پر لایا جا رہا ہے۔ ایک جلد کی ریکارڈنگ ہو چکی ہے۔ اندازہ ہے کہ تقریباً ۴۵ کیسٹ پر پوری تذکیر القرآن آجائے گی۔

۱۱ مولانا عبد الرحیم رشادی (پالاپتی، تامل ناڈو) نے اطلاع دی ہے کہ انھوں نے "روشن مستقبل" کا ترجمہ ٹامل زبان میں مکمل کر لیا ہے اور اب اس کو چھاپنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اسی طرح وہ مرکز کی دوسری کتابیں بھی ٹامل زبان میں ترجمہ کر کے چھاپنا چاہتے ہیں۔

۱۲ "خلیج ڈائری" اردو میں الرسالہ مئی ۱۹۹۱ میں شائع ہوئی ہے۔ اب اس کا ترجمہ عربی، ہندی، انگریزی میں کیا جا رہا ہے۔ ان شاء اللہ وہ بقیہ تینوں زبانوں میں بھی شائع

کی جائے گی۔ ایک مقدمہ کا اضافہ ہوگا۔

۱۳ داؤد آدم راوت صاحب (رائے گڑھ) لکھتے ہیں: آپ کی گراں قدر اور پر از معلومات کتاب عقلیات اسلام پڑھا۔ قرآن شریف کی حیرت انگیز معلومات سے آپ نے دنیا کو روشناس کیا ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو۔

۱۴ ۱۶ اپریل ۱۹۹۱ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: عید ـــــ مسرتوں کا تیوہار۔

۱۵ ایک کتاب "الربانیہ" کے نام سے تیار ہوئی ہے۔ یہ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی وہ چھپائی کے لئے بھیج دی جائے گی۔

۱۶ خبر نامہ کے تحت مشن کی جو خبریں آتی ہیں وہ اصل کام اور اصل سرگرمیوں سے بہت کم ہوتی ہیں۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر مشن سے وابستہ حضرات جو کچھ کر رہے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں سے ہمیں بذریعہ ڈاک مطلع کرتے رہیں تاکہ ان کو خبر نامہ میں شامل کیا جاسکے۔

۱۷ روشن مستقبل (الرسالہ جنوری ۱۹۹۱) کو ہر حلقہ میں کافی پسند کیا گیا۔ چنانچہ اصحاب ایجنسی نے زیادہ تعداد میں منگوا کر اس کو پھیلایا۔ اب اس کو علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کے ساتھ کوئی مزید اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔

۱۸ الرسالہ فرینڈس سرکل، بمبئی کی جانب سے عنقریب بمبئی میں الرسالہ سمپوزیم منعقد کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں تفصیلی معلومات آئندہ شائع کی جائیں گی۔ مزید معلومات کے لئے درج ذیل پتہ پر ربط قائم کریں۔

DR ABDUL KARIM M NAIK
42 JAIL ROAD (E), CHAR NULL, DONGRI
BOMBAY 400009
TEL. 861572, 8519194

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

[illegible]		[illegible]	
ایک سال	[illegible] روپیہ	ایک سال	۲۰ ڈالر امریکی
دو سال	[illegible] روپیہ	دو سال	[illegible]
تین سال	[illegible] روپیہ	تین سال	۵۵
پانچ سال	[illegible] روپیہ	پانچ سال	۸۵
خصوصی تعاون (سالانہ)	[illegible] روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰

عظمتِ صحابہ

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

عظمتِ صحابہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن میں خیر امت (آل عمران ۱۱۰) کہا گیا ہے۔ انبیاء و رسل کے بعد وہ تمام انسانوں میں سب سے بہتر گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں (هم خير اجيال البشرية خلا الانبياء والمرسلين)

صحابہ یا اصحاب رسول کی یہ غیر معمولی عظمت کیوں ہے۔ یہ کوئی پراسرار کرامت کی بات نہیں، یہ ایک معلوم اور ثابت شدہ حقیقت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قول وعمل سے تاریخ میں ایسی مثال قائم کی جیسی مثال کبھی کسی انسانی گروہ نے قائم نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ اعلیٰ اور افضل گروہ قرار پائے۔

ان کا سب سے پہلا اور انوکھا کارنامہ وہ ہے جس کو معرفتِ حق کہا جاسکتا ہے۔ لوگ سچائی کے مظاہر کو جانتے ہیں، صحابہ نے سچائی کو حقیقت کے اعتبار سے جانا۔ لوگ مانی ہوئی سچائی کو مانتے ہیں، انھوں نے سچائی کو خود اپنی بصیرت سے دریافت کیا۔ لوگ اس سچائی کی قدر دانی کرتے ہیں جو گنبد کی سطح پر نظر آتی ہو، انھوں نے اس سچائی کی قدر کی جو ابھی صرف مجرد روپ میں تھی۔

لوگ اس سچائی کے چیمپین بنتے ہیں جس کے ساتھ مادی وزن اکٹھا ہوگیا ہو، انھوں نے اپنے آپ کو اس سچائی کے لیے وقف کیا جو ہر قسم کے مادی وزن سے یکسر خالی تھی۔ لوگ اس سچائی کی علم برداری کرتے ہیں جس کی پشت پر ایک باعظمت تاریخ بن چکی ہو، انھوں نے ایک بے تاریخ سچائی کا ساتھ دیا اور ہر قسم کی نفسیاتی اور جسمانی قربانی دے کر خود اس کی ایک شاندار تاریخ بنائی۔

اصحاب رسول تمام انسانی نسلوں کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کو یہ منظور تھا کہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والے اپنے بندوں کے لیے ایک نمونہ قائم کرے۔ اصحاب رسول نے اپنی غیر معمولی قربانیوں کے ذریعہ یہ درجہ حاصل کیا کہ وہ تمام انسانیت کے لیے ابدی نمونۂ حیات قرار پائے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کے ہر مرحلہ میں حق پر ثابت قدم رہے۔ جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں وہی روش اختیار کی جو انصاف اور صداقت پر مبنی تھی۔ وہ آزاد ہوتے ہوئے اصولوں

کے پابند بن گئے۔ اختیار رکھتے ہوئے انھوں نے سچائی کے سامنے اپنے کو بے اختیار کر لیا۔ ان کے
بے راہ روی کے مواقع موجود تھے مگر وہ بے راہ رو نہیں ہوئے۔ انھوں نے ہر معاملہ میں اپنے آپ
راست روی کے اعلیٰ معیار پر پوری طرح قائم رکھا۔

پوری انسانی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی پیغمبر کو اس کے ہم عصر لوگوں نے پہچانا ہو۔ پچھ
پیغمبروں کو افراد ملے مگر انھیں جماعتیں نہ مل سکیں۔ اصحاب رسول کا یہ انوکھا کارنامہ ہے کہ انھوں نے جماعت
کی سطح پر اپنے ہم عصر پیغمبر کو پہچانا اور بڑی تعداد میں اس کے مشن کو اپنا کر اس کے لیے اپنی زندگی وقف
کر دی۔ ان کے ساتھ بار بار وہ واقعات پیش آئے جن کو عذر بنا کر لوگ بدک جاتے ہیں اور ساتھ
چھوڑ دیتے ہیں، مگر انھوں نے کسی عذر کو عذر نہیں بنایا، وہ ہر قسم کی ناخوش گوار باتوں کو نظر انداز
کرتے ہوئے آپ کی حمایت کرتے رہے، یہاں تک کہ اسی حال میں اس دنیا سے چلے گئے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں کی حیثیت سے مبعوث کیا تھا۔ یہ سادہ طور پر صرف تق
کا معاملہ نہ تھا، بلکہ ایک مشکل ترین منصوبہ کو بر روئے کار لانے کا معاملہ تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک
وسیع الاثر انقلاب برپا کر کے وہ تاریخی اسباب ظہور میں لائے جائیں جس کے بعد آپ کی نبوت ہمیشہ
کے لیے ایک مسلّم نبوت کی حیثیت اختیار کر لے۔ آپ کا دین ناقابل شکست حد تک ایک محفوظ دین بن
جائے۔ آپ کی ذات اور آپ کا کارنامہ تاریخ میں اس طرح ثبت ہو جائے کہ کوئی مٹانے والا اس
کو مٹانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ منصوبہ اسباب کی دنیا میں اور انسانی آزادی کے ماحول میں مکمل کرنا تھا۔ اس پہلو نے اس
منصوبہ کو آخری حد تک ایک انتہائی مشکل منصوبہ بنا دیا۔ اصحاب رسول نے اپنے آپ کو پوری طرح اس
منصوبہ الٰہی میں شامل کیا۔ اس کی خاطر انھوں نے اپنی جان کو جان اور اپنے مال کو مال نہیں سمجھا۔ اس کے
لیے انھوں نے اپنی انا کو کچلا۔ اپنے تاج کو اپنے پیروں کے نیچے روندا۔ اپنی محبوب چیزوں کو چھوڑ کر وہ اس
کی طرف بڑھے۔ انھوں نے نہ ماننے والی بات کو مانا۔ انھوں نے ناقابل برداشت کو برداشت کیا۔ سب
کو پانے کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ کسی بھی شرط اور کسی بھی تحفظ کے بغیر وہ آپ کے شریک
بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصحاب رسول انسانی تاریخ کے ایک منفرد گروہ تھے۔ اصحاب رسول کی عظمت
اس سے زیادہ ہے کہ کوئی شخص اس کو لفظوں میں بیان کر سکے۔

فطری اوصاف

ابتدائی دور کے سماج (primitive society) کے بارہ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی
ں جو مطالعہ کیا گیا ، اس میں یہ مان لیا گیا تھا کہ یہ لوگ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے کمتر
(mentally and morally inferior) تھے ۔ مگر بیسویں صدی میں علم الانسان (Anthropology)
ے علماء نے جو تحقیقات کی ہیں ، اس کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی ہے ۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ابتدائی
ور کا انسان نہایت اعلیٰ انسان تھا ۔ تہذیبی ساز و سامان میں بظاہر وہ پیچھے تھا ۔ مگر انسانی اوصاف
ے اعتبار سے وہ معیاری انسان کی حیثیت رکھتا تھا ۔ (VII/382)

اس جدید تحقیق کے بعد سماجیات میں ایک نیا شعبۂ فن وجود میں آیا ہے جس کو پریمیٹو زم
(Primitivism) کہا جاتا ہے ۔ اس فن میں ابتدائی دور کے انسان کا مطالعہ اس اعتبار سے کیا
اتا ہے کہ وہ اپنی صفات کے اعتبار سے آئیڈیل انسان تھا اور آج کے انسان کو اسی کی پیروی
رنا چاہیے (VIII/212)

یہ نظریہ اسلام کے تصور تاریخ کے عین مطابق ہے ۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ابتدائی دور کے
ک امت واحدہ تھے (البقرہ ۲۱۳) یعنی وہ اس واحد صحیح راستہ پر تھے جو خدا نے ان کے لیے انسانِ
ل (آدم) کی پیدائش کے وقت مقرر کر دیا تھا ۔ ایک عرصہ کے بعد وہ اس راستہ سے ہٹ گیے ۔ ان
ں بگاڑ اور اختلاف پیدا ہو گیا ۔ جب انسانی آبادی پر بگاڑ کا دور شروع ہوا تو خدا نے پیغمبر بھیجنے
روع کیے ۔ یہاں تک کہ آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ۔

ابتدائی دور کا انسان صحیح کیوں تھا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فطرت پر تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان
ے اندر جو فطرت بنائی ہے ، وہ انتہائی معیاری صفات کی حامل ہے ۔ جب تک آدمی اپنی اس پیدائشی
طرت پر تھا ، وہ اعلیٰ انسانی صفات سے متصف تھا ، اس کے بعد تمدن کا دور شروع ہوا ۔ اس
صنوعی تمدن نے انسان کو بگاڑنا شروع کیا ۔ اب انسان کی فطرت دب گئی اور اس پر مصنوعی تمدنی
فات غالب آگئیں ۔

فطرت کا یہی بگاڑ ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بعد کے دور میں آنے والے پیغمبروں کا انکار کیا جاتا رہا ۔

اس بگاڑ کی بنا پر انسانی فطرت اور دینِ خداوندی میں مطابقت باقی نہ رہی۔ انسان اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی وجہ سے پیغمبروں کو پہچاننے اور ان کی آواز پر لبیک کہنے والا نہ بن سکا۔ یہ صورت حال ہزاروں سال تک جاری رہی۔

حضرت ابراہیم کا پیغام جب اہل عراق کو متاثر نہ کرسکا تو انسان کی نااہلی آخری طور پر واضح ہوگئی اب اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ منصوبہ بندی کی گئی کہ انسان کو دوبارہ غیر تمدنی دنیا کی طرف واپس لے جایا جائے۔ اس منصوبے کے مطابق، حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسادیا گیا جہاں اس وقت صرف فطرت کا ماحول تھا۔ فطرت کے مناظر کے سوا وہاں کوئی اور چیز موجود نہ تھی۔

اس صحرائی ماحول میں ایک ایسی نسل کی تیاری شروع ہوئی جو تمدن سے مکمل طور پر منقطع ہو کر پرورش پاسکے۔ توالد و تناسل کے ذریعہ یہ نسل بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ڈھائی ہزار سال میں ایک نئی قوم بن کر تیار ہوگئی۔ اس نئی قوم کے ہر فرد میں وہ اعلیٰ فطری اوصاف پوری طرح موجود تھے جو ابتدائی دور کے انسان میں پائے جاتے تھے۔ یہی فطری یا انسانی اوصاف اس صحرائی قوم کی شناخت بن گیے۔

قدیم عربوں میں اعلیٰ انسانیت کو بتانے کے لیے کچھ الفاظ رائج تھے۔ مثلاً الفتوۃ، المروءۃ الرجولیۃ، وغیرہ۔ اردو میں اس کو جواں مردی یا مردانگی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے عربوں کی مراد وہی چیز ہوتی تھی جس کو آج "ابتدائی انسانی اوصاف" کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بنو اسماعیل کی یہ صحرائی قوم قدیم ابتدائی سماج کا ایک احیاء تھا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے "معادن عرب" کے بارہ میں پوچھا گیا۔ فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہوں گے (خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام) دور اول کے عرب اہل اسلام کے غیر معمولی اوصاف بھی اسی کا نتیجہ تھے۔ انس بن مالکؓ صحابہ کے بارہ میں کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، ہم جھوٹ نہیں بولتے تھے اور نہ ہم جانتے تھے کہ جھوٹ کیا ہے (واللہ ما کنّا نکذبُ ولا کنّا ندری ما الکذب)

عرب کے صحرا میں اعلیٰ فطری اوصاف سے متصف جو انسان تیار کئے گئے تھے، انھیں کے منتخب افراد ایمان لاکر اصحاب رسول بنے۔ یہ ایک بہترین خام مادہ تھا جو اسلام کی معرفت اور پیغمبر کی رفاقت سے جلا پاکر چمک اٹھا (تفصیل کیلئے: حقیقتِ حج ۵۴ - ۵۸)

خیر امت

کنتم خیر امة اخرجت للناس	تم بہترین گروہ ہو جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا
تأمرون بالمعروف وتنہون عن المنکر	ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے
وتؤمنون باللہ (آل عمران ۱۱۰)	ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں خیر امت (بہترین گروہ) سے مراد صحابہ کا گروہ ہے۔ "اخرجت" کے معنی اظہرت یا اوجدت کے ہیں۔ یعنی اس گروہ کو خصوصی اہتمام کے ساتھ نکال کر میدان میں لایا گیا ہے۔ یہ اس صحرائی منصوبہ کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ سے صحابہ کی وہ انوکھی جماعت حاصل کی گئی جس کو پروفیسر ڈی ایس مارگولیتھ (۱۹۴۰-۱۸۵۸) نے ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) کا نام دیا ہے۔

اصحاب رسول کون لوگ تھے۔ یہ بنو اسماعیل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نسل کے جد اعلیٰ اسماعیل بن ابراہیمؑ ہیں۔ چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم نے اپنے چھوٹے بچہ اسماعیل اور ان کی ماں ہاجرہ کو عراق سے نکالا اور ان کو لے جاکر حجاز (عرب) کے صحرا میں چھوڑ دیا۔

اس وقت یہ علاقہ ایک بے آب وگیاہ علاقہ تھا۔ وہاں کوئی انسانی آبادی نہ تھی۔ یہ مکمل طور پر فطرت کی ایک دنیا تھی۔ صحرا اور پہاڑ، زمین اور آسمان، سورج اور چاند، بس اس قسم کی چیزیں تھیں جن کے درمیان کسی شخص کو اپنے رات اور دن کو گزارنا تھا۔ یہاں شہریت اور تمدن کا کوئی نشان نہ تھا۔ چاروں طرف صرف فطرت کی پُرہیبت نشانیاں پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ مزید یہ کہ یہاں آرام اور عیش نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ یہاں زندگی سراپا چیلنج تھی۔ آدمی مجبور تھا کہ مسلسل چیلنج کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اس پُرمشقت ماحول میں زندہ رہنے کی کوشش کرے۔

تمدن کی خرابیوں سے دور اس سادہ ماحول میں توالد وتناسل کے ذریعہ ایک نسل بننا شروع ہوئی۔ یہ ایسے لوگ تھے جن کے حالات نے انھیں انسانی تکلفات سے دور کر رکھا تھا۔ وہ مصنوعی اخلاق سے بالکل ناآشنا تھے۔ وہ ایک ہی رہنمائی کو جانتے تھے، اور وہ فطرت کی رہنمائی تھی۔ فطرت بلاشبہہ انتہائی معیاری معلم ہے، اور صحرا کی یہ نسل اسی معیاری معلم کے تحت بن کر تیار ہوئی۔

آل عمران کی مذکورہ آیت میں خیرامت کی دو خاص صفتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے ہیں۔ یعنی خلافِ حق بات کو برداشت نہ کرنا اور حق سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہونا، یہ ان کا مستقل مزاج ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے گرد و پیش سے غیر متعلق رہ کر زندگی گزارتے ہیں یا جن کا رویہ ذاتی مصالح کے تحت متعین ہوتا ہے۔ بلکہ وہ کامل طور پر حق پسند ہیں۔ حق اور ناحق کی بحث میں نہ پڑنا، یا ناحق سے سمجھوتہ کر کے زندہ رہنا ان کے لیے ممکن نہیں۔

ان کی دوسری صفت یہ بتائی گئی کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ صاحب معرفت لوگ ہیں۔ وہ ظواہر میں گم رہنے والے لوگ نہیں ہیں۔ انھوں نے حقیقتِ اعلیٰ کو دریافت کیا ہے۔ ان کا شعور پائے ہوئے انسانوں کا شعور ہے۔ انھوں نے مخلوقات کی دنیا کے پیچھے اس کے خالق کا جلوہ دیکھ لیا ہے۔

یہ دونوں صفتیں بے حد نادر صفتیں ہیں۔ حق پسند اور صاحب معرفت وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو بے حد سنجیدہ ہوں۔ جو اصول کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہوں نہ کہ خواہش کی بنیاد پر۔ جو حقائقِ مادی کے بجائے حقائقِ معنوی کو اپنی توجہات کا محور بنائے ہوئے ہوں۔ جو مفاد کے بجائے صداقت کے لیے جینے والے ہوں۔ جو دباؤ کے بغیر اپنے آزادانہ فیصلہ کے تحت صحیح رویہ اختیار کر لیں۔ جو دلیل سے چپ ہو جائیں، بغیر اس کے کہ ان کو چپ کرنے کے لیے کوئی طاقت استعمال کی گئی ہو۔

اس دنیا میں سب سے بڑا قول حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے، اور اس دنیا میں سب سے بڑا عمل حقیقتِ واقعہ سے مطابقت۔ اور اصحاب رسول بلاشبہ ان نادر انسانوں میں سے تھے جو اس معیارِ انسانیت پر آخری حد تک پورے اترے۔

یہ وہ انسان کامل ہے جس کی انسانیت پوری طرح محفوظ ہوتی ہے۔ جو اپنی تخلیقی فطرت پر قائم رہتا ہے۔ یہی وہ زندہ فطرت والا انسان ہے جو عرب کے صحرائی ماحول میں ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ تیار کیا گیا۔ اور صحابہ کا گروہ وہ منتخب انسانی گروہ ہے جس کو اس مخصوص انسانی نسل سے چن کر نکالا گیا۔

صحابہ وہ لوگ تھے جو دوسروں کی خیر خواہی کے لیے جئے۔ جن کی ساری کوشش یہ تھی کہ وہ لوگوں کو جہنم سے بچا کر جنت میں پہنچا دیں۔ اسی لیے وہ خیرامت قرار پائے۔

ایک شہادت

اخرج ابن ابی الدنیا عن ابی اراکۃ یقول : صلیت مع علی رضی اللہ عنہ صلاۃ الفجر، فلما انفتل عن یمینہ مکث کأنّ علیہ کآبۃ ، حتی اذا کانت الشمس علی حائط المسجد قِیدَ رُمحٍ صلیٰ رکعتین ثم قلب یدہ فقال : واللہ لقد رأیت اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فما اری الیوم شیئاً یُشبہم: لقد کانوا یصبحون صُفراً شُعثاً غُبراً بین اعینہم کامثال رُکب المعزی ۔ قد باتوا للہ سُجّداً و قیاماً ، یتلون کتاب اللہ ، یتراوحون بین جباھہم و اقدامہم ، فاذا اصبحوا فذکروا اللہ مادوا کما یمید الشجر فی یوم الریح وھملت اعینہم حتی تبتل ثیابہم ، واللہ لکأنّ القوم باتوا غافلین ۔ ثم نھض فما رُئِیَ بعد ذلک مفترّاً یضحک حتی قتلہ ابن مُلجم عدوّ اللہ الفاسق ۔

ابن ابی الدنیا نے روایت کی ہے ۔ اسماعیل السدی کہتے ہیں کہ میں نے ابواراکہ تابعی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے خلیفہ چہارم علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی ۔ پھر جب انھوں نے اپنے چہرہ کو دائیں طرف پھیرا تو وہ اس طرح رہے جیسے کہ ان کے اوپر شدید غم ہو ۔ یہاں تک کہ جب دھوپ مسجد کی دیوار پر ایک نیزہ کے برابر آگئی تو انھوں نے اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھی ۔ پھر انھوں نے اپنے ہاتھ کو پلٹتے ہوئے کہا ۔ خدا کی قسم ، میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا ہے ۔ آج میں کوئی چیز ان کے مشابہ نہیں دیکھتا ۔ وہ خالی ہاتھ ، پراگندہ بال اور غبار آلود حالت میں صبح کرتے تھے ۔ ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بکری کے گھٹنے جیسا نشان ہوتا ۔ وہ اپنی رات اللہ کے لیے سجدہ اور قیام میں گزارتے ۔ وہ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ، وہ اپنی پیشانیوں اور قدموں کے درمیان باری باری عمل کرتے ۔ جب وہ صبح کرتے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ، اس وقت وہ ہلتے جس طرح درخت ہوا کے چلنے کے وقت ہلتا ہے ۔ ان کی آنکھیں آنسو بہاتیں ، یہاں تک کہ ان کے کپڑے بھیگ جاتے ۔ خدا کی قسم ، آج کے لوگوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی رات غفلت میں گزاری ۔ علی رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ، پھر وہ وہاں سے اٹھ گئے ۔ اس کے بعد وہ کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھے گئے ،

یہاں تک کہ دشمن خدا ابن ملجم نے ان کو قتل کر دیا (البدایہ والنہایہ ۸/۶)

" خالی ہاتھ، پراگندہ بال اور غبار آلود ہونا " اس بات کی علامت ہے کہ وہ دنیا سے آخری حد تک بے رغبت تھے اور آخرت کی طرف آخری حد تک متوجہ ہو چکے تھے۔ دین کی فکر میں وہ اس حد تک گم ہو چکے تھے کہ اہل دنیا اگر دیکھیں تو سمجھیں کہ یہ مجنون لوگ ہیں۔

ذکر اور عبادت اور تلاوت ان کی محبوب ترین چیز ہو چکی تھی۔ لمبے قیام میں انھیں تسکین ملتی تھی ان کے طویل سجدوں کا نشان ان کی پیشانیوں پر نمایاں نظر آتا تھا، وہ اندر سے باہر تک خدا کے نور میں نہائے ہوتے تھے۔ ان کی زندگی تمام تر خدا کے لیے وقف ہو چکی تھی۔

" اللہ کی یاد کے وقت وہ اس طرح ہلتے جیسے درخت تیز ہوا میں ہلتا ہے " یہ اس کیفیت کا ذکر ہے جو تھرتھراہٹ کے وقت ان کے جسم کی ہوتی تھی۔ اللہ کی یاد ان کے سینہ میں بھونچال کی طرح اٹھتی تھی۔ اس سے ان کی روح کے اندر ایک بجلی دوڑ جاتی اور ان کے جسم پر تھرتھری کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ وہ اللہ کے خوف سے بار بار کانپ اٹھتے تھے۔

" ان کی آنکھیں آنسو بہاتیں اور ان کے کپڑے بھیگ جاتے " اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے خدا کا ذکر کوئی تلفظ لسانی کا عمل نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک قلبی عمل ہوتا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے چند الفاظ میں اصحاب رسول کا جو خاکہ بتایا ہے، وہ نہایت کامل اور جامع خاکہ ہے۔ ان مختصر لفظوں میں اصحاب رسول کی وہ تمام بنیادی صفات آجاتی ہیں جن سے وہ متصف تھے اور جنھوں نے ان کو پوری نسل انسانی میں انبیاء کرام کے بعد سب سے اونچا درجہ دیدیا۔

اصحاب رسول بھی مومن تھے جس طرح دوسرے لوگ مومن ہوتے ہیں۔ مگر اصحاب رسول کا ایمان ان کے لیے ایک انتہائی سنجیدہ فیصلہ تھا۔ حتی کہ اس نے انھیں دیوانہ بنا دیا۔ ان کا ایمان ان کے پورے وجود میں چمک اٹھا تھا۔ اللہ کی یاد ان کے لیے ایک روحانی زلزلہ کے ہم معنی تھی۔ آخرت کو ماننا ان کے لیے ایک ایسی طوفان خیز حقیقت پر یقین کرنا تھا جو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بن کر بہہ نکلے۔

اصحاب رسول تاریخ کے سب سے زیادہ زندہ انسان تھے اور تاریخ کی سب سے زیادہ انقلابی جماعت۔

والذین معہ

حمد رسول اللہ والذین معہ
سداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم
عاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ
رضوانا۔ سیماھم فی وجوھھم من
ثر السجود۔ ذلک مثلھم فی التوراۃ۔
مثلھم فی الانجیل کزرع اخرج
طأہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی
لی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ
ھم الکفار۔ وعد اللہ الذین
منوا وعملوا الصالحات منھم
غفرۃ واجراً عظیما (الفتح ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم ان کو رکوع میں اور سجدہ میں دیکھو گے۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے سجدہ کے اثر سے، ان کی یہ مثال تورات میں ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی، اس نے اپنا انکھوا نکالا۔ پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر وہ اور موٹا ہوا۔ پھر اپنے تنہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسانوں کو بھلا لگتا ہے تاکہ ان سے کافروں کو جلائے۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ نے ان سے معافی کا اور بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

قرآن کے یہ الفاظ اصحاب رسول کے بارہ میں ہیں۔ اصحاب رسول کی تاریخی اہمیت کی بنا پر ن کی صفات قدیم آسمانی صحیفوں میں درج کر دی گئی تھیں۔ موجودہ محرف تورات میں اب بھی موجود ہے ، وہ لاکھوں قدسیوں (saints) میں سے آیا (استثنا ۳۳ : ۲) موجودہ انجیل میں یہ پیشین گوئی ن الفاظ میں ملتی ہے : خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے۔ اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پہلے پتی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیار دانے۔ پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (مرقس ۴ : ۲۶-۲۹) وہ رائی کے دانے کی مانند ہے کہ جب زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین کے سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ مگر جب بو دیا گیا تو اگ کر سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے اور ایسی ڈالیاں نکالتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کے سایہ میں بسیرا کریں (۳۲)

اس آیت کے پہلے حصہ میں تورات کے حوالہ سے صحابہ کی انفرادی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اور اس کے دوسرے حصہ میں انجیل کے حوالے سے ان کی اجتماعی صفات۔

اصحاب رسول کی پہلی شخصی صفت یہ بتائی کہ وہ منکروں پر سخت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پر ایمان نے ان کو ایک با اصول انسان بنا دیا ہے۔ جو لوگ دین خدا کے منکر ہیں یا بے اصول زندگی گزار رہے ہیں، ان کے ساتھ مصالحت کا معاملہ کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔ ذاتی مفاد کی خاطر کبھی وہ بے اصولی کا رویہ اختیار نہیں کرتے۔

"وہ آپس میں مہربان ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ اختلاف اور شکایت کے مواقع پیش آنے کے باوجود وہ ہمدردی اور مہربانی کے رویہ پر قائم رہتے ہیں۔ غیر اہل دین کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اصولی ٹکراؤ کا مسئلہ پیش آتا ہے، وہاں وہ بالکل بے لچک ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے ہم مذہب لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے شکایت کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، مگر وہ شکایتوں اور تلخیوں کو نظر انداز کرکے حسن سلوک کی روش پر قائم رہتے ہیں۔

"وہ رکوع اور سجدہ میں رہتے ہیں" یعنی وہ نماز قائم کرنے والے ہیں۔ ان کے دن اور ان کی راتیں اللہ کے آگے جھکنے میں اور اس کی عبادت گزاری میں بسر ہوتی ہیں۔

"وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کے طالب ہیں" یعنی ان کے لیے سب سے زیادہ محبوب و مطلوب چیز وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ وہ اللہ کی یاد میں اور اللہ سے دعا و التجا میں اپنے لمحات گزارتے ہیں۔

"ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے" یعنی ان کے دل کا اللہ کے لیے جھکاؤ ان کے چہروں پر تواضع اور سنجیدگی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ خدا کے ساتھ گہری وابستگی ان کے چہروں پر ربانی جھلک کی صورت میں نظر آتی ہے ــــــ یہ ان کے انفرادی اوصاف ہیں۔

صحابہ کے انفرادی اوصاف کے ذکر کے بعد ان اوصاف کے اجتماعی انجام کو بیج کی مثال سے بتایا گیا ہے۔ بیج زمین میں بو دیا جائے تو وہ بڑھتے بڑھتے درخت بن جاتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ اوصاف جب افراد انسانی میں پیدا ہو جائیں تو وہ بیرونی دنیا کو متاثر کرنے لگتے ہیں۔ یہ عمل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچ جاتا ہے جس کا کامل نمونہ اصحاب رسول کی صورت میں تاریخ میں قائم ہوا۔

اعترافِ حق

ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو عمر بن الخطاب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے منافق یہ گمان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ مگر خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ وہ اپنے رب کے پاس گئے ہیں جیسا کہ موسی بن عمران گئے تھے۔ وہ اپنی قوم سے چالیس دن کے لیے غائب ہوگئے تھے، پھر ان کی طرف واپس آئے جب کہ یہ کہا جانے لگا تھا کہ وہ مر گئے۔ خدا کی قسم، رسول اللہ ضرور اسی طرح لوٹ کر آئیں گے جس طرح موسیٰ لوٹ کر آئے۔ پھر آپ ان لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹیں گے جن کا یہ گمان ہے کہ آپ پر موت واقع ہوگئی ہے۔

ابوبکرؓ کو خبر ہوئی تو وہ آئے اور مسجد کے دروازے پر اترے۔ اس وقت عمرؓ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہے تھے۔ ابوبکر سیدھے آپ کے حجرہ میں گئے۔ ابوبکرؓ نے آپ کے چہرہ سے چادر اٹھائی اور اس کو بوسہ دیا، پھر کہا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر قربان، اللہ نے جو موت آپ کے لیے مقدر کی تھی، وہ آپ پر آچکی۔ اس کے بعد اب آپ پر موت کی مصیبت آنے والی نہیں۔ اس کے بعد ابوبکرؓ نے آپؐ کے چہرے کے اوپر چادر ڈال دی اور باہر آئے۔ عمرؓ برابر لوگوں کے سامنے بول رہے تھے۔ ابوبکرؓ نے ان سے کہا کہ اے عمر ٹھہرو، خاموش ہو جاؤ۔ عمرؓ نے چپ ہونے سے انکار کیا۔ ابوبکرؓ نے جب دیکھا کہ عمر چپ ہونے پر تیار نہیں ہیں تو وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ لوگوں نے جب ابوبکر کی آواز سنی تو سب ان کی طرف متوجہ ہوگئے اور عمر کو چھوڑ دیا۔

ابوبکر نے حمد و ثنا کے بعد کہا کہ اے لوگو، جو شخص محمدؐ کی عبادت کرتا تھا تو محمد مر گئے۔ اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، وہ کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کے بعد ابوبکر نے یہ آیت پڑھی :

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افأن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیه فلن یضر اللہ شیئا	اور محمد بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو آدمی پھر جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا

وسیجزی اللّٰہ الشاکرین (آل عمران ۱۴۴)   اور اللہ شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔

راوی کہتے ہیں کہ جب ابوبکر نے یہ آیت پڑھی تو ایسا محسوس ہوا جیسے لوگ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ قرآن میں یہ آیت بھی نازل ہوئی ہے۔ اب ابوبکرؓ سے اس آیت کو سن کر لوگوں نے اس کو اخذ کرلیا۔ اس کے بعد یہ آیت تمام لوگوں کی زبان پر تھی۔

راوی کہتے ہیں کہ عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم، جب میں نے ابوبکر کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو میں دہشت زدہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ میں زمین پر گر پڑا۔ اور میرے دونوں پاؤں میرا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ اور میں نے جان لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی (سیرۃ ابن ہشام ۴/۲۲۵-۲۲۴)

عمر فاروق اس وقت اتنے جوش میں تھے کہ ابوبکر صدیق کی باتوں سے چپ نہیں ہو رہے تھے۔ اس کے بعد جب انھوں نے قرآن کی ایک آیت پڑھ دی تو اچانک وہ ڈھ پڑے۔ حالانکہ ابوبکر صدیق پہلے بھی کچھ الفاظ بول رہے تھے، اور اب بھی انھوں نے کچھ الفاظ ہی اپنی زبان سے نکالے تھے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ پہلے الفاظ انسان کے الفاظ تھے، اور دوسرے الفاظ خدا کے الفاظ۔

اس سے اصحاب رسول کی ایک نہایت اہم صفت سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ اصحاب رسول اللہ کا حکم آتے ہی اس کے آگے ڈھ پڑنے والے لوگ تھے۔ عام انسان قیامت میں رب العالمین کو دیکھ کر اس کے آگے ڈھ پڑے گا۔ اصحاب رسول وہ لوگ تھے جو اسی دنیا میں رب العالمین کو دیکھے بغیر اس کے آگے ڈھ پڑے۔ منکرین خدا پر جو کچھ موت کے بعد بیتنے والا ہے، وہ اصحاب رسول پر موت سے پہلے کی زندگی میں بیت گیا۔ دوسرے لوگ جس چیز کو مجبوری کے تحت قبول کریں گے، اس کو اصحاب رسول نے خود اپنے آزادانہ فیصلہ کے تحت اختیار کرلیا۔

انسان کو موجودہ دنیا میں اسی خاص امتحان کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہاں انسان کو آزادی دی گئی ہے۔ مگر یہ آزادی برائے آزمائش ہے نہ کہ برائے انعام۔ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون شخص ہے جو آزادی پاکر سرکش ہو جاتا ہے، اور کون ہے جو آزادی پانے کے باوجود اللہ کے آگے جھک جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اسی خدائی مطلوب کا عملی نمونہ تھے۔ انھوں نے خدا کے حکم کو عملاً اختیار کرکے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ آدمی کو کیسا بننا چاہیے، اور اپنی آزادی کو اسے کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔

بے نفسی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اگر کسی مسلمان کی موت کا وقت آجائے اور اس کو اپنے مال کے بارہ میں وصیت کرنا ہے تو اس کو چاہیے کہ دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنا کر وہ اپنی وصیت کرے۔ اس سلسلہ میں احکام بتاتے ہوئے فرمایا ہے کہ بعد کو گواہی دینے کے وقت اگر یہ بات علم میں آئے کہ ان دونوں گواہوں نے گواہی دینے میں کوئی حق تلفی کی ہے تو ان کی جگہ دوسرے دو شخص وراثت کے حق داروں میں سے کھڑے ہوں۔ جو میت سے زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہوں۔ یہ دوسرے دونوں آدمی قسم کھا کر کہیں کہ ہماری گواہی ان دونوں اولیٰ بالشہادۃ گواہوں کی گواہی سے زیادہ برحق ہے (المائدہ ۱۰۷)

اس آیت کا ایک ٹکڑا یہ ہے : مِنَ الَّذِینَ اسْتَحَقَّ عَلَیْھِمُ الاولیان (ان میں سے جن کا کہ حق دبا ہے جو سب سے قریب ہوں میت کے) اس آیت کے ایک لفظ (الاولیان) کی قرأت میں اختلاف ہے۔ الحسن نے اس کو الاوّلان پڑھا ہے۔ اور ابن سیرین نے اس کو الاوّلین پڑھا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک روایت یہ ہے :

عن ابی مِجلَز اَن اُبَیّ بن کعب قرأ (من الذین استحق علیھم الاولیان) فقال عمر عند کذبتَ۔ قال انتَ اکذب۔ فقال رجل۔ تکذّب امیرالمومنین۔ قال : انا اشد تعظیمًا لحق امیرالمومنین منك۔ ولکن کذّبتُہ فی تصدیق کتاب اللہ، ولم اصدّق امیرالمومنین فی تکذیب کتاب اللہ۔ فقال عمر صدق (حیاۃ الصحابۃ ۲/۴۷-۵)

ابو مجلز سے روایت ہے کہ ابی بن کعب نے یہ آیت پڑھی (من الذین استحق علیہم الاولیان) پس عمر نے ان سے کہا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ انھوں نے کہا کہ تم خود زیادہ جھوٹے ہو۔ یہ سن کر ایک شخص نے کہا کہ تم امیرالمومنین کو جھوٹا کہتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں تم سے زیادہ امیرالمومنین کے حق کی تعظیم کرتا ہوں۔ لیکن میں نے ان کو اللہ کی کتاب کی تصدیق کے معاملہ میں جھٹلایا ہے۔ میں نے کتاب اللہ کی تکذیب کے معاملہ میں امیرالمومنین کی تصدیق نہیں کی۔ عمر نے یہ سن کر کہا کہ انھوں نے سچ کہا۔

اس واقعہ میں ایک صحابی نے دوسرے صحابی پر سخت تنقید کی جو کہ وقت کا سربراہ سلطنت

تھا۔ مگر ناقد صحابی کا معاملہ یہ تھا کہ سخت ترین لفظوں میں تنقید کرنے کے باوجود زیر تنقید صحابی کے شخصی احترام میں ان کے اندر کوئی کمی نہیں آئی۔ اور دوسری طرف زیر تنقید صحابی کا معاملہ یہ تھا کہ اعلیٰ منصب پر ہونے کے باوجود انھوں نے اس سخت تنقید کو برا نہیں مانا۔

یہ صفت اجتماعی زندگی اور اجتماعی اتحاد کے لیے بے حد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صفت کے بغیر نہ کوئی معاشرہ بہتر معاشرہ بن سکتا اور نہ اس کے اندر اتحاد کا ماحول قائم ہوسکتا ہے۔ مگر یہ قیمتی صفت انتہائی نادر اور انوکھی ہے۔ اور جماعت کی سطح پر معلوم تاریخ میں صحابہ کے علاوہ کہیں اور پائی نہیں گئی۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے کے خلاف بولنا پڑتا ہے۔ یہ بولنا زندگی کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ مگر بولنے والا معاملہ کو صاحب معاملہ سے الگ کر کے نہیں دیکھ پاتا۔ اس لیے وہ معاملہ پر تنقید کرنے کے ساتھ صاحبِ معاملہ سے بیزار بھی ہو جاتا ہے۔ مگر اصحاب رسول اس اعتبار سے ایک تاریخی استثناء تھے۔ اصحاب رسول کے درمیان تنقید کا عام رواج تھا۔ مگر تنقید کرنے والا ہمیشہ "بات" پر تنقید کرتا تھا۔ وہ زیر تنقید آدمی کی شخصیت سے نہ تو متنفر ہوتا تھا اور نہ اس کے احترام میں کوئی کمی کرتا تھا۔

یہی حال زیر تنقید شخص کا بھی تھا۔ وہ سخت سے سخت تنقید کو سنتا تھا۔ مگر وہ تنقید کی ظاہری سختی کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل تنقید پر سوچنے لگتا تھا کہ وہ قابلِ قبول ہے یا ناقابلِ قبول۔

تنقید کی چوٹ بہت کڑی چوٹ ہے۔ اپنے خلاف تنقید سنتے ہی آدمی کے اندر ایک آگ سی لگ جاتی ہے، مگر صحابہ کرام اس سے بہت بلند تھے۔ صحابہ کا حال یہ تھا کہ وہ نہ صرف اپنے خلاف تنقید کو ٹھنڈے دماغ سے سنتے تھے، بلکہ ناقد کے سخت ترین الفاظ کی بھی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

اس کی وجہ صحابہ کرام کی ربانیت تھی۔ ان کے ایمان نے ان کو ایسی بلند فکری سطح پر پہنچا دیا تھا کہ اس کے بعد ہر چیز انھیں ہیچ دکھائی دیتی تھی۔ وہ حقیقت اعلیٰ میں اتنا زیادہ گم ہو چکے تھے کہ وہ نہ ذاتی تعریف سے خوش ہوتے تھے اور نہ ذاتی تنقید پر غمگین۔ وہ ہر بات پر بات کی حیثیت سے غور کرتے تھے خواہ وہ ان کی پسند کی بات ہو یا ناپسندیدگی کی بات۔ وہ ہر واقعہ کو اس کی اصلیت کے اعتبار سے دیکھتے تھے نہ کہ اِس اعتبار سے کہ وہ ان کے موافق ہے یا ان کے خلاف۔

حمیت جاہلیہ نہیں

قرآن کی سورہ الفتح میں اللہ کی اس خصوصی نصرت کا ذکر ہے جو اصحاب رسول کو حاصل ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ انھوں نے صراط مستقیم کو پالیا۔ وہ دشمنوں کے ہاتھ سے محفوظ ہو گئے۔ زمین پر دین خداوندی کا اظہار ہوا۔ مخالفین کے علی الرغم انھیں فتح مبین حاصل ہوئی۔ اصحاب رسول کا وہ کون سا عمل تھا جس کے نتیجہ میں وہ اللہ کی اس خصوصی رحمت و نصرت کے مستحق قرار پائے، اس کا ذکر سورہ الفتح کی مختلف آیتوں میں موجود ہے۔ ایک آیت یہ ہے :

اذ جعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیۃ حمیۃ الجاھلیۃ فانزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین والزمھم کلمۃ التقوی وکانوا احق بھا واھلھا وکان اللہ بکل شیٔ علیما (الفتح ۲۶)

جب انکار کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی، جاہلیت کی حمیت۔ پھر اللہ نے اپنی طرف سے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اور اللہ نے ان کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا، اور وہ اس کے زیادہ حقدار اور اس کے اہل تھے۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

اس آیت میں اصحاب رسول کے اس رویہ کا ذکر ہے جو انھوں نے واقعۂ حدیبیہ کے موقع پر اختیار کیا۔ اس رویہ کو یک طرفہ صبر، یا اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا کہہ سکتے ہیں۔

۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہنچ کر عمرہ ادا کریں۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تھے کہ مکہ کے مشرکین نے آگے بڑھ کر آپ کو روک دیا اور کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ انھوں نے اس معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔

آپ کو واپسی پر مجبور کرنے کے لیے انھوں نے مختلف قسم کی جارحانہ کارروائیاں کیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہر موقع پر جوابی جارحیت سے بچتے رہے تاکہ دونوں فریقوں کے درمیان تصادم کی نوبت نہ آئے۔ اس دوران مکہ والوں کی طرف سے مختلف وفدبات چیت کے لیے آتے رہے۔ آخر کار یہ طے پایا کہ دونوں فریقوں کے درمیان لمبی مدت کا ایک معاہدہ ہو جائے

تاکہ دونوں اپنی اپنی حد پر رہیں اور کوئی کسی کے اوپر زیادتی نہ کر سکے۔

حدیبیہ کے واقعہ کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ آخری مرحلہ میں جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو قریش مکہ کے نمائندہ کی طرف سے نہایت اشتعال انگیز رویہ اختیار کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا۔ قریش کے نمائندہ نے کہا کہ ہم اس کو نہیں مانتے، آپ بسمک اللھم لکھئے۔ پھر آپ نے لکھوایا کہ "محمد رسول اللہ کی طرف سے"۔ قریش کے نمائندہ نے اس کو بھی رد کر دیا اور کہا کہ محمد بن عبد اللہ لکھئے۔ یہ باتیں بے حد جگر خراش تھیں مگر صحابہ پر اللہ نے "سکینت" اتاری اور وہ ان شرطوں پر راضی ہو گئے۔

اسی طرح قریش کے نمائندہ نے معاہدہ میں یہ لکھوایا کہ مکہ کا کوئی آدمی اسلام قبول کر کے مدینہ چلا جائے تو آپ اس کو ہماری طرف لوٹانے کے پابند ہوں گے۔ اور اگر مدینہ کا کوئی آدمی ہم پکڑ لیں تو ہم اس کو آپ کی طرف نہیں لوٹائیں گے۔ یہ یک طرفہ شرط توہین کی حد تک ناقابل برداشت تھی مگر اصحاب رسول نے اللہ کی خاطر اس کو بھی برداشت کر لیا۔ معاہدہ کی کتابت کے دوران مکہ کے ایک مسلمان ابو جندل وہاں آگئے۔ ان کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور ان کا جسم زخمی ہو رہا تھا۔ قریش کے نمائندہ نے کہا کہ معاہدہ کے مطابق ابو جندل کو ہماری طرف واپس کیجئے۔ ابو جندل نے کہا کہ کیا میں کافروں کی طرف لوٹایا جاؤں گا تاکہ وہ مجھے فتنہ میں ڈالیں۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا مگر اپنے کھولتے ہوئے جذبات کو دبا کر اصحاب رسول اس مطالبہ پر بھی راضی ہو گئے۔

یہ صحابہ کی شخصیت کا ایک انوکھا پہلو تھا۔ وہ مسلسل اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہوئے۔ جارحیت کے باوجود انھوں نے جوابی کارروائی نہیں کی۔ عمرہ کو وقار کا مسئلہ بنائے بغیر وہ حدیبیہ سے واپسی پر راضی ہو گئے۔ انھوں نے فریق ثانی کی یک طرفہ شرطوں کو مان کر جنگ کی حالت کو امن کی حالت میں بدل دیا۔

واقعۂ حدیبیہ کے دوران فریق ثانی نے ناقابل برداشت حالات پیدا کیے۔ مگر اصحاب رسول ان کو برداشت کرتے رہے۔ مخالفین کی حمیت جاہلیہ کا جواب انھوں نے اسلامی سکینت کی صورت میں دیا۔ اصحاب رسول کا یہ رویہ اللہ تعالیٰ کو پسند آیا۔ اس نے اپنی اعلیٰ تدبیر سے ایسے راستے کھولے کہ اصحاب رسول کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ مکہ کو فتح کر لیں۔ یہود کی جڑیں کاٹ دیں، اور پورے عرب میں اسلام کو ایک غالب دین کی حیثیت سے قائم کر دیں۔

وقافاً عند کتاب اللہ

قرآن کی ایک تعلیم وہ ہے جس کو اعراض کہا جاتا ہے۔ یعنی نادان لوگوں کی اشتعال انگیز باتوں پر مشتعل نہ ہونا، حتیٰ کہ اگر اس قسم کی بات کو سن کر غصہ کی آگ بھڑک اٹھے تو اس کو شیطانی وسوسہ سمجھ کر اس سے پناہ مانگنا۔ اور ہر حال میں نظر انداز کرنے کے رویہ پر قائم رہنا۔ اس سلسلہ میں قرآن کا حکم یہ ہے :

خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلين - واما ينزغنك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله انه سميع عليم - ان الذين اتقوا اذا مسهم طائف من الشيطان تذكروا فاذا هم مبصرون - واخوانهم يمدونهم في الغي ثم لا يقصرون (الاعراف ۲۰۲ - ۱۹۹)

درگزر کرو اور نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔ اور اگر تم کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آئے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جو لوگ اللہ کا ڈر رکھتے ہیں، جب ان کو شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں۔ اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو لوگ شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، پھر وہ کمی نہیں کرتے۔

صحیح البخاری، کتاب التفسیر (سورۃ الاعراف) میں باب خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلين کے تحت ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ یہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے :

عُبید اللہ بن عبد اللہ بن عُتبہ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن عباسؓ نے ان سے بیان کیا۔ عُیَینہ بن حصن بن حُذیفہ مدینہ آئے اور اپنے بھتیجے الحر بن قیس کے مکان پر ٹھہرے۔ الحر بن قیس ان لوگوں میں سے تھے جن کو عمر اپنے قریب جگہ دیتے تھے۔ وہ ان کے مشیروں میں سے تھے۔ عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ اے میرے بھتیجے، تم کو امیر المومنین کے یہاں قربت حاصل ہے۔ میری ان سے ملاقات کرادو۔ اس کے بعد الحر نے عمر سے ملاقات کی اجازت مانگی۔ انھوں نے اجازت دے دی۔

عیینہ جب عمرؓ کے یہاں پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اے خطاب کے بیٹے، خدا کی قسم تم ہم کو نہ کچھ

مال دیتے ہو اور نہ ہمارے درمیان انصاف کرتے ہو۔ عمر یہ سن کر غصہ میں آگئے اور ان پر اقدام کرنا چاہا۔ اس وقت الحر بن قیس نے ان سے کہا کہ اے امیر المومنین ، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے نبی کو یہ حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو معاف کر دو اور معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو (الاعراف ۱۹۹) اور یہ آدمی بلاشبہہ جاہلوں میں سے ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اس کے بعد عمر نے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا ، جب کہ انھوں نے قرآن کی یہ آیت ان کے سامنے پڑھ دی۔ اور عمر خدا کی کتاب پر بہت زیادہ رک جانے والے تھے (واللہِ ماجاوزَھا عمر حین تلاھا علیہِ وکانَ وقّافاً عندَ کتابِ اللہ)

یہ مثال اصحاب رسول کی ایک اہم صفت کو بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ اصحابِ رسول اللہ کی کتاب کے سامنے فوراً ٹھہر جانے والے (وقّافاً عند کتاب اللہ) تھے۔ خدا کا حکم سامنے آنے کے بعد وہ اپنے ہاتھ اور اپنے پاؤں اور اپنی زبان کو بلا تاخیر روک لینے والے تھے۔ ایک دلیلِ حق ان کے چلتے ہوئے قدموں میں بیڑی ڈال دینے کے لیے کافی تھی ، خواہ اس کے پیچھے کوئی محسوس اور مادی طاقت موجود نہ ہو۔

یہ ایک انتہائی نادر صفت ہے جس کا مظاہرہ صحابۂ کرام کے ذریعہ دنیا کے سامنے ہوا۔ جب آدمی کے اندر غصہ بھڑک اٹھے۔ جب اس کے لیے "میں" کا مسئلہ پیدا ہو جائے تو اس وقت وہ کوئی دلیل سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام وہ لوگ تھے جن کو سخت ہیجانی حالت میں بھی قرآن کی ایک آیت خاموش کر دینے کے لیے کافی ہوتی تھی۔

موجودہ دنیا میں خدا کا حکم لفظ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مگر ایک لفظی حکم سن کر ان کا یہ حال ہوتا تھا گویا کہ خود خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔

جس آدمی سے اختلاف پیدا ہوا ہے اس کے ساتھ عدل کا رویہ برتنا ، جس آدمی نے انا پر چوٹ لگائی ہے اس کے مقابلہ میں صبر کر لینا ، جس آدمی نے اپنے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے غصہ بھڑکا دیا ہے اس کے خلاف اپنے غصہ کو برداشت کر لینا ، جس آدمی نے تحقیر و تذلیل کا انداز اختیار کیا ہے اس سے انتقام نہ لینا ، یہ سب اعلیٰ ترین انسانی اوصاف ہیں۔ صحابہ کرام وہ مثالی لوگ ہیں جو ان اوصاف میں کمال کی حد تک پورے اترے۔

سنتِ خداوندی

غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب پر نظر ڈالی تو وہ تین سو سے کچھ زیادہ تھے۔ پھر آپ نے مشرکوں کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار سے زیادہ تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رو ہو کر سجدہ میں گر پڑے۔ اور آپ کے اوپر آپ کی چادر تھی۔ آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے :

اللّٰھم أنجزلی ما وعدتنی اللّٰھم ان تھلک ھٰذہ العصابۃ من اھل الاسلام فلا تعبد بعد فی الارض ابدا (البدایۃ والنہایۃ ۳/۲۰۵)

اے اللہ، اس وعدہ کو پورا فرما جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ اے اللہ، اگر تو اہل اسلام کے اس گروہ کو ہلاک کر دے تو اس کے بعد زمین پر کبھی تیری عبادت نہ ہو گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جیش اسامہ کی شام کی طرف روانگی اسلامی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس وقت عرب میں بغاوت پھیل گئی تھی۔ مگر خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے اس مومنانہ اقدام نے از سر نو اسلام کا دبدبہ قائم کر دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا :

واللّٰہ الذی لا الٰہ الا ھو، لولا أن أبا بکر استخلف ما عبد اللّٰہ (البدایۃ والنہایۃ ۶/۳۰۵)

اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اگر (رسول اللہ کے بعد) ابوبکر کو خلیفہ نہ بنایا جاتا تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔

یہ دونوں قول بظاہر بہت عجیب ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ نے جب یہ کہا تو سننے والے بولے کہ اے ابوہریرہ چپ رہو (مہ یا اباھریرۃ) مگر یہ الفاظ عین حقیقت واقعہ کا اظہار تھے۔

اصل یہ ہے کہ اس قول کا تعلق اللہ کی سنت سے ہے نہ کہ اللہ کی قدرت سے۔ اللہ کے لیے بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہواؤں کے ذریعہ تمام مشرکوں کو ہلاک کر دے اور ایک لفظ کُن کے ذریعہ تمام انسانوں کو اپنا عبادت گزار بنا دے۔ مگر موجودہ امتحان کی دنیا میں خود اللہ کے اپنے فیصلہ کی بنا پر ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں سارا کام اسباب وعلل کے پردہ میں انجام دیا جاتا ہے ـــــــ مذکورہ قول

کا مطلب یہ ہے کہ قانونِ الٰہی کے تحت ایسا نہیں ہوگا، نہ یہ کہ باعتبار امکان ایسا نہیں ہوسکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دعا کے وقت جو الفاظ نکلے، یا حضرت ابوہریرہ نے جو بات کہی، ان سے صحابہ کے گروہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ صحابہ عام قسم کے انسان نہ تھے۔ یہ ایک منفرد ٹیم تھی جو عرب کے صحرا میں خصوصی اہتمام کے ذریعہ تیار کی گئی تھی۔ اگر یہ انسان ضائع ہوجاتے تو دوبارہ تاریخ وہیں واپس چلی جاتی جہاں وہ صحابہ کے دور سے پہلے تھی۔

قرآن کے مطابق، اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ دنیا سے فتنہ ختم ہو، اور دینِ خداوندی کا عالمی اظہار ہو۔ یعنی دنیا سے شرک کے غلبہ کا دور ختم ہوجائے، اور توحید کے غلبہ کا دور قائم ہوجائے۔ یہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ کیونکہ اس کو مکمل طور پر اسباب کے دائرہ میں انجام دینا تھا۔ یہ گویا ایک خدائی واقعہ کو انسانی سطح پر ظہور میں لانا تھا۔

اس کے لیے ایسے حقیقت شناس انسان درکار تھے جو ایک ہم عصر پیغمبر کو پہچان کر ہمہ تن اس کے ساتھی بن جائیں۔ اس کے لیے ایسے پختہ کردار لوگ مطلوب تھے جو ایک بار عہد کرنے کے بعد پھر کبھی اس سے نہ پھریں، خواہ اس راہ میں ان کا سب کچھ لٹ جائے۔ اس کے لیے ایسا بامقصد گروہ درکار تھا جو مقصدِ حق کے سوا ہر دوسری چیز کو ثانوی حیثیت دے دے۔ اس کے لیے ایسے بہادر انسانوں کی ضرورت تھی جو چٹانوں سے ٹکرا جائیں اور اس وقت تک نہ رکیں جب تک اپنے مشن کو مکمل نہ کرلیں۔ اس کے لیے ایسے اعلیٰ ظرف افراد درکار تھے جو اختلاف کے باوجود متحد رہیں اور شکایت کے باوجود اپنا تعاون ختم نہ کریں۔

اصحابِ رسول اسی قسم کے نادر انسان تھے۔ وہ خاص اسی مقصد کے لیے ڈھائی ہزار سالہ تربیتی کورس کے تحت بنائے گئے تھے۔ اگر ان کے ذریعہ مذکورہ مشن اپنی تکمیل تک نہ پہنچتا تو دوبارہ ایک اور ابراہیمی شخصیت کی ضرورت ہوتی اور تاریخ کو پھر ڈھائی ہزار سال تک انتظار کرنا پڑتا تاکہ مطلوبہ نوعیت کی ایک ٹیم بنے اور اس کو استعمال کر کے خدا کے دین کا عالمی اظہار کیا جائے۔

اصحابِ رسول انسانی تاریخ کے وہ منتخب افراد تھے جن کی ذات پر انسانی ارادہ اور خدائی منصوبہ دونوں ایک ہوگیا تھا۔ ایسے افراد تاریخ کے ہزاروں سال کے عمل کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اگر وہ اپنے مقصد کی تکمیل سے پہلے ختم ہوجائیں تو تاریخ کا سفر رک جائے گا۔

میں کو حذف کرنا

غزوۂ بدر ۲ھ میں پیش آیا۔ اچانک صورت حال کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین مکہ کے مقابلہ کے لیے نکلنا پڑا۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ کیونکہ اس مقابلہ کے لیے مہاجرین کی تعداد ناکافی تھی، انصار کا معاملہ یہ تھا کہ اپنی بیعت کی رو سے وہ صرف مدینہ کے اندر آپ کی حمایت کے پابند تھے۔ مدینہ سے باہر نکل کر دشمنوں سے مقابلہ کرنا ان کے واجبات بیعت میں شامل نہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اے لوگو، مجھے مشورہ دو۔ اس کے جواب میں مہاجرین میں سے کچھ لوگوں نے اٹھ کر آپ کو اپنی پوری حمایت کا یقین دلایا۔ آپ نے کئی بار کہا کہ اے لوگو مجھے مشورہ دو، اور ہر بار مہاجرین اٹھ کر جواب دیتے رہے۔

آخر انصار کو احساس ہوا کہ غالباً آپ ہمارا خیال جاننا چاہتے ہیں۔ یہ احساس ہوتے ہی فوراً ان کے سردار اٹھے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، شاید آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ انھوں نے کہا کہ اب ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم آپ کو اکیلا چھوڑ دیں۔ اے خدا کے رسول، آپ جو چاہتے ہیں، اس کو کر گزریے۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم اگر آپ یہاں سے روانہ ہوں اور چلتے چلتے سمندر میں داخل ہو جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں داخل ہو جائیں گے۔ ہم میں سے کوئی شخص پیچھے نہ رہے گا (البدایہ والنہایہ ۳/۶۳-۲۶۲)

اسی طرح صلح حدیبیہ (۶ھ) کے بعد جب امن ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ اطراف عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کریں۔ آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے کچھ لوگوں کو دعوتی پیغام کے ساتھ عجمی بادشاہوں کی طرف بھیجوں۔ پس تم لوگ میرے ساتھ اختلاف نہ کرو جس طرح بنو اسرائیل نے عیسیٰ بن مریم کے ساتھ اختلاف کیا۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، ہم آپ سے کسی معاملہ میں کبھی اختلاف نہ کریں گے۔ آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو جہاں چاہے وہاں بھیجئے (البدایہ والنہایہ ۴/۲۶۸)

یہ واقعات اصحاب رسول کی ایک نہایت اہم خصوصیت کو بتا رہے ہیں۔ یہ خصوصیت ہے —

"میں" کو حذف کر کے کسی شخص کا ساتھ دینا۔

ساری تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ لوگ ابتدائی جذبہ کے تحت کسی کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں مگر جب ناموافق باتیں پیش آتی ہیں تو وہ فوراً اختلاف کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اصحاب رسول (انصار) بدر کی لڑائی کے موقع پر کہہ سکتے تھے کہ ہم نے داخلی دفاع کا عہد کیا ہے، ہم نے خارجی مقابلہ کا آپ سے عہد نہیں کیا (البدایہ والنہایہ ۳/۲۶۲) مگر انھوں نے اس پہلو کو نظر انداز کر کے آپ کا ساتھ دیا۔ جب کہ یہ ساتھ دینا بظاہر موت کے غار میں کودنے کے ہم معنی تھا۔ کیونکہ دشمن کے پاس ایک ہزار افراد کی طاقتور اور مسلح فوج تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ۳۱۳ آدمیوں کی نسبتاً کمزور جماعت۔

اسی طرح حکمرانوں کے نام دعوتی وفود بھیجنے کے سلسلہ میں وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ ابھی تو عرب میں بھی اسلام پوری طرح نہیں پھیلا۔ ابھی داخلی استحکام کے اعتبار سے ہمارے سامنے بے شمار مسائل ہیں۔ ایسی حالت میں بیرون ملک وفود بھیجنے کا کیا موقع ہے۔

مگر اصحاب رسول نے اس قسم کے ہر خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔ انھوں نے عذر کو عذر نہیں بنایا۔ انھوں نے "میں" کو حذف کر کے آپ کا ساتھ دیا۔ انھوں نے اجتماعی مفاد کے لیے انفرادی تقاضوں کو نظر انداز کر دیا۔ اختلاف اور شکایت کے ہر معاملہ کو اللہ کے حوالے کر کے وہ اس پر راضی ہو گئے کہ وہ رسول خدا کی قیادت کے تحت اسلام کی خدمت کرتے رہیں، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جائیں۔

ایک مفکر نے کہا کہ اگر تمہارے پاس بہترین عذر ہے تب بھی تم اس کو استعمال نہ کرو :

If you have a good excuse don't use it.

مغربی مفکر نے یہ بات بطور آئیڈیل کہی تھی۔ مگر اس آئیڈیل کو پہلی بار جن لوگوں نے عملی واقعہ بنایا وہ اصحاب رسول تھے۔ انھوں نے اختلاف کو نظر انداز کر کے اتحاد کیا۔ انھوں نے شکایتوں کو بھلا کر ساتھ دیا۔ انھوں نے اپنی ذات کو حذف کر کے اپنے آپ کو اجتماعیت سے وابستہ کیا۔ وہ اپنے جذبات کو دبا کر مقصد کی تکمیل میں لگے رہے۔ انھوں نے پانے کی امید کے بغیر دیا۔ انھوں نے کریڈٹ لینے کے خیال کو اپنے ذہن سے نکال کر قربانیاں دیں۔ عام لوگ جس حد پر رک جاتے ہیں ان حدوں پر رکے بغیر وہ آگے بڑھ گئے۔

اصحاب رسولؐ

خالد بن ولید اور عبد الرحمٰن بن عوف کے درمیان کسی بات پر اختلاف پیدا ہوا۔ اس موقع پر حضرت خالد کی زبان سے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے لیے کچھ سخت کلمات نکل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا :

لا تَسبُّوا اصحابی ، لا تسبوا اصحابی۔ فوا الذی نفسی بیدہ لو اَنَّ احدکم اَنفقَ مِثلَ اُحُدٍ ذَهَباً ما بلغ مُدَّ احدِهم ولا نصیفہ

(مسلم ، باب تحریم سب الصحابہ)

میرے اصحاب کو برا نہ کہو ، میرے اصحاب کو برا نہ کہو ، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کر دے تو وہ ان کے ایک مد یا اس کے نصف کے برابر بھی نہیں پہنچے گا۔

صحابہ کرام کی وہ کیا خاص صفت تھی جس کی بنا پر انھیں یہ امتیازی مقام ملا۔ قرآن کے لفظوں میں وہ تھی ــــــ مشکل گھڑیوں میں اتباع کرنا (التوبہ ۱۱۷) فتح کا دور آنے سے پہلے قربانیاں پیش کرنا (الحدید ۱۰)

آج پیغمبر اسلام کی رسالت ایک ثابت شدہ رسالت ہے۔ آپ کا نام بلند ترین عظمت کا نشان بن چکا ہے۔ آج آپ کے نام پر اٹھنے والے کو ہر قسم کی عزت اور ہر قسم کے مادی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایسا آدمی فوراً قوم کے درمیان قائد کا مقام پالیتا ہے۔ مگر جس وقت صحابہ کرام نے آپ کا ساتھ دیا ، اس وقت یہ تمام امکانات ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ ابھی واقعہ بن کر لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے۔

صحابہ کرام کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حال کے پیغمبر کو اس کے مستقبل کی عظمتوں کے ساتھ دیکھا۔ انھوں نے بظاہر ایک عام انسان کو اس کے پیغمبرانہ جوہر کے ساتھ دریافت کیا۔ انھوں نے اس وقت پیغمبر کا ساتھ دیا جب کہ پیغمبر کا ساتھ دینے کا مطلب پوری قوم میں نکو بن جانا تھا۔ جب پیغمبر کی حمایت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آدمی اپنی قوم اور اپنی برادری کی حمایت سے محروم ہو جائے۔

صحابہ کرام کا ایمان ایک دریافت تھا۔ آج کے مسلمانوں کا ایمان ایک قومی تقلید ہے۔ ان

دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آسمان اور زمین میں۔

لبید بن ربیعہ (م ۱۴۱ھ) عرب کے بڑے شاعروں میں سے تھے۔ وہ اصحاب معلقات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے شاعری کیوں چھوڑ دی۔ انھوں نے جواب دیا : أبعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی)

حضرت لبید کا یہ قول آج بظاہر کوئی غیر معمولی قول نظر نہیں آتا۔ کیونکہ آج لوگوں کے ذہنوں پر قرآن کی عظمت اتنی زیادہ چھائی ہوئی ہے کہ یہ بالکل ایک فطری بات معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص قرآن کے اعلیٰ ادب سے متاثر ہو کر شاعری کو چھوڑ دے۔ مگر اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ حضرت لبید نے ایسا کیا، اس وقت یہ ایک انتہائی غیر معمولی بات تھی۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں قرآن کی حیثیت ایک عام کتاب کی سی تھی۔ اس وقت وہ لوگوں کے درمیان ایک نزاعی کتاب بنی ہوئی تھی، اس وقت تک قرآن کی پشت پر وہ واقعاتی عظمتیں اور تاریخی صداقتیں جمع نہیں ہوئی تھیں جو آج اس کی پشت پر جمع ہو چکی ہیں۔

صحابہ کرام وہ لوگ تھے جنھوں نے دور عظمت سے پہلے قرآن کو پہچانا۔ جنھوں نے اس وقت اپنے آپ کو اسلام کے لیے وقف کیا جب کہ اسلام ہر قسم کے مادی مفادات سے خالی تھا۔ جو اس وقت پیغمبر کے حامی بنے جب کہ پیغمبر کے نام پر کسی قسم کی قیادت نہیں ملتی تھی۔ جنھوں نے محرومی کی قیمت پر دین خداوندی کو اپنایا اور بے قدر ہو کر اس کی کامل قدر دانی کی۔ انھوں نے "بے اسلام" میں اسلام کی تصویر دیکھی۔

اصحاب رسول کا امتیازی مقام ان کے امتیازی عمل کی بنا پر ہے۔ ان کا یہ امتیازی عمل، ایک لفظ میں، یہ تھا کہ انھوں نے ساتھ نہ دینے والے حالات میں ساتھ دیا۔

اصحاب رسول نے بے اعترافی کے حالات میں اعتراف کیا۔ انھوں نے ناقدری کے حالات میں قدر دانی کی۔ انھوں نے التباس کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو پہچانا۔ انھوں نے بے عظمت چیز کو عظمت کے روپ میں دیکھا۔ انھوں نے وہاں بینا ہونے کا ثبوت دیا جہاں لوگ اندھے بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے وہاں سچائی کی آواز سنی جہاں کان والوں کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

نہیں میں ہے کو دیکھنا

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ۱۴ھ میں ایران فتح ہوا۔ اس وقت ایران کا بادشاہ یزدگرد اور اس کا سپہ سالار رستم تھا۔ سعد بن ابی وقاصؓ کی قیادت میں جو مسلم لشکر ایران میں داخل ہوا، اس کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار سے کچھ زیادہ تھی، جب کہ رستم کی فوج کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ اس کے باوجود اہلِ اسلام کی فتوحات کی خبریں سن کر ایرانی حکمراں خائف تھے۔ انھوں نے سعد بن ابی وقاصؓ کو پیغام بھیجا کہ بات چیت کے لیے اپنا سفیر روانہ کریں۔

اس سلسلہ میں صحابۂ کرام کے کئی وفد مدائن گئے اور رستم اور یزدگرد سے بات کی۔ ان لوگوں نے انتہائی بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔ مثلاً ربعی بن عامر ایرانی دربار میں داخل ہوئے تو وہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تخت تک چلے گئے۔ انھوں نے اپنا نیزہ قالین میں گاڑ کر اس سے اپنے گھوڑے کو باندھ دیا۔ انھوں نے ایرانی حکمرانوں سے نہایت بے باکی کے ساتھ گفتگو کی جس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

آخری مرحلہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایرانی شہنشاہ یزدگرد ان کی باتیں سن کر بگڑ گیا۔ اس نے غصہ ہو کر مسلم وفد سے کہا کہ اگر یہ دستور نہ ہوتا کہ سفیر قتل نہ کیے جائیں تو میں تم لوگوں کو قتل کر دیتا۔ تمہارے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ تم اپنے سردار (سعد بن ابی وقاص) کے پاس جاؤ اور ان کو بتا دو کہ میں رستم کو ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ تمہاری طرف بھیج رہا ہوں جو تم لوگوں کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دے گا۔

پھر یزدگرد نے پوچھا کہ تمہارے وفد کا سب سے معزز شخص کون ہے۔ تاکہ میں اس کے سر پر مٹی کا ٹوکرا رکھ کر اس کو یہاں سے واپس کروں۔ لوگ اس سوال پر چپ رہے۔ آخر وفد کے ایک عام رکن عاصم بن عمرو کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ تم جس کو چاہتے ہو وہ شخص میں ہوں۔ تم مٹی میرے سر پر رکھ دو۔ یزدگرد نے لوگوں سے پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں وہ ہمارے معزز شخص ہیں۔

اس کے بعد یزدگرد نے مٹی سے بھرا ہوا ایک ٹوکرا منگایا اور اس کو ان کے سر پر رکھ دیا۔ اور حکم دیا کہ ان لوگوں کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ عاصم بن عمرو مٹی کا ٹوکرا لیے ہوئے محل کے باہر آئے۔ اس کو انھوں نے اپنی سواری پر رکھا اور تیزی سے روانہ ہو کر وہاں پہنچ گئے جہاں سعد بن ابی وقاص ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے خیمہ میں داخل ہو کر مٹی کا ٹوکرا سردار کے سامنے رکھ دیا اور ان کو واقعہ بتایا۔ راوی کہتے ہیں:

فقال : ابشروا فقد واللہ اعطانا اللہ اقالید ملکھم وتفاء لوا بذلك اخذ بلادھم۔ ثم لم یزل امر الصحابة یزداد فی کل یوم علواً وشرفاً ورفعة وینحط امر الفرس سفلاً وذلاً وھنا

سعد بن ابی وقاص نے کہا کہ تم کو خوش خبری ہو۔ خدا کی قسم، اللہ نے ہمیں ان کے اقتدار کی کنجیاں دیدیں۔ اور مٹی سے انھوں نے فال لیا کہ ان کا ملک ہمیں حاصل ہوگا۔ اس کے بعد صحابہ ہر روز بلندی اور شرف اور رفعت میں بڑھتے رہے اور ایرانی پستی اور ذلت اور ناکامی میں گرتے چلے گئے۔

مسلم وفد کو محل سے نکال دینے کے بعد یزدگرد نے یہ واقعہ رستم کو بتایا۔ اور مٹی کا ٹوکرا سر پہ رکھنے کے معاملہ کو ان کی حماقت قرار دیا۔ رستم نے کہا کہ نہیں، وہ آدمی احمق نہیں تھا، خدا کی قسم وہ لوگ تو ہمارے ملک کی کنجیاں اٹھالے گئے (واللہ ذھبوا بمفاتیح ارضنا) البدایہ والنہایہ ۷/۴۳-۴۲

سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے حالات میں گھر کر سوچنا، دوسرا ہے حالات سے اوپر اٹھ کر سوچنا۔ ایک ہے نفرت اور محبت جیسے جذبات کے تحت رائے قائم کرنا، دوسرا ہے نفرت اور محبت جیسے جذبات سے بلند ہوکر رائے قائم کرنا۔ عام طور پر لوگ حالات سے متاثر ہوکر سوچتے ہیں، وہ فوری جذبات کے زیر اثر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ مگر صحابہ کرام ان چیزوں سے اوپر تھے۔ وہ حالات اور جذباتی محرکات سے اوپر اٹھ کر خود اپنے فیصلہ کے تحت یہ طے کرتے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

صحابہ کی اس صفت نے ان کو بے پناہ حد تک طاقت ور بنا دیا تھا۔ انھیں مٹی دی جاتی اور وہ اس کو فتح کے تاج کی طرح قبول کر لیتے تھے۔ جس واقعہ کو لوگ بے عزتی کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں، اس سے وہ عزت کا مفہوم نکال لیتے تھے۔ جو تجربہ لوگوں کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے، اس سے وہ اپنے لیے یقین کی غذا حاصل کر لیتے تھے۔

صحابہ انسانی تاریخ کے وہ انوکھے افراد تھے جو عُسر میں یُسر کا راز پا لیتے تھے۔ جو ناکامی سے کامیابی کو نچوڑتے تھے۔ جو شکست کے واقعہ کو فتح کے واقعہ میں تبدیل کر دیتے تھے۔ جو مایوسی کی تاریکی میں امید کی روشنی دیکھ لیتے تھے۔ رکھنے والا ان کے سر پر مٹی کا ٹوکرا رکھتا تھا، اور وہ سمجھتے کہ اس نے خود ہی اپنا ملک ہمارے حوالے کر دیا ہے۔

بلند نظری

۱۷ھ کے آخر میں شام اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں طاعون کی وبا پھیلی۔ ۱۸ھ میں یہ وبا نہایت شدید ہوگئی۔ اس وقت شام کی مسلم فوجوں کے سپہ سالار ابوعبیدہ بن الجراحؓ تھے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ مسلمان جہاں ہیں وہیں ٹھہرے رہیں۔ حضرت ابوعبیدہ اس مرض میں مبتلا ہوئے اور اسی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ان کے بعد معاذ بن جبلؓ اس علاقہ کی مسلم فوجوں کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ ان کی پالیسی بھی وہی رہی جو حضرت ابوعبیدہ کی پالیسی تھی۔ حضرت معاذ بن جبل اس مرض میں مبتلا ہوئے اور ان کا بھی اسی مرض میں انتقال ہوگیا۔

اس کے بعد عمرو بن العاصؓ اس علاقہ کی مسلم افواج کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنی پالیسی بدلی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنی موجودہ جگہ کو چھوڑ دیں۔ مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں :

فلما مات استخلف على الناس عمرو بن العاص فقام فيهم خطيبا فقال - ايها الناس، ان هذا الوجع اذا وقع فانما يشتعل اشتعال النار فتحصنوا منه في الجبال۔ فقال ابو وائل الهذلي۔ كذبت والله - لقد صحبت رسول الله صلى الله عليه وسلم وانت شر من حماري هذا۔ فقال والله ما ارد عليك ما تقول

(البداية والنهاية ۷/۹۰)

پھر جب معاذ بن جبلؓ کی وفات ہوگئی تو عمرو بن العاص لوگوں کے اوپر سردار مقرر ہوئے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر لوگوں کے درمیان تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اے لوگو، یہ بیماری جب آتی ہے تو وہ آگ کی طرح بھڑک اٹھتی ہے۔ پس تم لوگ پہاڑوں میں اپنے آپ کو اس سے محفوظ کر لو۔ یہ سن کر ابو وائل ھذلیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم تم نے جھوٹ کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہے۔ اور تم میرے اس گدھے سے بھی زیادہ برے ہو۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ خدا کی قسم تم جو کہہ رہے ہو اس کا میں کوئی جواب نہیں دوں گا۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ صحابۂ کرام کے درمیان کتنی سخت تنقید دں کا رواج تھا۔ ان کے

یہاں اظہار رائے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ لوگ نہ صرف آپس میں ایک دوسرے پر تنقید کرتے تھے بلکہ حاکموں اور سرداروں کے اوپر بھی آزادانہ تنقید کی جا سکتی تھی۔ اور نہ حاکم اس کو برا مانتا تھا اور نہ عام لوگ۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب رسول کتنے زیادہ بڑے دل والے لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اتنی زیادہ بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ ——— جتنا بڑا دل، اتنی ہی بڑی کامیابی۔

اس دنیا میں خود تخلیقی فطرت کے تحت ایسا ہے کہ لوگوں کی سوچ الگ الگ ہوتی ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ باصلاحیت ہو اتنا ہی زیادہ وہ منفرد انداز سے سوچتا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی طاقتور ٹیم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد میں تنقید کو برداشت کرنے کا مادہ ہو۔ خاص طور پر سربراہ کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ سخت ترین تنقید کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سنے۔ وہ اختلاف اور اتفاق سے اوپر اٹھ کر لوگوں کے ساتھ معاملہ کرے۔

جو لوگ اپنے اندر یہ صفت رکھتے ہوں، وہی اپنے گرد اعلیٰ انسانوں کی ٹیم جمع کر سکتے ہیں اور ان کو ساتھ لے کر کوئی بڑا کام انجام دے سکتے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر یہ صفت نہ ہو ان کے گرد صرف سطحی اور خود غرض اور منافق قسم کے لوگ جمع ہوں گے، اور سطحی اور خود غرض اور منافق قسم کے لوگوں کی جماعت اس دنیا میں کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتی۔

اصحاب رسول وہ بلند نظر اور اعلیٰ فطرت انسان تھے جن کو نہ تعریف خوش کرتی تھی اور نہ تنقید کو سن کر وہ برہم ہوتے تھے۔ خدا کو انھوں نے ایسی عظیم ترین حقیقت کے طور پر پایا تھا کہ اس کے بعد ان کے لیے ہر دوسری چیز چھوٹی ہو گئی تھی۔ وہ برتر خدا میں جینے والے لوگ تھے۔ اس لیے تنقید و اختلاف جیسی چیزیں ان کے ذہنی سکون کو برہم نہیں کرتی تھیں۔

اصحاب رسول کا ایک ایک شخص ہیرو تھا۔ مگر ان کی یہی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ سب مل کر ایک مستحکم دیوار بن گئے۔ ان کے ساتھ ہر قسم کی ناخوش گوار باتیں پیش آئیں، مگر وہ ان کے اتحاد کو توڑ نہ سکیں۔ وہ ان کے استحکام میں رخنہ ڈالنے والی ثابت نہیں ہوئیں۔ اس قسم کی تمام خرابیاں اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، اور اختلاف کو پہلے ہی وہ اپنے لیے ایک ناقابل لحاظ چیز بنا چکے تھے۔

بے لاگ انصاف

اسلام کے چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے :

علی بن ابی طالبؓ، جب خلیفہ تھے، ایک روز وہ بازار کی طرف نکلے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک نصرانی وہاں ایک زرہ بیچ رہا ہے۔ حضرت علی نے پہچان لیا کہ یہ ان کی وہی زرہ ہے جو اس سے پہلے کھو گئی تھی۔ انھوں نے نصرانی سے کہا کہ یہ زرہ میری ہے۔ نصرانی نے انکار کیا۔ حضرت علی نے کہا کہ پھر مسلمانوں کے قاضی کے پاس چلو، وہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔

اس وقت کوفہ میں مسلمانوں کے قاضی شُریح بن الحارث تھے۔ وہ ۷۷ھ تک اس عہدہ پر رہے۔ چنانچہ دونوں وہاں گئے۔ جب قاضی شریح نے امیر المومنین کو دیکھا تو وہ اپنے مقام سے اٹھ گئے اور حضرت علی کو اپنے مقام پر بٹھایا۔ اور قاضی شریح خود ان کے سامنے نصرانی کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

حضرت علی نے کہا کہ اے شریح، میرے اور اس کے درمیان فیصلہ کرو۔ شریح نے کہا کہ اے امیر المومنین، آپ کیا کہتے ہیں۔ حضرت علی نے کہا کہ یہ میری زرہ ہے۔ کچھ دن پہلے وہ مجھ سے کھو گئی تھی۔ پھر قاضی شریح نے نصرانی سے کہا کہ تم کیا کہتے ہو۔ نصرانی نے کہا کہ امیر المومنین جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ یہ زرہ میری زرہ ہے۔

قاضی شریح نے حضرت علی سے کہا کہ کیا آپ کے پاس کوئی دلیل (بینہ) ہے۔ کیونکہ دلیل اور شہادت کے بغیر آپ زرہ کو اس کے ہاتھ سے نہیں لے سکتے۔ حضرت علی نے کہا کہ شریح نے سچ کہا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی طرف سے دو گواہ پیش کیے۔ ایک اپنے لڑکے حسن کو، اور دوسرے اپنے غلام قنبر کو۔ قاضی شریح نے کہا کہ حسن کے علاوہ کوئی اور گواہ لائیے۔ حضرت علی نے کہا کہ کیا تم حسن کی شہادت کو رد کرتے ہو۔ کیا تم کو یہ حدیث نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حسن اور حسین جنّت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔

قاضی شریح نے کہا کہ قنبر کی گواہی میں قبول کرتا ہوں مگر حسن کی گواہی میں قبول نہیں کر سکتا۔

کیونکہ خود آپ سے میں نے یہ سنا ہے کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں۔ اس کے بعد حضرت علی نے قاضی شریح کے فیصلہ کو قبول کر لیا۔

اس واقعہ کا نصرانی کے اوپر بہت اثر ہوا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم اے امیر المومنین، یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ آپ کے اونٹ سے وہ گر گئی تھی۔ پھر میں نے اس کو اٹھا لیا۔ پھر نصرانی نے کہا کہ اسلام کی یہ بات بہت عجیب ہے کہ امیر المومنین خود میرے ساتھ قاضی کے پاس آئے۔ قاضی اس کے خلاف فیصلہ کرے اور وہ اس فیصلہ پر راضی ہو جائے۔

اس کے بعد نصرانی نے کلمۂ اسلام پڑھ کر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ حضرت علی نے کہا کہ جب تم نے اسلام قبول کر لیا تو یہ زرہ اب تمہاری ہے۔ اسی کے ساتھ اس کو سات سو درہم اور ایک گھوڑا دیا۔ اس کے بعد وہ نصرانی حضرت علی کا ساتھی بن گیا۔ یہاں تک کہ جنگ صفین میں لڑتے ہوئے شہید ہوا (حیاۃ الصحابہ ۱/۳۵-۲۳۴)

قدیم زمانہ میں ہمیشہ حکمراں کو قانون سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ یہ ناقابل تصور تھا کہ ایک حکمراں کو عدالت میں معمولی انسان کی طرح کھڑا کیا جا سکے۔ موجودہ جمہوری زمانہ میں اگرچہ خالص قانونی اعتبار سے حکمراں اور عوام کو برابر سمجھا جاتا ہے۔ تاہم آج بھی عملی طور پر یہ ناممکن ہے کہ ایک برسر اقتدار شخص کو عدالت میں بلایا جائے اور جج کی کرسی پر بیٹھنے والا آدمی عام انسانوں کی طرح اس کے اوپر قانون کا نفاذ کرے۔

پوری معلوم تاریخ میں یہ صرف اصحاب رسول ہیں جنھوں نے یہ استثنائی مثال قائم کی کہ ان کے ایک حاکم کو عدالت میں لایا جائے اور ایک عام انسان کی طرح مقدمہ چلا کر اس کے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے۔

انسانی ضمیر یہ چاہتا ہے کہ ہر آدمی یکساں طور پر قانون کے سامنے جواب دہ ہو۔ مگر انسانی ضمیر کی یہ طلب حقیقی معنوں میں صرف ایک ہی دور میں عملی واقعہ بن سکی، اور وہ بلاشبہہ اصحاب رسول کا دور ہے۔

بادشاہ پر یکساں انصاف کی بات اصحاب رسول سے پہلے صرف افسانہ کی کتابوں میں تھی۔ اصحاب رسول نے اس کو افسانہ سے اٹھا کر حقیقی زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

سیاسی بے غرضی

۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپؐ کے بعد مسلمانوں کا امیر کون ہو۔ اس وقت مدینہ میں مسلمانوں کے دو بڑے گروہ تھے۔ مہاجرین اور انصار۔ انصار کا خیال تھا کہ امارت ان کا حق ہے۔ کیونکہ رسول اور مہاجر صحابہ کو جب مکہ چھوڑنا پڑا تو انصار نے اس پورے قافلہ کو اپنے شہر مدینہ میں جگہ دی۔ وہ ہر اعتبار سے ان کے مددگار بن گئے۔ ان کی حیثیت اس وقت اگرچہ ایک "لٹے ہوئے قافلہ" کی تھی مگر انصار نے ان کی عزت اور احترام میں کوئی کمی نہیں کی۔ انصار کی مسلسل حمایت اور قربانی کے ذریعہ اسلام مضبوط ہوا اور اس کی شاندار تاریخ بنی۔ ان اسباب کی بنا پر انصار کا یہ خیال تھا کہ امارت ان کا حق ہے۔ انصار کے لوگ اس معاملہ کو طے کرنے کے لیے اپنے قبیلہ کی چوپال (سقیفہ بنی ساعدہ) میں جمع ہوئے۔

یہاں تک معاملہ پہنچ چکا تھا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے مہاجرین کو خبر ہوئی۔ وہ فوراً سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے۔ کیونکہ اس معاملہ میں معمولی غفلت بھی نہایت دور رس نتیجہ پیدا کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔ انصار کا یہ خیال درست تھا کہ ان کو مخصوص فضیلتیں حاصل ہیں۔ مگر دینی فضیلت ایک الگ چیز ہے اور سیاسی قیادت اس سے مختلف دوسری چیز۔ دینی فضیلت کسی بھی شخص کے اندر ہو سکتی ہے۔ مگر سیاسی قیادت صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے حق میں قیادت کے تاریخی اسباب جمع ہوئے ہوں۔

حضرت ابو بکر سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے۔ تو وہاں انصار کے بزرگ قائد سعد بن عبادہ بھی موجود تھے۔ حاضرین کا رجحان یہ تھا کہ سعد بن عبادہ کو امیر المومنین بنایا جائے۔ حضرت ابو بکر نے سعد بن عبادہ سے کہا کہ کیا تم کو یاد نہیں کہ تمہاری موجودگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ : قریش ولاۃ ھذا الامر۔ اور الناس تبع لقریش۔ یعنی عرب میں سیاسی سرداری صرف قریش ہی کر سکتے ہیں۔ عرب کے لوگ ان کے سوا کسی اور کی ماتحتی قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے۔ حضرت ابو بکر نے انصار سے کہا کہ تمہاری دینی خدمت اور اسلام کے اندر تمہارا مقام مسلّم ہے۔ لیکن عرب کے لوگ قریش کی قیادت کے سوا کسی اور کی قیادت سے آشنا نہیں ہیں۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تقریر کے بعد تمام انصار اس پر راضی ہو گئے کہ

مہاجرین (قریش) میں سے کسی شخص کو امیر بنایا جائے۔ یہ ایک بے حد انقلابی فیصلہ تھا جس کی معلوم انسانی تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔

انصار پہلے اس معاملہ کو صرف "مدینہ" کے حالات کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، اب انھوں نے اس معاملہ کو پورے ملک کے نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ ان کے بے لاگ ذہن اور حقیقت پسندانہ مزاج نے انھیں بتایا کہ مدینہ میں اگرچہ مقامی طور پر انصار کو سیادت حاصل ہے مگر وسیع تر سطح پر پورا عرب کسی قریشی سردار ہی کی سرداری قبول کر سکتا ہے۔ انصار نے اس معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ یا سیاسی حق تلفی کا مسئلہ نہیں بنایا۔ چنانچہ انھوں نے فوراً حضرت ابو بکر کی تجویز کو مان لیا۔

عرب میں اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوا اس میں بلاشبہہ انصار کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اس میں ان کی عظیم قربانیاں شامل تھیں۔ ایسی حالت میں یہ عین فطری تھا کہ غلبہ حاصل ہونے کے بعد انصار یہ چاہیں کہ امیر المومنین کا عہدہ ان کے پاس ہو یا کم از کم اقتدار میں قابل لحاظ حد تک انھیں شریک کیا جائے۔ چنانچہ ایک انصاری نے جب دیکھا کہ امیر کا عہدہ انصار کو دینے پر اختلاف ہے تو اس نے کہا کہ ایک امیر تم میں سے ہو اور ایک امیر ہم میں سے (منا امیر و منکم امیر) مگر وسیع تر مصالح کو جاننے کے بعد تمام انصار مہاجرین (قریش) کی امارت پر راضی ہو گئے۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ سیاسی قیادت کا عہدہ یک طرفہ طور پر مہاجرین کو دے دیا جائے، اور انصار کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

کسی نظام کو چلانے کے لیے اس قربانی کی بے حد اہمیت ہے۔ مگر یہ قربانی صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں جو اپنے اندر سیاسی بے غرضی کی صفت رکھتے ہوں۔ انصار نے اس نادر صفت کا ثبوت دیا۔ اگر ان کے اندر سیاسی بے غرضی کی یہ غیر معمولی صفت نہ ہوتی تو پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد انصار اور مہاجرین میں ٹکراؤ شروع ہو جاتا۔ اسلام کی تاریخ بننے سے پہلے ہی مدینہ میں دفن ہو جاتی۔ مگر انصار نے اپنے سیاسی حق سے یک طرفہ طور پر دستبردار ہو کر اسلام کی تاریخ کو آگے بڑھا دیا۔

تحریک اپنے آغاز میں ہو تو اس میں عہدہ کی کشش نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ کامیابی کے مرحلہ میں پہنچتی ہے تو اس میں عہدہ اور اقتدار کی کشش شامل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر تحریک میں کامیابی کے بعد مناصب کی رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ اصحاب رسول تاریخ کے پہلے گروہ ہیں جو عظیم کامیابی کے مرحلہ تک پہنچے مگر انھوں نے مناصب کو دوسروں کے حوالے کر کے اپنے لیے بے منصب حیثیت قبول کر لی۔

حکومت کے باوجود

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور آخری انجام ڈرنے والوں کے لیے ہے (تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا في الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين) القصص ۸۳

اس طرح کی آیتیں اور احکام قرآن میں بہت ہیں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ زمین میں بڑا کون بنتا ہے اور کون ہے جو زمین میں فساد کرتا ہے۔ اگرچہ ایک عام انسان بھی اپنے دائرہ میں علو اور فساد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مگر یہ کام زیادہ بڑے پیمانہ پر وہ لوگ کرتے ہیں جن کو زمین میں اقتدار ملا ہوا ہو۔ جن کو وہ اختیار حاصل ہو جس کے بل پر کوئی شخص زمین کو فساد سے بھر دیتا ہے۔

اس اعتبار سے صحابہ کرام کا گروہ تاریخ کا واحد گروہ ہے جو اس مطلوب انسانی قدر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اقتدار ملا، مگر اقتدار نے ان کے اندر گھمنڈ پیدا نہیں کیا۔ ان کو زمین میں بڑائی ملی، مگر انھوں نے ایک عام آدمی کی طرح دنیا میں زندگی گزاری۔ وہ اعلیٰ اختیارات کے مالک تھے، مگر اختیار پانے کے باوجود وہ مفسد اور ظالم نہیں بنے۔ یہاں خلیفہ دوم عمر فاروق کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جو اس معاملہ میں ایک علامتی مثال کی حیثیت رکھتا ہے:

عن الفضل بن عميرة، انّ الاحنف بن قيس قدم على عمر بن الخطاب في وفد من العراق۔ قدموا عليه في يوم صائف شديد الحر وهو محتجز بعباءة يهنأ بعيرا من ابل الصدقة۔ فقال: يا احنف ضع ثيابك وهلمّ فأعن امير المومنين على هذا البعير فانه لمن ابل الصدقة، فيه حق لليتيم والمسكين والارملة۔ فقال رجل من القوم۔ يغفر الله لك يا امير المومنين فهلا تأمر عبدا من عبيد الصدقة فيكفيك هذا۔ قال عمر: وأىّ عبد هو أعبد منى۔ (تاریخ عمر بن الخطاب، لابن الجوزی، صفحہ ۷۱)

فضل بن عمیرہ کہتے ہیں کہ احنف بن قیس ایک عراقی وفد کے ساتھ عمر بن الخطاب کے پاس مدینہ آئے۔ وہ گرمی کے موسم میں آئے تھے جب کہ گرمی بہت سخت تھی۔ عمر اپنی کمر پر ایک چغہ باندھے ہوئے تھے۔ اور ایک

اونٹ کی مالش کر رہے تھے جو کہ بیت المال کا اونٹ تھا۔ انھوں نے کہا کہ اے احنف، اپنے کپڑے اتار دو اور اس اونٹ کے معاملہ میں امیر المومنین کی مدد کرو، کیونکہ یہ بیت المال کا اونٹ ہے۔ اس میں یتیم اور مسکین اور بیواؤں کا حصہ ہے۔ لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ آپ کو معاف کرے اے امیر المومنین، کیوں نہیں آپ نے بیت المال کے غلاموں میں سے کسی غلام کو حکم دے دیا، وہ آپ کی طرف سے اس کام کو انجام دے دیتا۔ عمر نے جواب دیا : مجھ سے زیادہ غلام کون ہے۔

اقتدار پانے کے بعد آدمی بگڑ جاتا ہے۔ یہ مظہر اتنا عام ہے کہ لارڈ ایکٹن (۱۹۰۲-۱۸۳۴) کا یہ قول ضرب المثل بن گیا ہے کہ اقتدار بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے :

Power corrupts and absolute power corrupts absolutely.

مگر تاریخ میں گروہ کے اعتبار سے صحابہ کرام کی مثال ایک استثنائی مثال ہے کہ ان کو زمین پر اقتدار ملا، لیکن اقتدار ان کو بگاڑنے والا نہ بن سکا۔ انھیں لوگوں کے اوپر حکومت حاصل تھی، مگر وہ محکوموں میں سے ایک محکوم بن کر لوگوں کے درمیان رہے۔ صحابہ کے دور میں خلیفہ اور امراء اور حکام کے یہاں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

صحابہ کرام تاریخ کی واحد مثال بن گئے جن کے حوالہ سے حکمرانوں کو سادہ اور معمولی زندگی گزارنے کی تلقین کی جائے۔ ۱۹۳۷ میں پہلی بار ہندستان میں کانگرس کی وزارت بنی تو مہاتما گاندھی نے اپنے انگریزی اخبار میں کانگریسی وزیروں کو سادہ زندگی کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ میں آپ لوگوں کے سامنے رام چندر اور کرشن کا حوالہ نہیں دے سکتا، کیونکہ وہ تاریخی شخصیتیں نہیں ہیں۔ میں مجبور ہوں کہ سادگی کے نمونہ کے لیے ابوبکر اور عمر کا نام پیش کروں۔ وہ اگرچہ بہت بڑی سلطنت کے مالک تھے مگر انھوں نے مفلسوں کی طرح زندگی گزاری (ہریجن ، ۲۷ جولائی ۱۹۳۷)

حکومت و اقتدار کے باوجود معمولی زندگی گزارنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ تمام مشکل کاموں میں سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس معیار پر وہ لوگ پورے اترتے ہیں جن کے لیے عہدہ اعزاز کی چیز نہ ہو بلکہ ذمہ داری کی چیز ہو۔ جو زندگی کے ذرائع کو سامان راحت نہیں بلکہ سامان آزمائش سمجھتے ہوں۔ جو اپنے نفس کی خواہش پر چلنے کے بجائے اپنے ایمانی شعور کے تحت عمل کرتے ہوں۔ صحابہ کرام وہ ربانی لوگ تھے جنھوں نے اس مشکل طریقہ کو اس کی تمام مشکلوں کے باوجود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔

معاہدہ کی پابندی

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب دوسری قوم سے تمہارا کوئی معاہدہ ہو تو تم اس معاہدہ پر قائم رہو۔ ایسا نہ کرو کہ اوپر اوپر معاہدہ کی حالت باقی رکھو اور اندر سے خفیہ طور پر اسے توڑ دو۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم کو کسی قوم سے بدعہدی کا ڈر ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو، ایسی طرح کہ تم اور وہ دونوں برابر ہو جائیں۔ بے شک اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا (الانفال ۵۸)

یعنی تم کو دشمن کے خلاف جو کارروائی کرنا ہے، معاہدہ کو بالاعلان توڑنے کے بعد کرو نہ کہ معاہدہ کو باقی رکھتے ہوئے۔ اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے دور صحابہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ کچھ لفظی فرق کے ساتھ احمد، الترمذی اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ تینوں روایتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں ہم اس کا ترجمہ درج کرتے ہیں :

سُلیم بن عامر کہتے ہیں کہ امیر معاویہ اور رومی حکومت کے درمیان ایک میعادی عہد نامہ تھا۔ معاویہ اپنی فوج کو لے کر رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ سرحد کے قریب جا کر ٹھہریں اور اچانک ان کے اوپر حملہ کر دیں، معاویہ جب سرحد پر پہنچے تو ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر ظاہر ہوا اور بلند آواز سے کہنے لگا کہ اللہ اکبر، اللہ اکبر، اسلام میں عہد کو پورا کرنا ہے، عہد کو توڑنا نہیں ہے (اللہ اکبر اللہ اکبر وفاء لا غدر)

لوگوں نے دیکھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عَمرو بن عنبسہ تھے۔ اس کے بعد امیر معاویہ نے ان کو اپنے خیمہ میں بلایا۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ کا مطلب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو وہ نہ اس کی کوئی گرہ باندھے اور نہ اس کی کوئی گرہ کھولے، یہاں تک کہ اس کی مدت پوری ہو جائے۔ یا پھر وہ عہد کو برابری کے ساتھ اس کی طرف پھینک دے (مَن کان بینہ وبین قوم عھد فلا یشدّ عقدۃ ولا یحلّھا حتی ینقضی امدُھا او ینبذ الیھم علی سواء) تفسیر ابن کثیر ۲/۳۲۰، الجامع لاحکام القرآن ۸/۳۲

اس وقت امیر معاویہؓ سرحد روم پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور اگلی صبح کو حملہ کرنے والے تھے مگر اس انتباہ کے بعد وہ حملہ سے رک گئے اور اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا (قال : فرجعَ

معاویۃ بالناس) مشکاۃ المصابیح، الجزء الثانی، صفحہ ۱۱۶۵

بین اقوامی دنیا میں ہمیشہ سے یہ رواج چلا آرہا تھا کہ جس قوم سے دشمنی ہوجاتی تھی، اس کے بارہ میں لوگ کسی اخلاقی اصول کی پیروی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ حتی کہ ایسی قوم سے بظاہر امن اور صلح کا معاہدہ کرنے کے باوجود اندر اندر اس کے خلاف کارروائی جاری رکھتے تھے۔

اسلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو جو نمونہ قائم کرنا تھا، اس میں یہ بھی شامل تھا کہ بین اقوامی تعلقات میں اخلاقی اصولوں کو پوری طرح نبھایا جائے۔ مثلاً کسی قوم سے معاہدہ ہو تو اس معاہدہ کی آخری حد تک پابندی کی جائے۔ اور اگر اس قوم کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو تب بھی کوئی کارروائی صرف اس وقت کی جائے جب کہ اس قوم کو اس سے مطلع کر دیا جائے۔ تاکہ معاہدہ کے دوسرے فریق کو بخوبی طور پر معلوم ہو جائے کہ اب دونوں کے درمیان سابقہ حالت باقی نہیں ہے۔

یہ بلاشبہ ایک بے حد اہم اصول تھا۔ مگر اس کو عملی طور پر قائم کرنے کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ کیونکہ یہ خود اپنے مفاد کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر دشمن کو پیشگی طور پر بتا دیا جائے کہ تمہارے ساتھ امن کی حالت ختم ہو چکی ہے اور اب ہم تمہارے اوپر حملہ کرنے والے ہیں تو ایسی حالت میں دشمن چوکنا ہو جائے گا۔ وہ تیاری کر کے سخت مقابلہ کرے گا۔ حتی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارا اقدام ہمارے لیے الٹا ثابت ہو جائے۔

اس صورت حال میں اس بین اقوامی اصول کو عملاً قائم کرنے کے لیے ایک بے حد با اصول قوم درکار تھی۔ جو ہر دوسرے پہلو کو نظر انداز کر کے اصول کو اعلیٰ ترین حیثیت دینے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ جو ہر نقصان کو گوارا کر لے مگر اصول کی خلاف ورزی گوارا نہ کرے۔

مذکورہ واقعہ ایک مثال ہے جو بتاتا ہے کہ اصحاب رسول نے اس حوصلہ کا ثبوت دیا۔ وہ اس کے لیے مطلوبہ قربانی دینے پر راضی ہو گئے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ تاریخ میں پہلی بار بین اقوامی تعلقات میں یہ اصول عملاً قائم ہوا کہ دو قوموں میں بگاڑ اور عناد ہو تب بھی اخلاقی روایات کو نہ توڑا جائے۔ دشمن سے مقابلہ میں بھی سچائی اور شرافت کے خلاف عمل نہ کیا جائے۔

ہر اصول کی ایک قیمت ہے۔ لوگ قیمت دینا نہیں چاہتے، اس لیے وہ اس پر عمل بھی نہیں کرتے۔ صحابہ نے ہر اصول کی مطلوبہ قیمت ادا کی، اسی لیے وہ ہر اصول پر عمل کرنے میں کامیاب رہے۔

تاریخ ساز

خلیفہ دوم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ اسلامی تاریخ کی مختلف کتابوں میں مذکور ہے۔ امام جمال الدین ابو الفرج بن الجوزی (م ۵۹۷ھ) نے اپنی کتاب تاریخ عمر بن الخطاب میں اس واقعہ کو نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ ہم عُمر بن الخطاب کے پاس تھے کہ ان کے یہاں اہل مصر کا ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ اے امیر المومنین، میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے۔ مصری نے کہا کہ مصر کے حاکم عَمرو بن العاص نے مصر میں گھوڑوں کی دوڑ کرائی۔ اس میں ایک گھوڑا بڑھ گیا جو میرا تھا۔ پھر جب لوگ آ آکر میرے گھوڑے کو دیکھنے لگے تو عمرو بن العاص کے لڑکے محمد اٹھے۔ انھوں نے کہا کہ کعبہ کے رب کی قسم، میرا گھوڑا بڑھ گیا۔ جب وہ میرے قریب آئے اور میں نے ان کو پہچانا تو میں نے کہا کہ کعبہ کے رب کی قسم، میرا گھوڑا۔ اس پر محمد بن عمرو یہ کہتے ہوئے مجھے کوڑے سے مارنے لگے کہ یہ لو، اور میں شریفوں کی اولاد ہوں (خذها، خذها، وانا ابن الاکرمین)

راوی کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، عُمر نے اس کے سوا اور کچھ نہ کیا کہ انھوں نے مصری سے کہا کہ بیٹھو پھر انھوں نے عَمرو بن العاص کے نام خط لکھا کہ جب تم کو میرا یہ خط پہنچے تو تم فوراً مدینہ آجاؤ اور اپنے ساتھ اپنے لڑکے محمد کو بھی لے آؤ۔ راوی کہتے ہیں کہ جب خط پہنچا تو عمرو بن العاص نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ کیا تم سے کوئی بات سرزد ہوئی ہے، کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے۔ محمد نے کہا کہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ عمر تمہارے بارہ میں ایسا لکھ رہے ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر دونوں چل کر عمر کے پاس آئے۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، اس وقت ہم لوگ عمر کے پاس منیٰ میں تھے کہ اتنے میں عمرو بن العاص آئے۔ ان کے جسم پر ایک ازار اور ایک چادر تھی۔ پھر عمر ان کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ ان کے لڑکے کو دیکھیں، تو وہ اپنے باپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ عمر نے کہا کہ مصری کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ میں یہ ہوں۔ عمر نے کہا کہ یہ کوڑا لو، شریف زادہ کو مارو، شریف زادہ کو مارو۔ راوی کہتے ہیں کہ مصری نے ان کو مارا یہاں تک کہ ان کو خون آلود کر دیا (فضربه حتی اثخنه)

پھر عمرؓ نے کہا کہ عمرو بن العاص کے سر پر بھی مارو۔ کیوں کہ خدا کی قسم، ان کے لڑکے نے انھیں کی
ائی کے بل پر تم کو مارا تھا۔ مصری نے کہا کہ اے امیر المومنین، جس نے مجھ کو مارا تھا اس کو میں نے مار لیا۔
رنے کہا کہ خدا کی قسم، اگر تم ان کو مارتے تو ہم تمہارے اور ان کے بیچ میں حائل نہ ہوتے۔ یہاں تک
م خود ہی ان کو چھوڑ دو۔ پھر انھوں نے عمرو بن العاص سے کہا کہ اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام
لیا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا (یاعمرو، متی استعبدتم الناس وقد
لدتهم امهاتهم احرارا)

اس کے بعد عمرؓ مصری کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ اطمینان کے ساتھ واپس جاؤ۔ اگر تمہارے
اف پھر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھو (انصرف راشدا فان رابك ريب فاكتب الیّ) ابوالفرج بن
زی، تاریخ عمر بن الخطاب، مطبعۃ التوفیق الادبیۃ، القاہرہ صفحہ ۹۹-۱۰۰

یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ساری انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔ وہ بتاتا ہے
صحابہ کرام کون لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے خدا کے دین کی تاریخ بنائی۔ صحابہ سے پہلے خدا کے
ن کی حیثیت ایک فکری تحریک کی تھی، صحابہ کے بعد خدا کے دین کی حیثیت ایک حقیقی اور عملی تاریخ کی ہوگئی۔
اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ اس کے دین کی پشت پر ایک تاریخی نمونہ قائم ہو جائے۔ مگر یہ کوئی
ادہ بات نہ تھی۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ دینی افکار کی بنیاد پر ایک عالمی انقلاب برپا ہو۔ اس قسم
ے ایک دور رس انقلاب کے بغیر مذکورہ قسم کا واقعہ تاریخ کے صفحات میں لکھا نہیں جا سکتا۔

مذکورہ واقعہ بلاشبہہ خدائی انصاف اور انسانی مساوات کی عظیم الشان مثال ہے مگر اس مثال
ظہور میں لانے کے لیے بے پناہ قربانیوں کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے وہ ہمہ گیر
نقلاب لایا جائے جو رسولؐ کی قیادت میں صحابہ کرام لے آئے۔ پھر اس کے لیے ضرورت تھی کہ سماج
ں صحابہ جیسے مثالی انسانوں کا غلبہ قائم ہو۔ پھر اس کے لیے ضروری تھا کہ جو خلیفہ ایک حاکم کے بیٹے کے
م پر اس کو کوڑا مارنے کا حکم دے رہا ہے وہ خود اپنے بیٹے کے جرم پر اسی طرح اس کو کوڑا
چکا ہو۔

اصحاب رسول نے یہ ساری مہنگی قیمت ادا کی۔ وہ اپنی ذات کے لیے جینے کے بجائے خدا کے
ین کے لیے جئے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ان کے ذریعہ سے خدا کے دین کی مطلوب عملی تاریخ بنے۔

بہتر حکمراں

افلاطون (۴۲۸۔ ۳۴۸ ق م) قدیم یونان کے تین بڑے فلسفیوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے
دوسرے دو فلسفی سقراط اور ارسطو ہیں۔ اس کی ایک مشہور کتاب "ریپبلک" ہے۔ یہ آئیڈیل ریاست
سے بحث کرتی ہے اور مکالمات کی صورت میں ہے۔ اچھے حکمراں کیسے بنتے ہیں، اس پر اظہار خیال کر
ہوئے افلاطون نے جو بات کہی ہے، اس کا ترجمہ انگریزی میں اس طرح کیا گیا ہے :

Unless philosophers bear kingly rule.... or those who are now called kings and princes become genuine and adequate philosophers, there will be no respite from evil.

جب تک فلاسفہ بادشاہت کا عہدہ نہ سنبھالیں، یا جو لوگ آج بادشاہ اور شہزادے کہے جاتے
وہ واقعی فلسفی نہ ہو جائیں، اس وقت تک برے بادشاہوں سے نجات ملنے والی نہیں۔

افلاطون کے اس نظریہ کے بعد ایسے متعدد افراد حکمراں ہوئے ہیں جن کو فلسفی بادشاہ
(philosopher-king) کہا جاتا ہے۔ مثلاً رومی بادشاہ مارکس اریلیس (Marcus Aurelius)
روس کی ملکہ کیتھرین دوم (Catherine II) پروشیا کا فریڈرک دوم (Frederick II)
مقدونیہ کا ڈیمیٹریس (Demetrius) اور عہد حاضر میں سنگاپور کا لی کوان ایو (Lee Kuan Yew)
فلسفی حکمراں تھے۔ مگر وہ بہتر حکمراں ثابت نہ ہو سکے۔

خود یونانی فلسفیوں کے کچھ شاگرد بادشاہ کے عہدے تک پہنچے۔ مثلاً ارسطو اسکندر رو
معلم تھا۔ اسی طرح ڈیمیٹریس ارسطو کے مدرسۂ فلسفہ کا تربیت یافتہ تھا۔ مگر یہ فلسفی حکمراں دوسروں
بہتر حکمراں ثابت نہ ہو سکے۔ پیٹر گرین (Peter Green) کے الفاظ میں، جو ہوا وہ یہ تھا کہ کچھ نہیں
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار فلسفیوں کو بھی بگاڑ دیتا ہے :

What happened was, nothing happened.... Power, it appeared, could corrupt even philosophers (*Time* magazine, May 13, 1991).

کارل مارکس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تمام خرابیوں کی جڑ ملکیت کا اقتصادی نظام ہے۔ اقتص
ملکیت کے نظام میں ایک مالک ہوتا ہے اور دوسرا مملوک۔ اس بنا پر جو مالک ہے وہ مملوک

استحصال کرتا ہے۔ اگر انفرادی ملکیت کے نظام کو ختم کر کے "سب کی ملکیت" کا نظام قائم کر دیا جائے تو ہر قسم کے ظلم و جبر کی جڑ کٹ جائے۔ اس کے بعد نہ کوئی مالک ہوگا اور نہ کوئی مملوک، پھر کون کس کا استحصال کرے گا۔ کون کس کے اوپر ظلم کرے گا۔

۱۹۱۷ میں روس میں مارکسی انقلاب آیا اور مذکورہ قسم کا بے ملکیتی نظام بزور قائم کر دیا گیا۔ مگر بعد کے حالات نے بتایا کہ مارکس کا تجویز کیا ہوا بے ملکیتی نظام تاریخ کا سب سے زیادہ ظالمانہ نظام تھا۔ اور وہاں کے حکمراں تمام حکمرانوں سے زیادہ جابر اور متشدد۔ نام نہاد اجتماعی ملکیت کے نظام نے ظلم و جبر میں مزید اضافہ کر دیا۔

اسی طرح بیسویں صدی کے نصف اول میں ایشیا اور افریقہ میں بہت بڑے پیمانہ پر نوآبادیاتی نظام کے خلاف آزادی کی تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے علم برداروں کا کہنا تھا کہ تمام ظلم و فساد کا سبب بدیشی راج ہے۔ اگر ملک میں دیش کے لوگوں کا راج قائم کر دیا جائے تو ظالمانہ حکمرانی کا اپنے آپ خاتمہ ہو جائے گا۔ قومی آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہوئی اور ہر ملک میں خود ملک کے افراد حکومت کے عہدوں کے مالک ہو گئے۔ مگر ظلم و جبر کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ ملکی افراد بدستور ظالم حکمراں بنے رہے۔ جو ظلم پہلے بدیشیوں کے ہاتھ سے ہوتا تھا، وہ اب دیش والوں کے ہاتھ سے ہونے لگا۔

خدا کا دین (اسلام) مذکورہ قسم کے تمام دعووں کو غلط بتاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کے اندر حقیقی اصلاح صرف ایک چیز سے پیدا ہوتی ہے، اور وہ اللہ کا خوف ہے۔ اللہ کے ڈر کے سوا کوئی چیز نہیں جو ایک بااقتدار انسان کو عدل اور حق کے معیار پر قائم رکھ سکے۔

صحابہ سے پہلے یہ دعویٰ، عام انسان کی نظر میں، صرف ایک دعویٰ تھا۔ کیوں کہ خالص تاریخی اعتبار سے وہ ثابت شدہ نہیں بنا تھا۔ ان سے پہلے مدوّن تاریخ میں کوئی ایسی معلوم مثال نہ تھی جو اس نظریہ کو واقعاتی طور پر ثابت کرتی ہو۔

صحابہ نے اس نظریہ کے حق میں واقعاتی مثال قائم کی۔ ان کو اقتدار ملا، مگر وہ اس بگاڑ سے محفوظ رہے جس میں ہر دور کے حکمراں مبتلا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک دعویٰ ہے اور اصحاب رسول اس کی دلیل۔ اسلام ایک نظریہ ہے اور اصحاب رسول اس نظریہ کے حق میں عملی تصدیق۔

نئے دور کے نقیب

خلیفہ دوم عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ایران فتح ہوا۔ ایران کی مسلح فوجوں کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔

اس زمانہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایرانی بادشاہ یزدگرد کی ہدایت پر اس کے سپہ سالار رستم نے حضرت سعد کو یہ پیغام بھیجا کہ صلح کی بات چیت کے لیے اپنے آدمیوں کا ایک وفد بھیجئے۔ اس دوران جو لوگ ایرانی حکمرانوں سے بات کرنے کے لیے ان کے یہاں گئے، ان میں سے ایک حضرت ربعی بن عامر تھے۔

ربعی بن عامر رستم کے دربار میں پہنچے۔ اس نے اپنے دربار کو نہایت شاندار طور پر سجایا تھا۔ قیمتی قالین، عالی شان تخت، سونا چاندی اور ہیرے اور جواہر کے آرائشی سامانوں سے وسیع خیمہ جگمگا رہا تھا۔ رستم اپنے سر پر سنہری تاج پہنے ہوئے اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔

ربعی بن عامر کے جسم پر نہایت معمولی کپڑا تھا۔ وہ ایک تلوار لٹکائے ہوئے اور ایک چھوٹے گھوڑے پر سوار ہو کر اندر داخل ہوئے۔ وہ گھوڑے سے اترے نہیں، یہاں تک کہ وہ رستم کے تخت تک پہنچ گئے۔ تخت کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترے اور قالین میں اپنا نیزہ گاڑ کر اس سے اپنے گھوڑے کو باندھ دیا۔ رستم کے آدمیوں نے اس بے باکانہ انداز پر اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں خود سے نہیں آیا ہوں۔ بلکہ تمہارے بلانے پر آیا ہوں۔ اگر تم مجھ کو میرے حال پر رہنے دو تو ٹھیک ہے، ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔

رستم نے اپنے آدمیوں کو روکا اور کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، ان سے تعرض نہ کرو۔ رستم نے مختلف سوالات کیے جس کا انھوں نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ رستم کے ایک سوال کا جواب انھوں نے ان الفاظ میں دیا :

قال : اللّٰہُ ابتعثنا لِنخرجَ مَن شاءَ مِن عبادةِ العباد الی عبادة اللّٰہ۔ و مِن ضیق الدنیا اِلی سعتھا	انھوں نے کہا کہ اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ اللہ کے بندوں میں سے جس کو وہ چاہے ہم اس کو بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت

ومن جور الاديان الى عدل الاسلام۔ فارسلنا بدينه الى خلقه ندعوهم اليه۔ فمن قبل ذلك قبلنا منه ورجعنا عنه۔ ومن ابى قاتلناه ابدا حتى نفضى الى موعود اللہ (البدایۃ والنہایۃ ۷/۳۹)

کی طرف لے آئیں، اور دنیا کی تنگی سے دنیا کی وسعت کی طرف، اور مذہبوں کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف۔ پس اللہ نے ہم کو اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں۔ پس جو اس کو قبول کرے ہم بھی اس سے قبول کرلیں گے اور اس سے واپس چلے جائیں گے۔ اور جو کوئی انکار کرے اس سے ہم لڑیں گے، یہاں تک کہ اس کو اللہ کے وعدہ تک پہنچا دیں۔

صحابی کے یہ الفاظ کوئی سادہ الفاظ نہ تھے۔ اس میں دراصل اس عظیم انقلاب کی طرف اشارہ تھا جو صحاب رسول کے ذریعہ لایا گیا اور جس نے عالمی سطح پر انسانی تاریخ کو بدل دیا۔ اس کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب "اسلام دور جدید کا خالق" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی صورت حال یہ تھی کہ ساری دنیا میں نسلی بادشاہت کا رواج تھا۔ اس بادشاہت نے ہر جگہ جبر کی وہ فضا پیدا کر رکھی تھی جس کو ہنری پرین نے شاہانہ مطلقیت (imperial absolutism) کہا ہے۔ ایک شخص جس کے سر پر حکومت کا تاج ہو وہ سب کا آقا تھا، اور تمام لوگ اس کے غلام۔

مشرکانہ مذہب اور مطلق شہنشاہیت دونوں نے مل کر فطرت کے سائنسی مطالعہ کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فطرت میں چھپی ہوئی خدا کی تمام نعمتیں بے دریافت اور غیر استعمال شدہ بنی ہوئی تھیں۔

مذہب میں مذہبی پیشواؤں کا مکمل قبضہ تھا۔ وہ دنیا میں خدا کے نمائندہ بن کر انسانوں کو اپنا بندہ بنائے ہوئے تھے۔ ان کے گھڑے ہوئے مصنوعی مذہب کے نیچے پوری انسانیت پس رہی تھی۔ اس پیشوائی نظام سے اختلاف کرنے والے کو سخت ترین سزا دی جاتی تھی تاکہ لوگ دبے رہیں اور اس سے بغاوت کی جرأت نہ کرسکیں۔ اللہ کو مطلوب تھا کہ اس حالت کو بدلا جائے۔ اصحاب رسول نے غیر معمولی قربانیوں کے ذریعہ جبر کے اس نظام کو توڑا۔ انھوں نے انسان کے اوپر خدائی رحمتوں کا وہ دروازہ کھول دیا جو ہزاروں سال سے ان کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

نمونۂ انسانیت

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اصحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی بھی تم پیروی کروگے تم ہدایت پا جاؤگے)

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اسلام کا نمونہ ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہم جان سکتے ہیں کہ ہمیں اللہ کی رضا کو پانے کے لیے اس دنیا میں کیا کرنا چاہیے۔ ایک تابعی نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کیا: والقدوۃ ھم۔ یعنی صحابہ ہی تو نمونہ ہیں۔

ایمان کیا ہے اور مومن کسے کہتے ہیں، اس کا نہایت واضح بیان قرآن میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مزید یہ اہتمام فرمایا کہ سچے ایمان کا عملی نمونہ دنیا میں قائم کر دیا۔ یہ عملی نمونہ اسی انسانی گروہ کے ذریعہ قائم کیا گیا ہے جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب رسول کے ایمان و اسلام کو قبول کیا اور اس کی تصدیق فرمائی۔ اس طرح اس نے عمل کی زبان میں تمام انسانوں کو بتا دیا کہ اس کو کون سا ایمان و اسلام مطلوب ہے۔

اس نمونہ کے سامنے آنے کے بعد اب ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے ایمان کو اصحاب رسول کے ایمان سے ملا کر دیکھے۔ اگر اس کا ایمان اصحاب رسول کے نمونہ کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے۔ اور اگر اس نمونہ کے مطابق نہیں ہے تو وہ خدا کے یہاں قبول کیے جانے کے لائق نہیں۔

اصحاب رسول کی یہ حیثیت کہ وہ تمام انسانی نسلوں کے لیے "ستارہ" قرار دیے گئے اور اعلان کیا گیا کہ تمام لوگ ان سے روشنی حاصل کریں، یہ کوئی سادہ سی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصحاب رسول نے وہ انتہائی مہنگی قیمت ادا کی جو کسی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ لوگوں کے لیے ستارۂ ہدایت بنے۔ اس قیمت کی ادائیگی کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ان کے حق میں یہ اعلان کیا جائے کہ وہ تمام نسلوں کے لیے ستارۂ ہدایت ہیں، اور اب قیامت تک تمام لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان کے نمونہ سے روشنی لے کر اپنی زندگیوں کی تعمیر کریں۔

آج ایک شخص محمد (قابل تعریف) پیغمبر پر ایمان لا کر مومن کہلاتا ہے، صحابہ کو مومن بننے کے لیے مذمم (قابل مذمت) پیغمبر پر ایمان لانے کے امتحان میں کھڑا ہونا پڑا۔ آج ہم مذہبی آزادی کے

ل میں دینے دار بنے ہوئے ہیں ، انھیں مذہبی جبر کے ماحول میں دین کو اختیار کرنا پڑا۔ آج ہم ایک
ز اسلامی تاریخ کے مالک ہیں ، انھیں ایک ایسے اسلام سے وابستہ ہونا پڑا جس کی سرے
ے کوئی تاریخ ہی نہ تھی۔

آج لوگوں کو اسلام کے نام پر بڑے بڑے اعزازات مل رہے ہیں ، انھیں اسلام کی خاطر
نے آپ کو بالکل بے قیمت کر دینا پڑا۔ آج اسلام کی علم برداری سے ہر جگہ لوگوں کو قیادت اور
قبال کا تحفہ حاصل ہو رہا ہے ، انھیں ایک ایسے اسلام کا علم بردار بننا پڑا جس نے ان کی موجودہ عزت و
دت کو بھی مٹی میں ملا دیا۔

صحابہ نے جس اسلام کو اختیار کیا اس کو اختیار کرنا اخلاص کے بغیر ممکن نہ تھا۔ انھوں نے جس
ن کو اپنا دین بنایا اس کا محرک اللہ کی رضا کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ ان کا اسلام مکمل طور
بے داغ اسلام تھا۔ ان کی للّٰہیت ہر امتحان میں پوری اتری تھی ، یہی وجہ ہے کہ وہ
یخ کے وہ منتخب گروہ قرار پائے جس کی تقلید کی جائے۔ جس کے نمونہ کو ہمیشہ کے لیے اپنا
نا بنا لیا جائے۔

جو لوگ معمول کے حالات میں اسلام کو اختیار کریں ، وہ کبھی اسلام کا نمونہ نہیں بن سکتے۔ اسی
ح جو لوگ اس دور میں اسلام کا نام لیں جب کہ اسلام کا نام لینے سے قیادت ملتی ہے۔ اقتصادی
دے حاصل ہوتے ہیں ، اور سماج میں عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے ، وہ بھی نمونہ بننے کے
ق نہیں۔ کیونکہ نمونہ کے لیے خالص ہونا ضروری ہے۔

اسلام کا نمونہ صرف وہ لوگ بن سکتے ہیں جو غیر معمولی حالات میں اسلام پر قائم رہیں۔ جو اس
ر میں اسلام کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کریں جب کہ اس کے ساتھ وابستگی کے بعد ملی ہوئی عزت بھی
م ہو جائے۔ جب آدمی عوام کے درمیان اپنی مقبولیت کھو دے۔

اصحاب رسول اسی قسم کے غیر معمولی لوگ تھے جنھوں نے غیر معمولی حالات میں اسلام کا ساتھ دیا۔
وں نے کھونے کی قیمت پر اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ وابستہ کیا۔ وہ اعلیٰ انسانیت پر کھڑے ہوئے۔
ا اپنے معیاری قول و عمل کی بنا پر اس قابل ٹھہرے کہ وہ تمام قوموں اور تمام نسلوں کے لیے رول ماڈل
ں۔ وہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے ابدی مثال بن جائیں۔

دنیا کے لیے رحمت

پیغمبروں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ ان کی مخاطب قوم اگر ان کو نہ مانے تو ا
زمینی یا آسمانی عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیا جائے۔ چنانچہ پچھلے زمانوں میں ایسا ہوا کہ پیغمبروں کی مخاط
قومیں اپنے انکار کے سبب سے بار بار ہلاک کی جاتی رہیں (العنکبوت ۴۰) آخر کار اللہ نے چاہا کہ ا
ایسا پیغمبر بھیجے جس کے بعد ہلاکت کا مذکورہ سلسلہ ختم ہو جائے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم یہی خاص پ
تھے۔ اسی لیے قرآن میں آپ کو دنیا والوں کے لیے رحمت (الانبیاء ۱۰۷) کہا گیا ہے۔ اس آیت
متعلق مفسرین کے کچھ اقوال یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

قولہ تعالیٰ (وما ارسلناك الا رحمة للعالمين) قال سعيد بن جبير عن ابن عباس قال : كان محمد صلى الله عليه وسلم رحمة لجميع الناس فمن آمن به وصدّق به سعد ومن لم يؤمن به سلم مما لحق الأمم من الخسف والغرق (الجامع لاحکام القرآن ۱۱/۳۵۰)

"اور ہم نے تم کو بس رحمت بنا کر بھیجا ہے" اس
تفسیر میں عبد اللہ بن عباس نے کہا کہ محمد صلی اللہ ع
تمام انسانوں کے لیے رحمت تھے۔ جو آدمی آپ
ایمان لایا اور آپ کی تصدیق کی اس نے سعاد
حاصل کی اور جو آدمی آپ پر ایمان نہیں لایا و
یں دھنسنے اور غرق ہونے کے اس عذاب
بچ گیا جو دوسری قوموں کو پیش آیا۔

فان قيل فای رحمة حصلت لمن كفر به۔ فالجواب ما رواه ابو جعفر بن جرير عن ابن عباس، قال من آمن بالله واليوم الآخر كتب له الرحمة فى الدنيا والآخرة۔ ومن لم يؤمن بالله ورسوله عوفى مما اصاب الامم من الخسف والقذف (مختصر تفسیر ابن کثیر ۲/۵۲۵)

اگر یہ کہا جائے کہ اس کو کون سی رحمت ملی جس
آپ کا انکار کیا۔ تو اس کا جواب وہ ہے جو ابن
نے عبد اللہ بن عباس سے روایت کیا ہے۔ ا
نے کہا کہ جو آدمی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان
اس کے لیے دنیا اور آخرت میں رحمت لکھ دی
اور جو آدمی اللہ اور رسول پر ایمان نہیں لا
دھنسانے اور پتھراؤ کیے جانے کے اس عذاب
بچ گیا جو پچھلی امتوں کو پیش آیا تھا۔

وقیل ھو رحمۃ للمومنین فی الدارین وللکافرین فی الدنیا بتاخیر عذاب الاستئصال والمسخ والخسف (تفسیر النسفی ۳/۹۱)

اور کہا گیا ہے کہ آپ اہل ایمان کے لیے دونوں عالموں میں رحمت ہیں۔ اور اہلِ انکار کے لیے دنیا میں رحمت، کیونکہ ان پر مہلک عذاب اور مسخ اور دھنسائے جانے کا عذاب ٹال دیا گیا۔

فکان رحمۃً للعالمین حتی الکفار رُحموا بہ حیث اخّر عقوبتھم ولم یستأصلھم بالعذاب کالمسخ والخسف والغرق (صفوۃ التفاسیر ۲/۲۷۷)

آپ منکرین تک کے لیے رحمت تھے۔ آپ کی وجہ سے ان کی سزا موخر ہو گئی اور ان پر عذاب مستاصل نہیں آیا، مثلاً مسخ، دھنسانا اور غرق کرنا۔

روی البخاری فی التاریخ عن ابی ھریرۃ، قال: انما بعثت رحمۃ ولم ابعث عذابا۔ وقال ابن عباس: ھو رحمۃ للکافر فی الدنیا بتأخیر العذاب علیھم ورفع المسخ والخسف والاستیصال (التفسیر المظہری ۶/۲۴۴)

بخاری نے اپنی تاریخ میں ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں عذاب بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ اور عبداللہ بن عباس نے کہا کہ آپ منکرین کے لیے دنیا میں ان پر عذاب ٹل جانے کی وجہ سے رحمت ہیں اور مسخ اور دھنسا اور مہلک عذاب اٹھا لیے جانے کی وجہ سے۔

مگر دنیا میں "رسولِ رحمت" کا دور لانا سادہ طور پر محض تقرری (appointment) کا معاملہ نہ تھا۔ یہ ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لانے کا معاملہ تھا۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک طاقت ور انسانی ٹیم رسول رحمت کی کامل معاونت کرے اور اسباب وعلل کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مطلوبہ تاریخی انقلاب لے آئے۔ اصحاب رسول اپنے اعلیٰ شعور اور اپنی بے پناہ قربانیوں کے ذریعہ یہی طاقت ور ٹیم بنے۔ انھوں نے رسول رحمت کے خدائی منصوبہ کو عملاً قائم کیا۔

قرآن کے مطابق، موجودہ دنیا انسان کے لیے آزمائش گاہ ہے۔ یہاں انسان کو آزادی دے کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا عمل کرتا ہے اور کون برا عمل۔ انسان کے اسی ریکارڈ کے مطابق اس کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ خدا کے پیغمبر انسان کو اسی نوعیتِ حیات کی خبر دینے کے لیے آتے تھے۔ جب آخری رسول پر پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم کیا گیا تو اس کے بعد اللہ نے چاہا کہ دینِ پیغمبر کو ذاتِ پیغمبر کا بدل بنا دیا جائے۔ زندہ پیغمبر کے بجائے پیغمبر کا لایا ہوا ہدایت نامہ لوگوں کے لیے ہدایت کا

ذریعہ بن جائے۔

یہ صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ خدا کا دین ہمیشہ کے لیے ایک محفوظ دین بن چکا ہو۔ پچھلے زمانوں میں ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ کیونکہ پیغمبروں کو انسانوں کی اتنی بڑی تعداد نہیں ملی جو دین کی حمایت کر کے عالم اسباب میں اس کی حفاظت کا انتظام کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر کا دین اس کے بعد مٹایا جاتا رہا۔ آج پچھلے پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کی تاریخ موجود نہیں، اور نہ کسی پیغمبر کی کتاب محفوظ حالت میں پائی جاتی ہے۔

اس مقصد کے لیے ضرورت تھی کہ خدا کے دین کو مجرد نظریہ کی سطح سے اٹھا کر اس کو عملی انقلاب کے درجہ تک پہنچا دیا جائے۔ اس کے لیے ضرورت تھی مخالفِ دین طاقتوں کا زور توڑ دیا جائے تاکہ وہ ماضی کی طرح اس دین کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ خدا کے دین کی پشت پر ایک طاقت ور امت کھڑی کر دی جائے جو تمام مخالفین کے علی الرغم اس کی محافظ اور امین بن سکے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ خدا کے دین کی بنیاد پر ایک مکمل تاریخ وجود میں آجائے تاکہ خدا کے دین کی پشت پر ایک عملی نمونہ موجود رہے جو ہر دور کے انسانوں کی رہنمائی کرتا رہے۔

یہ منصوبہ بلاشبہہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اصحاب رسول نے ہر قسم کی رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دے کر اس کو مکمل کیا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنا وطن اور اپنے عزیز واقارب کو چھوڑ دیا۔ قریش آپ کے دشمن ہو گئے۔ مگر صحابہ نے اپنے جان و مال کو لٹا کر پیغمبر کی مدد کی۔ حنین کی جنگ میں دشمنوں نے آپ پر تیروں کی بارش کر دی۔ اس وقت صحابہ کی ایک جماعت نے آپ کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان کے جسموں پر تیر اس طرح اٹک رہے تھے جس طرح ساہی کے جسم پر کانٹے لٹکتے ہیں۔ مگر انھوں نے پیغمبر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ روم و ایران کی طاقتور سلطنتیں خدا کے دین کی دشمن ہو گئیں۔ صحابہ نے ان طاقتور چٹانوں کو توڑ ڈالا، وغیرہ۔

صحابہ کرام نے ہر قربانی کی قیمت پر پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دیا۔ انھوں نے اپنے بے پناہ عمل سے وہ تاریخی حالات پیدا کیے جس کے بعد سنت اللہ کے مطابق نبیوں کا سلسلہ ختم ہوا اور انسانیت بار بار دنیوی ہلاکت کے انجام سے بچ گئی۔ نبوت رحمت کا قیام ایک خدائی منصوبہ تھا مگر یہ اصحاب رسول ہی تھے جنھوں نے عالم اسباب میں اس منصوبہ کو مکمل کیا۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اکتوبر ۱۹۹۱ ، شمارہ ۱۷۹

ترتیب

اونچی عمارتوں میں آٹومیٹک لفٹ لگی ہوتی ہے۔ آپ اس کے اندر داخل ہو کر بٹن دباتے ہیں اور وہ آپ کو آپ کی مطلوبہ منزل پر پہنچا دیتی ہے۔

فرض کیجئے کہ چار آدمی بیک وقت لفٹ کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ آپ کو دوسری منزل پر جانا ہے، اور بقیہ لوگ دسویں اور گیارھویں منزل پر جانے والے ہیں، اب اگر دوسرے لوگ پہلے اپنے نمبر والا بٹن دبا دیں اور آپ اپنا نمبر بعد کو دبائیں تو ایسا نہیں ہوگا کہ اس بنا پر لفٹ پہلے اوپر چلی جائے اور بقیہ لوگوں کو دسویں اور گیارھویں منزل پر اتارے۔ اور اس کے بعد نیچے آکر آپ کو دوسری منزل پر پہنچائے۔ بٹن دبانے کی بے ترتیبی کے باوجود ایسا ہوگا کہ لفٹ پہلے دوسری منزل کے مسافر کو اس کی مطلوبہ منزل پر اتارے گی۔ اس کے بعد وہ اوپر کی منزلوں پر جائے گی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بٹن دبانے کی بے ترتیبی کو وہ ازخود کس طرح باترتیب بنا لیتی ہے۔ اس کا جواب کمپیوٹر ہے۔ جدید طرز کی لفٹ میں کمپیوٹر لگا ہوا ہوتا ہے، یہ کمپیوٹر ایک قسم کے مشینی دماغ کی مانند کام کرتا ہے۔ وہ بٹن دبانے کی بے ترتیبی کو منزل کی ترتیب میں بدل دیتا ہے اور لفٹ کو "حکم" دیتا ہے کہ منزل کی اصل ترتیب کے اعتبار سے مسافروں کو اوپر لے جائے۔

آٹومیٹک لفٹ خدا کی ایک ادنیٰ مخلوق ہے۔ جب خدا کی ایک ادنیٰ مخلوق میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مصنوعی ترتیب کو صحیح ترتیب کی صورت میں بدل دے تو یہ طاقت خود خالق کے اندر کتنی زیادہ ہوگی۔ بلاشبہ خالق کے اندر وہ صفت آخری کمال درجہ میں ہے جو آٹومیٹک لفٹ میں صرف معمولی ابتدائی درجہ میں پائی جاتی ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں انسان کو مکمل آزادی دی گئی ہے۔ اس آزادی سے فائدہ اٹھا کر لوگوں نے اپنا نام مصنوعی ترتیب کے ساتھ لکھ لیا ہے، کوئی تیسرے درجہ کا آدمی ہے مگر اس نے اپنا نام نمبر ایک پر لکھوا رکھا ہے، کوئی نچلی سطح پر بٹھائے جانے کے قابل ہے۔ مگر اس نے اپنے آپ کو اونچی سطح پر بٹھا رکھا ہے۔ کوئی ہے جو سرے سے ذکر کے قابل نہیں مگر وہ مصنوعی طور پر شہرت کے اسٹیج پر جگہ حاصل کیے ہوئے ہے۔ آخرت میں یہ تمام غلط ترتیب درست کر دی جائے گی۔ اس کے بعد ادنیٰ درجہ کا آدمی ادنیٰ سیٹ پر پہنچا دیا جائے گا اور اعلیٰ درجہ کا آدمی اعلیٰ سیٹ پر۔

موت کا فیصلہ

آئن فلیمنگ (Ian Fleming) ۱۹۰۸ میں لندن میں پیدا ہوا، ۱۹۶۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ ۱۹۲۹ سے ۱۹۳۳ تک وہ ماسکو میں جرنلسٹ کی حیثیت سے رہا۔ مارچ ۱۹۳۳ میں سوویت روس کی حکومت نے پانچ برطانی انجینیروں کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ ماسکو میں ان کے اوپر مقدمہ چلایا گیا۔ یہ یورپی صحافت کے لیے انتہائی اہمیت کی خبر تھی۔ اس مقدمہ کی کارروائی لکھنے کے لیے یورپ کے جو اخباری نمائندے ماسکو پہونچے، ان میں رائٹر کا نمائندہ آئن فلیمنگ بھی تھا۔ آئن فلیمنگ چاہتا تھا کہ وہ اس فیصلہ کی خبر سب سے پہلے یورپ بھیجے۔

اس مقصد کے لیے اس نے ایک خاموش منصوبہ بنایا۔ جس دن ماسکو کے جج مقدمہ کا فیصلہ دینے والے تھے، اس نے پورے واقعہ کی دو الگ الگ رپورٹیں تیار کیں۔ ایک رپورٹ ملزمین کے سزایاب ہونے کی صورت میں۔ اور دوسری رپورٹ وہ جب کہ انھیں چھوڑ دیا جائے۔

مقررہ وقت پر جیسے ہی ججوں نے فیصلہ کے الفاظ کہے۔ آئن فلیمنگ نے فوراً اپنی رپورٹ کی خالی جگہ پُر کی اور اسی وقت ٹیلی گرام کے ذریعہ اس کو اپنے یورپی دفتر کے نام روانہ کر دیا۔ یہ مذکورہ مقدمہ کی پہلی خبر تھی جو لندن پہونچی۔ آئن فلیمنگ کو اس کے بعد رائٹر نے بڑی ترقی دیدی۔

آئن فلیمنگ کا زیادہ دولت کمانے کا شوق اس کو ناول نگاری کی طرف لے گیا۔ اس نے سنسنی خیز ناول نگاری میں زبردست شہرت حاصل کی۔ اس کے تیرہ ناول تقریباً دو کروڑ کی تعداد میں فروخت ہوئے اور گیارہ زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا گیا۔ اس کا ایک ناول ڈاکٹر نو (Dr. No) ایک لاکھ ڈالر میں فروخت ہوا۔ یہ کہانی فلمائی گئی اور اس سے مزید اس کو ایک لاکھ ڈالر حاصل ہوئے۔ آئن فلیمنگ اب دولت اور شہرت کے آسمان پر تھا۔ مگر عین اس وقت اس کے اوپر وہ وقت آگیا جو ہر ایک کے اوپر آتا ہے۔ ابھی وہ صرف ۵۶ سال کی عمر کو پہونچا تھا کہ اچانک وہ ۱۲ اگست ۱۹۶۴ کو مر گیا۔

آئن فلیمنگ روسی جج کے فیصلہ کی پیشگی رپورٹ تیار کر سکتا تھا، مگر وہ موت کے جج کے فیصلہ کا پیشگی اندازہ نہ کر سکا۔ عین اس وقت اسے اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا پڑا جب کہ وہ سب سے زیادہ زندگی کا خواہش مند ہو چکا تھا۔

سادگی میں عظمت

ایک مرتبہ میں ایک قصبہ میں گیا۔ وہاں ایک مسجد میں چند بار نماز پڑھی۔ میں نے دیکھا کہ اس مسجد کے جو امام ہیں، وہ لوگوں کے درمیان نہایت محبوب ہیں۔ لوگ ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ وہ جو بات کہہ دیں، اس کو تمام لوگ فوراً مان لیتے ہیں۔ میں نے مختلف لوگوں سے پوچھا کہ امام صاحب کی اس مقبولیت کا سبب کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے کچھ سادہ اصولوں پر پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ اور یہی ان کی مقبولیت اور محبوبیت کا راز ہے۔

امام صاحب کا معمول تھا کہ وہ اذان سنتے ہی اپنے گھر سے نکل پڑتے تھے۔ مؤذن کے آخری کلمات کے ساتھ وہ مسجد میں داخل ہو جاتے۔ یہ گویا خدا کی پکار پر فی الفور دوڑ پڑنا ہے۔ اور جس آدمی کا یہ حال ہو کہ وہ خدا کی پکار پر فوراً دوڑ پڑے تو لوگ بھی اس کی طرف دوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح امام صاحب کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ سلام میں پہل کرتے تھے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شخص سلام کرنے میں ان پر سبقت لے جائے۔ جو شخص اس طرح لوگوں کو سلام کرنے لگے، وہ گویا لوگوں کے حق میں اپنے جذبۂ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اور جس آدمی کے دل میں دوسروں کے لیے محبت ہو دوسرے لوگ بھی اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

امام صاحب کی ایک اور صفت یہ تھی کہ وہ کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی آمدنی کے بقدر نہایت سادگی اور قناعت کی زندگی گزارتے تھے۔ یہ طریقہ بھی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ دوسروں سے سوال کرنے والا دوسروں سے چھوٹا بن جاتا ہے۔ اور جو شخص دوسروں سے سوال نہ کرے، وہ دوسروں کو اپنے سے بڑا دکھائی دینے لگے گا۔

امام صاحب کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ صرف بقدر ضرورت کلام کرتے تھے۔ وہ دوسروں کی بات زیادہ سنتے اور خود کم بولتے، اور جو کچھ بولتے، سوچ سمجھ کر بولتے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کم بولنا آدمی کو باوزن بناتا ہے اور زیادہ بولنا آدمی کو ہلکا کر دیتا ہے۔

یہ اصول سب کے سب نہایت سادہ اصول ہیں۔ وہ بظاہر بہت معمولی ہیں۔ مگر وہ جس انسان کے اندر پیدا ہو جائیں، اس کو وہ غیر معمولی انسان بنا دیتے ہیں۔

نظر انداز کرو

سر پرسی کاکس (Sir Percy Cox) ایک انگریز تھا۔ وہ ۱۸۶۴ میں پیدا ہوا، اور ۳۷
میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ۱۸۸۴ سے ۱۸۹۰ تک برٹش فوجی افسر کی حیثیت سے انڈیا میں رہا
پہلی عالمی جنگ کے بعد عراق برٹش مینڈیٹ کے تحت آگیا۔ اس کے بعد کاکس کو ۱۹۲۰ میں عـرا
بھیجا گیا۔ وہ وہاں برٹش ہائی کمشنر کی حیثیت سے ۱۹۲۳ تک مقیم رہا۔

سر پرسی کاکس کا قیام بغداد میں تھا۔ ایک روز صبح کو وہ اپنی رہائش گاہ میں تھا کہ صبح کے
وقت قریب کی مسجد سے آواز سنائی دینے لگی۔ یہ موذن کی آواز تھی جو فجر کی اذان پکار رہا تھا
کاکس کے لیے یہ ایک نئی آواز تھی جو اس نے اب تک نہیں سنی تھی۔ اس کو اندیشہ ہوا کہ یہ باغیوا
کا کوئی گروہ تو نہیں ہے جو نعرہ لگا رہا ہے۔ اس نے اپنے آدمی کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ بتا
والے نے بتایا کہ یہ مسلمانوں کی اذان ہے۔ وہ روزانہ اپنی مسجد میں اسی طرح اذان پکارتے ہیں تاکہ لوگ
اس کو سن کر مسجد میں نماز کے لیے آجائیں۔

سر پرسی کاکس نے سنجیدہ لہجہ میں پوچھا کہ اس سے ہمارے ایمپائر کو کوئی خطرہ تو نہیں۔ بتایا گ
کہ نہیں۔ اس نے جواب دیا: پھر انھیں چھوڑ دو، وہ جو کر رہے ہیں کرتے رہیں۔

میں کہوں گا کہ مسلمانوں کو یہی پالیسی سڑک کے نعروں کے بارہ میں اختیار کرنا چاہیے۔
دوسرے فرقہ کے لوگ جلوس نکالتے ہیں۔ اس میں وہ "دل آزار نعرے" لگاتے ہیں۔ کوئی فرقہ پرست
لیڈر پارک میں جلسہ کر کے "اشتعال انگیز" الفاظ بولتا ہے۔ اس سے مسلمان بھڑک کر کارروائی
کرتے ہیں اور اس کے بعد فساد ہو جاتا ہے۔

ایسے مواقع پر مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سوچیں کہ کیا یہ الفاظ ان کے لیے کوئی عملی خطرہ ہیں۔ کیا
وہ انھیں کوئی جسمانی یا مادی نقصان پہونچا رہے ہیں۔ مسلمان جب اس طرح سوچیں گے تو انھیں
معلوم ہوگا کہ اس قسم کے الفاظ ان کے لیے کوئی عملی خطرہ نہیں۔ یہ معلوم ہونے کے بعد انھیں چاہیے
کہ سر کاکس کی طرح وہ کہہ دیں: پھر انھیں چھوڑ دو، وہ جو کچھ بولتے ہیں بولتے رہیں۔ ہم تو ان کو
نظر انداز کر کے اپنا تعمیری کام جاری رکھیں گے۔

جوابی فارمولا

کہا جاتا ہے کہ ہندستان کے فرقہ پرست ہندو سازش کر کے مسلمانوں کے خلاف فساد کرتے ہیں۔ ان فسادات میں مسلمانوں کا بے حساب جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی "سازش" کیا ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو جان لیا ہے کہ ان کے اندر صبر کا مادہ نہیں۔ ان کے خلاف اشتعال انگیزی کی جائے تو وہ فوراً مشتعل ہو کر آمادۂ تشدد ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کی اسی کمزوری کو استعمال کرنے کا نام فرقہ وارانہ فساد ہے۔

فرقہ پرست ہندو منصوبہ بنا کر ایک جلوس نکالیں گے۔ وہ جلوس سڑکوں سے گزرتا ہوا مسلم محلہ میں پہنچے گا۔ وہاں وہ مسجد کے سامنے باجا بجائے گا یا اشتعال انگیز نعرہ لگائے گا۔ اب مسلمان بھڑک کر جلوس کو روکیں گے۔ بات بڑھے گی۔ یہاں تک کہ عملی تشدد شروع ہو جائے گا۔ اب ہندوؤں کو موقع مل جائے گا۔ وہ مسلمانوں پر آغازِ تشدد کا الزام لگا کر ان کو جلانا اور مارنا شروع کر دیں گے۔ ان کی اس فسادی پالیسی کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ غصہ دلاؤ اور کامیابی حاصل کرو :

Anger and conquer

قرآن کے مطابق، اس فسادی پالیسی کا بہترین توڑ صبر و اعراض ہے۔ فساد کی مذکورہ سازش گویا ایک ٹائم بم ہے۔ اس بم کی تباہی سے بچنے کی آسان تدبیر یہ ہے کہ اس کو حکمت کے ساتھ ڈیفیوز کر کے ناکارہ بنا دیا جائے۔ فساد کے ٹائم بم کو ناکارہ بنانے کا قرآنی فارمولا ایک لفظ میں یہ ہے کہ اعراض کرو اور کامیابی حاصل کرو :

Avoid and conquer

اس فارمولے کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بھی اس قسم کا جلوس نکلے تو مسلمان نہ تو اس کی روٹ بدلنے پر اصرار کریں اور نہ ان کے اشتعال انگیز نعروں پر مشتعل ہوں۔ ان باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہیں۔ بار بار کا تجربہ ہے کہ جہاں مسلمانوں نے اس فارمولے پر عمل کیا وہاں فساد نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی اگر جلوس والوں نے کوئی حرکت کرنا چاہا تو پولیس نے اول مرحلہ میں اس کو سختی سے روک دیا۔ کیوں کہ اب مسئلہ پولیس بمقابلہ جلوس بن گیا تھا۔

تدبیر نہ کہ اشتعال

۲۰ فروری ۱۹۹۱ کو مئو کے عبدالجبار صاحب (۶۴ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہر فساد کا واحد حل حکیمانہ تدبیر ہے۔ اگر حکمت کا طریقہ اختیار کیا جائے تو کبھی کوئی فساد نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے ذاتی تجربہ کے کئی واقعات بتائے۔

مئو کے محلہ مرزا ہادی پورہ میں عبدالحکیم گرہست صاحب رہتے ہیں۔ ان کے گھر کے پاس ایک مسجد ہے جو "جامع مسجد احناف" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۸۱ کا واقعہ ہے۔ رات کے وقت کسی نے خنزیر کا مرا ہوا بچہ اس مسجد میں ڈال دیا۔ صبح کو فجر کی نماز کے لیے لوگ مسجد آئے تو دیکھا کہ وہاں خنزیر پڑا ہوا ہے۔

خبر مشہور ہوتے ہی سارے مئو میں سنسنی پھیل گئی۔ ۸ بجے تک عبدالحکیم گرہست کے مکان پر بھیڑ لگ گئی۔ مسلمان بڑی تعداد میں جمع ہو گیے۔ لوگ سخت مشتعل تھے۔ اور قریب تھا کہ کوئی کارروائی کر بیٹھیں اور پھر سارے شہر میں فساد کی صورت پیدا ہو جائے۔ مگر عبدالحکیم گرہست صاحب نے لوگوں کو سختی سے روکا اور پرامن رہنے کی تاکید کی۔

اس کے بعد انھوں نے پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ فوراً پولیس جائے واردات پر پہونچ گئی۔ پولیس والوں نے صدر دفتر اعظم گڈھ کو بھی ٹیلی فون کر دیا تھا۔ چنانچہ وہاں سے بھی افسران آگئے۔ پولیس افسروں نے آکر مسلمانوں کو سمجھایا اور کہا کہ آپ لوگ پرامن رہیں، ہم کو کارروائی کرنے کا موقع دیں۔ اس کے بعد پولیس والوں نے خنزیر کو وہاں سے اٹھوایا۔ اور فائر بریگیڈ کو بلا کر دور تک پانی سے اچھی طرح دھو دیا۔ اس کے بعد معاملہ وہیں کا وہیں ختم ہو گیا۔ کسی قسم کے فساد کی نوبت نہیں آئی۔ جب کہ اس طرح کے ایک واقعہ پر اکثر پورا شہر فساد کی زد میں آجاتا ہے۔

اس طرح کے مواقع پر بہترین عقل مندی یہ ہے کہ مسلمان امن پسندی کا ثبوت دیں۔ وہ خود کوئی جارحانہ کارروائی نہ کریں۔ بلکہ معاملہ کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو یقینی ہے کہ کسی قسم کا فساد نہیں ہوگا۔ خنزیر ڈالنے والے اس لیے خنزیر ڈالتے ہیں کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی جارحانہ کارروائی کر دیں تاکہ انھیں مکمل فساد کرنے کا موقع مل جائے۔ اس "سازش" کا توڑ یہ ہے کہ مسلمان بالکل خاموش رہیں اور پولیس کو اطلاع دینے کے سوا کوئی اور کارروائی نہ کریں۔ یہ فساد کے بم کو ناکارہ کر دینے کے ہم معنی ہوگا۔

غصّہ نہ دلاؤ

۲۹ مئی ۱۹۹۰ کو دہلی کے اخبارات میں ایک سبق آموز خبر تھی۔ سدرشن پارک (موتی نگر) کی جھگیوں میں ایک شخص رہتا ہے۔ اس کا نام اننت رام ہے۔ عمر ۳۵ سال ہے۔ وہ شراب کا عادی ہے۔ اس کے پاس شراب کے لیے پیسہ نہیں تھا، اس نے اپنی بیوی سے پیسہ مانگا۔ بیوی نے شراب کے لیے پیسہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر میاں اور بیوی میں تکرار ہوئی۔ اس کے بعد ٹائمس آف انڈیا (۲۹ مئی ۱۹۹۰) کے الفاظ میں، جو کچھ ہوا، وہ یہ تھا:

> The accused, a habitual drunkard, was enraged when his wife refused to give him money he asked for. Giving way to his tantrums, he dashed his son against the floor, thus killing him then and there.

مجرم جو کہ شراب کا عادی ہے، اس وقت غصہ ہو گیا جب کہ اس کی بیوی نے اس کو وہ رقم نہ دی جو اس نے مانگی تھی۔ غصہ سے بے قابو ہو کر اس نے اپنے دو سال کے بچے (ارجن) کو لیا اور اس کو کئی بار اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹکا۔ اس کے نتیجہ میں اس کا بچہ اسی وقت مر گیا۔

جب آدمی غصہ میں ہو تو اس وقت وہ شیطان کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ اس وقت وہ کوئی بھی غیر انسانی حرکت کر سکتا ہے۔ حتی کہ خود اپنے بیٹے کو بے رحمانہ طور پر ہلاک کر سکتا ہے۔

یہ ایک ایسی کمزوری ہے جو ہر آدمی کے اندر موجود ہے۔ ایسی حالت میں سماج کے اندر محفوظ اور کامیاب زندگی حاصل کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو غصہ دلانے سے بچے۔ وہ خوش تدبیری کے ذریعہ اس بات کی کوشش کرے کہ وہ دوسرے کو اس جذباتی حالت تک نہ پہونچنے دے جب کہ وہ شیطان کا معمول بن جائے اور اُس مجنونانہ کارروائی پر اتر آئے جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

غصّہ اور انتقام کی برائی کا تعلق کسی قوم سے نہیں۔ وہ ہر انسان کے مزاج میں شامل ہے، خواہ وہ کسی بھی قوم یا کسی بھی ملک سے تعلق رکھتا ہو۔ غصّہ اور انتقام کو انسانی مسئلہ کے طور پر لینا چاہیے نہ کہ فرقہ یا قوم کے مسئلہ کے طور پر۔

کاروباری استقلال

خوش حال طبقہ ناشتہ میں یا چائے کے ساتھ اناج کی بنی ہوئی ہلکی چیزیں لینا پسند کرتا ہے۔ اسی کی ایک صورت وہ ہلکی خوراک ہے جس کو کارن فلیک (cornflakes) کہا جاتا ہے۔ اس کی مختلف قسمیں بازار میں فروخت ہوتی ہیں۔

بہت سی فرموں نے مختلف ناموں سے کارن فلیک بنائے۔ ان کے مزہ میں طرح طرح کا تنوع پیدا کیا۔ مگر ہندستانی مارکٹ میں وہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔ حالاں کہ انھوں نے اشتہار پر کافی رقمیں خرچ کیں۔

اس وقت ہندستان کے بازار میں صرف دو فرموں کے بنائے ہوئے کارن فلیک زیادہ چل رہے ہیں۔ ایک، ہندستان وجیٹیبلس آئلس کارپوریشن (HVOC) کا اور دوسرے موہن میکنس لمیٹڈ کا۔ یہ دونوں فرمیں سالانہ ایک ہزار ٹن کارن فلیک فروخت کرتی ہیں۔ جن کی قیمت تین کروڑ پچاس لاکھ ہوتی ہے۔ حالاں کہ یہ دونوں فرمیں اشتہار پر سرے سے کوئی رقم خرچ نہیں کرتیں۔ ان کا تیار کیا ہوا کارن فلیک بغیر کسی اشتہار کے فروخت ہوتا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۹ جون ۱۹۹۰)

اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دوسری فرموں کی کوئی تاریخ نہیں۔ انھوں نے کسی نام سے کارن فلیک کی ایک قسم بنائی۔ وہ بازار میں نہیں چلی تو انھوں نے دوسری قسم بنا ڈالی یا سرے سے اس کو بنانے کا کام چھوڑ کر کوئی دوسرا کام شروع کر دیا۔ اس کے برعکس مذکورہ دونوں کامیاب فرموں کی صنعت کے پیچھے ۲۰ سال کی تاریخ ہے۔ وہ ۲۰ سال سے متواتر ایک ہی قسم کا کارن فلیک بنا رہی ہیں۔ ۲۰ سالہ تاریخ نے ان کو لوگوں کی نظر میں معلوم اور مسلّم بنا دیا ہے۔ کسی آدمی کو کارن فلیک لینا ہوتا ہے تو ان کے ذہن میں پہلے سے اس کا نام موجود ہوتا ہے اور وہ بازار جا کر اپنے اس معلوم کارن فلیک کو خرید لیتے ہیں۔

یہی کاروبار میں ترقی کا راز ہے۔ کاروبار میں استقلال کی حیثیت لازمی شرط کی ہے۔ آپ کاروبار کر کے اس کو چھوڑتے یا بدلتے رہیں تو آپ کبھی کاروبار میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ اور اگر آپ کاروبار کر کے اس پر جمے رہیں۔ کسی بھی دشواری کی وجہ سے اس کو نہ چھوڑیں تو ۲۰ سال گزرنے کے بعد آپ لازماً کامیابی کی اگلی منزل پر پہونچ چکے ہوں گے۔

مطالعہ قرآن

قرآن میں یہود کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے وہ ایک "نجات دہندہ" کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب وہ آئے گا تو ہم اس کا ساتھ دے کر مشرکوں سے لڑیں گے اور پھر دوبارہ اپنا غلبہ قائم کریں گے۔ مگر جب محمد بن عبد اللہ کی صورت میں وہ آنے والا آیا تو یہود نے آپ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حتی کہ وہ آپ کے سخت ترین دشمن بن گیے (البقرہ رکوع ۱۱)

اس کی کیا وجہ ہے کہ جو لوگ ایک "آنے والے" کے منتظر رہتے ہیں، جب وہ آنے والا آتا ہے تو یہی لوگ اس کے سب سے بڑے دشمن بن جاتے ہیں۔ اس کا جواب قرآن کے مذکورہ حصہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

اس انکار اور دشمنی کا سبب ہوائے نفس (البقرہ ۸۷) ہے۔ یہ انتظار کرنے والے سمجھتے ہیں کہ آنے والا ان کی ہوائے نفس کے مطابق ہوگا۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ ان کی ہوائے نفس کی تائید نہیں کر رہا ہے تو پہچان لینے کے باوجود وہ اس کے منکر اور مخالف بن جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو بدلنے کے بجائے وہ خدا کے فیصلہ کو بدلنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

آنے والا بے آمیز حق کو لے کر آتا ہے، جب کہ وہ ملاوٹ والے حق کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا خدا کی بڑائی کو بیان کرتا ہے، جب کہ وہ اپنے اکابر کی بڑائی کو محبوب بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا اصولی دین کا اعلان کرتا ہے، جب کہ وہ قومی دین کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا آخرت کے مسائل کو سب کچھ بتاتا ہے، جب کہ وہ دنیا کے مسائل کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا زندہ دین کی طرف پکارتا ہے، جب کہ وہ جامد دین کی بنیاد پر گدیاں سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا اتباعِ حق کا داعی ہوتا ہے، جب کہ وہ اتباعِ ھوی پر اپنی زندگی کا نقشہ بنائے ہوتے ہیں۔

یہ فرق آنے والے کو ان کی نظر میں سخت مبغوض بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی اصلاح پر آمادہ نہیں ہوتے، کیوں کہ اس میں انھیں اپنی پوری زندگی کا ڈھانچہ بگڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ آنے والے کو غلط ثابت کرنے کی جھوٹی مہم شروع کر دیتے ہیں۔ وہ خود اپنے مطلوب کو نامطلوب بنا دیتے ہیں۔

ایک آزمائش

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب ۴) اس سے انسان کی ایک پیدائشی کمزوری معلوم ہوتی ہے۔ وہ کمزوری یہ ہے کہ انسان بیک وقت دو چیزوں پر دھیان نہیں دے سکتا۔ آدمی صرف ایک چیز کو اپنا مرکز توجہ بنا سکتا ہے۔ جب بھی وہ ایک چیز پر فوکس کرے گا تو دوسری چیزیں لازمی طور پر اس کے لیے فوکس سے باہر (out of focus) ہو جائیں گی۔

انسان کی یہ صفت انسان کے لیے ایک بے حد نازک آزمائش ہے۔ اپنے حالات یا اپنے ذوق کے لحاظ سے وہ ایک چیز کو اختیار کرتا ہے۔ اس کے یک قلبی مزاج کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ وہی ایک چیز اس کو ساری چیز نظر آنے لگتی ہے۔ بقیہ چیزیں، خارجی طور پر موجود ہوتے ہوئے بھی، اس کے اپنے علم میں غیر موجود ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی اس سوچ میں پختہ ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی ایک چیز کو وہ سب سے اعلیٰ چیز سمجھ لیتا ہے جس پر ابتداءً اس نے اپنی نظروں کو جمایا تھا۔

یہ ایک نازک صورت حال ہے جس میں ہر انسان مبتلا ہے۔ اپنے فطری مزاج کی بنا پر چونکہ دوسری چیزیں آدمی کے فوکس میں نہیں ہوتیں اس لیے بقیہ چیزوں کی حیثیت اس کے نزدیک ایسی ہو جاتی ہے گویا کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں، بلکہ شاید ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

انسان کی اسی پیدائشی ساخت کی بنا پر اس کے اندر وہ کمزوری پیدا ہوتی ہے جس کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ شیطان نے لوگوں کے لیے ان کے کاموں کو ان کی نظر میں خوب صورت بنا دیا ہے (النحل ۶۳) اسی طرح فرمایا کہ لوگ ناپسندیدہ کام میں مشغول ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں (الکہف ۱۰۴) دوسری جگہ فرمایا کہ لوگ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور پھر بطور خود اس کے کسی جزء کو لے کر خوش ہوتے ہیں کہ وہ اصل دین کو پکڑے ہوئے ہیں (الروم ۳۲)

کسی انسان کے ساتھ اس قسم کی تباہ کن صورت حال کیوں پیش آتی ہے۔ اس کا سبب اس کی یہی مزاجی کیفیت ہے۔ وہ جب ایک بار کسی چیز کو اپنا لیتا ہے تو اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ اس ایک چیز کے علاوہ دوسری تمام چیزیں اپنے آپ اس کے لیے اوجھل (آوٹ آف فوکس) ہو جاتی ہیں۔ وہ موجود ہوتے ہوئے بھی اس کے اپنے لیے ایسی بن جاتی ہیں گویا کہ وہ موجود ہی نہ ہوں۔

اب آدمی کی ساری دل چسپی اس کی اپنی اختیار کردہ چیز سے ہو جاتی ہے۔ اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر وہ اس فرضی یقین میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ معاملہ کا سرا پکڑے ہوئے ہے۔ حالانکہ اس کے ہاتھ میں صرف ایک بے حقیقت تنکا ہوتا ہے جو طوفان کے پہلے ہی جھٹکے میں اس سے جدا ہو جائے۔

اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے کہ ہر انسان اپنے شاکلہ پر عمل کرتا ہے، اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون شخص زیادہ صحیح راستہ پر ہے (الاسراء ۸۴) اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے ذاتی شاکلہ میں اپنے آپ کو پوری طرح برسرِ حق سمجھے مگر وہ اللہ کے نزدیک برسرِ حق نہ ہو۔ ایسے لوگ آخرت میں بے حقیقت ہو کر رہ جائیں گے۔

انسان کی یہ پیدائشی کمزوری جس طرح عام انسانوں کے لیے فتنہ ہے اسی طرح وہ امت مسلمہ کے افراد کے لیے بھی فتنہ ہے۔ امت مسلمہ کا معاملہ اس عام آزمائش سے مستثنیٰ نہیں۔ مسلمانوں کے درمیان بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ دین کے ایک پہلو کو لے کر اس کو اپنا مرکز توجہ بنا لیں، اور پھر دین کے دوسرے تمام تقاضے ان کے فوکس سے باہر نکل جائیں۔ ایسے لوگوں کا سارا دھیان بس ایک چیز پر جم کر رہ جائے گا۔

قرآن وحدیث کے معیار کے مطابق، وہ ایک خود ساختہ دین پر ہوں گے۔ مگر اپنے ذاتی ذہن کے اعتبار سے وہ یہی خیال کریں گے کہ وہ کامل حق پر ہیں، کیونکہ ان کا ذہن انھیں بتا رہا ہوگا کہ انھوں نے دین کے سب سے اہم حصہ کو پکڑ رکھا ہے۔

یہ ایک انتہائی نازک آزمائش ہے جس میں ہر شخص مبتلا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن کے الفاظ ہر ایک کو یہ چیتاونی دے رہے ہیں کہ ——— کہو کیا میں تم کو آگاہ کردوں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت ہو گئی۔ اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں (الکہف)

اس امتحان سے بچنے کا واحد ذریعہ احتساب خویش ہے۔ یعنی اپنے مزاج کو کسوٹی نہ سمجھنا بلکہ قرآن وسنت کو دین کی کسوٹی قرار دے کر اپنے آپ کو اس پر جانچتے رہنا۔ جو آدمی اس طرح اپنا بے رحمانہ احتساب نہ کرے وہ اپنے آپ کو اس خطرے میں مبتلا کر رہا ہے کہ آخرت میں اس پر کھلے کہ وہ محض ایک خود ساختہ دین پر تھا، اگرچہ نادانی کی بنا پر وہ اپنے آپ کو خدا کے مطلوب دین پر سمجھتا رہا۔

اختلاف کے ساتھ اعتراف

مولانا حسین احمد مدنی (۱۹۵۷-۱۸۷۹) سیاسی مسلک کے اعتبار سے انڈین نیشنل کانگریس کے حامی تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳-۱۸۶۳) کا مسلک اس معاملہ میں مختلف تھا۔ وہ کانگریس کی حمایت کو مسلمانوں کے لیے درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس اختلاف کے باوجود دونوں بزرگوں میں نہایت اچھے تعلقات تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔

ایک شخص کا ذہنی سانچہ اگر یہ ہو کہ موقف صرف دو ہوا کرتے ہیں۔ یا کامل موافقت یا کامل مخالفت، تو وہ دونوں بزرگوں کے اس طریقہ کو "زمانہ شناسی" پر محمول کرے گا۔ وہ کہے گا کہ دونوں صاحبان اگرچہ ایک دوسرے کے مخالف تھے، مگر ذاتی مفاد کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے بارے میں اچھے الفاظ بولتے رہے۔

مگر جو شخص اسلام کی روح اور مومنانہ مزاج کو جانتا ہو وہ اس کو وسعت نظری قرار دے گا۔ وہ کہے گا کہ دونوں صاحبان مخلص تھے۔ دونوں کا دین ایک تھا۔ البتہ بعض مسائل میں دونوں کی رائے ایک دوسرے سے الگ ہو گئی تھی۔ اور اس قسم کا اختلاف انسانوں کے درمیان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ہر دور کے مومنین صالحین میں اس قسم کا اختلاف پایا جاتا تھا اور ہمیشہ پایا جاتا رہے گا۔ یہ اختلاف بذات خود کوئی غیر محمود چیز نہیں۔ وہ غیر محمود صرف اس وقت بنتا ہے جب کہ اختلاف صرف اختلاف نہ رہے، وہ نفرت اور عناد تک جا پہونچے۔

اصحاب رسولؐ کے درمیان بہت سے امور میں اختلاف تھا۔ اسی طرح فقہاء اور علماء میں اور مفسرین قرآن اور شارحین حدیث میں ہزاروں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اختلافات کا برملا اظہار کیا۔ اس کے باوجود ایسا ہوا کہ انھوں نے ایک دوسرے کا اعتراف کیا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی قدردانی کرتے رہے۔ اس دوطرفہ عمل کا سبب زمانہ شناسی نہیں تھی بلکہ دین شناسی تھی۔ ان کا یہ مسلک مفادِ دنیا کی بنا پر نہ تھا بلکہ خوف آخرت کی بنا پر تھا۔

اختلاف کے ساتھ اعتراف ایک آدمی کے مومن خاشع ہونے کی علامت ہے۔ لیکن بے خبر لوگوں کے لیے وہ مفاد پرستی اور زمانہ شناسی کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

دو طریقے

تحریکیں، خواہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، وہ ہمیشہ دو طریقے پر عمل کرتی ہیں۔ ایک تنظیم کی صورت میں، اور دوسرے اشاعتِ افکار کی صورت میں۔ اول الذکر تحریک کی مثال، موجودہ زمانہ میں، الاخوان المسلمون اور انڈین نیشنل کانگریس ہے۔ یہ دونوں تحریکیں تنظیم کی صورت میں ظہور میں آئیں اور تنظیمی انداز میں آگے بڑھیں۔

دوسرے انداز کی تحریکوں کی مثال اس سے بھی زیادہ عام ہے۔ اور وہ قدیم اور جدید دونوں زمانوں میں پائی جاتی ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کی ایک مثال حضرت مسیح علیہ السلام کی دینی تحریک ہے۔ یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے نہ کوئی جماعت بنائی اور نہ کوئی تنظیم قائم کی۔ وہ صرف اپنی تعلیم کی اشاعت میں مشغول رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا "رفع" فرمالیا۔ مگر آپ کے بعد آپ کے شاگرد اور متاثرین اٹھے۔ انھوں نے آپ کے مشن کو (اگرچہ محرف صورت میں) اتنے بڑے پیمانہ پر پھیلایا کہ آج حضرت مسیح کے ماننے والوں کی تعداد تمام مذاہب میں سب سے زیادہ ہے۔ اسی طرح جدید یورپ میں ڈیموکریسی اور کمیونزم کی تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے ابتدائی علم برداروں نے کبھی کوئی تنظیم نہیں بنائی۔ وہ صرف اپنے نظریہ کے حق میں لٹریچر تیار کرکے مرگیے۔ مگر ان کے بعد ان کے ہم خیال افراد نے ان تحریکوں کو اتنے بڑے پیمانہ پر پھیلایا کہ یہی تحریکیں عملاً ساری دنیا پر چھا گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریکوں کی اصل طاقت ان کے افکار ہیں۔ تحریکیں اپنے افکار کے زور پر اٹھتی ہیں اور اپنے افکار کے زور پر پھیلتی ہیں۔ کسی تحریک کا محرک اول اگر اپنا کوئی تنظیمی ڈھانچہ نہ بنا سکے، وہ اپنے افکار کی تخلیق میں بیج کی مانند بظاہر فنا ہو جائے تب بھی اگر اس کے افکار میں طاقت ہے تو وہ درخت کی مانند ابھرے گا اور آندھی اور طوفان کی طرح دنیا میں پھیل جائے گا۔

کسی تحریک کے مستقبل کے لیے اصل اہمیت کی چیز کوئی خارجی ڈھانچہ نہیں بلکہ اس کی اپنی فکری طاقت ہے۔ اگر تحریک کے فکر میں یہ طاقت ہے کہ وہ انسانوں کے ذہن میں انقلاب پیدا کردے، وہ لوگوں کی ذہنی صلاحیت کو ابھار کر انھیں تخلیقی انسان بنادے تو یہی واقعہ اس بات کی ضمانت ہے کہ تحریک ہر موڑ کا مقابلہ کرتے ہوئے زندہ رہے گی۔ ایسی تحریک وہ افراد پیدا کرتی ہے جو خود اپنی ذات میں جماعت ہوں، جو خود پروگراموں کی تخلیق کریں۔ پھر کون ہے جو ایسی تحریک کا راستہ روک سکے۔

تحقیق ضروری

عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ جَاءَتْ اِمْرَأَةٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ عِنْدَهُ، فَقَالَتْ زَوْجِی صَفْوَانُ بْنُ الْمُعَطَّلِ یَضْرِبُنِی اِذَا صَلَّیْتُ، وَیُفَطِّرُنِی اِذَا صُمْتُ، قَالَ وَصَفْوَانُ عِنْدَهُ، قَالَ فَسَأَلَهُ عَمَّا قَالَتْ، فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمَّا قَوْلُهَا "یَضْرِبُنِی اِذَا صَلَّیْتُ"، فَاِنَّهَا تَقْرَأُ بِسُوْرَتَیْنِ وَقَدْ نَهَیْتُهَا، قَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْ کَانَتْ سُوْرَةٌ وَاحِدَةٌ لَکَفَتِ النَّاسَ، قَالَ وَاَمَّا قَوْلُهَا "یُفَطِّرُنِی اِذَا صُمْتُ" فَاِنَّهَا تَنْطَلِقُ تَصُوْمُ وَاَنَا رَجُلٌ شَابٌّ فَلَا اَصْبِرُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَصُوْمُ اِمْرَأَةٌ اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِهَا۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک صفوان بن معطل ہیں۔ اس درمیان ایک عورت آتی ہے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہتی ہے کہ صفوان بن معطل میرے شوہر ہیں۔ جب میں نماز پڑھتی ہوں تو وہ مجھ کو مارتے ہیں اور جب میں روزہ رکھتی ہوں تو میرا روزہ کھلوا دیتے ہیں۔

عورت کے اس بیان کے مطابق، بظاہر عورت صحیح تھی اور اس کا شوہر غلط، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شوہر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ صفوان بن معطل چوں کہ مجلس میں موجود تھے، آپ نے عورت کی شکایت کے بارہ میں ان سے دریافت کیا۔

انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، نماز کے لیے مارنے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ دو دو سورتیں پڑھتی ہے، حالاں کہ اس سے میں اس کو منع کر چکا ہوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ہی سورہ کافی ہے۔ پھر صفوان نے کہا کہ، روزہ کھلوانے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلسل روزہ رکھتی ہے اور میں جوان آدمی ہوں، صبر نہیں کر سکتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت کے لیے درست نہیں کہ وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر (نفل) روزہ رکھے۔

کسی کے خلاف شکایت کی بات معلوم ہو تو صرف سن کر اس کو نہیں مان لینا چاہیے۔ بلکہ تحقیق کرنا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ تحقیق کے بعد شکایت غلط ثابت ہو۔

غلط استدلال

امام البخاری نے اپنی "صحیح" میں کتاب الدعوات (باب اذا بات طاہراً) میں البراء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے۔ ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ تم سونے کے لیے بستر پر جاؤ تو کس طرح سوؤ اور اس وقت کون سی دعا پڑھو۔ یہ ایک لمبی روایت ہے۔ اس کا آخری حصہ یہ ہے:

آمنتُ بکتابکَ الذی انزلتَ وبنبیکَ الذی ارسلتَ۔ فان متَّ متَّ علی الفطرۃ۔ واجعلھنَّ آخرَ ما تقولُ۔ فقلتُ استذکرھنَّ: وبرسولکَ الذی ارسلتَ۔ قال لا۔ وبنبیکَ الذی ارسلتَ۔

میں تیری کتاب پر ایمان لایا جو تو نے اتاری اور تیرے نبی پر جس کو تو نے بھیجا۔ اس کے بعد اگر تم مر گیے تو تم فطرت پر مروگے۔ اور تم اس قول کو آخری قول بناؤ۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر میں نے یاد کرتے ہوئے دہرایا: وبرسولک الذی ارسلت۔ آپ نے کہا کہ نہیں۔ وبنبیک الذی ارسلت

اس واقعہ کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ حدیث بالمعنی کی روایت جائز نہیں (لا یجوز روایۃ الحدیث بالمعنی) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو دعا سکھائی تھی اس میں بنبیک الذی ارسلت کا لفظ تھا۔ صحابی نے اس کو دہرایا تو ان کی زبان سے برسولک الذی ارسلت نکل گیا۔ دونوں کا مطلب ایک تھا مگر لفظ میں فرق ہو گیا تھا۔ آپ نے اس لفظی فرق کو گوارا نہیں کیا۔ بلکہ خود اپنے کہے ہوئے لفظ ہی کو دہرانے کی تاکید فرمائی۔ اس سے یہ نکلا کہ روایت بالمعنی کا طریقہ صحیح نہیں، بلکہ لفظ کی تبدیلی کے بغیر بعینہ روایت کرنا ضروری ہے۔

اگر اس دلیل کو مان لیا جائے تو احادیث کا بیشتر ذخیرہ قابل رد ٹھہرے گا۔ کیوں کہ بیشتر حدیثوں کی حیثیت روایت بالمعنی ہی کی ہے۔ مگر یہ استدلال بذات خود درست نہیں۔ یہ حدیث کو اس کے اصل مفہوم سے ہٹا کر اس کا ایک غلط مفہوم بیان کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں ہے کہ روایت بالمعنی صحیح ہے یا روایت باللفظ۔ اس کا تعلق تمام تر ایک ادبی مسئلہ سے ہے۔ برسولک الذی ارسلت میں لفظی تکرار کی وجہ سے ایک ادبی نقص پیدا ہو رہا تھا۔ اس لیے آپ نے بنبیک الذی ارسلت کہنے کے لیے فرمایا جو ادبی اعتبار سے زیادہ بہتر ہے —— اس دنیا میں خدا اور رسول کے کلام کو بھی غلط مفہوم دیا جا سکتا ہے پھر ایک انسان کے کلام سے غلط مفہوم نکالنا کیوں کر ممکن نہ ہو گا۔

فطرت کا تقاضا

تجرّد (غیر شادی شدہ زندگی) کو بعض مذاہب میں تقدس کا درجہ دیا گیا ہے۔ مگر جب بھی تجرّد (celibacy) کو عمل میں لایا گیا، معاشرہ میں ناقابل حل خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ مثلاً قدیم یونان میں تجرد پر عمل کرنے کا انجام یہ ہوا کہ ان کی آبادی میں غیر معمولی کمی آگئی (14/815) اسی طرح مسیحی چرچ میں تجرد کو اعلیٰ معیار قرار دیا گیا۔ اس کا نتیجہ اس بدتر صورت میں ظاہر ہوا کہ اہل کلیسا میں غیر منکوحہ تعلقات اور ناجائز اولاد کے مسائل پیدا ہوگئے (3/1043)

یہ فطرت سے انحراف کی سزا ہے۔ جب بھی انسان کے کسی فطری تقاضے پر پابندی لگائی جائے گی، یہ پابندی شدید تر برائیاں پیدا کرے گی۔ جو تقاضا تخلیقی طور پر انسان کی فطرت میں شامل ہو، اس پر روک لگانا ممکن نہیں۔ ایسے کسی تقاضے پر روک لگانا صرف اس قیمت پر ہوتا ہے کہ مزید ایسی سنگین خرابیاں پیدا ہو جائیں جن پر کنٹرول کرنا ممکن نہ ہو۔

اسی قسم کی غیر فطری پابندی کی ایک مثال لوگوں کو تنقید سے روکنا ہے۔ تنقید دوسرے فطری تقاضوں کی طرح ایک فطری تقاضا ہے۔ اگر اس پر روک لگائی جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ لوگوں کے دلوں میں تو کچھ ہوگا مگر وہ زبان سے کچھ اور بیان کریں گے۔ اس طرح لوگوں کے اندر منافقت کی برائی پیدا ہو جائے گی۔ اور منافقت تمام برائیوں میں سب سے زیادہ بڑی برائی ہے۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ لوگوں کی سوچ میں فرق ہوتا ہے۔ اس بنا پر لوگوں کی رایوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی اختلافِ فکر کے اظہار کا نام تنقید ہے۔ تنقید اختلافِ رائے کی بنا پر ظہور میں آتی ہے اور اختلافِ رائے فطرت کے لازمی تقاضے کی بنا پر۔

تنقید پر روک لگانے سے تنقید کا اصل سبب تو ختم نہ ہوگا۔ البتہ اس کا عملی نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ منافق بن جائیں گے۔ لوگوں کے دلوں میں تنقید ہوگی اور زبان پر تعریف۔ وہ بناوٹی باتیں کریں گے۔ ان کے قول اور ان کے احساس میں مطابقت باقی نہ رہے گی۔ اسی دو عملی کا نام منافقت ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ تنقید کو برداشت کرنے کا مزاج پیدا کیا جائے نہ کہ خود تنقید پر روک لگائی جائے۔ تنقید کو برداشت کرنے سے صحت مند معاشرہ بنتا ہے اور تنقید کو بند کرنے سے منافق معاشرہ۔

مجازی اسلوب

اقبال کہتے ہیں کہ قضا وقدر (خدا) نے مجھ سے کہا کہ کیا ہماری دنیا تمہارے لیے سازگار ہے۔ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ کہا کہ پھر اس کو توڑ دو :

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد　　گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اسی طرح اقبال کا ایک شعر ہے :

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے　　جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

بظاہر ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ اقبال اور خدا کے درمیان گفتگو ہوئی۔ یا جبریل فرشتہ نے براہ راست اقبال سے کلام کیا۔ مگر جو آدمی ان اشعار کو اس طرح بالکل لفظی معنی میں لینے لگے اس کو اقبال کا جواب ہوگا کہ : شعر مرا بمدرسہ کہ برد ۔

یہ اشعار اور اس طرح کے بے شمار منثور اور منظوم کلام مجازی اسلوب میں ہیں نہ کہ حقیقی اسلوب میں۔ یہ اپنے ایک احساس کو واقعہ کی زبان میں بیان کرنا ہے ، یہ اپنی ایک داخلی واردات کو اس طرح ظاہر کرنا ہے گویا کہ وہ خارجی دنیا میں پیش آئی تھی ۔

یہ ایک معروف اسلوب ہے اور وہ اس لیے اختیار کیا جاتا ہے تاکہ ایک طرف متکلم کے یقین کا اظہار ہو ، اور دوسری طرف اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب پر زیادہ سے زیادہ اثر ڈالا جا سکے۔ مولانا روم کی پوری مثنوی اسی اسلوب میں ہے۔ بزرگانِ دین کا بیشتر کلام اس اسلوب سے بھرا ہوا ہے۔ ماضی اور حال کے تمام اکابر کے یہاں اس اسلوب کی مثالیں پائی جاتی ہیں ۔

مثلاً ایک کہنے والا اگر یہ کہے کہ "میں نے خدا کو دیکھا۔ میں نے خدا کو چھوا" تو وہ شخص بڑا نادان ہوگا جو ان الفاظ کو بالکل حقیقی معنیٰ میں لے کر اس پر فتویٰ صادر کرنے لگے ۔

اس قسم کا ہر کلام مجازی اسلوب کلام ہے۔ یہ دراصل انسانی زبان میں اپنے یقین کا اظہار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے خدا کے بارہ میں اس یقین کا تجربہ ہوا جو کسی چیز کو دیکھنے سے ہوتا ہے۔ کسی چیز کو چھونے سے اس کی موجودگی کا جو احساس ہوتا ہے اسی طرح میں نے خدا کی موجودگی کا احساس کیا۔ بالفاظ دیگر ـــــ گویا کہ میں نے خدا کو دیکھا، گویا کہ میں نے خدا کو چھوا۔ گویا کہ میں نے خدا کو موجود پایا۔

یک طرفہ اقدام کی ضرورت

صلح حدیبیہ (۶ ھ) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے۔ اس موقع پر مخالفین اسلام نے صلح کی جو شرطیں پیش کیں، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بحث کے بغیر منظور کر لیا۔ یہ شرطیں سب کی سب مخالفینِ اسلام کے حق میں تھیں۔ چنانچہ جو مسلمان آپ کے ساتھ تھے ان کی اکثریت پر یہ صلح بے حد شاق گزری۔ حتیٰ کہ بعض صحابہ یہ کہہ پڑے کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ اور کیا فریق ثانی باطل پر نہیں ہے۔ اگر ہم حق پر ہیں اور فریق ثانی باطل پر ہے تو ہم اس قسم کی ذلت آمیز شرائط پر صلح کیوں کریں۔

پیغمبر اسلامؐ اور عام مسلمانوں کے درمیان رائے کا یہ فرق کیوں ہوا۔ اس کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ مسئلہ کو یک طرفہ طور پر دیکھ رہے تھے اور عام مسلمان دوطرفہ طور پر۔ عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ کچھ ہم جھکیں اور کچھ وہ جھکیں۔ کچھ شرطیں ہماری مانی جائیں، کچھ شرطیں ان کی مانی جائیں۔ یعنی معاملہ کو دوطرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ جب کہ پیغمبر اسلامؐ کا خیال تھا کہ ہم اس بحث کو نہ چھیڑیں کہ اس معاملہ میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ اس بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم یک طرفہ طور پر فریق ثانی کی پیش کی ہوئی شرطوں پر راضی ہو جائیں۔

مسلمانوں کی رائے خالص منطقی اعتبار سے بالکل درست تھی۔ نظری انصاف کے اعتبار سے یقیناً یہی ہونا چاہیے تھا کہ دونوں میں سے کوئی فریق ضد نہ کرے، بلکہ اصولی بنیاد پر جو بات صحیح ہے اس پر دونوں فریق راضی ہو جائیں۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم معاملہ کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ اگر اصول اور منطق کی بنیاد پر اصرار کیا گیا تو فریق ثانی ہرگز راضی ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے عملی اعتبار سے مسئلہ کا ممکن حل صرف یہ ہے کہ فریق ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا جائے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں فریقوں میں ٹکراؤ کی صورت حال ختم ہو جائے گی۔ اور مسلمانوں کے لیے کام کے مواقع نکل آئیں گے۔ دوطرفہ بنیاد پر اصرار عملاً دونوں فریقوں کے درمیان ٹکراؤ کو برقرار رکھنے کے ہم معنی تھا۔ جب کہ یک طرفہ بنیاد پر راضی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جنگی ٹکراؤ ختم

ہو، اور میدانِ جنگ سے باہر جو ممکن دائرہ ہے، اس میں مسلمانوں کے لیے دعوت اور تعمیر کی جدوجہد کی راہیں کھل جائیں۔

دور نبوت کا یہ واقعہ موجودہ حالات میں ہمارے لیے رہنما واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان آج جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں وہ انتہائی پیچیدہ ہیں۔ پچھلے پچاس سال کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مسئلہ کا منطقی تجزیہ کرنا یا فریقِ ثانی کے سامنے اصولی مطالبات کا میمورنڈم پیش کرنا موجودہ حالات میں اتنا زیادہ بے فائدہ ہے کہ اس کی قیمت کاغذ کے اس ٹکڑے کے بقدر بھی نہیں ہے جس پر یہ منطق اور اصولی مطالبات لکھے جاتے ہیں۔ اصولی مطالبہ صرف اس وقت بامعنی ہوتا ہے جب کہ فریق ثانی اصول کے آگے جھکنے کے لیے تیار ہو۔ اور موجودہ صورت حال میں اس کا کوئی ادنیٰ امکان بھی نہیں۔

مسلمان اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو دوطرفہ بنیاد پر طے کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ مسئلہ کا واحد قابل عمل حل صرف یہ ہے کہ اس کو یک طرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ اس وقت مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں نے فرصتِ عمل کو کھو دیا ہے۔ ان کے لیے ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے لیے کوئی تعمیری منصوبہ بنائیں اور اس کی طرف اپنا سفر شروع کریں۔ اگر مسلمان اس قربانی پر راضی ہو جائیں کہ وہ فریقِ ثانی سے اپنے تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں تو اس کا نقد فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان فوراً ہی اپنے لیے عمل کا موقع پا لیں گے۔ جس کو وہ تقریباً نصف صدی سے کھوئے ہوئے ہیں۔ عمل کا موقع پانا گویا سفر کے آغاز کو پانا ہے۔ اور جو لوگ اپنے سفر کے آغاز کو پالیں وہ یقیناً ایک روز اپنے سفر کے اختتام کو پہونچ کر رہتے ہیں۔

یہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں جو نقصان کو برداشت کرے وہی فائدہ کو حاصل کرتا ہے۔ یک طرفہ طور پر مسئلہ کو ختم کرنا اسی اصول کی تعمیل ہے۔ یک طرفہ طور پر مسئلہ کو ختم کرنے پر راضی ہونا بلاشبہ اپنے اندر نقصانات کے پہلو رکھتا ہے مگر موجودہ دنیا میں کسی بھی قسم کی ترقی کا یہی واحد زینہ ہے۔ موجودہ دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ صرف فائدہ چاہیں ان کے حصہ میں آخر کار صرف نقصان آئے، اور جو لوگ ابتدائی نقصان کو برداشت کریں وہ بالآخر ہر قسم کے فائدوں کے مالک بنیں۔

سیاست، دعوت

پاکستان کی ایک خاتون بیگم شائستہ اکرام اللہ (۷۵ سال) کا مضمون انگریزی ماہنا ریڈرس ڈائجسٹ کے شمارہ مئی ۱۹۹۱ میں چھپا ہے۔ وہ تقسیم سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کی ایا سرگرم کارکن تھیں۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۴ تک وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی ممبر ر ۱۹۶۴ سے ۱۹۶۷ تک وہ مراکو میں پاکستان کی سفیر تھیں۔ مذکورہ مضمون کا عنوان ہے: "محمد ع جناح"۔ اس مضمون میں انھوں نے مسٹر محمد علی جناح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ بٹوارہ سے پ ۱۹۴۵ میں پیش آیا۔ وہ لکھتی ہیں:

'd been invited by the government to represent India at an international peace onference in San Francisco, but the leader of our political party was telling me shouldn't go. His reason: our party, the All-India Muslim League, was com-ıitted to non-cooperation with India's British rulers; as a disciplined Leaguer, I ould not be part of a government delegation. I was tempted to go, so I said, Can't I go and not talk politics?" "Then what will you talk about?" Mohammed ıli Jinnah asked sharply. "The man in the moon?" His face softened. "I know ow disappointed you are," he said, "but a principle is at stake. One day, I romise, you will go to an international conference — and with honour, repre-enting your country." That encounter took place in 1945, but even today the ronder of it moves me.

ɩeader's Digest. New Delhi, May 1991, pp. 29-30

برٹش گورنمنٹ کی طرف سے مجھے یہ دعوت دی گئی تھی کہ میں سان فرانسسکو میں ہونے والی ایک بین اقوامی امن کانفرنس میں ہندستان کی نمائندگی کروں۔ مگر ہماری سیاسی پارٹی کے قائد نے مجھ سے کہا کہ مجھ کو اس کانفرنس میں نہیں جانا چاہئے۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری پارٹی آل انڈیا مسلم لیگ، اس کی پابند ہے کہ وہ ہندستان کے برٹش حکمرانوں سے تعاون نہیں کرے گی۔ لیگ کی ایک باضابطہ فرد کی حیثیت سے مجھ کو ایک سرکاری وفد کا حصہ نہیں بننا چاہئے۔ میں اس کانفرنس میں جانے کی طرف راغب تھی۔ اس لئے میں نے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں جاؤں مگر وہاں میں سیاست کی بات نہ کروں۔ محمد علی جناح نے تیزی سے پوچھا کہ پھر اور کون سی بات تم وہاں کروگی۔ کیا چاند پر انسان کے بارہ میں۔ اس کے بعد انھوں نے نرمی کے ساتھ کہا کہ میں

جانتا ہوں کہ اس سے تم کو کتنی زیادہ مایوسی ہوگی۔ مگر یہاں ایک اصول خطرہ میں ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دن تم ایک بین اقوامی کانفرنس میں جاؤگی اور عزت و وقار کے ساتھ اپنے ملک کی نمائندگی کروگی۔ مسٹر جناح کے ساتھ میرا یہ سامنا ۱۹۴۵ میں ہوا تھا، مگر آج بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرے اوپر اس کا عجیب تاثر ہوتا ہے۔

مذکورہ بین اقوامی کانفرنس امن کے موضوع پر ہو رہی تھی۔ یہاں موقع تھا کہ عالمی شخصیتوں کے سامنے اسلام کی امن سے متعلق تعلیمات پیش کی جائیں۔ اس عالمی اسٹیج کو اسلام کے تعمیری پیغام کے اعلان کے لئے استعمال کیا جائے۔ مگر مسٹر محمد علی جناح کے ذہن پر سیاست کا اتنا غلبہ تھا کہ انھیں اس کے سوا کوئی اور قابل ذکر بات معلوم ہی نہ تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عالمی کانفرنس میں اگر سیاست کی بات نہ کہنا ہو تو پھر اور کون سی بات ہے جو وہاں کہی جائے گی۔

تاہم یہ صرف مسٹر جناح کا معاملہ نہیں، یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم قائدین کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانہ کے ہر مسلم قائد کا یہ حال ہوا کہ وہ سیاسی محرک کے تحت اٹھا۔ اس کی پوری سوچ سیاسی رخ پر چل رہی تھی۔ اس لئے اس کو سیاست کے سوا کوئی اور کرنے کا کام معلوم ہی نہ تھا۔ ہر ایک بس سیاست کے میدان میں اپنی سرگرمیاں دکھاتا رہا۔ سیاست کے باہر اس کو کوئی کام نظر نہ آیا جس میں وہ اپنے کو یا اپنے ساتھیوں کو مصروف کرے۔

دور جدید کے انقلاب نے ہمارے لئے جو سب سے بڑا میدان کھولا وہ اسلامی دعوت کا میدان تھا۔ اس دور میں پہلی بار مذہب پر آزادانہ غور و فکر کی فضا پیدا ہوئی۔ جدید حالات نے اس کو ممکن بنایا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے اہتمام میں مذہبی اور روحانی کانفرنس کریں، اور دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کے نمائندوں کو بھی دعوت دیں کہ آپ وہاں آکر اسلام کی تعلیمات پیش کریں۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے سفر کو اور پیغام رسانی کے عمل کو بے حد آسان بنا دیا۔

مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں پہلی بار مذاہب کی آزادانہ تحقیق کی گئی۔ اس تحقیق نے خالص علمی اور تاریخی طور پر یہ ثابت کیا کہ تمام مذاہب غیر معتبر ہیں۔ مذاہب کی فہرست میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علمی طور پر ثابت شدہ اور تاریخی طور پر قابل اعتبار ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کو یہ کرنا تھا کہ وہ ہر دوسرے مسئلہ کو نظر انداز کرکے اسلام کے

پیغام رحمت کو تمام قوموں تک پہنچائیں۔ مگر مسلمانوں نے اس کے بالکل برعکس عمل کیا۔ انھوں نے اسلام کی پیغام رسانی کے کام کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ اور نام نہاد سیاسی جہاد میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ حتی کہ ان کا یہ حال ہوا کہ ان کے بڑے بڑے رہنماؤں تک کو شعور کے درجہ میں بھی اس کا احساس نہ رہا کہ اسلام کی دعوت بھی کوئی کام ہے جس کے لئے انھیں دوسری قوموں کے درمیان متحرک ہونا چاہئے۔ آج کوئی مسلم جماعت تو درکنار، پوری مسلم دنیا میں کوئی قابل ذکر فرد بھی نہیں جس کو حقیقی طور پر دعوت الی اللہ کا شعور ہو، اور وہ اس اہم ترین کام میں فی الواقع اپنے آپ کو لگائے ہوئے ہو۔

حضرت یونس علیہ السلام سے دعوت الی اللہ کے معاملہ میں جزئی اور اجتہادی کوتاہی ہوئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں وہ مچھلی کے پیٹ میں ڈال دئے گئے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے یہی کوتاہی مکمل طور پر اور بدترین طور پر کی ہے۔ یہ بلاشبہہ اللہ کی ناراضگی کی بات ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں پوری ملت مسلمہ مسائل کے پیٹ میں ڈال دی گئی۔ مسائل کی مچھلی نے ان کو نگل رکھا ہے۔ یہ حالت کسی ایک ملک کی نہیں۔ ہندستان، پاکستان، بلاد عربیہ، اور دوسرے تمام علاقوں کے مسلمان مسائل کے شکنجہ میں گرفتار ہیں۔ ان کی ہر کوشش اس کی شدت میں اضافہ کر رہی ہے، وہ اس میں کوئی کمی نہیں کرتی۔

"مسائل کی مچھلی" کے پیٹ سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے۔ مسلمان اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ وہ اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ وہ دوسری قوموں کو حریف اور رقیب سمجھنے کا مزاج ختم کریں۔ وہ ان سے مدعو و الامعاملہ کریں۔ وہ ان کے اوپر دعوت الی اللہ کی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ یہی مسائل کے پیٹ سے نکلنے کا واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا راستہ نہیں جو انھیں اس گرفتاری سے نجات دینے والا ہو۔

سجدۂ فطرت

اس صفحہ کے نیچے ایک تصویر دی جا رہی ہے۔ اس میں ایک آدمی "سجدہ" کی حالت میں نظر آتا ہے۔ مگر یہ مسجد کا یا نماز کا سجدہ نہیں ہے بلکہ فطرت کا سجدہ ہے۔ یہ ہندستانی پارلیمنٹ کے نئے ممبر سباش چندر نایک ہیں۔ ۹ جولائی ۱۹۹۱ کو جب وہ پہلی بار پارلیمنٹ ہاؤس پہنچے تو اس کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ان کے اندر غیر معمولی طور پر احترام کا جذبہ ابھرا۔ وہ بے تابانہ طور پر پارلیمنٹ کے سامنے سجدہ کی مانند گر پڑے۔

سجدہ کی حالت آخری سپردگی کی حالت ہے۔ انسان کے اندر جب کسی چیز کے لئے تسلیم و سپردگی کا جذبہ کامل طور پر پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس چیز کے آگے ڈال دینا چاہتا ہے، اس وقت اس کا جسمانی وجود جس آخری حالت میں ڈھل جاتا ہے وہی سجدہ ہے۔ سجدہ کی حالت سپردگی کی آخری حالت ہے، اس کے بعد عملی سپردگی کا اور کوئی درجہ نہیں۔ سجدہ کی حالت میں اپنے آپ کو پہنچا کر انسان اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو آخری حد تک حوالہ کئے جانے والے کے آگے حوالہ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی انسان کے اندر کامل سپردگی کی خواہش ابھرتی ہے تو وہ فوراً سجدہ

Mr Subash Chandra Nayak, Congress MP from Orissa, a first timer in the Lok Sabha, kneels down in symbolic respect to Parliament House, on Tuesday. —TOI

کی حالت میں گر جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ ہے۔

مطبوعہ تصویر ٹائمس آف انڈیا (۱۰ اجولائی ۱۹۹۱) کے فوٹو گرافر نے دسویں لوک سبھا کی حلف برداری کی تقریب کے موقع پر کھینچی تھی۔ اس دن اسپیکر کی جانب سے نومنتخب ممبران کو حلف دلا کر دسویں لوک سبھا کی باضابطہ تشکیل کی گئی تھی۔ لوک سبھا میں ۵۰۷ منتخب شدہ ممبر ہیں۔ ان میں سے آدھے ممبران نئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک مسٹر سباش چندر نایک ہیں۔ وہ جب نئی دہلی کے پرعظمت پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے پہنچے اور اس میں داخل ہونے لگے تو وہ واقعہ گزرا جس کو اخباری رپورٹر کے کیمرہ نے ریکارڈ کر لیا۔ پارلیمنٹ کے عظمت و تقدس کا احساس ان پر اس طرح طاری ہوا کہ وہ اس کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

"سجدہ" انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان کا پورا وجود اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ کسی کے آگے سجدہ میں گر جانا چاہتا ہے۔ آدمی کے اندر فطری طور پر یہ احساس چھپا ہوا موجود ہے کہ "تو بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں" یہ اندرونی احساس جب شدت اختیار کر کے ظاہری ہیئت میں ڈھل جائے تو اسی کا نام سجدہ ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ میں نے جن اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے بنایا ہے (الذاریات ۵۶) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر عبادت اور سجدہ گزاری کا جو جذبہ چھپا ہوا ہے وہ اصلاً خالق کے لئے ہے۔ اس کا صحیح استعمال یہ ہے کہ آدمی خداوند رب العالمین کا ساجد بن جائے۔ جو لوگ خدا کو پائے ہوئے نہ ہوں وہ اپنی بے خبری کی بنا پر کسی غیر خدا کے سجدہ گزار بن جاتے ہیں۔

اس واقعہ سے مزید یہ بات معلوم ہوئی کہ توحید کی دعوت ایک ایسی دعوت ہے جس کا آدھا مرحلہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔ انسان اپنی پیدائشی فطرت کے تحت پیشگی طور پر اپنے اندر یہ آمادگی لئے ہوئے ہے کہ وہ کسی برتر ہستی کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔ اب داعیان حق کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ انسان کو یہ بتا دیں کہ تمہاری فطرت جس ہستی کے آگے جھکنا چاہتی تھی وہ ہستی دراصل تمہارا خالق ہے۔

اس معاملے میں فارسی شاعر کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے کہ جنگل کے تمام ہرن اپنا سر ہتھیلی پر لئے ہوئے اس انتظار میں ہیں کہ تو آئے اور ان کا شکار کرے:

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف　　بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

قرآن کا فلسفہ

غالباً ۱۹۷۰ کی بات ہے۔ میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو ایک یونی ورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اسلام کے فلسفیانہ فکر پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اسلام میں ثانوی عقلیت (secondary rationalism) ہے۔ اسلام میں ابتدائی عقلیت (primary rationalism) نہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اسلامی فکر کا آغاز وحی کے عقیدہ سے ہوتا ہے۔ آدمی پیشگی طور پر وحی کو مسلّمہ صداقت مان کر سوچنا شروع کرتا ہے۔ جب کہ عام انسانی فلسفہ میں کوئی چیز پیشگی مسلّمہ کے طور پر نہیں مانی جاتی۔ بلکہ تحقیق وجستجو کے بعد جو بات ثابت ہوتی ہے اس کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کی بات بطور واقعہ درست ہے۔ مگر میں اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ اس دنیا میں انسان کے لیے ثانوی عقلیت ہی ممکن ہے۔ ابتدائی عقلیت موجودہ دنیا میں انسان کے لیے قابلِ عمل اور قابلِ حصول نہیں۔

ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم کو صرف محدود عقلی صلاحیت حاصل ہے۔ حقائق کی کائنات لامحدود ہے اور اس کے مقابلہ میں انسان کی عقل انتہائی محدود۔ اس لیے ابتدائی عقلیت کا اصول ایک دل پسند اصول تو ہو سکتا ہے مگر اس دنیا میں وہ قابلِ عمل اصول نہیں۔

خالص فنی اعتبار سے اسلام کی عقلیت اگرچہ ثانوی عقلیت ہے مگر وہ عام معنوں میں ادعائیت (dogmatism) کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کے بارے میں ایک بیان (statement) دیتا ہے۔ اور اس کے بعد انسان سے یہ کہتا ہے کہ اس بیان کو واقعات معلومہ (known facts) پر جانچ کر دیکھو۔ اگر تم پاؤ کہ یہ بیان واقعاتِ معلومہ سے مطابقت رکھتا ہے تو تم کو مان لینا چاہیے کہ یہ عین درست ہے۔

علم کیا ہے، اور انسان اس علم تک کس طرح پہنچتا ہے یا پہنچ سکتا ہے، اس سلسلہ میں جدید سائنس نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ علم تک پہنچنے کے تین مرحلے ہیں:

۱۔ مشاہدہ (observation)

۲۔ مفروضہ (hypothesis)

۳۔ تصدیق (verification)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اولاً آدمی کے سامنے کچھ واقعات آتے ہیں۔ ان واقعات کی توجیہہ کے لیے اس کے ذہن میں ایک مفروضہ قائم ہوتا ہے۔ اب وہ مزید مطالعہ شروع کرتا ہے۔ اگر مزید یا وسیع تر مطالعہ اس کے مفروضہ کی تصدیق کرے تو مان لیا جائے گا کہ وہ حقیقت ہے۔ اس آخری مرحلہ میں پہنچ کر ابتدائی مفروضہ ثابت شدہ حقیقت (proved fact) بن جاتا ہے۔

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ زمین پر قدیم انسان نے دیکھا کہ یہاں خشکی کے حصے بھی ہیں اور سمندر بھی۔ اس نے ابتدائی طور پر یہ مفروضہ قائم کیا کہ زمین پر آدھا حصہ خشکی ہے اور آدھا حصہ پانی۔ یہ مفروضہ یونانی فلسفیوں کے زمانے سے لے کر ابن خلدون تک قائم رہا۔

اس کے بعد خشکی اور سمندر کے سفروں سے آدمی نے یہ جانا کہ خشکی کے مقابلے میں پانی کا حصہ زمین پر زیادہ ہے۔ اس دوسرے مشاہدے سے پہلا مفروضہ رد ہوگیا۔ اب دوسرا مفروضہ یہ قائم ہوا کہ زمین پر پانی کا حصہ دو تہائی ہے اور خشکی کا حصہ ایک تہائی۔ اس کے بعد مزید ذرائع انسان کو حاصل ہوئے اور یہ ممکن ہوگیا کہ خشکی کے حصے اور پانی کے حصے کی باقاعدہ پیمائش کی جا سکے۔ چنانچہ باقاعدہ پیمائش سے معلوم ہوا کہ زمین کی سطح پر پانی کا حصہ ۷۱ فی صد ہے اور خشکی کا حصہ ۲۹ فی صد۔ بعد کے اس مشاہدہ نے دوسرے مفروضہ کی تصدیق کر دی اور وہ مسلّمہ حقیقت کے طور پر مان لیا گیا۔

قرآن کا فلسفہ بھی تقریباً یہی ہے۔ البتہ مقدمات کی ترتیب کے اعتبار سے دونوں میں معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ قرآن کا فلسفہ یا قرآن کا طریق تفکیر معمولی فرق کے ساتھ یہ ہے کہ اس میں سب سے پہلے "مفروضہ" قائم ہوتا ہے۔ اس کے بعد "مشاہدہ" کی روشنی میں اس پر غور وفکر کیا جاتا ہے۔ اور پھر آخر میں "تصدیق" کا درجہ آتا ہے۔ یعنی قرآن کے دعویٰ (مفروضہ) کو لے کر اس پر غور کرنا۔ اور پھر غور وفکر کی سطح پر مفروضہ کی واقعیت ثابت ہونے کے بعد اس کو مسلّمہ حقیقت مان لینا۔ اسی آخری درجۂ معرفت کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان ہے۔

گویا سائنس کے طریق علم کی ترتیب یہ ہے کہ مشاہدہ۔ مفروضہ۔ تصدیق۔ اس کے بجائے قرآن کے طریق علم کی ترتیب یہ ہے کہ مفروضہ۔ مشاہدہ۔ تصدیق:

Science: observation—hypothesis—verification.
Qur'an : hypothesis—observation—verification.

دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام انسانی فلسفہ میں فکر کا آغاز تلاش (pursuit) سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی فلسفہ میں فکر کا آغاز یافت (finding) سے ہوتا ہے۔ قرآن ابتداءً یہ دعویٰ یا علمی زبان میں مفروضہ پیش کرتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور اس کائنات کا ایک انجام ہے۔ اس کے بعد قرآن تخلیقی دنیا کے مختلف شواہد (آیات) انسان کے سامنے لاتا ہے۔ اور انسان سے کہتا ہے کہ ان شواہد پر غور کرو اور دیکھو کہ کیا یہ شواہد قرآن کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔

اب تک کے تجربات بتاتے ہیں کہ کائنات کے تمام حقائق معلومہ (known facts) قرآن کے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں۔ کوئی بھی معلوم حقیقت ایسی نہیں جو قرآن کے بیان سے ٹکرانے والی ہو یا اس کو مشتبہ ثابت کرتی ہو۔

اس کی ایک مثال لیجئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں یہ اعلان کیا کہ مجھ پر خدا نے اپنے فرشتے کے ذریعہ وحی بھیجی ہے۔ اس پر مکہ کے لوگوں نے کہا کہ ہم تمہاری بات کو صرف اس وقت مانیں گے جب کہ ہم اپنی آنکھ سے دیکھیں کہ فرشتہ خدا کی وحی لے کر آسمان سے تمہارے پاس آرہا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ لوگ تم سے وحی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وحی خدا کے حکم سے ہے اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے (بنی اسرائیل ۸۵)

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ مکہ کے لوگ پیغمبر اسلام کے دعویٰ رسالت پر براہِ راست دلیل مانگ رہے تھے۔ مگر قرآن نے یہ جواب دیا کہ تم اس معاملہ کو بالواسطہ دلیل یا استنباطی دلیل کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہو۔ کیونکہ تم اپنی محدودیت کی وجہ سے اس معاملہ میں براہ راست دلیل کا تحمل نہیں کر سکتے۔

یہ معاملہ اسی طرح متنازعہ صورت میں تاریخ میں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹ ویں صدی میں سائنسی ذرائع کی دریافت کے بعد جدید مفکرین نے مزید یقین کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ ہمیں کسی معاملہ میں بالواسطہ یا استنباطی استدلال پر قانع رہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جدید ذرائع کی مدد سے تمام امور پر براہ راست دلیل قائم کر سکتے ہیں۔

مگر بیسویں صدی کی تحقیقات نے آخری طور پر قرآن کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی ذہنی محدودیت فیصلہ کن طور پر اس راہ میں حائل ہے کہ وہ کسی بھی حقیقت پر

براہ راست دلیل قائم کر سکے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں متفقہ طور پر مان لیا گیا کہ بالواسطہ یا استنباطی استدلال عین معقول استدلال (valid arguments) ہے، بشرطیکہ وہ ثابت شدہ مشاہدات پر مبنی ہو اور تمام متعلق مشاہدات کی زیادہ بہتر توجیہہ کرتا ہو۔

مثال کے طور پر نظریۂ ارتقاء (Evolution theory) کو اسی بنا پر سائنس دانوں کے درمیان عمومی قبولیت (general acceptance) کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ حتی کہ کچھ لوگوں نے اس کو ثابت شدہ حقیقت (proved fact) کہنا شروع کر دیا۔ حالانکہ ارتقاء کا نظریہ اتنے لمبے ماضی سے تعلق رکھتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے عمل کا براہ راست مشاہدہ کیا جا سکے یا اس پر براہِ راست دلیل قائم کی جائے۔ ارتقاء کا نظریہ تمام تر ایک استنباطی نظریہ ہے نہ کہ براہ راست مشاہدہ میں آنے والا نظریہ۔

نظریۂ ارتقاء کیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کا فارمولا چند لفظوں میں یہ ہے ــــــ دوبارہ پیدائش، فرق اور فرق کا باقی رہنا :

Reproduction, Variation and Differential survival

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حیوان کے یہاں توالد وتناسل سے بچے پیدا ہوئے۔ ان میں باہم فرق تھا۔ مثلاً کوئی چھوٹا تھا کوئی بڑا۔ بڑے بچے توالد وتناسل کے عمل کے تحت دوبارہ تھوڑا تھوڑا بڑے ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ بکری کا بچہ لمبی مدت تک فرق جمع ہونے کے نتیجہ میں زرافہ بن گیا۔ ارتقاء پسند عالم ایک طرف بکری کے ڈھانچہ کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف زرافہ کے ڈھانچہ کو، اور پھر وہ فرض کر لیتا ہے کہ ان دونوں کے بیچ میں اور بہت سی نسلیں ہیں جو ان دونوں کو جوڑتی ہیں۔ گویا وہ دو چیزوں کی موجودگی سے تیسری چیز کی موجودگی کا قیاس کرتا ہے۔

اس سے قطع نظر کہ یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، منطقی اعتبار سے یہ استدلال سراسر استنباطی استدلال ہے۔ اسی طرح کے استنباطی استدلالات پر ان تمام نظریات کی بنیاد قائم ہے جن کو موجودہ زمانے میں سائنٹفک نظریات کہا جاتا ہے۔

سائنس کے حلقے میں جتنے بھی نظریات قائم کیے گئے ہیں وہ سب اسی طرح بالواسطہ استدلال پر مبنی ہیں۔ یہ نظریات اس وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک کوئی نیا مشاہدہ سابقہ توجیہہ یا

استنباط کو مشتبہ ثابت نہ کر دے۔

اسلامی عقائد پر منطقی استدلال کی نوعیت بھی عین یہی ہے۔ اگر کائناتی مشاہدات اسلامی عقائد کی تائید کرتے ہوں اور ان مشاہدات سے جائز طور پر ان کا استنباط ہو رہا ہو تو وہ عین جدید سائنسی منطق کے مطابق درست اور قابل تسلیم قرار پائیں گے۔ صرف اس بنا پر ان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ استنباطی استدلال پر مبنی ہیں۔ ایسا کرنے کے بعد صرف اسلامی عقائد ہی رد نہیں ہوں گے بلکہ خود سائنس کا پورا قلعہ بھی مکمل طور پر منہدم ہو جائے گا۔

قرآن میں ۱۴۰۰ سال پہلے یہ کہا گیا تھا کہ انسان کو صرف علم قلیل (بنی اسرائیل ۸۵) دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں خالص سائنسی تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسانی ذہن کی کچھ ناگزیر محدودیتیں (limitations) ہیں اور ان محدودیتوں کی وجہ سے انسان کے لیے صرف محدود علم تک پہنچنا ممکن ہے۔ چنانچہ جدید سائنسی منطق کا یہ کہنا ہے کہ ہم اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ صرف قرینہ (probability) تک پہنچ سکتے ہیں۔ قرینے سے آگے ہمارے علم کی رسائی ممکن نہیں۔

جدید سائنس کا یہ موقف اسلام کی اس عقلیت کو برحق ثابت کرتا ہے جس کو ثانوی عقلیت کہا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر سائنس کا موقف اور اسلام کا موقف دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ سائنس کا موقف جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں یہ ہے کہ ہم ایک مفروضہ قائم کریں اور ممکن تجربات اور مشاہدات پر ان کو جانچیں۔ اگر ہمارے تجربات اور مشاہدات اس مفروضہ کی تصدیق کریں تو ہمیں گمان کرنا چاہیے کہ مفروضہ درست ہے۔

عین یہی موقف اسلامی فلسفہ کا بھی ہے۔ اسلام یہ کرتا ہے کہ وہ وحی کی صورت میں ہمارے سامنے ایک "مفروضہ" رکھ دیتا ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ مشاہدات اور تجربات کی جو بھی معلوم مقدار ہے، اس پر جانچ کر اسے دیکھو۔ اگر معلوم مشاہدات اور تجربات اس سے نہ ٹکرائیں، بلکہ وہ اس کی تصدیق کریں تو یہ اس بات کا قرینہ ہوگا کہ وحی کی صورت میں جو مفروضہ قائم کیا گیا وہ عین درست ہے۔

نیوٹن نے دیکھا کہ سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔ اس سے اس نے یہ نظریہ یا مفروضہ قائم کیا کہ زمین میں کھینچنے کی طاقت ہے۔ اس واقعہ میں سیب کا گرنا ایک مشہود واقعہ ہے، مگر زمین کی قوت کشش ایک غیبی واقعہ۔ اس واقعہ میں سائنس داں نے ایک غیبی واقعہ کو صرف اس لیے مان لیا کہ

ایک مشہود واقعہ اس کی موجودگی کا قرینہ پیش کر رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس نے "گر نے" کو دیکھ کر "گرانے والے" کا اقرار کر لیا۔ اصولی طور پر، ٹھیک یہی طریق استدلال قرآن میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن بھی یہی کرتا ہے کہ وہ مشہود حقائق سے غیبی حقائق پر دلیل قائم کرتا ہے۔ وہ واقعہ کی بنیاد پر صاحبِ واقعہ کو ماننے کی دعوت دیتا ہے۔

اس طرز استدلال کی ایک مثال قرآن میں یہ ہے : افعیینا بالخلق الاول بل هم فی لبس من خلق جدید (کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز رہے، بلکہ یہ لوگ از سرِ نو پیدا کرنے کی طرف سے شبہ میں ہیں) ۵۰/۵۱

سورہ ق کی اس آیت میں تخلیق اول سے تخلیق ثانی پر استدلال کیا گیا ہے۔ اس استدلال کی منطق یہ ہے کہ پہلے زندگی بعد موت کا "دعویٰ" پیش کیا گیا۔ اس کے بعد زندگی قبل موت کا مشاہدہ سامنے لایا گیا۔ اور پھر کہا گیا کہ جب پہلی بار بے زندگی سے زندگی کا وجود میں آنا ممکن تھا تو دوسری بار بے زندگی سے زندگی کا وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو گا۔

انسان خود اپنے وجود کی صورت میں اور دوسرے بے شمار انسانوں کی موجودگی کی صورت میں پہلی تخلیق کا تجربہ کر رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ انسان ایک مکمل وجود کے طور پر پہلی بار دنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد وہ مر کر دوبارہ اپنی قبل از پیدائش حالت کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔

گویا کہ انسان حالتِ موت سے حالتِ زندگی میں آیا۔ اور اس کے بعد پھر حالتِ موت میں چلا گیا۔ اب اگر ایک بار حالتِ موت سے حالتِ زندگی میں آنا ممکن تھا تو دوسری بار حالتِ موت سے حالتِ زندگی میں آنا کیوں ناممکن ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی بار زندگی کا ثابت ہونا، دوسری بار زندگی کو اپنے آپ ثابت کر دیتا ہے۔

برٹرینڈ رسل ایک ملحد فلسفی ہے۔ مگر اس نے بالواسطہ طور پر اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اہلِ مذاہب کے دلائل میں کم از کم ایک دلیل ایسی ہے جس کو منطقی دلیل (logical argument) کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظم کے ذریعہ استدلال (argument from design) ہے جس سے خدا کے وجود کو ثابت کیا جاتا ہے، یعنی جب دنیا میں نظم ہے تو لازم ہے کہ اس کا ایک ناظم بھی ہو۔

برٹرینڈرسل نے اگرچہ خود اس دلیل کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ تاہم وہ مانتا ہے کہ اپنی نوعیت (nature) کے اعتبار سے یہ دلیل ایک خالص سائنسی دلیل ہے۔

Bertrand Russell, *Why I am not a Christian,* p. 9

حقیقت یہ ہے کہ اصولی اعتبار سے، قرآن کے استدلال اور سائنس کے استدلال میں کوئی فرق نہیں۔ تمام سائنسی نظریات میں معلوم سے نامعلوم پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔ اسی طرح قرآن میں بھی معلوم سے نامعلوم یا شہود سے غیب پر دلیل قائم کی گئی ہے۔ قرآن کا طریق استدلال بھی اتنا ہی سائنٹفک ہے جتنا علوم مادی کا استدلال۔

اسلامی فلسفہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے خالص سائنٹفک فلسفہ ہے۔ جو لوگ سائنٹفک فلسفہ کو مانتے ہوں، ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اسلامی فلسفہ کی معقولیت (validity) کو پوری طرح تسلیم کر لیں۔ خالص علمی اعتبار سے، اس موقف کے سوا کوئی اور موقف انسان کے لیے درست نہیں۔

قرآنی فلسفہ اور سائنسی فلسفہ میں اصل فرق مقدمات کی ترتیب کا ہے نہ کہ ثانوی عقلیت اور ابتدائی عقلیت کا۔ موجودہ دنیا میں انسان کے لیے عملاً ایک ہی طریق استدلال ممکن ہے، اور قرآن اور سائنس دونوں کا طریق استدلال بنیادی طور پر یہی ہے۔

ایک سفر

مئی ۱۹۹۱ کے آخری ہفتہ میں پٹنہ سے مسٹر ایم ٹی خان نے ٹیلیفون پر بتایا کہ پٹنہ کے الرسالہ ریڈرس فورم کی طرف سے یہ طے کیا گیا ہے کہ شہر میں "الرسالہ سمپوزیم" کے نام سے ایک اجتماع کیا جائے۔ یہ تجویز مجھے پسند آئی۔ میں نے فوراً اس کی تائید کی۔ اس کے بعد چند بار ٹیلیفون پر مزید گفتگو ہوئی آخر کار یہ طے پایا کہ پٹنہ میں ۲۸ جولائی ۱۹۹۱ کو الرسالہ سمپوزیم منعقد کیا جائے۔ پٹنہ کے ساتھیوں کی خواہش پر مزید یہ طے ہوا کہ میں بھی اس میں شرکت کروں۔

۲۶ جولائی ۱۹۹۱ کی شام کو نئی دہلی سے مگدھ اکسپریس کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ اپنے کیبن میں داخل ہوا تو پہلا احساس یہ تھا کہ انڈیا کا فرسٹ کلاس باہر کے ملکوں کے سکنڈ کلاس سے بھی کمتر ہے چھوٹے چھوٹے ملکوں، مثلاً سنگاپور اور کوریا میں آپ جائیں تو ہر طرف آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ آپ ایک ترقی یافتہ ملک میں چل رہے ہیں۔ وہاں کی ہر چیز جدید معیار کے مطابق نظر آئے گی۔ مگر انڈیا میں کوئی بھی چیز جدید معیار ترقی کے مطابق نہیں۔

اسی پسماندگی کی علامت وہ فقرہ تھا جو میرے ٹکٹ کی پشت پر لکھا ہوا تھا۔ وہ ہندی میں یہ تھا کہ ٹکٹ پر انکت پرستھان سمے میں پریورتن ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک تجربہ مجھ کو یہ ہوا کہ مگدھ اکسپریس جاتے ہوئے شاید اتفاقاً وقت پر پٹنہ پہنچ گئی۔ مگر واپسی میں یہی گاڑی دو گھنٹہ لیٹ ہو کر دہلی پہنچی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس قسم کی تاخیر ناقابل برداشت سمجھی جاتی ہے، کیوں کہ وہ قومی دولت کے ضیاع کے ہم معنی ہے۔ مگر جہاں پانے کی تڑپ نہ ہو وہاں کھونے کا احساس بھی اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ میں فرانس تباہ ہو گیا تھا۔ مگر اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ تیز رفتار ٹرین فرانس میں ہے۔ جاپان کی بولیٹ ٹرین کے مقابلہ میں فرانس نے ٹی جی وی ٹرین بنائی ہے۔ ان ٹرینوں کی اوسط رفتار ۲۷۰ سے ۳۰۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ ۱۹۸۱ میں پیرس اور لیونز کے درمیان اس تیز رفتار ٹرین نے ۱۴۰ ملین مسافر منتقل کئے اور ایک بھی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔ فرانس ریلوے نے مسافر کے بغیر نمائش کے طور پر ایک ٹرین پیرس اور تورس کے درمیان چلائی۔ یہ ٹرین ۵۱۵ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چل کر اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ یہ رفتار بعض ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد فرانس یورپ کا ایک کمزور ملک بن گیا تھا۔ اس کی ریلوے یورپ کی سب سے زیادہ ناقص ریلوے تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس نے اپنے اوپر افریقہ کے مقبوضات (الجیریا وغیرہ) کا بوجھ لاد رکھا تھا جن کو وہ فرانس کا حصہ کہتا تھا۔ فرانس کے سابق صدر جنرل ڈیگال نے طے کیا کہ افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا جائے۔ ڈیگال کا یہ فیصلہ فرانس کے قومی وقار کے خلاف تھا۔ لوگوں نے کہا کہ ڈیگال فرانس کو پست اور ذلیل کر دینا چاہتا ہے۔ ڈیگال نے ۱۹۷۰ میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

On the slope that France is climbing, my mission is always to guide her toward the heights, while all the voices from below call on her ceaselessly to come down again.

فرانس اس وقت ڈھلوان پر جا رہا ہے۔ میرا مشن یہ ہے کہ اس کو اوپر اٹھاؤں، جب کہ دوسرے لوگ اس لئے چیخ پکار کر رہے ہیں کہ اس کو دوبارہ نیچے کی طرف دھکیل دیں (ٹائم میگزین ۱۵ جولائی ۱۹۹۱)

ڈیگال نے اپنی نامقبولیت کا خطرہ مول لے کر افریقہ کے مقبوضات کو آزاد کر دیا۔ اس کے فوراً بعد فرانس ترقی کرنے لگا۔ آج فرانس دنیا کا پانچواں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ مستقبل کی ترقی کے لئے حال کی بے ترقی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس قربانی کے بغیر کسی کو ترقی کا اعلیٰ مقام حاصل نہیں مل سکتا۔

ٹرین کے ایک ساتھی سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمارے ملک کے جس پہلو کو دیکھا جائے اس پر پسماندگی کی چھاپ پڑی ہوئی نظر آئے گی۔ اس کا سبب بنیادی طور پر ایک ہے۔ اور وہ ملک کی یہ بدقسمتی ہے کہ ۱۹۴۷ میں جب ملک آزاد ہوا تو اس کی لیڈرشپ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں چلی گئی جو ذہنی طور پر پوری طرح سوشلسٹ تھا۔ سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو آزادی سے پہلے اپنی آپ بیتی میں لکھ چکے تھے کہ ہمارے مسائل کا کوئی بھی حل اشتراکی نظام (Socialist order) کے سوا نہیں ہے، پہلے قومی دائرہ میں، اور پھر ساری دنیا میں، جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے (آٹوبیاگرافی، لندن ۱۹۳۶، صفحہ ۵۲۳) جس اشتراکی نظام نے روس کو برباد کیا، اسی نے انڈیا کو بھی برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

میرے ایک ہم سفر نے ۲۷ جولائی ۱۹۹۱ کا ہندی اخبار "آج" خریدا۔ میں نے دیکھا تو اس کے اندر کے صفحہ پر ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا: پنڈت نہرو بنام من موہن سنگھ۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ موجودہ وزیر مالیات نے کس طرح نہرو کی سابقہ اقتصادی پالیسی کو بدل کر اس کو بالکل دوسرے رخ پر ڈال دیا ہے۔ انڈیا ٹوڈے (۱۵ اگست) نے اس انقلابی واقعہ پر یہ سرخی لگائی ہے کہ لائسنس راج کا خاتمہ (Ending the Licence Raj) ٹائم میگزین (۵ اگست) نے اس کے بارہ میں دو صفحہ کی رپورٹ چھاپی ہے اور اس کی سرخی یہ ہے:

After nearly a half-century of socialist controls, a new government ventures to catch the free-market winds sweeping the world. (p. 22)

کانگرس پارٹی کا ڈائمنڈ جوبلی سیشن جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں ہوا تھا۔ اس موقع پر سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے تالیوں کی گونج میں یہ رزولیوشن منظور کرایا کہ ہندستان میں سوشلسٹ طرز کا سماج (Socialistic pattern of society) بنایا جائے گا

(نیشنل ہیرالڈ ۲ جنوری ۱۹۵۵)

اسی زمانہ میں راقم الحروف نے ۴۸ صفحہ کی ایک کتاب (ہندستان کی منزل) شائع کی تھی۔ اس میں بتایا تھا کہ سوشلزم ہمارے ملک کو تباہ کر دے گا۔ آج یہ الفاظ واقعہ بن چکے ہیں۔ اب موجودہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ اس سوشلسٹ کھنڈر پر ایک نئے ہندستان کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم موجودہ حالات میں اس کی کامیابی کے بارہ میں زیادہ پر امید رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

۱۹۱۷ میں جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو اس نے اتنے طاقت ور انداز میں اس کی فرضی خوبیوں کا پروپگنڈا کیا کہ ساری دنیا میں سوشلزم کا لفظ ترقی پسندی کا نشان بن گیا۔ مگر ۷۵ سال بعد آج ہر شخص سوشلزم کو بربادی کا جیل خانہ سمجھ رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک نظریہ لفظی طور پر انتہائی حسین ہونے کے باوجود عملی طور پر انتہائی حد تک تباہ کن ہو سکتا ہے۔

درمیان میں ایک چھوٹے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ حالاں کہ یہ اس کے رکنے کا اسٹیشن نہ تھا۔ چند منٹ بعد مقابل کی پٹری سے ایک اور ٹرین شور مچاتی ہوئی آئی اور آگے چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ اس دوسری

ٹرین کو گزارنے کے لئے ہماری ٹرین روکی گئی تھی۔ یہی اس دنیا میں سفر کا قاعدہ ہے۔ یہاں ہر گاڑی کو دوسری گاڑی کے لئے راستہ دینا پڑتا ہے۔ جو گاڑی اس "رعایت" کے لئے تیار نہ ہو وہ خود بھی تباہ ہوگی اور دوسری گاڑی کو بھی تباہ کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

یہی اصول انسانی زندگی کا بھی ہے۔ انسانی عمل کی شاہراہ پر بھی بیک وقت بہت سے انسان اپنا اپنا سفر طے کر رہے ہیں۔ یہاں بھی کسی کے لئے محفوظ سفر کی ضمانت صرف یہ ہے کہ جب بھی دوسرے کسی انسان سے ٹکراؤ کا اندیشہ ہو تو وہ فوراً فریق ثانی کی رعایت کے مذکورہ اصول پر عمل کرتے ہوئے اس کو گزرنے کا راستہ دیدے۔ جو آدمی ایسا نہ کرے وہ کبھی اپنی مطلوبہ منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔

گاڑی الٰہ آباد پہنچی تو ۲۰ جولائی کی صبح نمودار ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے چاروں طرف تاریکی کا غلاف پڑا ہوا تھا۔ اب چاروں طرف روشنی کی بہار نظر آنے لگی۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا جو اللہ تعالیٰ نے بنائی اور پھر اس کو انسان کی تحویل میں دے دیا۔ کوئی ہے جو اللہ کا شکر ادا کرے۔

ایک صاحب نے کہا کہ خدا نے ہم کو پیدا کرکے ہم کو جنت دوزخ کے جھنجھٹ میں کیوں ڈالا۔ اس نے ہم کو پیدا ہی نہ کیا ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اوپر اللہ کے بے شمار احسانات ہیں اور سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کے لئے ابدی جنت کے حصول کے امکانات کھول دئے۔ اللہ نے انسان کو غیر موجود سے موجود کیا۔ اس کو حیرت انگیز صلاحیتیں عطا کیں۔ اور پھر اس کو احساسِ لذت دیا جو ساری کائنات میں انتہائی نادر چیز ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس نے ایک ابدی لذت گاہ (جنت) پیدا کی۔ اللہ نے اس ابدی لذت گاہ کی ایک انتہائی وقتی قیمت مقرر کی۔ اس نے کہا کہ جو شخص موجودہ دنیا کی مختصر مدت میں حالتِ غیب میں خدا کا اعتراف کرے گا اور کسی مجبوری کے بغیر خود اپنے اختیار سے اس کے آگے جھک جائے گا، اس کو موت کے بعد اس ابدی لذت گاہ میں بسنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ یہ کتنی بڑی چیز کی کتنی چھوٹی قیمت ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ صدیاں گزر گئیں اور آدمی اس جہانِ لذت کو پانے کا شوق نہ کر سکا۔

آخرت کی اس دنیائے لذت کو پانے کا موقع انسان کو صرف ایک بار ملا ہے۔ اس کے بعد یہ موقع ابدی طور پر ختم ہو جائے گا۔ مگر اس واحد قیمتی موقع کو انسان انتہائی بے دردی کے ساتھ کھو رہا ہے۔ کیسا عجیب ہے وہ انسان جو سب سے بڑی نعمت کے ساتھ سب سے بڑی بے اعتنائی کرے۔

مسٹر مہیش گوپ (Mahesh Gope) میرے ہم سفر تھے۔ ان کا تعلق ائر فورس سے ہے۔ وہ نئی دہلی میں ائر فورس کے ہیڈ کوارٹر میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار وہ ایک نیتا کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ اتفاق سے نیتا صاحب کے کچھ نوٹ گم ہوگئے۔ وہ دوسرے مسافر پر شبہ کرنے لگے۔ مسٹر مہیش گوپ نے تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ خود نیتا جی کی غفلت سے نوٹ پھسل کر سیٹ کے نیچے چلے گئے تھے۔ اور وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی کوئی بات بگڑے تو آپ اپنے آپ کو بلیم دیجئے۔ ہمارے سماج میں ساری خرابی اسی سے آئی ہے کہ آدمی فوراً دوسرے کو بلیم دینے لگتا ہے۔

دلدار نگر اسٹیشن پر گاڑی رکی تو اچانک پلیٹ فارم پر نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر۔ نعرۂ رسالت، محمد رسول اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ ایک صاحب حج کرکے آئے ہیں اور اسی ٹرین سے یہاں اترے ہیں۔ حاجی صاحب کے استقبال کے لئے بہت سے مسلمان پلیٹ فارم پر جمع تھے۔ جیسے ہی حاجی صاحب اپنی بوگی سے باہر آئے، مسلمانوں کے نعروں سے پلیٹ فارم گونج اٹھا۔

میں نے سوچا کہ خدا اور رسول کا نام صحابۂ کرام کے لئے "عمل" کا عنوان تھا، موجودہ مسلمانوں کے لئے وہ "نعرہ" کا عنوان بن گیا ہے۔ یہی وہ اصل خرابی ہے جس کی بنا پر آج یہ حالت ہو رہی ہے کہ دین کے مظاہر تو مسلمانوں کے یہاں خوب ہیں مگر دین کی حقیقت کا ان کے یہاں کوئی وجود نہیں۔

ایک رات اور آدھا دن ٹرین میں گزارنے کے بعد ۷ جولائی کی دوپہر کو پٹنہ پہنچا۔ یہاں میرے جو ساتھی اسٹیشن پر موجود تھے ان میں سے ایک صاحب کالی وردی میں تھے۔ ان کے کوٹ پر ریلوے سروس کا بلا لگا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر ان کے دفتر کے کمرہ میں کچھ وقت گزارنے کے بعد ہم لوگ عدالت گنج کے لئے روانہ ہوئے جہاں مسٹر ایم ٹی خان کے مکان پر مجھے قیام کرنا تھا۔

شام کو ایک صاحب ملنے کے لئے آئے۔ وہ سفید کپڑے میں ملبوس تھے۔ میں ان کو پہچان نہ سکا۔ انھوں نے بتایا کہ میں وہی ہوں جو ریلوے اسٹیشن پر آپ سے ملا تھا۔ لباس کے فرق کی بنا پر ان کو پہچاننے میں مجھے مشکل ہوئی۔ یہ ایک سادہ انسانی تجربہ ہے۔ مگر اسی قسم کے تجربہ کی مضمون بندی کرکے شاعر نے اس سے وحدت وجود کا مسئلہ نکال لیا اور کہا :

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

ایک شخصیت کا مختلف لباس پہننے کے باوجود ایک رہنا بجائے خود ایک واقعہ ہے۔ مگر اس مثال

سے یہ الہیاتی نظریہ اخذ کرنا صحیح نہیں کہ ظاہری پیکر خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، سب کے اندر ایک ہی عظیم ہستی چھپی ہوئی ہے۔

میرا طریقہ ہے کہ جب مجھے کسی مقام کا سفر کرنا ہوتا ہے تو اس مقام کے بارہ میں کتابوں سے معلومات حاصل کرتا ہوں۔ چنانچہ پٹنہ کے بارہ میں مختلف کتابیں دیکھیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں پٹنہ کے بارہ میں ایک صفحہ کا مضمون ہے۔ اس کے لکھنے والے پروفیسر بیج ناتھ پوری ہیں۔

یہ شہر ۴۸۷ ق م میں پاٹلی پتر کے نام سے آباد کیا گیا۔ پھر وہ پاٹن بنا اور آخر میں پٹنہ ہو گیا۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ پٹنہ کی تاریخ کے بارہ میں ساتویں صدی سے لے کر ۱۵۴۱ تک کچھ معلوم نہیں ہے، جب کہ افغان حکمران شیر شاہ سوری نے پٹنہ کے نام سے دوبارہ اس کی بنیاد ڈالی:

Nothing is known of its history from the 7th century untill 1541, when it was refounded as Patna by the Afghan ruler Sher Shah. (13/1076)

شیر شاہ سوری نے تقریباً نو سو سال بعد پٹنہ کو از سر نو آباد کیا۔ مگر اس نے اس شہر کا نام شیر آباد نہیں رکھا بلکہ پٹنہ رکھا۔ لیکن بعد کو اورنگ زیب (وفات ۱۷۰۷) آیا تو اس نے پٹنہ کا نام اپنے پوتے عظیم کے نام پر عظیم آباد رکھ دیا۔ حالاں کہ اس کے بعد ۱۷۶۵ میں یہ شہر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں جاکر دوبارہ پٹنہ بن جانے والا تھا۔ اور خود شہزادہ عظیم کے لئے مقدر تھا کہ وہ تاریخ کے اندھیرے میں گم ہو کر رہ جائے۔

پٹنہ میں شہری اعتبار سے جو کچھ میں نے دیکھا اس کی نمائندگی ریٹائرڈ لیفٹننٹ جنرل ایس کے سنہا کے ایک مضمون سے ہوتی ہے۔ یہ مضمون ٹائمس آف انڈیا کے پٹنہ اڈیشن (۲۸ جولائی ۱۹۹۱) میں چھپا تھا۔ اور اس کا عنوان تھا ـــــ پٹنہ نراشا کا شہر:

Patna: Tne City of Despair

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ موجودہ صدی کے نصف اول میں پٹنہ کی آبادی تقریباً ایک لاکھ تھی۔ اب اس کی آبادی ایک ملین سے اوپر ہے۔ اسی نسبت سے انتظامی سروسوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ مگر ورک کلچر (work culture) پیدا نہ ہونے کی بنا پر شہر گندگی، اور بدعنوانی کا اڈہ بنا ہوا ہے۔

پٹنہ کی سڑکوں پر ٹریفک جام ہونا ایک معمول کا واقعہ بن چکا ہے۔ سڑکوں پر گندگی شاید ملک کے تمام شہروں سے زیادہ ہے۔ اس قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے مضمون نگار نے لکھا تھا کہ پہلے یہ حال تھا کہ

گایوں اور بھینسوں کو سڑکوں پر پھرنے اور گندگی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر اب حالات مختلف ہیں۔ آج مذہبی اور سیاسی اسباب سے ہم گایوں اور بھینسوں کو سڑکوں پر گھومنے سے نہیں روک سکتے:

Today for religious and political reasons we may not object to cows and buffaloes having the run of the city.

شہری انتظام اور تمدنی امور کو سائنسی تحقیقات کے تابع ہونا چاہئے نہ کہ مذہبی عقائد کے تابع۔ جب بھی ان چیزوں کو مذہبی عقیدہ کے تابع کیا جائے گا، انسانی دنیا میں وہی خرابیاں پیدا ہوں گی جس کا ایک چھوٹا سا نقشہ اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔

روز نامہ قومی آواز دہلی، لکھنؤ اور پٹنہ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ۹ جولائی ۱۹۹۱ میں صفحہ اول پر ایک تصویر ہے جس میں ایک امتحان کا منظر دکھایا گیا ہے۔ طلبہ کی نصف تعداد میز پر ہے اور بقیہ نصف زمین پر بیٹھی ہوئی نقل کرنے میں مصروف ہے۔ پاس ہی دو پولیس مین اور چند نگراں کھڑے ہوئے ہیں۔ تصویر کے نیچے یہ الفاظ درج ہیں: بدھ کو پٹنہ کے ایک مقامی مرکز پر امتحان کے دوران انٹر کے طلبہ پولیس اور نگراں کی موجودگی میں کھلے عام نقل کرتے ہوئے (تصویر: یو این آئی)

امتحان میں نقل کرنے کا مرض بہت سی دوسری ریاستوں میں بھی ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ بہار میں یہ رواج سب سے زیادہ ہے۔ ہندستان میں بیشتر لوگ پڑھتے نہیں، اور جو لوگ پڑھتے ہیں وہ نقل کرکے امتحان پاس کرنا چاہتے ہیں۔ اس بد مذاقی نے علم کا معیار اتنا زیادہ گرا دیا ہے کہ اب پڑھے ہوئے اور بغیر پڑھے ہوئے انسان میں بہت زیادہ فرق باقی نہیں رہا۔

۳۰ جولائی ۱۹۹۱ کو بہار ودھان سبھا نے ایک عجیب قسم کا بل پاس کیا۔ اس کا نام ہے ——
Bihar Bhoodan Yagya (Amendment) Bill 1991) اس قانون کا تعلق اس پندرہ لاکھ ایکڑ زمین سے ہے جس کو اچاریہ ونوبا بھاوے (۱۸۹۵ - ۱۹۸۲) نے لوگوں سے دان (عطیہ) کے طور پر حاصل کیا تھا۔ ابتدائی قانون میں اچاریہ ونوبا بھاوے کا نام شامل تھا مگر موجودہ ترمیمی قانون میں کسی "ٹکنکل" سبب سے ان کا نام حذف کر دیا گیا ہے۔

میں نے بہار کے بارہ میں مختلف اخباروں میں نہایت سخت رپورٹیں پڑھیں۔ بہار میں کرپشن اپنی انتہا پر ہے۔ مجرمین سیاسی لیڈر بنے ہوئے ہیں۔ پوری ریاست فنکشننگ انارکی کا منظر پیش

کررہی ہے۔ ریاستی حکومت کے لئے زیادہ ضروری تھا کہ وہ ریاست سے بدعنوانی کو حذف کرے، ایک کاغذی دستاویز سے دنو با بھاوے کا نام حذف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

بہار میں لوک سبھا کی ۵۴ سیٹیں ہیں۔ ان میں سے بیشتر سیٹیں جنتا دل اور اس کے اتحادیوں کو ملی ہیں (جنتا دل کی ۲۸ سیٹ ہے) اس بار لوک سبھا کے دسویں الکشن میں کانگرس کو بہار میں صرف ایک سیٹ مل سکی۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ یہاں کے مسلمانوں نے بڑے پیمانہ پر جنتا دل کو ووٹ دیا۔

ایک سیاسی مبصر جی ایس راج ہنس کا آرٹیکل ہندستان ٹائمس (۲۲ جولائی ۱۹۹۱) میں چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے —— بہار میں کانگرس کا اتنا برا حال کیوں ہوا :

(Why Congress did so badly in Bihar)

اس آرٹیکل میں کانگرس کی ہار کا ایک سبب یہ بتایا تھا کہ جنتا دل کے لیڈر اور چیف منسٹر لالو پرشاد یادو نے بڑی چالاکی سے مسلم کارڈ کھیلا۔ انھوں نے ایل کے اڈوانی کی رتھ یاترا بہار میں روک دی اس سے پہلے کہ وہ یوپی میں داخل ہو۔ اس طرح انھوں نے سارے ملک میں مسلمانوں کی احسان مندی حاصل کرلی۔ اس کے بدلے میں بہار کے مسلمان ایک طرف سے لالو پرساد اور ان کی پارٹی کی طرف چلے گئے جب کہ الکشن کا اعلان ہوا :

> Mr Laloo Prasad Yadav played the Muslim card very deftly. He stopped Mr Advani's Rath Yatra in Bihar before it could enter UP and thus earned the gratitude of the Muslims all over the country. In turn, the Muslims of Bihar went all out for Mr Laloo Prasad Yadav and his party when the elections were announced.

رتھ یاترا کے روکنے یا نہ روکنے کا کچھ بھی تعلق مسلمانوں کے حقیقی مسائل سے نہیں ہے۔ یہ تمام تر صرف ایک جذباتی مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "مسلم کارڈ" کا تصور ہی مسلمانوں کی بے شعوری کی زمین پر پیدا ہوا ہے۔ اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمان اگر اس معاملہ میں حساس ہو جائیں کہ ہمیں صد فی صد تعلیم یافتہ بننا ہے۔ ہم کو جدید صنعتوں میں آگے بڑھنا ہے۔ ہمیں اپنی ایک اعلیٰ صحافت پیدا کرنا ہے۔ اگر مسلمانوں کی حساسیت اس طرح کے امور میں ہو تو لیڈروں کے لئے یہ امکان ہی ختم ہو جائے گا کہ وہ الکشن کے موقع پر کوئی شعبدہ دکھا کر مسلم کارڈ کا کھیل کھیلیں۔ مسلم کارڈ صرف اس وقت ممکن

ہوتا ہے جب کہ قوم ظاہر فریب الفاظ پر خوش ہوتی ہو۔ حقیقی اور واقعی عمل پر خوش ہونے والے کبھی کسی کے ہاتھ میں اس قسم کا کارڈ نہیں بنتے۔

۲۷ جولائی کی شام کو پٹنہ کے اردو لائبریری ہال میں پریس کانفرنس ہوئی۔ اردو، ہندی، انگریزی اخبارات کے نمائندے موجود تھے۔ میں نے اپنے ابتدائی خطاب میں کہا کہ ہمارا مشن فکری بیداری (intellectual awakening) ہے۔ انڈیا ۱۹۴۷ میں آزاد ہو گیا۔ مگر تقریباً پچاس سال کے بعد بھی وہ اب تک ایک ترقی یافتہ ملک نہ بن سکا۔ یہاں کے مسائل گھٹنے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ سیاسی آزادی تو حاصل کر لی گئی مگر افراد کے اندر تعمیر شعور کا کام بالکل نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں مختلف تفصیلات دیتے ہوئے میں نے کہا کہ ذہنی تعمیر کا کام مسلسل اور متواتر عمل چاہتا ہے۔ مگر اس نوعیت کی کوئی کوشش ہمارے یہاں ابھر نہ سکی۔ اخبارات یہ کام کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے اخبارات کا یہ حال ہے کہ تمام اخبارات کے اوپر سیاست جیسے موضوعات چھائے رہتے ہیں، تعمیری موضوعات کے لئے ان کے یہاں کوئی کالم نہیں۔

میرے ابتدائی خطاب کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہا۔ بابری مسجد سے متعلق سوال کے سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس کا حل میرے نزدیک وہی ہے جس کو میں نے نہ صرف اپنے میگزین میں شائع کیا ہے بلکہ مشترکہ میٹنگوں میں پیش کیا ہے اور ہندستان ٹائمس وغیرہ میں بھی اس کو شائع کرایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مورخین کے ایک بورڈ کو بطور ثالث مقرر کیا جائے اور وہ جو فیصلہ کریں اس کو دونوں فریق بلا بحث مان لیں۔

اگلے دن صبح کو مقامی اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات میں اس پریس کانفرنس کی رپورٹ شائع ہوئی۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۸ جولائی) نے اپنی رپورٹ کی سرخی میں بورڈ والی تجویز کو نمایاں کیا اور ان الفاظ میں اس کی سرخی قائم کی:

(Historians should resolve Ayodhya issue)

ہندستان ٹائمس (۲۸ جولائی) نے دوسری باتوں کے علاوہ اس تنقید کا بھی ذکر کیا جس کی زد خود اس کے اپنے اوپر بھی پڑتی تھی۔ اس نے لکھا کہ مولانا نے اخباروں سے اپیل کی کہ وہ انسانی دلچسپی کے واقعات کو نمایاں کریں اور ان کو نصیحت کی کہ وہ صرف سیاست میں گم ہو کر نہ رہ جائیں:

The Maulana called upon the media to highlight human-interest stories and exhorted it not to remain obsessed only with politics

۲۸ جولائی کو ڈاکٹر عبد الحیٔ کمرشیل کامپلکس میں درس قرآن کا پروگرام تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جدید طرز پر ایک وسیع بلڈنگ بنائی ہے جو کئی منزلہ ہے۔ اس کی تیسری منزل پر ایک خوبصورت مسجد ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ عمل ایک نمونہ ہے جو بہت سے دوسرے لوگوں کے لئے قابل تقلید ہے۔ فارسی شاعر نے کہا تھا:

در عمارت گری گنبد اسلاف خود اند　　　خانۂ شرع خراب است کہ ارباب صلاح

مگر ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب نے اپنا گنبد بنانے کے ساتھ خانۂ شرع بنانے کی نہایت عمدہ مثال قائم کی ہے۔ اس مسجد میں ہفتہ وار درس کا باقاعدہ نظام قائم ہے۔ میں نے اپنے درس میں قرآن کی اہمیت اور عظمت پر کچھ باتیں عرض کیں۔ اس کا ٹیپ ان لوگوں کے پاس موجود ہے۔ دوسرے تمام پروگراموں کا بھی ٹیپ لیا جاتا رہا۔

۲۸ جولائی کی شام کو ایک پروگرام سنہا انسٹی ٹیوٹ (اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز) میں رکھا گیا تھا۔ یہ اجتماع ڈاکٹر ڈی ڈی گرو کی صدارت میں ہوا۔ اس کا عنوان تھا: اسلام اور بقاء باہم (Islam and co-existence) اجتماع میں تقریباً ۵۰ فیصد ہندو اور ۵۰ فیصد مسلمان تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انسانوں کے درمیان پر امن باہمی بقا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ ان کے پاس عمل کے لئے پر امن طریق کار ہو۔ اس کے بعد میں نے بتایا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام قوموں میں اپنے عمل کے لئے صرف متشددانہ طریقہ (وائلنٹ میتھڈ) کا رواج تھا۔ پیغمبر اسلام نے تاریخ میں پہلی بار غیر متشددانہ طریقہ (نان وائلنٹ میتھڈ) لوگوں کے سامنے پیش کیا اور اس پر عمل کر کے دکھایا کہ پر تشدد طریق کار کے مقابلہ میں بے تشدد طریق کار زیادہ مفید اور زیادہ کارآمد ہے۔ اس سلسلہ میں سیرت کی بہت سی مثالیں پیش کیں۔ آخر میں سوال وجواب ہوا اور صدر کی اختتامی تقریر پر کارروائی ختم ہوئی۔

۲۸ جولائی کی شام کو ڈاکٹر عبد الحیٔ کمرشیل کامپلکس کے ہال میں دوبارہ ایک پروگرام ہوا۔

اس کا عنوان تھا "اسلام اور عصری چیلنج"۔ مسٹر ایل دیال آئی اے ایس (سابق چیف سکریٹری) نے صدارت کی۔ اور جناب محمد شفیع قریشی گورنر بہار نے خصوصی مہمان کے طور پر شرکت کی۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ جدید سائنس اور جدید علوم کی بنیاد پر اسلام کے لئے جو فکری چیلنج پیدا ہوا وہ اسلام کے لئے کوئی مخالف انقلاب نہ تھا بلکہ ایک مددگار انقلاب تھا۔ مگر جس طرح برسات کے ساتھ کیچڑ آتی ہے۔ اسی طرح اس مفید انقلاب کے ساتھ کچھ ناخوش گوار باتیں بھی شامل تھیں۔ مگر مسلم دانشور اور رہنما اس کے ناخوش گوار پہلوؤں میں الجھ کر رہ گئے، وہ اس کے مفید پہلو کو اسلام کے حق میں استعمال نہ کر سکے۔ مختلف مثالوں کے ذریعہ اس کو واضح کیا۔

۲۹ جولائی کی صبح کو ایوب گرلز کالج میں خواتین اور طالبات سے خطاب کا پروگرام تھا۔ اس کا عنوان تھا "اسلام اور خواتین" میں نے سادہ انداز میں بتایا کہ اسلام نے عورت کو کتنا زیادہ عزت اور احترام کا مقام دیا ہے۔ اور یہ کہ اسلام کے دائرہ میں رہ کر عورت انتہائی بڑے بڑے کام کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے حضرت ہاجرہ کی مثال تفصیل کے ساتھ پیش کی اور کہا کہ کسی شخص کا یہ قول سب سے زیادہ جس خاتون پر صادق آتا ہے وہ حضرت ہاجرہ ہیں:

There is a woman at the beginning of all great things.

ایوب گرلز کالج کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس کے منتظمین کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ وہ لوگ غریب خاندان کی لڑکیوں کو خصوصی طور پر اپنے یہاں داخلہ دیتے ہیں اور ان کی ہر طرح مدد کرتے ہیں تاکہ وہ تعلیم یافتہ ہو کر اپنے خاندان کے معیار کو بلند کر سکیں۔ چنانچہ اس کالج میں تقریباً ۵۰ فیصد طالبات غریب خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

پٹنہ میں مجموعی طور پر چھ تقریری پروگرام ہوئے۔ ہر پروگرام میں امید سے زیادہ تعلیم یافتہ افراد نے شرکت کی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ پٹنہ میں الرسالہ کی دعوت اللہ کے فضل سے کافی پھیل چکی ہے۔ قومی اشو اور "اسلام خطرہ میں" جیسے نعروں پر بھیڑ جمع کرنا بہت آسان ہے۔ مگر راقم الحروف کے پروگراموں میں جو لوگ جمع ہوئے وہ الرسالہ کے تعمیری مشن کے نام پر جمع ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ مشن کی آواز اب لوگوں کے درمیان بذات خود ایک موثر اور قابل لحاظ آواز بن چکی ہے۔

مسٹر ایم ٹی خان (کنوینر) نے کہا کہ ۱۹۸۶ میں جب ہم لوگوں نے آپ کو پٹنہ بلایا تھا، وہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے ہم نے کئی سبق لئے۔ چنانچہ موجودہ سفر میں ہم نے تین نئے پروگرام رکھے۔ ایک پریس کانفرنس۔ دوسرے غیر قارئین الرسالہ سے اپروچ کرنا، مسلم اور غیر مسلم دونوں سے۔ ہم نے انھیں ہندی، انگریزی اور اردو الرسالہ دے کر آبزرور کی حیثیت سے سمپوزیم میں آنے کی دعوت دی۔ تیسرا پروگرام عورتوں میں خطاب کا انتظام تھا۔ دعوت نامہ کو بھی انھوں نے تعارف کے طور پر استعمال کیا۔ چنانچہ اس موقع پر جو دعوت نامہ چھاپا گیا اس کی پشت پر الرسالہ مشن کے سات اہم نکات لکھے ہوئے تھے۔ ایک یہ تھا:

One's faith in religion should be the outcome of a self-conscious enquiry. Such faith would be reasoned not conditioned, insighted not inherited, rational not traditional.

مذکورہ اجتماعات میں کچھ سوالات کیے گئے جن کا جواب دیا گیا۔ میری قیام گاہ پر بھی پٹنہ اور پٹنہ کے باہر کے افراد برابر آتے رہے۔ ان سے سوال وجواب کی صورت میں گفتگو جاری رہی۔ ان سب کو سمپوزیم کے سوال وجواب کے ساتھ یکجا طور پر درج کیا جارہا ہے۔

تاہم خواہ سوال وجواب کا معاملہ ہو یا تقریر کا معاملہ، ان کی کامیابی کے لئے سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ سامع ایک تیار ذہن (prepared mind) کی حیثیت رکھتا ہو۔ اگر سامع کا ذہن تیار نہ ہو تو بولنے والے اور سننے والے کے درمیان ایک فکری بعد (intellectual gap) پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جہاں فکری بُعد پایا جائے وہاں کسی کو کچھ سمجھانا انتہائی مشکل ہے (لقمان ۷)

مثلاً اگر کوئی شخص فزکل نفسیات میں جی رہا ہو تو تواضع کی بات اس کے لئے قابل فہم نہیں ہوسکتی۔ کوئی شخص ظلم کی اصطلاحوں میں سوچنے کا عادی بن گیا ہو تو چیلنج کی اصطلاح میں سوچنا اس کے لئے سخت دشوار ہوگا۔ کوئی شخص اپنے بڑوں کو تنقید سے بالاتر سمجھ لے تو وہ اس پر راضی نہیں ہوسکتا کہ اپنے بڑوں کے کسی اقدام کو غلط ٹھہرائے۔ جہاں متکلم اور سامع کے درمیان اس قسم کا فرق ہو وہاں متکلم کی بات سامع کے لئے اجنبی بن جائے گی۔ اس کے لئے متکلم کی بات کو سمجھنا اسی طرح ناممکن ہو جائے گا جس طرح ایک اردو داں کے لئے روسی یا جاپانی کلام کو سمجھنا۔

نئی دہلی کے ایک ادارہ (Citizens' Drive) کے تحت یکم جون ۱۹۹۱ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک راؤنڈ ٹیبل میٹنگ ہوئی۔ اس کا موضوع بحث تھا:

Growing cult of violence in Indian politics.

صدر اسلامی مرکز کو اس اجتماع میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ وہ اس میں شریک ہوئے اور مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔

۲ بعض مقامات پر الرسالہ کے قارئین نے ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ یعنی "الرسالہ سمپوزیم" منعقد کرنا۔ ضرورت ہے کہ اس انداز پر ہر جگہ سمپوزیم کئے جائیں۔ ان میں موافق اور مخالف ہر ایک کو بولنے کا موقع دیا جائے اور الرسالہ کے پیغام کے ہر پہلو پر کھلا اظہار خیال کیا جائے۔ آخر میں حلقۂ الرسالہ کا کوئی ذمہ دار شخص اپنی آخری تقریر میں اپنی رائے دے اور بحث کی تکمیل کرے۔

۳ ڈاکٹر انوار الحق صاحب (اعظم گڈھ) کئی سال سے الرسالہ اور اس کی مطبوعات کو ایک مہم کے طور پر اپنے علاقہ میں پھیلا رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے حلقہ میں پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان اب الرسالہ کی آواز ہی سب سے زیادہ طاقت ور آواز بن رہی ہے اور مخالفین اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں محسوس کرنے لگے ہیں۔

۴ ایک صاحب لکھتے ہیں: آپ کے خلاف جو ساڑھے تین سو صفحہ کی کتاب چھپی ہے اس کا میں نے بغور مطالعہ کیا۔ بہت افسوس ہوا کہ مصنف نے آپ کے خلاف نہایت نازیبا اور نامعقول انداز استعمال کیا ہے۔ ان کے اعتراضات محض برائے اعتراض ہیں۔ افسوس ہے کہ انھوں نے تخریب اور انتشار کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کی مقبولیت اور آپ کے دائرہ کی مسلسل وسعت ان سے برداشت نہیں ہو پائی ہے۔ مجھ جیسے آدمی نے بھی یہ سمجھ لیا کہ جگہ جگہ انھوں نے اعتراض کرنے میں کیسی شدید غلطی کی ہے۔ سچ یہ ہے کہ الرسالہ اور آپ کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کرکے ہماری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ اسلام اور دین الٰہی کیا ہے۔ آج ہماری نماز، ہمارا روزہ، ہماری زکوٰۃ اور تلاوت قرآن وغیرہ بالکل مختلف ہے۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ شاید یہی وہ طریقہ ہے جو بارگاہ رب العالمین میں پسندیدہ ہوگا (اقبال احمد، مرادآباد)

۶ محمد نعیم صاحب (گنگاپور، راجستھان) الرسالہ ہندی اور الرسالہ اردو کی ایجنسی چلاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ جن لوگوں کو الرسالہ دیتے ہیں ان میں سے ایک سیتارام آریہ بھی ہیں۔ وہ ہندی روزنامہ "پرجاجن" کے ایڈیٹر ہیں۔ اور الرسالہ ہندی بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے بعض مضامین اپنے اخبار میں نقل کرتے ہیں۔

۷ اسلامی مرکز کے تحت جو مختلف دعوتی اور تعمیری کام ہو رہے ہیں، ان کو جاری رکھنے کے لئے نیز اس میں اضافہ اور ترقی کے لئے ضرورت ہے کہ لوگوں کا مالی تعاون ہمیں حاصل رہے۔ خاص طور پر الرسالہ کی مد میں آپ کا تعاون بے حد ضروری ہے۔ تاکہ اس کی قیمت میں اضافہ کئے بغیر اس کو جاری رکھا جاسکے۔

۸ محمد مطلوب صاحب (رامپور) الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے الرسالہ کے پیغام کو عملی تجربہ میں نہایت مفید پایا ہے۔ جب جب میں نے الرسالہ کی تعلیم کے مطابق مثبت انداز اختیار کیا تو مجھے زبردست فائدہ ملا۔ اور جب کبھی میں نے منفی طریقہ اختیار کیا تو مجھے نقصان اٹھانا پڑا۔

۹ مولانا سعید صاحب (سورت) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہر ہفتہ جمعہ کی نماز سے پہلے الرسالہ کے مضامین کو سناتے ہیں اور اس کی تشریح کرتے ہیں۔ اس طرح بہت سی مسجدوں کے امام جمعہ کے دن الرسالہ کی باتوں کو اپنی تقریروں میں بیان کرتے ہیں۔

۱۰ خلیج ڈائری (الرسالہ مئی ۱۹۹۱) کو مختلف اخبارات نے قسط وار نقل کیا ہے۔ مثلاً سری نگر کا چٹان (مئی ۱۹۹۱) اسی طرح پاکستان کے روزنامہ وفاق نے اپنے شمارہ ۲۴ اپریل اور ۲۵ اپریل ۱۹۹۱ میں مکمل طور پر نقل کیا ہے۔ وغیرہ۔

۱۱ ایک صاحب لکھتے ہیں: خلیج ڈائری پڑھی۔ اس کا ہر صفحہ عبرت اور نصیحت کا کوہ ہمالہ ہے۔ میں نے بمبئی کے بک اسٹالوں کا سروے کیا: تمام بک اسٹالوں پر الرسالہ ختم ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے پرانے رسالے بک اسٹال پر مل جاتے تھے، اب ہر جگہ الرسالہ ہاتھوں ہاتھ ہدیہ ہو رہا ہے (محمد افضل لاڈی والا، بمبئی)

۱۲ ایک صاحب لکھتے ہیں: "خلیج ڈائری" سات عدد موصول ہوئی۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ میں اپنے جمعہ کے خطبات میں الرسالہ کے اقتباسات برابر سناتا ہوں۔ سامعین الرسالہ

کی باتوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر لوگوں کو بطور مطالعہ بھی دے رہا ہوں
(قاضی محمد ادریسی، شاہ جہاں پور)

۱۳ ایک صاحب لکھتے ہیں : میں تقریباً چار سال سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کے تمام مضامین ٹو دی پوائنٹ اور دل کو چھونے والے ہوتے ہیں۔ جب سے میں نے الرسالہ پڑھنا شروع کیا ہے تب سے میری زندگی میں ایک انقلاب سا آگیا ہے۔ میرا ذہن صاف اور میرا نظریہ بہتر ہونے لگا ہے۔ آپ کی کتاب "راہ عمل" دیکھی۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آپ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ مسلمانوں کو دوسروں سے شکایت کرنے کے بجائے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی طرف دھیان دینا چاہئے۔ مجھے ہر مہینہ الرسالہ (اردو، انگریزی) کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ (نثار احمد خاں کشمیری، بمبئی)

۱۴ مسٹر ششی ٹنڈن (آگرہ) لکھتے ہیں : دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی غرض سے بہت سے جرائد و رسائل ملک میں نکل رہے ہیں۔ لیکن الرسالہ کا اپنا منفرد مقام ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کر چکے ہیں، لہٰذا آپ کا مشاہدہ و مطالعہ بہت وسیع ہے۔ جون کے شمارہ میں "قومی مسئلہ" کے عنوان سے آپ نے ملک کے مختلف حصوں میں چل رہی علیٰحدگی پسند پر تشدد تحریکوں پر قلم اٹھایا۔ آپ نے بیباک انداز میں حقیقت کو قارئین کے سامنے رکھ دیا۔ الرسالہ کے ذریعہ مذہب اسلام کے متعلق جس قدر معلوم ہوا اتنا شاید دوسرے رسائل و جرائد سے ممکن نہیں ہے۔ الرسالہ کی تحریروں سے اسلام کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔ اسے مجھ جیسے غیر مسلم حضرات بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ آپ کی تحریریں جذبات کے بجائے حقیقت کو قارئین کے سامنے لاتی ہیں۔ ان سے اسلام کو صحیح تناظر میں سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ الرسالہ اسلام کے سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوا ہے۔

۱۵ الرسالہ کے مضامین کو لوگ مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بنگلور کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے لوگوں نے انگریزی الرسالہ میں پڑھا :

A thousand mile journey starts with the first step.

اس کو انھوں نے ہاتھ سے یا کمپیوٹر سے لکھ کر اپنے دروازوں پر لگا دیا اور دوسروں تک پھیلایا۔

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

- الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔
- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔
- کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	۶۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ 〃 〃	۱۸ 〃 〃
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ 〃 〃	۲۵ 〃 〃
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ 〃 〃	۴۰ 〃 〃
خصوصی تعاون (سالانہ)	۳۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ 〃	— —

مطبع و ناشر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

نومبر ۱۹۹۱ ، شمارہ ۱۸۰

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013, India
Telephone: 611128, 697333 Telex: 031-61755 PSBLIN ATT IC
Fax: 91-11-[illegible]
Annual Subscription: Inland Rs. [illegible] Abroad US $ [illegible] (Air Mail)

مخلصانہ ایمان

عن زید بن أرقم رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من قال لا اله إلا الله مخلصا دخل الجنة۔ قیل وما اخلاصها۔ قال أن تحجزه عن محارم الله (الترغیب والترہیب)

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہے وہ جنّت میں جائے گا۔ کہا گیا کہ اس کا اخلاص کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ کہ یہ کلمہ اس کو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے روک دے۔

اخلاص اسی کیفیت کے لیے ایک دینی لفظ ہے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں سنجیدگی کہا جاتا ہے۔ جو آدمی اس حقیقت کو جان لے کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور وہ فی الواقع پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کا اقرار کرے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی زندگی اور اس کے قول وعمل میں اس کا اظہار ہونے لگے گا۔ سنجیدہ قول اور اس کے عملی اختیار میں کوئی فرق نہیں۔

ایک شخص جب یہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، تو وہ حقیقۃً اپنی اس دریافت کو بیان کرتا ہے کہ اس کائنات میں ساری عظمتیں صرف ایک اللہ کو حاصل ہیں۔ اللہ کو اس کی تمام شان عظمت کے ساتھ جان لینے کے بعد آدمی کے اندر جو کیفیت ابھرتی ہے اسی کا نام اخلاص ہے۔

آدمی جب اللہ کو اس کے جلال وکمال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ اپنے عجز اور اپنے احتیاج کو بھی دریافت کر لیتا ہے۔ یہ دریافت اس کے اندر عبدیت کا جذبہ ابھارتی ہے۔ وہ خدا کی نعمتوں کو جان کر شکر وسپاس کی کیفیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد خدا کے سامنے حاضری کا تصور اس کو اپنے قول وعمل کے بارہ میں آخری حد تک چوکنّا بنا دیتا ہے۔ ان کیفیات کے مجموعہ کا نام اخلاص ہے، اور ان کے زیر اثر جو انسان بنتا ہے اسی کا نام مخلص انسان ہے۔

اس نوعیت کا اخلاص جب کسی آدمی کے اندر پیدا ہو تو اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرے، وہ خدا کی منع کی ہوئی چیزوں کو اپنے لیے حلال کر لے۔

ایک سچے انسان کے لیے قول اور عمل میں کوئی فرق نہیں۔ جو شخص سچے دل سے اللہ کی معبودیت کا اقرار کرے گا، اس کے بعد ناممکن ہے کہ اس کا عمل اس کے اقرار کے تابع نہ ہو جائے۔

اسلامی مشورہ

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ لو (وشاورھم فی الامر، آل عمران ۱۵۹) دوسری جگہ عام مسلمانوں کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنا کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں (وامرھم شوری بینھم، الشوری ۳۸)

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ لوگوں سے مشورہ کرتا ہو (ما رأیت رجلاً اکثر استشاراً للرجال من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، التفسیر المظہری) اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ صحابہ کے بارہ میں بتاتے ہیں کہ میں نے کسی کو اصحاب رسول سے زیادہ مشورہ کرنے والا نہیں پایا (ما رأیت احداً اکثر مشاورۃ من اصحاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، تفسیر الکشاف)

حسن بصریؒ کا قول ہے کہ جب بھی کوئی گروہ مشورہ سے کام کرتا ہے تو وہ ضرور صحیح ترین رائے تک پہنچ جاتا ہے (ما شاور قوم قط الاّ ھُدُوا لارشد امورھم، صفوۃ التفاسیر)

مشورہ کا مطلب یہ ہے کہ مختلف لوگوں کی معلومات اور ان کے تجربات کو حاصل کیا جائے اور پھر ان کی روشنی میں زیر بحث معاملہ کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر مشورہ دینے والے سنجیدہ ہوں، اور مشورہ لینے والے حق پسند ہوں تو مشورہ اتنا مفید ثابت ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مفید کوئی چیز نہیں۔ مشورہ امکانی نقصانات سے بچنے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہے۔

مشورہ دینے والے کو چاہیے کہ جو کچھ بولے سوچ کر بولے، اور اپنی رائے پر کبھی اصرار نہ کرے۔ مشورہ لینے والے کو چاہیے کہ وہ کسی بات کو وقار کا مسئلہ نہ بنائے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف بات کہے تب بھی اس کا خالی الذہن ہو کر سنے۔ حتی کہ کوئی شخص سخت انداز میں تنقید کرے، تب بھی اس کے الفاظ یا لہجہ کی سختی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی اصل رائے پر غور کرے۔

اگر مشورہ دینے والے اور مشورہ لینے والے دونوں مشورہ کے ان آداب کو سمجھیں اور ان کو پوری طرح ملحوظ رکھیں تو ہر مشورہ لازمی طور پر مفید ثابت ہوگا اور صحیح فیصلہ تک پہنچانے والا بن جائے گا، فرد یا ادارہ کے معاملہ میں بھی اور پوری قوم کے معاملہ میں بھی۔

مشورہ ایک اسلامی طریقہ ہے۔ مشورہ کامیابیوں کا زینہ ہے۔

سادہ پہچان

ن انس بن مالك ، عن النبی صلی اللہ
لیہ وسلم قال : لا یُؤمنُ احدکم
تی یُحِبَّ لاخیہِ ما یُحبُّ لِنفسہِ
رواہ البخاری ومسلم)

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

ایک مسلمان کو دوسرے انسانوں کے لیے کیسا ہونا چاہیے، اس حدیث میں اس کی نہایت سادہ پہچان ائی گئی ہے۔ وہ پہچان یہ ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لیے بھی وہی پسند کرنے لگے جو وہ خود اپنے لیے سند کرتا ہے۔

کسی آدمی کے ساتھ بدزبانی کی جائے تو اس کو برا لگے گا اور اگر اس کے ساتھ نرم بول بولے جائیں تو ں کو اچھا معلوم ہوگا۔ اسی ذاتی تجربہ کے مطابق وہ دوسروں پر بھی عمل کرے۔ وہ دوسروں کے ساتھ تلخ امی نہ کرے، وہ ہمیشہ ان کے ساتھ نرم انداز میں بات کرے۔

کسی کو اس کا جائز حق نہ دیا جائے تو وہ اس کو سخت ناپسند کرے گا۔ آدمی یہی معاملہ دوسروں کے اتھ کرنے لگے۔ اس کے اوپر دوسروں کا جو حق ہے اس کو وہ ادا کرے، وہ دوسروں کی حق تلفی سے ری حد تک اپنے آپ کو بچائے۔

کسی کے ساتھ وعدہ کیا جائے اور پھر اس کو پورا نہ کیا جائے تو اس کو بے حد تکلیف پہنچے گی۔ آدمی ں سے دوسروں کے بارہ میں سبق لے لے۔ وہ کسی سے وعدہ کرے تو ضرور اس کو پورا کرے، وہ کسی کے اتھ وعدہ خلافی کا سلوک نہ کرے۔

کسی کو نقصان پہنچایا جائے تو اس کو فوراً غصہ آجاتا ہے۔ اس ذاتی تجربہ سے وہ دوسروں کے رہ میں جان لے۔ وہ کبھی دوسروں کو نقصان پہنچنے نہ دے، وہ ہمیشہ یہ کوشش کرے کہ اس کی ات دوسروں کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔

مومن ایک حساس انسان ہوتا ہے۔ اس کی حساسیت اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ دوسروں کے ق میں ویسا ہی بنے جیسا وہ دوسروں کو اپنے حق میں دیکھنا چاہتا ہے۔

الرسالہ نومبر ۱۹۹۱

دو طریقے

عن عبدِ اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : لا یؤمنُ اَحَدُکم حتی یکونَ ھواہُ تَبَعاً لِما جئتُ بہ (مشکاۃ المصابیح ۱/۵۹)

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اس کی خواہش اس چیز کے تابع ہو جائے جو میں لایا ہوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں عمل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے ھویٰ (اپنی خواہش) پر عمل کرنا، اور دوسرا ہے ماجاء بہ الرسول (پیغمبر کے لائے ہوئے دین) پر عمل کرنا۔

آپ کے سامنے ایک حق آیا۔ آپ کے دل نے گواہی دی کہ یہ حق ہے۔ مگر اسی کے ساتھ شعوری یا غیر شعوری طور پر، یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر میں اس حق کا اعتراف کر لوں تو میرا درجہ نیچا ہو جائے گا۔ اب اگر آپ نے حق کو مان لیا تو آپ نے ماجاء بہ الرسول پر عمل کیا اور اگر آپ نے حق کا انکار کیا تو آپ نے اپنی ھویٰ کی پیروی کی۔

ایک شخص نے آپ کے اوپر تنقید کی۔ اس سے آپ کی انا کو چوٹ لگی۔ آپ برہم ہو گئے۔ اسی کے ساتھ رسولؐ کی لائی ہوئی شریعت کا یہ حکم آپ کے سامنے آیا کہ متکبر نہ بنو بلکہ متواضع بن کر لوگوں کے درمیان رہو۔ اب اگر آپ نے تنقید کے جواب میں تواضع کا انداز اختیار کیا تو آپ نے ماجاء بہ الرسول پر عمل کیا اور اگر آپ نے تنقید کے جواب میں گھمنڈ کا انداز اختیار کیا تو آپ نے ھویٰ کی پیروی کی۔

ایک شخص کے کسی رویہ سے آپ کو شکایت پیدا ہوئی۔ آپ مشتعل ہو گئے۔ اس وقت آپ کے سامنے شریعت کا یہ حکم آیا کہ لوگ اشتعال انگیزی کریں تب بھی تم صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ اب اگر آپ نے اشتعال کے باوجود صبر کیا تو آپ نے ماجاء بہ الرسول پر عمل کیا۔ اور اگر آپ مشتعل ہو کر فریق ثانی سے لڑنے لگے تو آپ نے ھویٰ کی پیروی کی۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ ہر معاملہ جو آدمی کے ساتھ پیش آتا ہے، اس میں اس کے لیے دو میں سے ایک رویہ اختیار کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ ایک رویہ اختیار کرنے کے بعد وہ خدا کے یہاں مومن لکھ دیا جاتا ہے اور دوسرا رویہ اختیار کرنے کے بعد غیر مومن۔

انوکھی صفت

قرآن میں نہایت تفصیل کے ساتھ جنت کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ان سب کا خلاصہ اس مختصر آیت میں ہے کہ جنت میں وہ تمام چیزیں ہوں گی جن کو آدمی کا جی چاہے گا اور جن سے اس کی آنکھوں کو لذت حاصل ہوگی (وفیہا ما تشتہیہ الانفس وتلذ الاعین) الزخرف ۷۱

انسان ساری معلوم کائنات میں ایک انوکھی مخلوق ہے جو لذت پسند ہے ، جو لذت کا ادراک کر سکتا ہے ۔ اس عجیب انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ عجیب تر امکان کھولا کہ اس کے لیے اعلیٰ ترین لذتوں سے بھری ہوئی ایک جنت بنا دی جہاں وہ ابدی طور پر رہ سکے ۔

لذت (pleasure) کی تخلیق بلاشبہ خالق کا ایک حیرت ناک تخلیقی کرشمہ ہے ۔ ایک انجینئر خدا کی دی ہوئی عقل اور خدا کی دی ہوئی چیزوں کو کام میں لا کر مشینی انسان (robot) بناتا ہے ۔ وہ سارے انسانی کام کرتا ہے ۔ مگر کسی مشینی انسان کے اندر احساسِ لذت نہیں ۔ کوئی مشین کسی بھی چیز سے محظوظ ہونا نہیں جانتی ۔ یہ صرف انسان ہے جو لذت کا ادراک کرتا ہے ۔ جو اپنی پسندیدہ چیزوں سے محظوظ ہو سکتا ہے ۔

لذت سے مراد کوئی محدود چیز نہیں ۔ یہ ایک نہایت وسیع بلکہ لامحدود معنویت رکھنے والا لفظ ہے ۔ انسان صرف کھانے پینے جیسی لذتوں ہی سے محظوظ نہیں ہوتا بلکہ ہر معیاری چیز میں اس کے لیے لذت ہے ۔ مثلاً ایک کمپیوٹر سو ہزار سوال کا نہایت صحیح جواب دے گا ۔ لیکن وہ اپنے اس فعل پر خوش ہونا نہیں جانتا ۔ مگر انسان جب ایک نفیس کام کرتا ہے ۔ جب وہ ایک مسئلہ کا نہایت عمدہ جواب دیتا ہے تو اس کی روح کو بے پناہ خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ یہی دوسرے تمام افعال کا معاملہ ہے ۔

جنت میں ہر چیز اپنے آخری معیارِ کمال پر ہوگی ۔ جنت میں جو آدمی داخل کیا جائے گا وہ بھی کامل شخصیت میں ڈھال کر داخل کیا جائے گا ۔ اس لیے جنت کا ہر فعل انتہائی حد تک پُر لذت بن جائے گا ۔ وہاں بولنا ، چھونا ، دیکھنا ، سننا ، اٹھنا ، بیٹھنا اور چلنا پھرنا ہر فعل اپنے اندر لذتوں کا لامحدود سامان لیے ہوئے ہوگا ۔

فہرستِ آرزو

کلیری سمپسن (Cleary Simpson) امریکہ کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ مختلف قسم کے وقتی جاب کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تمناؤں کے مطابق، ان کو امریکہ کے ٹائم میگزین میں اپنی پسند کا کام مل گیا۔ اس وقت وہ ٹائم کے نیویارک کے دفتر میں ڈائرکٹر (Advertising Sales Director) ہیں۔

ٹائم کے شمارہ ۵ اگست ۱۹۹۱ (صفحہ ۴) میں مذکورہ خاتون کا ہنستا ہوا پُر ابتہاج فوٹو چھپا ہے۔ وہ اس عہدہ کے ملنے پر انتہائی خوش ہیں۔ تصویر کے نیچے ان کا پُرمسرت تاثر ان لفظوں میں درج ہے ـــــ ٹائم کے لیے کام کرنا ہمیشہ سے میری فہرست آرزو پر تھا :

Working for *Time* was always on my wish list.

ہر آدمی کسی چیز کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے۔ وہ اس کی تمنا میں جیتا ہے۔ وہ اس کا خواب دیکھتا ہے۔ اس کے صبح و شام اس کی یادوں میں گزرتے ہیں۔ وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب وہ دن آئے جب کہ وہ اپنی اس محبوب چیز کو پالے۔ یہ چیز اس کی فہرستِ آرزو میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ درج ہوتی ہے۔ موجودہ دنیا میں کوئی بھی ایسا آدمی نہیں جس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز اس طرح مرکز تمنا بنی ہوئی نہ ہو۔

مومن وہ ہے جس نے جنّت کو اپنی فہرستِ آرزو (وِش لسٹ) میں لکھ رکھا ہو۔ ابدی اور معیاری نعمتوں کی وہ دنیا جہاں وہ اپنے رب کو دیکھے گا۔ جہاں سچے انسانوں سے اس کی ملاقات ہوگی۔ جہاں وہ خدا کی رحمتوں کے سایہ میں زندگی گزارے گا۔ وہ دنیا جو لغو اور تاثیم سے پاک ہوگی۔ جہاں صخب اور نصب کو ختم کر دیا جائے گا۔ جس کا ماحول چاروں طرف حمد اور سلامتی سے بھرا ہوا ہوگا۔ جہاں خوف اور حزن کو حذف کیا جا چکا ہوگا۔ جہاں ایسی آزادی ہوگی جس پر کوئی قید نہیں۔ جہاں ایسی لذتیں ہوں گی جن کے ساتھ محدودیت شامل نہیں۔

جب کسی شخص پر زندگی کی حقیقت کھلتی ہے تو وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ اس کے لیے سب سے بڑی چیز جنّت ہے۔ وہ جنّت کا حریص بن جاتا ہے۔ اور جنّت اسی کے لیے ہے جو حرص کے درجہ میں جنّت کا طلبگار بن گیا ہو۔

ایک اور آواز

جب ایک انسان بول رہا ہو اور آپ اس کی بات سن رہے ہوں تو یہ کوئی سادہ واقعہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک انتہائی انوکھا واقعہ ہوتا ہے جو ہماری زمین پر پیش آتا ہے۔ ایک شخص کا بولنا اور دوسرے شخص کا سننا اپنے اندر اتنی زیادہ نشانیاں رکھتا ہے کہ آدمی اگر اس پر سوچے تو وہ حیرت کے سمندر میں غرق ہو جائے۔

ایسا عجیب واقعہ کیوں ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے تاکہ انسان ایک عظیم تر حقیقت کو محسوس کر سکے۔ وہ انسانی کلام کے ذریعہ خدائی کلام کو اپنے تصور میں لائے۔

جس طرح ایک انسان بولتا ہے اور آپ سنتے ہیں۔ اسی طرح خدا بھی بول رہا ہے۔ وہ بھی انسانوں سے ہم کلام ہے۔ جو شخص انسان کی بات سنے مگر وہ خدا کی بات نہ سنے وہ بہرا ہے۔ آدمی کو کان اس لیے دیئے گئے تھے کہ وہ خدا کی بات سننے والا بنے۔ مگر اس کا حال یہ ہوا کہ انسانوں کی بات اس کو سنائی دی، مگر خدا کی بات اس کو سنائی نہ دی۔ ایسا شخص یقیناً بہرا ہے، اس کے بہرا ہونے میں کوئی شک نہیں۔ خواہ بظاہر وہ کان والا کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

انسان کی ہر چیز خدا کے لیے ہے۔ اس کو کان اس لیے دیئے گئے تھے کہ وہ خدا کی بات سنے۔ کان کے اندر دوسری آوازوں کو سننے کی صلاحیت صرف اس لیے دی گئی تھی کہ اس کو قریبی تجربہ سے معلوم ہو جائے کہ وہ "سننے" کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر جو چیز صرف ابتدائی تجربہ کے لیے تھی۔ اسی کو اس نے آخری تجربہ سمجھ لیا۔ وہ راستہ میں اٹک کر رہ گیا، وہ اصل منزل تک نہیں پہونچا۔

انسان کی بات کو سننا اور خدا کی بات کو نہ سننا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص پھل کا چھلکا کھائے اور اس کا مغز پھینک دے۔ وہ دئے کی روشنی کو روشنی سمجھے، مگر سورج کی روشنی کا روشنی ہونا اس کے لیے لامعلوم بنا رہے۔

ایسا آدمی بلاشبہ اندھا ہے، خواہ اس کے سر پر دو آنکھیں موجود ہوں۔ خواہ دنیا کے رجسٹر میں اس کا نام دیکھنے والوں کی فہرست میں لکھا ہوا ہو۔

ایک نصیحت

بنجمن فرینکلن (Benjamin Franklin) ایک امریکی مفکر تھا۔ وہ ۱۷۰۶ میں پیدا ہوا، اور ۱۷۹۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک قول ہے کہ ——— نکاح سے پہلے اپنی آنکھیں خوب کھلی رکھو، مگر نکاح کے بعد اپنی آدھی آنکھ بند کرلو :

Keep your eyes wide open before marriage, half shut afterwards

یعنی نکاح کرنے سے پہلے اپنے جوڑے کے بارہ میں پوری معلومات حاصل کرو۔ مگر جب نکاح ہو جائے تو اجمال پر اکتفا کرو۔ اسی بات کو کسی نے سادہ طور پر ان لفظوں میں کہا کہ نکاح سے پہلے جانچو، اور نکاح کے بعد نبھاؤ۔

کوئی مرد یا عورت پرفکٹ نہیں۔ کوئی بھی کامل یا معیاری نہیں۔ اس لیے رشتہ سے پہلے تحقیق تو ضرور کرنا چاہیے۔ مگر رشتہ کے بعد یہ کرنا چاہیے کہ اپنے رفیق حیات کی خوبیوں کو دیکھا جائے، اور کمیوں سے صرف نظر کرلیا جائے۔

معیار کا حصول موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔ مزید یہ کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ جس چیز کو ایک فریق معیاری سمجھے وہ دوسرے فریق کے نزدیک بھی معیاری ہو۔ اس بنا پر خواہ کوئی کتنا ہی زیادہ صحیح ہو وہ دوسرے کو آخری حد تک مطمئن نہیں کر سکے گا، دونوں فریق کو ایک دوسرے کے اندر کچھ نہ کچھ کوتاہیاں نظر آئیں گی۔

اب ایک شکل یہ ہے کہ دوسرے فریق کی کوتاہی سے لڑکر اس سے علٰحدگی اختیار کرلی جائے، مگر مشکل یہ ہے کہ ایک تعلق کی علٰحدگی کے بعد دوسرا تعلق جو قائم کیا جائے گا۔ اس میں بھی جلد ہی وہی یا کوئی دوسری خامی ظاہر ہو جائے گی، اور اگر دوسرے رشتہ کو ختم کرکے تیسرا یا چوتھا کیا جائے تو اس میں بھی۔ ایسی حالت میں موافقت کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ ہر مرد یا عورت میں خوبی بھی ہوتی ہے اور کوتاہی بھی۔ ضرورت ہے کہ خوبی کو دیکھا جائے اور کوتاہی کو برداشت کیا جائے۔ عملی طور پر یہی ایک ممکن طریقہ ہے۔ اس کے سوا اور کوئی طریقہ اس دنیا میں قابل عمل نہیں۔

دانش کے بغیر

سسرو (Cicero) ۱۰۶ قبل مسیح میں اٹلی میں پیدا ہوا، ۴۳ ق م میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ رومی دور کا مشہور عالم اور مفکر اور خطیب شخص سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ایک فوج کی قیمت میدان جنگ میں صرف اس وقت ہے جب کہ میدان جنگ کے پیچھے بہت سے دانش مند مشیر موجود ہوں:

An army is of little value in the field unless
there are wise councels at home.

یہ ایک بے حد اہم حقیقت ہے۔ فوج یا ہتھیار کی حیثیت طاقت کی ہے۔ طاقت سے مطلوب فائدہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو دماغ کی رہنمائی میں استعمال کیا جائے۔ جس طاقت کو استعمال کرنے کے لیے دماغ کی صلاحیت موجود نہ ہو، وہ طاقت صرف تخریب برپا کرے گی، ایسی طاقت کبھی تعمیری نتائج ظاہر نہیں کر سکتی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان اس تاریخی حقیقت کی بدترین مثال ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے بار بار اپنی ہتھیار بند فوج بنائی ہے اور بار بار مفروضہ دشمنوں کے ساتھ ٹکراؤ کیا ہے۔ مگر ہر بار صرف ایک ہی نتیجہ سامنے آیا، اور وہ تخریب تھا، موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے متشددانہ اقدامات نے تخریب اور بربادی کی تاریخ تو ضرور بنائی ہے، مگر ان کا کوئی ایک اقدام بھی ایسا نہیں جس نے حقیقی معنوں میں مسلمانوں کے لیے یا وسیع انسانیت کے لیے تعمیر اور فلاح کی تاریخ بنائی ہو۔ اور اس کی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے فوج تو کسی نہ کسی طرح بنالی مگر اس کی رہنمائی کے لیے دانش مند ذہن انھیں حاصل نہ ہو سکا۔

متشددانہ کارروائی نفرت کے جذبہ کے تحت کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس مجاہدانہ کارروائی کا سرچشمہ محبت ہوتا ہے۔ مجاہد سب سے پہلے اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے، اس کے بعد وہ دوسرے کے خلاف اقدام کرنے کے لیے اٹھتا ہے۔ موجودہ مسلمان نفرت کے جذبہ کے تحت اٹھے، اس لیے ان کی یہ کارروائیاں نفسانی عمل کے خانہ میں جاتی ہیں نہ کہ مجاہدانہ عمل کے خانہ میں۔ اگر وہ اپنی ان کارروائیوں کو جہاد کہیں تو یہ غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہوگا۔ اس طرح وہ خدا کی نظر میں بھی مجرم ٹھہریں گے اور بندوں کی نظر میں بھی۔

محنت کا کرشمہ

اختر حسین غازی خاں ۱۹۲۶ میں غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۷ سے وہ دہلی میں ہیں۔ وہ دہلی آئے تو اپنی معمولی تعلیم کی بنا پر وہ یہاں کوئی اچھا کام نہ پا سکے۔ سالہا سال تک ان کا یہ حال تھا کہ معمولی کاموں کے ذریعہ وہ کچھ پیسہ حاصل کرتے اور اس سے بالکل سادہ قسم کی زندگی گزارتے۔ اکثر ان کا اور ان کے بیوی بچوں کا کھانا چٹنی اور چاول یا چٹنی اور دال ہوتا تھا۔ مگر آج وہ نئی دہلی کے ایک فلیٹ میں رہتے ہیں۔ ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے : 387899

۱۹۷۰ میں وہ ایک مسجد کے حجرہ میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے چھ لڑکے ہو چکے تھے مگر حال یہ تھا کہ ان بچوں کے لیے نہ رہنے کا کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ کھانے پینے کا۔ ایک بار مہینوں تک چٹنی اور چاول اور وہ بھی آدھا پیٹ کھانا پڑا۔ ان کی بیوی گھبرا اٹھیں۔ انھوں نے کہا کہ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم کہیں سے زہر لے آؤ۔ ہم سب لوگ زہر کھا کر اپنا قصہ ختم کریں۔

بیوی کی اس بات نے اختر حسین صاحب کو تڑپا دیا۔ انھوں نے سوچا کہ میرا یہ حال اس لیے ہے کہ میں نے علم حاصل نہیں کیا۔ اور اگر میرے بچے بھی علم سے محروم رہے تو ان کا بھی وہی حال ہوگا جو میرا ہے۔ ان کو وہ شعر یاد آیا جو انھوں نے اسماعیل میرٹھی کی کتاب میں پڑھا تھا:

جہاں تک دیکھئے تعلیم کی فرماں روائی ہے   جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

انھوں نے طے کیا کہ میں بچوں کو زہر نہیں دوں گا بلکہ انھیں تعلیم دلاؤں گا۔ اب ان کے اندر ایک نیا جذبۂ عمل جاگ اٹھا۔ حالات کے دباؤ نے انھیں ہیرو بنا دیا۔ وہ روزانہ ۱۶ - ۱۶ گھنٹے تک کام کرنے لگے۔ وہ رات دن پیسہ کمانے کے لیے دوڑتے رہتے تاکہ اپنے بچوں کو پڑھا سکیں۔ ۲۶ جون ۱۹۹۱ کی ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ برسوں تک میرا یہ حال رہا کہ میں دہلی کی سڑکوں پر دیوانوں کی طرح دوڑتا رہتا تھا تاکہ محنت کر کے اتنا پیسہ حاصل کروں جو میرے بچوں کی تعلیم کے لیے کافی ہو۔

جن حالات نے اختر حسین صاحب کو ہیرو بنا دیا تھا ان حالات نے ان کے بچوں کو بھی سراپا محنت بنا دیا۔ ان کا ہر بچہ انتہائی لگن کے ساتھ پڑھنے لگا۔ ہر بچہ اپنے کلاس میں فرسٹ آنے لگا۔ یہ جدوجہد تقریباً بیس سال تک جاری رہی۔ آج ان کا ہر بچہ اعلیٰ ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔

حکمت کی بات

کانگرس کے صدر نرسمہا راؤ (P.V. Narasimha Rao) کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (یکم جون ۱۹۹۱) میں چھپا ہے۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ہندستانی سماج مختلف قومیتوں کا مشترک سماج ہے۔ اور اس سماج کے ہر جزء کو آزادی اور برابری کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ہندستان میں رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ مل جل کر رہا جائے:

We have a plural society and all segments of the society should exist in freedom and equality. The only way to exist in India is to co-exist.

یہ نہایت صحیح اور درست بات ہے۔ مگر اس کا تعلق صرف ہندستانی سماج سے نہیں ہے، بلکہ دنیا کے ہر سماج سے ہے۔ یہی طریقہ پاکستان اور افغانستان کے لیے بھی صحیح ہے اور یہی طریقہ یورپ اور امریکہ کے لیے بھی۔ چاہے ایک خاندان کا معاملہ ہو یا پوری زمین کا معاملہ، اس دنیا میں زندہ رہنے کی یہی واحد صورت ہے کہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہوئے زندگی گزاری جائے۔ اگر برداشت اور رواداری (ٹالرنس) کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو اس زمین پر نہ ایک خاندان بن سکتا اور نہ ایک ملک۔

اس دنیا میں اختلاف کا موجود ہونا اتنا ہی فطری ہے جتنا خود انسان کا موجود ہونا۔ جہاں انسان ہوں گے وہاں اختلاف ہوگا، خواہ یہ انسان ایک مذہب اور کلچر کے ہوں یا کئی مذہب اور کلچر کے۔ ایسی حالت میں انسان کو دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہے۔ یا تو وہ اختلاف کو برداشت کرے یا اختلاف کو برداشت نہ کرکے دوسروں سے ہمیشہ لڑتا جھگڑتا رہے۔

ہمارے لیے انتخاب کا موقع اختلاف اور بے اختلافی میں نہیں ہے۔ بلکہ اختلاف کو برداشت کرنے یا اختلاف کو برداشت نہ کرکے مرجانے میں ہے۔ اگر ہم زندگی چاہتے ہیں تو وہ صرف اختلاف کو برداشت کرنے ہی میں مل سکتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا جو امکان ہے وہ لڑ کر اپنے کو برباد کر لینے کا ہے۔ اس کے سوا کسی تیسرے انتخاب کا ہمارے لیے موقع نہیں۔

انذارِ آخرت

سرونسٹن چرچل نے ۱۹۵۴ میں جنگ کے خلاف چیتاونی دیتے ہوئے کہا تھا کہ آج ساری دنیا جہنم کے کنارے پر گھوم رہی ہے :

The world is roaming around the brim of hell.

چرچل کے سامنے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ تھا۔ انھوں نے اپنے انتباہ میں "جہنم" کا لفظ مجازی طور پر استعمال کیا تھا۔ مگر ایک باخبر مومن اور داعی کے لیے یہ مجاز نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ پوری دنیا ایک بھڑکتی ہوئی جہنم کے کنارہ کھڑی ہے۔ ہر آن یہ خطرہ ہے کہ کب وہ اس کے اندر گر پڑے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ ٹل سکتا ہے، مگر جہنم کا خطرہ اتنا یقینی ہے کہ اس سے اللہ کے متقی بندوں کے سوا کوئی بھی مامون و محفوظ نہیں۔

تیسری عالمی جنگ کے خطرات سے جو لوگ آگاہ ہیں، وہ اس کو ٹالنے کے لیے رات دن سرگرم عمل ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ جہنم کے شدید تر خطرات سے آگاہ ہیں، ان کو سیکڑوں گنا زیادہ بڑھ کر سرگرم عمل ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ آدمی کو اگر اس کا احساس ہو جائے تو اس کا دن کا سکون اور رات کی نیند اڑ جائے۔ اس کی نفسیات کے اندر ایک ایسا بھونچال آجائے کہ وہ چاہنے لگے کہ کاش میرا ہر بال ایک زبان ہوتا اور میں اپنی ساری قوت کو استعمال کرکے ساری دنیا کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کر دیتا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تصویر قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ آپ لوگوں کو خدا کا مومن بنانے کے لیے اتنا زیادہ بے قرار رہتے تھے گویا کہ آپ اسی غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ (الشعراء ۳)

بخاری و مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی بابت فرماتے ہیں کہ میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر تم کو آگ میں جانے سے روک رہا ہوں اور تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ تم آگ میں گرے جا رہے ہو (مشکاۃ المصابیح ۱/۵۳)

جو مسئلہ جتنا زیادہ بڑا ہو اتنا ہی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے سرگرمی دکھائی جائے۔ مومن کی نظر میں آخرت کا مسئلہ سب سے بڑا ہوتا ہے اس لیے وہ آخرت کے لیے سب سے زیادہ سرگرم ہوتا ہے۔

جزئی مسئلہ

ٹائمس آف انڈیا (۶ جولائی ۱۹۹۱) میں ایک آرٹیکل چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ——
رام راجیہ کا مطلب عورتوں کے لیے کیا ہوگا :

What will Ramrajya mean to female.

اس مضمون میں جو باتیں کہی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ رام راجیہ ہندی دانوں کے شہری حلقہ کا ایک ظاہرہ ہے، اور اس کا دائرہ بھی صرف مرد آبادی تک محدود ہے :

Ramrajya is a Hindi belt urban phenomenon confined to the male population alone. (p.6)

یہ تجزیہ بالکل درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ "رام راجیہ" کی تحریک سارے ہندوؤں کی تحریک نہیں، وہ ہندو قوم کے ایک حصہ کی تحریک ہے۔ اور وہ حصہ بھی اقلیت میں ہے نہ کہ اکثریت میں۔

سورج گرہن، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو، ساری زمین پر اندھیرا نہیں پھیلاتا۔ اور نہ کوئی سورج گرہن ہمیشہ کے لیے باقی رہتا۔ یہی معاملہ انسانی دنیا کا ہے۔ انسانی دنیا میں کوئی برائی، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، وہ کبھی ساری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی۔ انسانیت کا ایک حصہ اگر وقتی طور پر اس کی زد میں آتا ہے تو بقیہ حصہ اس کے اثرات سے بچا رہتا ہے۔ اور جو حصہ بچتا ہے وہ اکثر اوقات زیادہ قیمتی اور زیادہ اہم ہوتا ہے۔

ہندستان میں مسلمانوں کے خلاف چلنے والی تحریکیں ہوں یا دنیا کے دوسرے حصوں میں چلنے والی اس قسم کی تحریکیں، ان سے ہمیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ خود قدرت کا قانون ان کے اوپر چیک لگانے کے لیے ابدی طور پر موجود ہے۔ عین قانون قدرت کے تحت ایسا ہے کہ اپنی ساری تگ و دو کے باوجود ایسی تحریکیں کسی سماج کے صرف ایک جزئی حصہ کو متاثر کر سکتی ہیں۔ سماج کا بڑا حصہ پھر بھی ایسا باقی رہے گا جو ہمارے موافق ہوگا اور جن کو استعمال کرکے ہم اتنا آگے بڑھ سکتے ہیں کہ ناموافق عناصر کی زد سے باہر نکل جائیں۔

ایک آیت

قرآن کی سورہ نمبر ۴۵ میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ خدائے عزیز وحکیم کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اور زمین وآسمان میں پھیلی ہوئی نشانیاں اس کی تصدیق کر رہی ہیں۔ مگر جن لوگوں کے اندر گھمنڈ کا مزاج ہو، وہ اس سے نصیحت لینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے:

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (الجاثیہ ۹)	اور جب اس کو ہماری آیتوں میں سے کسی چیز کا علم ہوتا ہے تو وہ اس کو مذاق بنا لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلت کا عذاب ہے۔

قرآن کی آیتوں میں "چیز" کو پانا اور اس کو لے کر قرآن کا مذاق اڑانا کیا ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن میں بتایا گیا کہ جہنم کے اوپر ۱۹ فرشتے ہوں گے (المدثر ۳۰) یہاں منکرین نے یہ کیا کہ ساری باتوں کو چھوڑ کر صرف "۱۹" کے عدد کو لے لیا اور اس کا مذاق اڑاتے ہوئے ایک پہلوان نے کہا کہ اگر وہ صرف انیس ہیں تو میں اکیلا ہی ان کو گرا دوں گا (ان کانوا تسعۃ عشر فانا القاھم وحدی) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ۱۹/۱۵۹

بے حس اور متکبر لوگ عام طور پر سچائی کو نہ ماننے کے لیے یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ آیات کو چھوڑ کر شئ کو لے لیتے ہیں۔ وہ حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور شوشہ کو لے کر صاحب حق کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں بدترین مجرم ہیں۔

حق کو ماننا ہمیشہ اپنی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ حق کو ماننے کے لیے آدمی کو اپنی رائے بدلنا پڑتا ہے اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی خواہش کو کچلے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑائی کے مقام سے اتارے اور اپنے آپ کو چھوٹا بنانے پر راضی ہو جائے۔ اس جہاد عظیم کے لیے آدمی تیار نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کو منکر حق کہا جائے۔ اس لیے وہ حق کے پیغام میں شوشہ نکال کر اس کا استہزاء کرتا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ جس چیز کو وہ نہیں مان رہا ہے وہ اسی قابل ہے کہ اس کو نہ مانا جائے۔

جو لوگ خدائی صداقت کو رد کریں وہ خود آخرت میں رد کر دیئے جائیں گے۔ اور جن لوگوں کو خدا رد کر دے ان کے لیے بربادی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

لہو حدیث

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (لقمان ۶)

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو ان باتوں کا خریدار بنتا ہے جو غافل کرنے والی ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے گمراہ کرے بغیر کسی علم کے، اور اس کی ہنسی اڑائے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

جب حق کی دعوت اٹھتی ہے تو ایک طبقہ بڑھ کر اس کو قبول کر لیتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر سنجیدگی ہوتی ہے۔ جو نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ جو دنیا کی مصلحتوں میں ٹکے ہوئے نہیں ہوتے۔ حق کا پیغام ان کے لیے ان کے دل کی آواز ثابت ہوتا ہے۔ وہ فوراً اس کو اپنا لیتے ہیں۔ اور اللہ کی توفیق سے اللہ کے مقبول بندوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو کبر کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کا احساس برتری اس میں رکاوٹ بن جاتا ہے کہ وہ حق کے پیغام کو قبول کرے۔ وہ بے پروائی کے ساتھ اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کو یہ بات اپنے مقام سے فروتر نظر آتی ہے کہ وہ ایک ایسے پیغام کو قبول کرے جس کے ساتھ عظمتوں کی روایات شامل نہیں، جس میں اس کو بیٹھنے کے لیے اونچی گدّیاں دکھائی نہیں دیتیں۔

یہ لوگ صرف اس پر بس نہیں کرتے کہ حق کے پیغام کو اختیار نہ کریں۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنی روش کو جائز اور معقول ثابت کریں۔ اس مقصد کے لیے، مذکورہ آیت کے مطابق وہ لہو حدیث کا طریقہ اپناتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ گمراہ کن باتیں پھیلا کر لوگوں کو حق سے متوحش کر دیں۔

لہو حدیث سے مراد وہ گمراہ کرنے والی باتیں ہیں جن کو وہ حق سے ہٹانے کے لیے لوگوں کے درمیان پھیلاتے ہیں ـــــ داعیٔ حق کی اصل بات کا جواب دینے کے بجائے اس کی ذات پر طعنہ زنی کرنا۔ دلائل کے مقابلہ میں عیب جوئی کا طریقہ اختیار کرنا۔ داعی کے پیغام میں شوشے نکال کر اس کو غیر معتبر ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔ داعی کی بات کو غلط شکل میں پیش کر کے اس کو نشانۂ ملامت بنانا۔ حقائق اور بینات کے جواب میں طنز و تضحیک کی مہم چلانا، وغیرہ

یہ تدبیریں اسی طرح بے فائدہ ہیں جس طرح پانی کے سیلاب کو روکنے کے لیے ریت کی دیوار۔

دین فطرت

خورشید بسمل صاحب (پیدائش ۱۹۴۷) سے ۲۲ جون ۱۹۹۱ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ وہ جموں کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے کئی سبق آموز واقعات بتائے۔

انھوں نے بتایا کہ ضلع راجوری میں ایک مقام کالاکوٹ ہے۔ یہاں ایک صاحب راجہ رام شرما ہیں۔ اس وقت وہ محکمۂ تعلیم میں ڈسٹرکٹ پلاننگ افسر ہیں۔ ان کے پاس ایک آدمی ان کی گائے خریدنے کے لیے آیا۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس گائے تو ہے، مگر اس کو حال میں باؤلے کتے نے کاٹ لیا ہے۔ اگر آپ یہ جاننے کے بعد بھی خریدنا چاہیں تو آپ اس کو خرید سکتے ہیں۔

کچھ دنوں بعد پاکستان ٹی وی دیکھتے ہوئے شرما صاحب نے ایک حدیث کا مضمون سنا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ مسلمان وہ ہے جو تجارت کے وقت اپنے سودے کی خرابی سے گاہک کو آگاہ کر دے۔ شرما صاحب کو یہ پروگرام سن کر اپنا گائے کا واقعہ یاد آیا۔ انھوں نے کہا: اس لحاظ سے تو میں بھی مسلمان ہوں۔ یہ حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ، قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُنَبِّهْهُ لَمْ يَزَلْ فِي مَقْتِ اللهِ اَوْ لَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تَلْعَنُهُ۔

(مشکاۃ المصابیح ۲/۸۶۹)

واثلہ بن اسقع کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس آدمی نے عیب دار چیز بیچی اور خریدار کو اس کے عیب سے آگاہ نہیں کیا تو وہ برابر اللہ کی ناراضگی میں رہتا ہے، یا فرشتے برابر اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کوئی اجنبی چیز نہیں۔ اسلام دین فطرت ہے۔ ہر آدمی جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے، اسی کو اسلام الفاظ کی صورت دیدیتا ہے۔ اگر باہمی نفرت اور قومی جھگڑوں کی فضا ختم کر دی جائے اور اسلام کی نمائندگی کرنے کے لیے صرف قرآن اور حدیث لوگوں کے سامنے ہو تو بے شمار آدمی اسلام کو عین اپنے دل کی آواز سمجھیں گے اور اس کو اس طرح اپنا لیں گے جیسے کہ وہ خود ان کی اپنی چیز تھی جو کچھ عرصہ گم رہنے کے بعد دوبارہ انھیں واپس مل گئی۔

دین فطرت اپنے آپ میں ایک طاقت ہے۔ اس کو کسی مزید طاقت کی ضرورت نہیں۔

انسان کدھر

ہندستان کے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی (۱۹۴۴ - ۱۹۹۱) پارلمنٹ کے دسویں الکشن (مئی ۱۹۹۱) کی مہم چلارہے تھے۔ وہ ملک کا طوفانی دورہ کرتے ہوئے ۲۱ مئی ۱۹۹۱ کو اپنے مخصوص ہوائی جہاز کے ذریعہ تامل ناڈو پہونچے۔ وہ ہوائی اڈہ مینم پکم (Meenampakkam) پر اترے۔ یہاں وہ اپنی بلٹ پروف گاڑی میں بیٹھے اور ۳۰ سے زیادہ کاروں کے قافلہ کے ساتھ سری پرم بودور (Sriperumbudur) کے لیے روانہ ہوئے جہاں انھیں ایک الکشن میٹنگ کو خطاب کرنا تھا۔

رات کو ۱۰ بجے وہ پنڈال کے اندر عوام کی طرف سے گلدستے وصول کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک ۲۵ سالہ عورت اپنے دونوں ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ لیے ہوئے راجیو گاندھی کی طرف بڑھی۔ راجیو بھی احساس فتح کے ساتھ اس کی طرف بڑھے۔ کیوں کہ ہر جگہ عوامی استقبال نے انھیں یقین دلایا تھا کہ اس الکشن کے بعد وہ ملک کے وزیر اعظم بننے والے ہیں۔

عورت نے قریب آکر اپنا گلدستہ راجیو گاندھی کی طرف بڑھایا۔ مگر اس عورت کا تعلق خودکشی دستہ (suicide squad) سے تھا اور وہ اپنے جسم پر خطرناک بم باندھے ہوئے تھی۔ راجیو گاندھی نے گلدستہ اپنے ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ بم پھٹ گیا۔ راجیو گاندھی پوری طرح اس کی زد میں آگئے۔ ان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اسی لمحہ ان کی موت واقع ہو گئی۔

بظاہر یہ بم کا دھماکہ تھا، مگر حقیقۃً وہ موت کا دھماکہ تھا جو ہر انسان کے لیے مقدر ہے۔ اس اعتبار سے یہ صرف راجیو گاندھی کی کہانی نہیں بلکہ ہر انسان کی کہانی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہر آدمی کا ہاتھ خوشیوں کے گلدستہ پر ہے۔ مگر اصل حقیقت اس کی امیدوں کے بالکل برعکس ہے ——— جس چیز کو آدمی گلدستہ سمجھ کر وصول کر رہا ہے وہ اس کے لیے ہلاکت کا بم ہے۔

اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن کو موت سے پہلے اپنے رب کی معرفت حاصل ہوئی جنھوں نے اپنی زندگی کو رب کائنات کی اطاعت میں گزارا۔ جن کی موت اس حال میں آئی کہ وہ اپنے پرچۂ امتحان کو کامیابی کے ساتھ حل کر چکے تھے۔

الرسالہ نومبر ۱۹۹۱ ۲۰

تنقید ضروری

دور اول میں جن محدثین نے حدیث کے راویوں کی جانچ کی اور فن رجال بنایا، وہ حدیث کے راویوں پر کھلی تنقید کرتے تھے۔ ان کی تنقید اتنی سخت ہوتی تھی کہ لوگ ان پر غیبت اور کردار کشی کے الزام لگانے لگے۔ مگر انھوں نے اپنی تنقید نہیں چھوڑی۔ ان کی یہ تنقیدیں آج بھی اسماء الرجال کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ محدثین نے اس قسم کی تنقید صرف راویوں کے بارہ میں کی۔ عام انسانوں کے بارہ میں انھوں نے کبھی اس قسم کی تنقید نہیں کی۔

ان بڑے بڑے محدثین نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر شخص جو یہ کہتا تھا کہ "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" وہ گویا ترجمان اسلام ہونے کا دعویٰ کررہا تھا۔ اور جب بھی کوئی شخص ترجمان اسلام یا شارح دین کے مقام سے بولے تو اس کی سخت ترین جانچ کی جائے گی۔ اس معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی مطلق پروانہیں کی جائے گی۔ یہ کام بہرحال کیا جائے گا، خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی پڑے۔ کیونکہ عام انسان صرف ایک انسان ہے، اور راوی عین اپنے دعوے کے مطابق، نمائندۂ اسلام۔

موجودہ پریس کے دور میں بہت سے لوگ ابھرے ہیں جن کو "مفکر اسلام" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ دین کی تفسیر و تشریح کررہے ہیں۔ وہ "اسلام کیا ہے" کا جواب دے رہے ہیں۔ ایسا کوئی شخص باعتبار حیثیت، عین اسی مقام پر آجاتا ہے جس مقام پر قدیم راویانِ حدیث نے اپنے آپ کو کھڑا کیا تھا۔ اس لیے لازم ہے کہ ان کا مکمل جائزہ لیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان کی تشریح دین معتبر ہے یا غیر معتبر۔

قدیم راویانِ حدیث کی جرح میں زیادہ تر ان کی شخصی اہلیت کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ تاکہ یہ واضح ہوسکے کہ وہ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ۔ مگر موجودہ مفکرین اسلام کے سلسلہ میں اس قسم کی شخصی چھان بین کی ضرورت نہیں۔ موجودہ مفکرین کے سلسلہ میں تنقید کا اصل نشانہ ان کے افکار کو بنایا جائے گا، ان لوگوں کے افکار کو قرآن و حدیث پر جانچ کر دیکھا جائے گا کہ وہ دین کے صحیح ترجمان ہیں یا غلط ترجمان۔

جو لوگ اس قسم کی تنقید پر برہم ہوں، وہ اپنی برہمی سے صرف یہ ثابت کررہے ہیں کہ وہ شخصیت پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں، انھیں دین کا مجروح ہونا گوارہ ہے، مگر اپنے اکابر کا مجروح ہونا انھیں گوارہ نہیں۔

کلام کی شرط

عن ابی ھریرۃ، ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: مَن کانَ یؤمنُ باللہِ والیوم الآخر فلیقلْ خیراً أو لیصمُتْ (متفق علیہ)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جوشخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ بہتر بات بولے ورنہ چپ رہے۔

جوشخص اللہ کو اس کے عظمت وجلال کے ساتھ مانے، جس کو یہ یقین ہو کہ قیامت کے دن اللہ اس کے ہر بول پر اس سے بازپرس کرنے والا ہے، وہ اپنی زبان کے بارہ میں آخری حد تک محتاط ہو جاتا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ خدا کے یہاں جائزہ لیے جانے سے پہلے خود اپنا جائزہ لینے لگتا ہے۔

یہ مزاج اس کو اپنا نگراں آپ بنا دیتا ہے۔ اس کی زبان پر خاموشی کا تالا لگ جاتا ہے۔ وہ صرف اس وقت بولتا ہے جب کہ بولنا فی الواقع ضروری ہو گیا ہو، اور جہاں حقیقی ضرورت نہ ہو وہاں وہ چپ رہنا پسند کرتا ہے۔

جوشخص اپنی نفسیات کے اعتبار سے ایسا بن جائے، اس کی زبان جب کھلے گی تو بھلی بات ہی کے لیے کھلے گی۔ لغو یا بے ہودہ بات کے لیے اس کی زبان اس طرح بند ہو جائے گی جیسے اس کے پاس بولنے کے لیے الفاظ ہی نہیں۔

بہتر بات سے مراد وہ بات ہے جس سے کسی خدائی سچائی کا اعلان ہوتا ہو۔ جس میں کسی مظلوم کی حمایت کی گئی ہو۔ جس سے انسانی بھلائی قائم کرنا مقصود ہو۔ جو خیرخواہی اور اصلاح کے جذبہ کے تحت ظاہر ہوئی ہو۔

اس کے برعکس غیر بہتر بات وہ ہے جس کا مقصد اپنے آپ کو نمایاں کرنا ہو۔ جس کے ذریعہ ظالم کی تائید چاہی گئی ہو۔ جو بدخواہی اور ظلم کے جذبہ کے تحت نکلی ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ سویا ہوا فتنہ جاگ اٹھے اور خدا کی زمین میں فساد پھیل جائے۔

اللہ پر اور آخرت پر ایمان آدمی کو سنجیدہ اور ذمہ دار بناتا ہے۔ اور جوشخص حقیقی معنوں میں سنجیدہ اور ذمہ دار ہو جائے اس کا کلام ویسا ہی ہو جائے گا جس کا حدیث میں ذکر ہوا۔

جنگ بے فائدہ

نپولین ۲۳ سال تک یورپی ملکوں سے جنگ لڑتا رہا۔ آخر کار انگلینڈ کے ڈیوک (Duke of Wellington) نے ۱۸ جون ۱۸۱۵ کو واٹرلو جنگ (Battle of Waterloo) میں نپولین بوناپارٹ کو شکست دی (X/570) ڈیوک کی یہ فتح اتنی عظیم تھی کہ اس کو "گریٹ ڈیوک" کہا جانے لگا۔ اس کی بابت لکھا گیا کہ واٹرلو کے مقام پر نپولین کو شکست دینے کے بعد وہ دنیا کے فاتح کو فتح کرنے والا بن گیا:

By defeating Napoleon at Waterloo he became the conqueror of the world's conqueror. (19/755)

ہر طرف ڈیوک کی تعریف کی جانے لگی۔ مگر خود ڈیوک جھوٹے فخر (false pride) کا شکار نہیں ہوا۔ اس کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس فتح تک پہنچنے کے لئے اس کے اپنے ملک سمیت چار ملک تباہ ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ کوئی بھی چیز، ایک ہاری ہوئی جنگ کے سوا، ایک جیتی ہوئی جنگ کی غم ناکی کی آدھی غم ناک بھی نہیں ہو سکتی:

Nothing except a battle lost can be half so melancholy as a battle won.

یہی ہر جنگ کا معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ میں ہار جیت کے درمیان اتنا ہی فرق ہے کہ ہار کے ساتھ شرمندگی شامل ہوتی ہے، اور جیت کے ساتھ شرمندگی شامل نہیں ہوتی۔ ورنہ بربادی کے اعتبار سے جیت اور ہار دونوں تقریباً یکساں ہیں۔

دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ فاتح بن کر نکلا۔ مگر اس کے نتیجہ میں وہ اتنا کمزور ہو گیا کہ اس کے اندر یہ طاقت نہیں رہی کہ وہ اپنے زیر قبضہ ملکوں پر اپنا کنٹرول قائم رکھ سکے۔ خلیج کی جنگ میں امریکہ نے بظاہر شاندار فتح حاصل کی۔ مگر مسلسل ایسی رپورٹیں اخباروں میں آرہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کے لوگ نتیجۂ جنگ کے معاملہ میں مایوسی کا شکار ہو رہے ہیں۔

ہندستان ٹائمس (۸ جون ۱۹۹۱) میں اس کے نمائندہ مقیم واشنگٹن، مسٹر این سی منن کی رپورٹ

پہنچی ہے۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ امریکہ نے کویت جنگ کے ساتھ پر ... ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ امریکہ
نے آخر خلیج کی جنگ سے کیا حاصل کیا :

Just what did the United States gain from the war?

جب کسی سے اختلاف اور ٹکراؤ کی حالت پیش آتی ہے تو اس کا پر امن حل بھی وہیں موجود ہوتا ہے۔ مگر آدمی اکثر اوقات پر امن حل کو چھوڑ کر جنگ کے حل کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ پر امن حل میں وہ اپنی کچھ چیزوں کو کھو رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پر امن حل میں بظاہر جو نقصان ہے، اس سے بہت زیادہ نقصان وہ ہے جو جنگ کی صورت میں آدمی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

مثال کے طور پر خلیج کے بحران میں اگر کویت اس پر راضی ہو جاتا کہ وہ اپنا غیر آباد جزیرہ وربہ (Warba Island) عراق کو پٹہ پر دیدے، جیسا کہ عراق کا مطالبہ تھا، تو یہ اس نقصان سے بہت کم تھا جو جنگ کی صورت میں کویت کو اٹھانا پڑا۔ اسی طرح خود عراق اگر کویتی جزیرہ کے بارہ میں اپنے مطالبہ سے باز آجاتا اور اپنی موجودہ جغرافی حالت پر قانع رہتا تو یہ اس کے لئے اس نقصان سے ہزاروں گنا کم ہوتا جو جنگ کے بعد اس کے نتیجہ میں عراق کے حصہ میں آیا۔

انسان جب بھی کسی جنگ میں الجھتا ہے تو وہ جذباتی ہیجان کی حالت میں اس سے الجھتا ہے۔ اگر انسان ایسا کرے کہ ٹکراؤ پیش آنے کی صورت میں وہ رک کر ٹھنڈے دل سے غور کرے تو یقینی طور پر وہ جنگ کے مقابلہ میں امن کو ترجیح دے گا۔

جنگ کی طاقت ہتھیار ہے۔ مگر جس طرح فوج اور ہتھیار ایک طاقت ہے، اسی طرح امن کی تدبیر بھی ایک طاقت ہے۔ جس طرح ہتھیار دشمن کو زیر کرتا ہے۔ اسی طرح امن کی طاقت بھی دشمن کو زیر کرتی ہے۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ ہتھیار کو استعمال کرنا ہمیشہ تخریب کی قیمت پر ہوتا ہے، اور امن کی طاقت ایک تعمیری طاقت ہے۔ وہ اپنے آخری استعمال کے بعد بھی تعمیری رہتی ہے۔ جنگ کی تدبیر اختیار کرنے سے نئے شدید تر مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب کہ پر امن تدبیر مسئلہ کو اس طرح حل کرتی ہے کہ وہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہونے نہیں دیتی۔

لحم خنزیر

خنزیر کا گوشت کھانا اسلام میں حرام ہے۔ حوالہ کے لئے قرآن کی حسب ذیل آیتیں ملاحظہ ہوں: البقرہ ۱۷۳، المائدہ ۳، الانعام ۱۴۵، النحل ۱۱۵۔ موجودہ زمانہ کے عیسائی حضرات اگرچہ خنزیر کا گوشت عملاً استعمال کر رہے ہیں۔ مگر مذہبی حکم کے اعتبار سے ان کے یہاں بھی خنزیر کا گوشت ممنوعہ غذاؤں میں سے ہے۔ بائبل کے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

اور سور کو کیوں کہ اس کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہیں، پر وہ جگالی نہیں کرتا۔ وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے۔ تم ان کا گوشت نہ کھانا۔ اور ان کی لاشوں کو نہ چھونا۔ وہ تمہارے لئے ناپاک ہیں (احبار ۱۱: ۷)

اور سور تمہارے لئے اس سبب سے ناپاک ہے کہ اس کے پاؤں تو چرے ہوئے ہیں۔ پر وہ جگالی نہیں کرتا۔ تم نہ تو ان کا گوشت کھانا اور نہ ان کی لاش کو ہاتھ لگانا (استثنا ۱۴: ۸)

حلال جانور گویا قدرت کے زندہ کارخانے ہیں۔ وہ انسان کے لئے پروٹینی خوراک فراہم کرنے کا قیمتی ذریعہ ہیں۔ یہ حیوانات غیر غذا (non-food) کو غذا (food) میں تبدیل کرتے ہیں۔

بکری گھاس کھاتی ہے اور اس کو دودھ اور گوشت میں تبدیل کرتی ہے۔ چڑیاں کیڑے مکوڑے کھاتی ہیں اور ان کو گوشت میں تبدیل کرتی ہیں۔ مچھلیاں پانی کے معمولی جانور کھاتی ہیں اور ان کو قیمتی سفید گوشت میں تبدیل کرتی ہیں۔

مگر خنزیر کے اندر یہ صلاحیت نہیں۔ خنزیر نہ گھاس کھاتا ہے اور نہ کیڑے مکوڑے۔ اس کی خوراک گندگی ہے۔ اس کا گوشت گندگی سے بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خنزیر کے کھانے کا اثر آدمی کے مزاج پر پڑتا ہے اور اس کا اخلاق بگڑ جاتا ہے۔

خنزیر بیماری کا سبب بھی ہے۔ کیوں کہ اپنی گندی خوراک کی وجہ سے وہ اکثر بہت سی متعدی اور جراثیمی بیماریوں میں مبتلا رہتا ہے:

Pigs are subject to many infectious and parasitic diseases. (10/1282)

موجودہ زمانہ میں خنزیر کو سائنٹفک فارموں میں رکھا جاتا ہے اور اس کو گندی خوراک سے بچاکر دوسری خوراک کھلائی جاتی ہے۔ مگر واضح ہو کہ یہ دوسری خوراک "غیر غذا" نہیں ہوتی بلکہ خود غذا ہوتی ہے۔ یعنی جو خوراک آدمی کھاتا ہے، عین وہی خوراک نام نہاد سائنٹفک فارموں میں خنزیر کو کھلائی جاتی ہے۔ گویا خنزیر غذا کو غذا میں تبدیل کرتا ہے، جب کہ حلال جانوروں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ غیر غذا کو غذا میں تبدیل کرتے ہیں۔

خنزیر گھاس یا کیڑے مکوڑے نہیں کھاتا۔ وہ غلّہ کھاکر اس کو گوشت میں تبدیل کرتا ہے۔ مگر یہاں بھی اس کا معاملہ دوسرے غذائی حیوانات سے مختلف ہے۔ اس کا تبدیل کیا ہوا گوشت زیادہ تر چربی ہوتا ہے۔ اس کا بہت کم حصہ گوشت کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

فطرت کی خلاف ورزی

خنزیر کا لفظ اکثر زبانوں میں برا مفہوم رکھتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ خنزیر عام طور پر گندگی کھاتا ہے۔ اس بنا پر اس کے نام کے ساتھ گندگی کا تصور وابستہ ہوگیا۔ انگریزی میں کہتے ہیں:

Pig turns man into a pig.

یعنی سور (کا گوشت) آدمی کو بھی سور بنا دیتا ہے۔ ویبسٹر ڈکشنری میں لفظ پگ (pig) کا چوتھا مفہوم حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔

A person regarded as acting or looking like a pig, a greedy or a filthy person. (clloq)

یعنی سور جیسا آدمی، لالچی اور گندہ آدمی۔ فرانسیسی میں خنزیر کو کوشوں (couchon) کہتے ہیں۔ یہ لفظ فرانسیسی زبان میں پگ سے بھی زیادہ برے معنی رکھتا ہے۔

خنزیر کو گندہ خوراک سے بچانے کے لیے موجودہ زمانہ میں اعلیٰ قسم کے بڑے بڑے فارم بنائے گئے ہیں۔ پگ کیپنگ (Pig-keeping) اب ایک مستقل فن بن گیا ہے۔ پگ فارموں میں ان کے لئے خاص طور پر صاف ستھری غذاؤں کا انتظام کیا جاتا ہے اور دوسری سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔

تاہم خنزیر کے فارم مغربی دنیا میں اب تنقید کا موضوع بن رہے ہیں۔ لندن کے اخبار گارجین (۲۹ مئی ۱۹۸۳) میں دو کالم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ــــــ کیا خنزیر ختم ہونے والے ہیں:

Are pigs doomed?

مضمون نگار Ralph Whitlock نے دکھایا ہے کہ مغرب میں خنزیر کے جدید فارم اب دن بدن ناقابل

برداشت ہوتے جارہے ہیں کیونکہ خنزیر مضمون نگار کے الفاظ میں انسان کا مدمقابل (Competitor) ہے۔ یعنی وہ وہی خوراک کھاتا ہے جو انسان کھاتا ہے۔ خنزیر نہ گھاس کھاتا ہے اور نہ گوشت۔ اس کو غلّہ کی بنی ہوئی چیزیں (ڈبل روٹی وغیرہ) کھلانی پڑتی ہیں۔ مزید یہ کہ خنزیر بہت پیٹو جانور ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر زیادہ غذا کھاتا ہے۔ چند خنزیر اگر کسی بیکری میں داخل ہو جائیں تو وہ وہاں کی تمام ڈبل روٹی اور پنیر کھا کر ختم کر دیں گے۔

موجودہ زمانہ میں خنزیر کی خوراک میں کفایت کی خاص کوشش کی جارہی ہے۔ خنزیر کے فارموں میں کمپیوٹروں کے ذریعہ ان کی خوراک پر کنٹرول کیا جاتا ہے تاکہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ کھا سکیں۔ مگر ان ساری کوششوں کے بعد بھی خنزیر کا یہ حال ہے کہ اس کے لاشہ میں ایک پونڈ کا اضافہ کرنے کے لئے اس کو ۵ پونڈ خوراک کھلانی پڑتی ہے:

Despite all modern aids to economic production, it still takes about 5 pounds of pig food to produce one pound of weight increase in the pig's carcase.

مضمون نگار کے الفاظ میں یہ خنزیر کی بنیادی کمزوری (Fundamental weakness) ہے۔ بکری اور گائے گھاس کو گوشت میں تبدیل کرتے ہیں۔ گویا جس چیز کو انسانی معدہ براہ راست ہضم نہیں کر سکتا اس کو خود کھا کر دودھ اور گوشت کی صورت دیتے ہیں اور ہمارے لئے کھانے کے قابل بناتے ہیں۔ مگر خنزیر کے اندر یہ صلاحیت نہیں۔ وہ خود انسان کی غذا (ڈبل روٹی وغیرہ) کھاتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ۵ پونڈ انسانی غذا کھا کر صرف ایک پونڈ گوشت انسان کو واپس کرتا ہے۔ خنزیر صرف یہ کرتا ہے کہ سستی خوراک کو مہنگی خوراک بنا دے:

The pig can only translate a cheap food into an expansive one

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ آبادی کا انفجار ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایٹمی جنگ سے بھی زیادہ بڑا خطرہ ہے:

The population explosion is a far greater threat than that of nuclear war.

زمین پر انسانی آبادی ہندسی نسبت (Geometrical progression) سے بڑھ رہی ہے۔ ماہرین کے اندازہ کے مطابق ۲۰۱۵ میں دنیا کی موجودہ آبادی دگنا ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں خنزیر کا مستقبل، مضمون نگار کے نزدیک، اکیسویں صدی میں یہ نظر آتا ہے کہ ان کی بہت تھوڑی تعداد کو چھاچھ اور ٹکڑوں کی خوراک مل سکے گی۔ اور بقیہ تمام خنزیر غذائی اشیاء کی قلت کے سبب دوبارہ گندگی کھانے والے جانور (scavenger)

بن کر رہ جائیں گے۔

معلوم ہوا کہ خنزیر یا تو گندگی کھاتا ہے یا انسانی خوراک۔ خنزیر کو خدا نے اس لئے بنایا تھا کہ وہ گندگی کو اپنی خوراک بنا کر "صفائی کرم چاری" کا کام انجام دے۔ مگر انسان نے اس کو اپنی خوراک بنالیا اور اس کی خاطر جدید طرز کے بڑے بڑے فارم بنائے۔ قدرت کے انتظام میں یہ مداخلت صرف اس قیمت پر ہوئی کہ انسان اپنی خوراک کا زیادہ حصہ اس کو کھلا کر اس سے اپنے لئے کم خوراک حاصل کرے۔

خدا نے اپنی دنیا میں جو نظام قائم کیا ہے، وہ حد درجہ حکمت پر مبنی ہے۔ اس میں مختلف پہلوؤں کی مجموعی رعایت پائی جاتی ہے۔ یہ نظام اتنا کامل ہے کہ ایک جزء میں کوئی فرق کیا جائے تو دوسرے تمام اجزاء میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے۔

ایسی حالت میں انسان کے لئے واحد درست طریقہ یہ ہے کہ وہ قدرت کے نظام میں دخل اندازی سے بچے، وہ اس کی مکمل پیروی کرے۔ اگر آدمی نے قدرت کے اس نظام کو بدلنے کی کوشش کی تو وہ صرف اس قیمت پر ہوگا کہ اس کے بعد ماحول میں ایسی خرابی پیدا ہو جائے جس پر قابو پانا اس کے لئے ناممکن ہو۔

اخلاق پر اثر

جانوروں کا گوشت سادہ طور پر محض ایک خوراک نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اخلاقیات سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ بکری کا گوشت کھانے سے بکری والی صفات بنتی ہیں اور بھیڑیا کا گوشت کھانے سے بھیڑیا والی صفات۔ اسی طرح خنزیر کا گوشت بھی آدمی کے اندر مخصوص اخلاقی صفت پیدا کرتا ہے۔ یہ صفت انسانی زندگی کے لئے ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے اس کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک تقابلی مطالعہ کیجئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خنزیر کا گوشت زیادہ تر مغربی قوموں میں کھایا جاتا ہے۔ مشرقی قوموں میں بحیثیت خوراک اس کا رواج ناقابل ذکر حد تک کم ہے۔ مغربی قوموں میں خنزیر کی حیثیت ایک عام غذا کی ہے۔ اس کے برعکس مشرقی قوموں کی عام غذا غلہ اور سبزی اور دودھ جیسی چیزیں ہیں۔ مشرق کی جن قوموں (مثلاً مسلمان) میں گوشت کھایا جاتا ہے۔ وہ صرف حلال گوشت ہے جس میں خنزیر کا گوشت شامل نہیں۔

اب دونوں قوموں کا اخلاقی حیثیت سے تقابل کیجئے۔ مشرقی قوموں میں مذہب اور روحانی علوم کا ارتقاء ہوا۔ دوسری طرف مغربی قوموں میں ایسے علوم کا ارتقاء نہ ہو سکا۔ ان کے درمیان زیادہ تر ٹکنکل علوم کو ترقی حاصل ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حلال غذا آدمی کے اندر ذوق لطیف پیدا کرتی ہے اور حرام غذا ذوق کثیف پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

اسی طرح قدیم زمانہ میں زیادہ تر مشرقی قوموں کو سیاسی اور فوجی غلبہ حاصل تھا۔ موجودہ زمانہ میں غلبہ کی حیثیت زیادہ تر مغربی قوموں کو حاصل ہو گئی ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو مشرقی قوموں کے غلبہ کا زمانہ نسبتاً زیادہ پر امن نظر آئے گا۔ مشرقی قوموں نے کبھی اس بے رحمانہ درندگی کا ثبوت نہیں دیا جس کا نمونہ موجودہ مغربی قوموں میں دکھائی دیتا ہے۔

مغربی قوموں نے تاریخ کی سب سے زیادہ بھیانک لڑائیاں چھیڑی ہیں۔ انھوں نے مہلک ہتھیاروں کو پہلی بار انڈسٹری کی حیثیت دے دی۔ آج یہ لوگ عالمی سطح پر قوموں کو صرف اس لئے لڑاتے ہیں تاکہ یہ قومیں بھاری قیمت پر ان سے ہتھیار خریدیں اور ان کی وار انڈسٹری کامیابی کے ساتھ چلتی رہے۔ وغیرہ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حلال غذا آدمی کے اندر پر امن نفسیات پیدا کرتی ہے، اور حرام غذا آدمی کے اندر تشدد کی نفسیات پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

الحدیبیہ

اسلام کی تاریخ کا ایک واقعہ وہ ہے جس کو الاستراتیجیۃ الحدیبیہ (Al-Hudaibiya strategy) کہا جا سکتا ہے۔ جب الحدیبیہ کا معاہدہ ہوا تو قرآن میں اس کو فتح مبین (الفتح ۱) کہا گیا۔ الحدیبیہ اسٹریٹجی اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تھی کہ مقابلہ کو جنگ کے میدان سے ہٹا کر امن کے میدان میں لایا جائے۔ تشدد کی طاقت سے فیصلہ لینے کے بجائے امن کی طاقت سے فیصلہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ تدبیر انتہائی کامیاب رہی۔ الحدیبیہ کے بعد دو سال کے اندر مکہ کسی جنگ کے بغیر فتح ہو گیا۔

یہ ۶۲۸ء کا واقعہ ہے۔ اسلام نے الحدیبیہ کی صورت میں پہلی بار انسانی تاریخ میں اس اصول کا کامیاب مظاہرہ کیا کہ تشدد کی تدبیر کے مقابلہ میں امن کی تدبیر زیادہ کارگر اور زیادہ موثر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں سب سے بڑی طاقت امن کی طاقت ہے۔ جنگ کی طاقت بظاہر کتنا ہی زیادہ اہم دکھائی دیتی ہو، اس کی ایک حد ہے، اپنی حد پر پہنچ کر وہ غیر موثر ہو جاتی ہے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اس حقیقت کو نہ اسلام کی تاریخ سے لیا اور نہ موجودہ حالات سے وہ اس کو اخذ کر سکے۔ مسلمانوں کے نادان رہنما سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے "تلوار" کی عظمت بیان کرنے میں مصروف ہیں۔ اس الٹی رہنمائی نے ساری دنیا میں مسلمانوں کی سوچ کو بگاڑ دیا ہے۔ وہ ہر جگہ تلوار کی طاقت سے فیصلہ لینا چاہتے ہیں، خواہ اس کا نتیجہ یک طرفہ طور پر خود ان کی اپنی بربادی کی صورت میں کیوں نہ نکلتا ہو۔

اس غلط رہنمائی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان آج کی دنیا میں ایک تضاد بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنی عدم تیاری کی بنا پر وہ پر امن مقابلہ میں دوسری قوموں کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر بے فائدہ قسم کی منفی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ ان کا یہ مزاج کہیں لاحاصل مطالبہ اور احتجاج کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے اور کہیں لاحاصل بم اور گولی کی صورت میں۔

مسلمان اگر آج کی دنیا میں اپنے لئے باعزت جگہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں دوبارہ الحدیبیہ اسپرٹ کو زندہ کرنا ہوگا۔ انھیں اپنے آپ کو پر امن طاقتوں سے مسلح کرنا ہوگا۔ موجودہ عسکری سرگرمیاں انھیں بربادی کے سوا کہیں اور پہنچانے والی نہیں۔ اس معاملہ میں ایک محدث کا مشہور قول پوری طرح

صادق آتا ہے کہ اس امت کے بعد کے دور کے حالات بھی اسی سے درست ہوں گے جس سے اس کے دور اول کے حالات درست ہوئے تھے (لن یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها)

قرآن میں معاہدۂ حدیبیہ کو فتح مبین (الفتح ۱) کہا گیا ہے۔ قال البخاری عن البراء قال: تعدّون الفتحَ فتح مكة ونحن نعدّ الفتحَ يومَ الحديبية

معاہدۂ حدیبیہ کیا ہے۔ معاہدۂ حدیبیہ اپنی روح کے اعتبار سے یہ ہے کہ دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ مداخلت کی حد تک پابند کر کے بقیہ ہر اعتبار سے انھیں آزاد کر دیا جائے۔ اس قسم کی آزادی جب قائم کی جائے گی تو ظاہر ہے کہ وہ صرف ایک فریق کے لئے نہیں ہو سکتی وہ لازماً دونوں فریقوں کے لئے ہوگی۔ چنانچہ یہی معاملہ حدیبیہ کے وقت پیش آیا۔ اس میں اہل شرک پر جنگی اقدام کی ممانعت قائم کی گئی تو اہل اسلام بھی جنگی اقدام سے روک دئے گئے۔ اسی طرح اہل اسلام کو اگر تبلیغ توحید کی آزادی ملی تو دوسرے فریق کو بھی یہ آزادی ملی کہ وہ شرک کی حمایت میں جو کچھ کہنا چاہیں کہیں۔ یہاں تک کہ انھیں یہ بھی آزادی ملی کہ لفظ رسول اللہ کو کاغذ پر مٹائیں۔ وہ کسی موحد اور مومن کو اپنے یہاں روک لیں، جیسا کہ انھوں نے ابوجندل کو روکا۔ وغیرہ

اگر ہم ایک ایسی صورت حال قائم کرنا چاہتے ہیں جو ہماری موافقت میں ہو، تو اس صورت حال کے قیام کے بعد دوسروں کو اس سے فائدہ اٹھانے سے روکا نہیں جا سکتا۔ موجودہ عالم اسباب میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ ہم اپنی اس خواہش کا اظہار بے جا احتجاج کی صورت میں کر سکتے ہیں۔ مگر ایسے احتجاج کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔

مثال کے طور پر آزادئ فکر کی صورت حال ہمارے لئے مفید ہے۔ کیوں کہ اسلام کی عمومی اشاعت اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ دنیا میں فکری آزادی کا ماحول موجود ہو۔ مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ آزادی صرف ہمارے لئے ہو، وہ دوسروں کے لئے نہ ہو۔ حتی کہ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دوسرے لوگ اپنی آزادی کے حق کو ہماری مقرر کی ہوئی شرائط کے تحت استعمال کریں۔

یہ ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور اور مسلم رہنما اس سادہ سی بات کو نہیں جانتے۔ جدید دنیا میں آزادئ فکر اور آزادئ اظہار خیال کے جو مواقع پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اپنے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جب دوسرے لوگ اس آزادی کو

اپنے نظریہ کے حق میں استعمال کرتے ہیں تو ہمارے دانشور اور رہنما احتجاج شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کا احتجاج صرف سطحیت ہے نہ کہ کوئی واقعی کام۔

ہمارا اعتماد اپنے نظریہ کی برتر قوت پر ہونا چاہئے نہ کہ دوسروں کی زبان بندی کرنے پر۔ دوسروں کی زبان بندی عملاً ممکن نہیں۔ البتہ ہم اپنے نظریہ کو ان کے دلوں میں داخل کرکے ان پر قابو پانے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ اظہار خیال کا زمانہ ہے۔ اس صورت حال نے اسلامی دعوت کے لیے نہایت اعلیٰ موافق میدان پیدا کر دیا ہے۔ اس جدید امکان کو استعمال کرکے اسلام کی اشاعت کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کیا جا سکتا ہے۔ مگر عملاً ابھی تک ایسا نہ ہو سکا۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جب آزادیٔ اظہار کا زمانہ آیا تو قدرتی طور پر وہ ہر ایک کے لیے آیا۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کو ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی باتیں مسلمانوں کے ذوق کے خلاف تھیں۔ مسلمان بس انھیں کے خلاف چیخ و پکار کرنے میں مشغول ہو گئے۔

اس قسم کی چیخ و پکار سراسر بے فائدہ ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مخالفانہ باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلام کی تعلیمات کو پھیلایا جائے۔ جدید امکانات کو اسلام کی دعوت کو عمومی بنانے کے لیے استعمال کیا جائے۔

اسلام کے مثبت پیغام کی اشاعت اسلام کے مخالفین کا زیادہ بہتر جواب ہے۔ اسلام کے سورج سے پردہ کا ہٹنا باطل کے اندھیرے کو اپنے آپ ختم کر دینے والا ہے۔

الرسالہ سمپوزیم

پٹنہ کا بنیادی پروگرام الرسالہ سمپوزیم تھا۔ ۲۸ جولائی ۱۹۹۱ کو اس کا انعقاد گورنمنٹ اردو لائبریری کے ہال میں ہوا۔ اس لائبریری میں اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر لائبریری کے منتظمین کا کہنا تھا کہ اتنا کامیاب اجتماع آج تک یہاں کوئی اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس سمپوزیم کی صدارت پٹنہ ہائی کورٹ کے جسٹس این پی سنگھ کرنے والے تھے۔ مگر عین وقت پر سرکاری ضرورت پیش آنے کی وجہ سے وہ رانچی چلے گئے۔ ان کی جگہ شہر کی مشہور شخصیت ڈاکٹر شری نواس نے سمپوزیم کی صدارت کی۔ مسٹر ایم ٹی خان نے کنوینر کی حیثیت سے کارروائی کو چلایا۔

یہ سمپوزیم پٹنہ کے الرسالہ ریڈرس فورم کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کی روداد کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ سمپوزیم الرسالہ مشن کی تاریخ کا ایک حصہ ہے، اس لئے اس کا ریکارڈ میں آجانا ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ الرسالہ میں اس کی اشاعت سے دوسرے مقامات کے حلقۂ الرسالہ کو ان شاء اللہ تحریک ملے گی اور وہ اپنے حالات کے لحاظ سے اپنے یہاں بھی اسی نوعیت کی سرگرمیاں جاری کر سکیں گے۔

ماہنامہ الرسالہ ۱۹۷۶ سے برابر نکل رہا ہے۔ اسی کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ جگہ جگہ اجتماعات بھی کئے جاتے رہے ہیں۔ اس طرح پندرہ سال کی مسلسل محنت کے نتیجہ میں الرسالہ کا مشن پورے ملک میں بحث و گفتگو کا موضوع بن گیا ہے۔ ملک کا بیشتر تعلیم یافتہ طبقہ اس سے واقف ہو چکا ہے۔ الرسالہ کی فکری ضرب لوگوں کے لئے اتنی شدید ہے کہ لوگ مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کو پڑھنے کے بعد اس کے بارہ میں کچھ نہ کچھ ردعمل ظاہر کریں، خواہ مخالفت کی صورت میں یا موافقت کی صورت میں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ الرسالہ مشن کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ آج الرسالہ ملک میں "سمپوزیم" کا عنوان بن رہا ہے۔ یہ واقعہ الرسالہ مشن کے دوسرے مرحلہ میں داخل ہونے کی علامت ہے، یعنی وہ مرحلہ جب کہ الرسالہ مشن انفرادی دلچسپی کے موضوع سے اوپر اٹھ کر اجتماعی دلچسپی کے دور میں پہنچ گیا۔ وہ عمومی سطح پر غور و فکر کا عنوان بن گیا۔

سمپوزیم (symposium) اصلاً ایک مرکب یونانی لفظ ہے۔ قدیم یونان میں تعلیم یافتہ

لوگ فکری مباحثہ (intellectual discussion) کے لئے جمع ہوتے تھے۔ ان کے مذاق کے مطابق، ایسی مجلسوں میں تفریحی پروگرام بھی رکھے جاتے تھے۔ اس کو وہ لوگ سمپوزن (sumposion) کہتے تھے۔ یہی لفظ انگریزی میں آکر سمپوزیم بن گیا۔ موجودہ استعمال میں سمپوزیم کا لفظ ایسی کانفرنس کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی مخصوص موضوع پر بحث و مذاکرہ کے لئے منعقد کی گئی ہو:

A conference organized for the discussion of some particular subject.

پٹنہ کے الرسالہ سمپوزیم کا عنوان بحث تھا: الرسالہ ایک روشنی، زندگی کی تعمیر میں الرسالہ کا رول۔ الرسالہ ریڈرس فورم جس کی طرف سے یہ سمپوزیم منعقد کیا گیا، اس فورم کے سرپرست (پیٹرن) جسٹس این پی سنگھ ہیں اور مسٹر ایم ٹی خان، ایم اے اس کے کنوینر ہیں۔

سمپوزیم کا مقررہ وقت صبح دس بجے تھا۔ مگر عملاً وہ ساڑھے دس بجے شروع ہو سکا۔ کنوینر مسٹر ایم ٹی خان مائک پر کھڑے ہوئے تو سب سے پہلے انھوں نے کہا کہ آدھ گھنٹے کی یہ تاخیر الرسالہ مشن کے اصول کے خلاف ہے۔ اس کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ اور آپ سے اس کوتاہی کی معافی چاہتے ہیں۔ اس کے بعد کنوینر نے کہا کہ کچھ دیر بعد یہاں لوگوں کے مقالات پڑھے جائیں گے اور لوگوں کے تاثرات آپ کے سامنے آئیں گے۔ اس سلسلہ میں چند ضروری باتیں میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ مشن کو سمجھنے کے لئے چار خاص شرطیں (conditions) ہیں۔ آپ براہ کرم اپنے اظہار خیال میں ان کو ملحوظ رکھیں۔

۱۔ الرسالہ کے پیغام کو اس کے صحیح تناظر (perspective) میں لینے کے لئے غیر متاثر ذہن ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم پیشگی تاثرات کے ساتھ الرسالہ مشن کو دیکھیں تو الرسالہ کے صفحات میں ہم اپنے آپ کو پڑھیں گے، ہم الرسالہ کو نہیں پڑھ سکیں گے۔

۲۔ الرسالہ مشن کو سمجھنے کے لئے وہ انسان درکار ہے جو ڈبل اسٹینڈرڈ پالیسی پر راضی نہ ہو۔ یعنی ذاتی زندگی میں ایک طریقہ پر عمل کرنا اور اجتماعی امور میں دوسرے طریقہ کی وکالت کرنا۔ انھوں نے کہا کہ دہراپن (duality) کے ساتھ آپ واقعیت (actuality) کو نہیں سمجھ سکتے۔

۳- تیسری چیز یہ کہ الرسالہ مشن کو سمجھنے کے لئے تقلیدی ذہن کے بجائے غیر تقلیدی ذہن ہونا ضروری ہے۔ تقلید پر مبنی (Tradition-based) سوچ رکھنے والا آدمی تعقل پر مبنی (Reason-based) پیغام کو سمجھنے سے عاجز رہتا ہے۔

۴- اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ الرسالہ کے پیغام کو اس کے جامع انداز (integrated way) میں لیں، آپ اس کو متفرق انداز (segregated way) میں نہ لیں۔ کسی بھی پیغام کو اس کے کامل ڈھانچہ ہی میں رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے نہ کہ منقسم ڈھانچہ میں۔

اس کے بعد کنوینر نے کہا کہ ہر اصول کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ جس طرح اصول مطلوب ہوتا ہے اسی طرح اس کے تقاضے بھی لازمی طور پر مطلوب ہوتے ہیں۔ تقاضوں کو چھوڑنے کے بعد اصول بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے حق (right) کو پانے کے لئے تحمل (restraint) کا اہتمام ضروری ہے۔ آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنی چیز کو حاصل کرے مگر حاصل کرنے کی جد وجہد کے دوران تحمل کے اصول کو پکڑے رہنا ضروری ہوگا۔ ورنہ حق دار ہونے کے باوجود آدمی اپنے حق کو پانے سے محروم رہے گا۔

اس تمہیدی تقریر کے بعد لوگوں کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ سب سے پہلے جسٹس این پی سنگھ کا پیغام پڑھا گیا۔ وہ سمپوزیم میں بحیثیت صدر شریک ہونے والے تھے مگر اچانک سرکاری ضرورت پیش آنے کی وجہ سے ان کو رانچی جانا پڑا۔ چنانچہ ڈاکٹر شری نواس نے سمپوزیم کی صدارت کی۔ جسٹس سنگھ نے اپنا تحریری پیغام بھیج دیا تھا۔ ان کے پیغام کا ایک حصہ یہ تھا :

A serious reader of *Al-Risala* can take a great benefit from Maulana's manifestations by becoming quick in precision, broad in vision and fresh in approach

اس کے علاوہ اور بھی کئی صاحبان کے پیغامات پڑھے گئے۔ انھوں نے اپنے پیغام میں یہ کہا تھا کہ وہ الرسالہ کے قاری ہیں۔ اور اس کے پیغام سے اتفاق رکھتے ہیں۔ یہی قوم اور ملک کی ترقی کا راستہ ہے۔ ان حضرات کے نام یہ ہیں :

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ، مارواڑی کالج ، بھاگل پور

محمد مصباح الزماں ، پرنسپل ایم اے اے ہائی اسکول ، پٹنہ

بدرالدین احمد، اکاؤنٹ افسر، کنارا بینک، پٹنہ
محمد شفیق، شیخ پورہ، مونگیر
ڈاکٹر عبدالصمد، پٹنہ

پیغام سنانے کے بعد مقالات پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان مقالات میں الرسالہ کے بارے میں اپنے اپنے تاثرات کو بیان کیا گیا تھا۔ اور یہ بتایا گیا تھا کہ موجودہ ملکی اور بین اقوامی حالات میں اس کے پیغام کی کیا اہمیت ہے۔ یہاں ان مقالات کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مسٹر ایم کے سنہا، سابق انسپکٹر جنرل آف پولیس، بہار نے اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھا۔ اس میں انھوں نے دوسری باتوں کے علاوہ لکھا کہ آج ہمارے پاس انڈیا ہے، انڈین ہیں، مگر انڈین نس (Indianness) نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ ملک میں انڈین نس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کے مقالہ کا ایک جملہ یہ ہے:

Al-Risala gives a correct lead to this vexed (communal) problem which is possibly due to politics becoming more and more complicated in recent times.

دوسرا مقالہ جناب مصطفی کمال صدیقی (اورنٹیل بینک آف کامرس) کا تھا۔ یہ مقالہ اردو میں تھا۔ انھوں نے اپنے تفصیلی تاثرات بتاتے ہوئے کہا کہ اگر مجھ سے الرسالہ کی ڈیفینیشن (تعریف) پوچھی جائے تو میں کہوں گا کہ الرسالہ ایک ایسا مشن ہے جو جاگے ہوئے لوگوں کو جگانے کا کام کر رہا ہے۔ سوئے ہوئے لوگوں کو جگانا آسان ہوتا ہے۔ مگر جاگے ہوئے لوگوں کو جگانا انتہائی حد تک مشکل ہے۔

اس کے بعد مس انشو مترا چودھری (ایم اے انگلش، پٹنہ یونیورسٹی) نے اپنا انگریزی پیپر پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ انگریزی کی مستقل قاری ہوں۔ مجھے اس کے پیغام سے اتفاق ہے۔ الرسالہ کرکٹ تھنکنگ پیدا کرتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں سماج کی اصلاح کے لئے الرسالہ کے انداز میں کام کروں۔ ان کے مقالہ کا ایک جزء یہ تھا:

The publication of *Al-Risala* in Hindi, Urdu and English provides people across the country with ample scope to introduce themselves with reason and rationalism.

اس کے بعد حافظ محمد حفظ الرحمان صاحب (رضا ہائی اسکول، پٹنہ) نے اپنا اردو مقالہ پیش

کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کچھ تجربات بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ ہم کو اعراض کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ اصول زندگی کی کامیابی کے لئے بے حد اہم ہے۔ اعراض کا مطلب بزدلی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس آدمی کے اندر اعراض کی صفت آجائے وہ سب سے زیادہ بہادر آدمی ہے۔

اس کے بعد پروفیسر ایس شہاب الدین دسنوی اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے اپنا مقالہ پڑھا۔ ان کا مقالہ انگریزی میں تھا۔ انھوں نے اپنے مقالہ میں الرسالہ کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو اپنی تعمیر نو کے لئے اپنا ذہن بدلنا چاہئے:

Muslims should consider changing their own thinking which may lead to building up their own strength and help them in the reconstruction of the *millat*.

ذکیہ مشہدی صاحبہ نے اپنے اردو مقالہ میں کہا کہ مجھے الرسالہ کے پیغام سے پورا اتفاق ہے۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کے مشن کو آگے بڑھانے کے سلسلہ میں اپنی بساط کے مطابق میں پورا تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہ قوم وملک کی بہترین خدمت ہے۔

واصف امام صاحب نے اپنے انگریزی مقالہ میں الرسالہ کے مشن سے مکمل اتفاق کیا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کی تاثیر اتنی غیر معمولی ہے کہ کوئی بھی شخص پڑھنے کے بعد اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا:

One can like *Al-Risala*, one can dislike *Al-Risala*, but one cannot ignore *Al-Risala*.

شفیع مشہدی صاحب نے اپنے اردو مقالہ میں کہا کہ الرسالہ اپنی ذات میں ایک آفاقی پیغام بن چکا ہے۔ وہ محض کسی قوم کے لئے نہیں، محض کسی ملک کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانیت کے لئے ہے۔

مسٹر اے خان (منیجر، انڈین بینک) نے اپنے انگریزی مقالہ میں الرسالہ کے مشن کی تائید کی اور اس کو مسلمانوں کے لئے صحیح راہ عمل بتایا۔ انھوں نے کہا:

Al-Risala's stand on peaceful co-existence is essentially a message to Muslims.

محمد رضی احمد صاحب نے اپنے اردو مقالہ میں کہا کہ الرسالہ ایک عظیم تعمیری منصوبہ ہے۔ یہ

بزدلی کا سبق نہیں بلکہ بہادری کی تعلیم ہے۔ یہ بے عملی کا نہیں بلکہ حقیقی عمل کا پیغام ہے۔

ڈاکٹر شری نواسن صاحب نے انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے الرسالہ کے تعمیری پیغام کی پوری حمایت کی۔ انھوں نے واضح لفظوں میں کہا :

Every Hindu must read *Al-Risala* for purity of heart and cleansing of head.

ڈاکٹر ایل اے خان دیکھا نے انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ صرف ایک میگزین نہیں ہے بلکہ وہ ایک تحریک ہے۔ وہ روح اور دل اور دماغ کے لئے ایک انقلاب ہے :

Al-Risala is not a magazine but a movement, a change and a revolution of soul, mind and heart

ایس خالد رشید صاحب نے ہندی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے الرسالہ کے پیغام کی حمایت کی اور کہا کہ الرسالہ مانو مولیہ (انسانی قدروں) کے پرچار میں دلوں کو دل سے جوڑنے میں، اور نفرت کو پیار سے بدلنے میں سپھل ہوا ہے، اور یہ آج کے حالات میں بہت بڑی بات ہے۔

ڈاکٹر ایس ایف رب نے اپنے اردو مقالہ میں کہا کہ الرسالہ کے مطابق کسی بھی قوم کی ترقی یا تنزل کا راز اس حقیقت میں چھپا ہوا ہے کہ اس کے افراد کے سوچنے کا انداز کیا ہے۔ آدمی جیسا سوچتا ہے ویسا ہی وہ بن جاتا ہے۔ اس لئے الرسالہ کی کوشش ہے کہ وہ صحیح سوچ والے انسان بنائے۔

ڈاکٹر ڈی ڈی گروو نے انگریزی میں اپنا مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کی بیس اگرچہ مذہب ہے مگر وہ ریزن اور عقیدہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے نہ کہ جذبات اور عقیدہ کی طرف۔ انھوں نے کہا:

Al-Risala refers to a path of reason and faith rather than emotion and faith.

یمین ثمر فضل صاحبہ نے اپنے اردو مقالہ میں کہا کہ الرسالہ عصری تقاضوں کے پیش نظر پوری دردمندی کے ساتھ قوم کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ وہ مستقبل کی تعمیر کا پیغام ہے۔

نعمان غنی دیوروی نے اپنے اردو مقالہ میں کہا کہ الرسالہ کی تحریر بڑی جاندار ہوتی ہے۔ مختصر جملوں میں بڑی اچھی اچھی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ الرسالہ اس قابل ہے کہ اس کو اپنی زندگی کا رہنما بنایا جائے۔

پرنسپل بلبیر سنگھ نے اپنے انگریزی مقالہ میں کہا کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ الرسالہ کے ذریعہ جس پیغام کی اشاعت کی جارہی ہے وہ براہ راست قارئین کے دل تک پہنچ رہا ہے:

I have come to the conclusion that the messages conveyed by *Al-Risala* go straight to the heart of the reader.

ڈاکٹر اختر حسین آفتاب نے اپنے اردو مقالہ میں کہا کہ میری نگاہ میں الرسالہ کا شمار اقوال زریں میں ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے قیمتی اصولوں کو مختصر الفاظ میں پیش کر رہا ہے۔

ریحانہ خانم صاحبہ نے اپنے اردو مقالہ میں کہا کہ تعمیر حیات کی ساری ضروری باتیں (inputs) الرسالہ میں موجود ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی اپنے ذاتی خول سے باہر آئے۔ اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کرے۔

کوثر مظہری صاحب (پٹنہ یونیورسٹی) نے اپنے اردو مقالہ میں دوسری باتوں کے علاوہ کہا کہ الرسالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو عصری اسلوب اور جدید علم کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ڈاکٹر رام شوبھت پرشاد سنگھ نے اپنے ہندی مقالہ میں کہا کہ الرسالہ ایک وچار اتیجک اور پربھاوکاری پتریکا ہے۔ ہر آدمی کو اسے پڑھنا چاہئے۔

ڈاکٹر عبد الصمد صاحب نے اپنے اردو مقالہ میں کہا کہ الرسالہ تحریر کا جادو ہے۔ ہر دور کی ایک زبان ہوتی ہے اور الرسالہ آج کے دور میں آج کی زبان میں بات کرتا ہے۔ اس کا پیغام وقت کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔

یہ پیش کئے گئے مقالات کا ضروری خلاصہ ہے۔ کچھ مقالوں میں تنقیدی باتیں بھی تھیں۔ ان تنقیدوں کی وضاحت مقالات پڑھے جانے کے بعد راقم الحروف کی طرف سے کی گئی۔ ان تنقیدوں کا ذکر آئندہ سوال وجواب کے تحت کیا جا رہا ہے۔

سوال و جواب

مقالات پڑھنے کے بعد "سوال و جواب" کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں حق اختلاف (right to dissent) کا پورا لحاظ رکھا گیا۔ بعض مقالات میں کچھ تنقیدی باتیں کہی گئی تھیں۔ نیز سفر کے دوران پٹنہ میں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ انھوں نے بھی مختلف قسم کے سوال یا اعتراض کئے۔ ان سب کا تذکرہ یکجا طور پر یہاں کیا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ اپنی صبر و اعراض کی پالیسی کے لئے صلح حدیبیہ کی مثال دیتے ہیں۔ حالاں کہ حدیبیہ میں تو جہاد و قتال کی بیعت ہوئی تھی جس کو بیعت الرضوان کہا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں معاہدۂ امن کی بات چلا رہے تھے۔ اس درمیان میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ مکہ کے لوگوں نے حضرت عثمان بن عفان کو قتل کر دیا ہے۔ اس وقت آپ نے صحابہ سے وہ بیعت لی جس کو بیعت الرضوان کہا جاتا ہے۔ صحابی کہتے ہیں کہ ہم نے آپ سے یہ بیعت موت پر نہیں کی تھی بلکہ اس امر پر کی تھی کہ ہم فرار کی راہ نہیں اختیار کریں گے (لم نبایعنا علی الموت ولکن بایعنا علی أن لا نفر) البدایہ والنہایہ ۴۰/ ۱۶۸)

اگر اس بیعت کو قتال کے معنی میں لیں تو نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور تمام صحابہ نے اس کے خلاف عمل کیا۔ کیوں کہ وہ جنگ نہ کر کے عمرہ کئے بغیر مدینہ واپس آ گئے۔ اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تو ساری کوشش معاہدۂ امن کے لئے کر رہے تھے۔ مگر حضرت عثمان کے قتل کی خبر جو غلط تھی، اس سے وقتی طور پر یہ اندازہ ہوا کہ قریش جنگ پر تلے ہوئے ہیں، اس لئے آپ نے صحابہ سے بیعت لی کہ اگر ہمارے اوپر جنگ تھوپی گئی تو ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے بلکہ مقابلہ کریں گے۔

اس سے یہ اصول ملتا ہے کہ اگر انتخاب امن اور جنگ کے درمیان ہو تو ہر قیمت پر امن کا انتخاب کیا جائے گا اور جنگ کا طریقہ چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن اگر انتخاب فرار اور جنگ کے درمیان پیش آ جائے تو فرار نہیں کیا جائے گا بلکہ متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے گا۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ فرقہ وارانہ فسادات میں ہمیشہ مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

یہ کہاں تک درست ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ہماری بات کی صحیح ترجمانی نہیں۔ الرسالہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ دوسری غلطی نہ کیجئے (الرسالہ، جنوری ۱۹۹۰، صفحہ ۳۲) اس دنیا میں "پہلی غلطی" بہر حال

کی جاتی ہے۔ ہندستان میں اگر ہندو کرتا ہے تو پاکستان میں مسلمان کرے گا۔ پہلی غلطی اس دنیا میں بہر حال ہونے والی ہے۔ اس کے بعد اگر دوسری غلطی نہ کی جائے تو بات اپنے ابتدائی مرحلہ میں ختم ہو جاتی ہے۔ اور اگر بے صبر ہو کر دوسری غلطی کر دی جائے تو بات بڑھتی ہے یہاں تک کہ فساد اور ہلاکت کی نوبت آجاتی ہے۔ اس لئے عقلمند وہ ہے جو پہلی غلطی کو برداشت کر لے۔ اور دوسری غلطی کرنے کی غلطی نہ کرے۔ یہی اس دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا واحد راز ہے، ہندستان میں بھی اور ہندستان کے باہر بھی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی کتابوں کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ کتابوں کی قیمت زیادہ ہوتی نہیں بلکہ زیادہ لگتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے یہاں خرید کر پڑھنے کا مزاج نہیں۔ لوگ چاہتے ہیں کہ بس مفت لے کر پڑھ لیں۔ اور جب مفت پڑھنے کا مزاج ہو تو جو بھی قیمت رکھی جائے وہی لوگوں کو زیادہ معلوم ہوگی۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ بیک سیٹ پر بیٹھنے کے لئے کہتا ہے۔ کیا اس سے پوری قوم شکست خوردگی اور پسماندگی کا شکار نہیں ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ "بیک سیٹ" کا لفظ علامتی طور پر صرف وقتی تدبیر کے معنی میں ہے۔ اس کا مطلب ہے ابتدائی مرحلہ میں کم پر راضی ہونا تاکہ زیادہ کے لئے جدوجہد کی جا سکے۔ یہ ہر بامقصد انسان کا طریقہ ہے۔ ہر آدمی جو کسی بڑے مقصد تک پہنچنا چاہتا ہو وہ ابتداءً پہلے زینہ پر قدم جمانے کے لئے اپنے آپ کو راضی کرتا ہے۔ جو آدمی ابتدائی مرحلہ میں پہلے زینہ پر اپنا قدم رکھنے پر راضی نہ ہو وہ کبھی اگلے زینہ پر پہنچنے کی سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی رضامندی اس دنیا میں وقفۂ تعمیر حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ایک باپ اگر صرف میٹرک پاس ہو تو اس کو کلرک بننے پر راضی ہونا پڑے گا تاکہ وہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے قابل ہو سکے۔ ایسا باپ اگر اپنے آپ کو "بیک سیٹ" پر بیٹھنے کے لئے راضی نہ کرے تو وہ اپنے بیٹے کو اگلی سیٹ تک پہنچانے کا خواب پورا نہیں کر سکے گا۔ یہ دراصل تدبیر کار کا مسئلہ ہے نہ کہ ہمیشہ کے لئے پس ماندہ بن جانے کا مسئلہ۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہندوؤں کے جلوس کو اپنے محلہ سے یا مسجد کے سامنے سے گزرنے دیں۔ یہ تو بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔ وہ لوگ اشتعال انگیز

الفاظ بولتے ہیں۔ پھر ہم کیسے ان کو اپنے علاقہ سے گزرنے دیں۔

میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی کے لئے ہمیشہ دو میں سے ایک کا چوائس ہوتا ہے مگر وہ تیسرا چوائس لینا چاہتا ہے جو ممکن نہیں۔ جلوس کے معاملہ میں ہم کو دو میں سے ایک کا چوائس ہے۔ یا تو جلوس کو برداشت کریں یا فساد کو۔ مگر ہم تیسرا چوائس لینا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ سرے سے جلوس ہی کو نکلنے نہ دیں جو ناممکن ہے۔ اچھی طرح جان لیجئے کہ یہ ہمارے لئے جلوس اور بے جلوس میں انتخاب کا کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ جلوس اور فساد میں انتخاب کا معاملہ ہے۔ اب آپ سوچ لیجئے کہ دونوں میں سے کون سا آپ کے لئے اہون ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ ہر ایک کے اوپر تنقید کرتے ہیں۔ کیا کوئی ہے جو آپ کے نزدیک صحیح ہو۔ میں نے کہا کہ یہ صحیح اور غلط کا مسئلہ نہیں ہے، یہ آزادی رائے کا مسئلہ ہے۔ اسلام میں ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی دی گئی ہے۔ چنانچہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں تنقید کا عام رواج تھا۔ لوگ سخت ترین الفاظ میں ایک دوسرے پر تنقید کرتے تھے مگر کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ تنقید نہ کرو۔ کیوں کہ تنقید کو ختم کرنا تخلیقی فکر کو ختم کرنا ہے۔ اور جس قوم میں تخلیقی فکر کی صلاحیت نہ رہے وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔

اصل یہ ہے کہ یہاں بھی وہی چوائس (انتخاب) کا معاملہ ہے۔ ہمارے لئے صرف دو میں سے ایک کا چوائس ہے۔ تیسرے چوائس کا ہمارے لئے کوئی موقع نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے لئے تنقید اور بے تنقیدی میں چوائس ہے۔ حالاں کہ صحیح یہ ہے کہ آپ کے لئے تنقید اور ذہنی موت میں چوائس ہے۔ آپ اگر تنقید کو ختم کر دیں تو اس کے بعد جو چیز آپ کے حصہ میں آئے گی وہ سادہ معنوں میں بے تنقیدی نہیں ہے بلکہ ذہنی موت ہے۔ یعنی جمود اور منافقت۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں صرف آپ کے مضامین ہوتے ہیں۔ کسی اور کا مضمون اس میں شائع نہیں ہوتا۔ اس طرح الرسالہ "ون مین شو" بن گیا ہے۔ ایسا کیوں۔

میں نے کہا کہ الرسالہ ایک مشن ہے اور مشن میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر میں نے مثال دی کہ مولانا یوسف صاحب مرحوم کے زمانہ میں تبلیغ کے ہر جلسہ میں انھیں کی لمبی لمبی تقریر ہوا کرتی تھی۔ مولانا یوسف صاحب کی تقریر کا نام تبلیغی اجتماع تھا۔ مگر کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ تو ون مین شو ہے۔ اصل

یہ ہے کہ جو مشن تقریر کی سطح پر چلایا جائے اس کو لوگ مشن سمجھتے ہیں، اور جو مشن رسالہ اور کتاب کے ذریعہ چلایا جائے اس کو وہ صحافت سمجھتے ہیں۔

اس قسم کا اعتراض کرنے والوں کی مشکل یہ ہے کہ وہ ابھی تک الرسالہ کو صرف ایک میگزین سمجھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ابھی تک اس کو ایک مشن نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ایسے اشکالات پیش آرہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مشن اپنے ابتدائی دور میں ون مین شو ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ الرسالہ مشن کو کوئی مین شو کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو اس مشن کے اگلے دور کا انتظار کرنا چاہئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے اب تک اپنا کوئی عملی پروگرام نہیں بتایا۔ پھر آخر آپ کا مقصد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ الرسالہ مشن کا مقصد، ایک لفظ میں ــــــ **اسلامی بیداری** (Islamic awakening) ہے۔ یعنی موجودہ مسلمانوں میں دوبارہ اسلام کی اس اسپرٹ کو زندہ کرنا جو دور اول کے مسلمانوں میں تھی۔ یہی اسلامی اسپرٹ تمام باتوں کا خلاصہ ہے۔ اسلامی اسپرٹ بیدار ہو تو لوگوں میں ایمان کی حرارت پیدا ہو جائے۔ عبادتوں میں جان آجائے۔ اسلامی کردار ابھر آئے۔ لوگ معاملات و مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں اور اسلامی ہدایات کے مطابق ان کے حل کی تدبیر کریں۔ اسلامی دعوت کا جذبہ ان کے اندر ابھر آئے۔

ہماری تشخیص کے مطابق، موجودہ مسلمانوں میں جو اصل چیز کھوئی گئی ہے وہ کوئی ظاہری ڈھانچہ نہیں ہے بلکہ اصل چیز جو ان سے کھوئی گئی ہے وہ اندرونی اسپرٹ ہے۔ دوسری تمام چیزیں جو ان میں مفقود نظر آتی ہیں وہ اسی اصل کے نہ ہونے کا نتیجہ ہیں۔

تعمیر ملت کے سلسلہ میں اس بنیادی کام کی اہمیت ہر ایک کو معلوم ہے۔ مگر کوئی اپنے آپ کو اس کام میں نہیں لگاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے کاموں میں فوراً لیڈری ملتی ہے، جب کہ اس کام میں لیڈری اور مقبولیت کی کشش موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑی قربانی گم نامی کی قربانی ہے۔ یعنی شہرت والے کام کو چھوڑ کر اس کام کو اختیار کرنا جس میں آدمی کو عوامی شہرت نہیں ملتی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ زیادہ تر رسالہ اور کتاب کے ذریعہ اپنا مشن چلا رہے ہیں۔

آپ نے ابھی تک اپنی کوئی مستقل تنظیم قائم نہیں کی۔ ایسی حالت میں آپ کا مشن آئندہ صرف کتب خانوں میں رہ جائے گا، ان کے باہر اس مشن کا کوئی وجود نہ ہوگا۔

میں نے کہا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲ — ۱۷۰۳) نے صرف کتابیں لکھیں۔ اپنے افکار کی بنیاد پر وہ کوئی عملی تنظیم قائم نہ کر سکے۔ پھر کیا شاہ ولی اللہ کا مشن ختم ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ وہ شاہ صاحب کے بعد بھی پوری طاقت کے ساتھ زندہ رہا اور آج تک زندہ ہے۔ میں نے کہا کہ پھر آپ کیسے یہ فرض کر رہے ہیں کہ الرسالہ مشن آئندہ ختم ہو جائے گا، صرف اس لئے کہ ہم نے ابھی تک اس کے لئے معروف قسم کی کوئی عملی تنظیم قائم نہیں کی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اب میں بوڑھا ہو گیا۔ ایسی حالت میں آپ نے اپنے بعد اس مشن کو زندہ رکھنے کا کیا انتظام کیا ہے۔

میں نے کہا کہ کسی مشن کی بقا کا انحصار اس کی اپنی فکری طاقت پر ہوتا ہے نہ کہ کسی خارجی سہارے پر۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد نے دھواں دھار خلافت تحریک اٹھائی۔ مگر وہ ۱۹۲۴ میں ختم ہو گئی جب کہ محمد علی اور ابو الکلام ابھی زندہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلافت تحریک اگرچہ ہندستان میں چل رہی تھی مگر اس کا اصل سرا ترک لیڈروں کے ہاتھ میں تھا۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشن اگر اندرونی طاقت سے محروم ہو تو وہ بانی کی موجودگی میں ختم ہو سکتا ہے۔ اور اگر مشن خود جاندار ہے تو وہ بانی کے بعد بھی زندہ اور قائم رہے گا۔

میں نے کہا کہ غور کیجئے کہ الرسالہ مشن کیا ہے۔ یہ مشن مسلمانوں کے لئے اسلام کو ان کی تازہ دریافت (rediscovery) بنانا چاہتا ہے۔ اس کی اساس داخل پر ہے نہ کہ خارج پر۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں کہ کچھ صاحب صلاحیت افراد کے لئے اسلام کو ان کی ازسرنو دریافت بنا دیں تو خود اسلام ان کے لئے ہر دوسری چیز کا بدل بن جائے گا۔ لوگ جس طرح کسی خارجی سہارے کے زور پر حرکت کرتے ہیں، یہ افراد خود اسلام کے ابدی سرچشمہ سے اپنے آپ کو جوڑ کر مزید شدت کے ساتھ متحرک ہو جائیں گے۔ اور اس طرح یہ مشن خود اپنی اندرونی طاقت کے زور پر زندہ رہے گا۔ انشاءاللہ۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ باتیں تو بہت اچھی اچھی کرتے ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے

سامنے کوئی عملی نقشہ نہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے بتایا کہ ستمبر ۱۹۸۹ میں میں ایک عرب ملک میں تھا۔ وہاں عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر میں نے الرسالہ کے پیغام کا تعارف کرایا۔ آخر میں ایک نوجوان نے کہا کہ میں نے آپ کی عربی مطبوعات پڑھی ہیں اور آج آپ کا خطاب بھی سنا۔ مگر میں یہ نہ سمجھ سکا کہ آپ کا پروگرام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہم پروگرام بنانے والے انسان بنائیں (برنامجنا هو اعداد المبرمجين)

یہ اللہ کا فضل ہے کہ اب الرسالہ مشن بالفعل اس مرحلہ میں پہنچ رہا ہے۔ اس کے حلقہ میں پروگرام ساز انسان بننا شروع ہو گئے ہیں۔ اس کی ایک مثال خود یہ سمپوزیم ہے۔ الرسالہ میں کبھی یہ تصور نہیں دیا گیا تھا کہ لوگ "الرسالہ سمپوزیم" منعقد کریں۔ مگر پٹنہ کے قارئین نے خود اپنی سوچ سے الرسالہ سمپوزیم کی اسکیم بنائی اور کامیابی کے ساتھ اس کو عملی مرحلہ تک پہنچایا۔

اسی طرح متعدد مقامات پر ہمارے ساتھیوں نے بطور خود الرسالہ اکیڈمی، الرسالہ لائبریری جیسی مختلف تحریکیں چلا رکھی ہیں۔ بعض مقامات پر انھوں نے اسکول اور مدرسہ قائم کیا ہے اور اس کو بنیاد بنا کر الرسالہ مشن کی توسیع و اشاعت میں مشغول ہیں۔ اسی طرح باہر کے ملکوں میں کئی مقامات پر اجتماعی انداز میں کام ہو رہا ہے۔ ایک عرب ملک میں خاص اسی مقصد کے لئے دار الرسالۃ الربانیۃ قائم کیا گیا ہے، وغیرہ۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ وقت آرہا ہے جب کہ ملت کے اندر عمومی سطح پر ایک نئی لہر ابھرے۔ لوگ بستی بستی اور شہر شہر میں الرسالہ کی فکر کو پھیلانے کے لئے مختلف تحریکیں اس کے نام سے چلائیں ــــــ مثلاً الرسالہ لائبریری، الرسالہ ریڈرس فورم، الرسالہ اکیڈمی، الرسالہ ریسرچ سنٹر، الرسالہ سمپوزیم، الرسالہ کانفرنس، الرسالہ اسٹڈی سرکل، الرسالہ انفارمیشن سروس، الرسالہ اسپتال، الرسالہ اسکول الرسالہ کالج وغیرہ، وغیرہ۔ لوگ جگہ جگہ اس طرح کے کام شروع کریں۔ حتی کہ انشاء اللہ وہ وقت آئے گا جب کہ کچھ لوگ الرسالہ یونیورسٹی قائم کریں گے، اور ایک نئی تازہ دم ملت بنانے کے لئے اس کو مکمل ادارہ کے طور پر چلائیں گے۔

الرسالہ مشن قوم کی فکری تعمیر کی مہم ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا ہوگا، یہاں تک کہ قوم کے اندر مطلوبہ فکری انقلاب آجائے۔ الرسالہ مشن کی کامیابی یہ ہے کہ وہ ایک عمومی فکری

انقلاب بن جائے۔ اگر وہ عام جماعتوں کی طرح محض ایک تشکیلی ڈھانچہ کے روپ میں زندہ رہا تو کم از کم میں اس کو الرسالہ مشن کی کامیابی نہیں سمجھوں گا۔

ایک صاحب نے فرمایا کہ آپ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ مسلم دشمن طاقتوں کی طرف سے آپ کو مدد ملتی ہے اور آپ ان کے تعاون سے اپنا مشن چلا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ جو شخص بھی غور کرے وہ پائے گا کہ یہ ایک بے بنیاد الزام ہے۔ الرسالہ میں سراسر قرآن و حدیث کی دعوت دی جاتی ہے۔ پھر وہ کون مسلم دشمن اور اعداء اسلام ہیں جو ہم کو اس لئے مدد دے رہے ہیں کہ ہم قرآن و حدیث والے دین کو دنیا میں پھیلائیں۔

پھر میں نے کہا کہ الرسالہ مشن خدا کے فضل سے اتنا طاقت ور ہو چکا ہے کہ وہ خود اپنی بنیاد پر قائم ہے۔ اس کو کسی "دشمن دین" کی مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ مشن کے حامی اور مؤید ساری دنیا میں بڑی تعداد میں پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ آپ نے خود پٹنہ میں آج (۲۸ جولائی ۱۹۹۱) کو دیکھا ہے۔ یہاں سنہا انسٹی ٹیوٹ میں الرسالہ ریڈرس فورم نے شام کو ایک پروگرام رکھا تھا جس میں میری تقریر اسلام اور بقائے باہم کے بارہ میں تھی۔ اتفاقاً ایسا ہوا کہ جس وقت انسٹی ٹیوٹ کے ایک ہال میں میری تقریر تھی، ٹھیک اسی وقت انسٹی ٹیوٹ کے دوسرے ہال میں بہار کے چیف منسٹر مسٹر لالو پرشاد کی تقریر تھی۔

دونوں ہال گراؤنڈ فلور پر ہیں اور پاس پاس ہیں۔ حسب معمول دوسرے ہال میں زبردست دھوم تھی۔ پولیس اور سرکاری لوگ بڑی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے ہال کی تمام سیٹیں بھر گئیں۔ بہت سے لوگوں کو کھڑا ہونا پڑا۔ لمبی تقریر کے دوران مکمل خاموشی تھی۔ آخر وقت تک لوگ نہایت سکون کے ساتھ تقریر کو سنتے رہے۔ سامعین میں تقریباً نصف ہندو اور نصف مسلمان تھے۔ خود سنہا انسٹی ٹیوٹ کے کئی لوگ، مثلاً پروفیسر ڈی ڈی گرو (Dr. D.D. Guru) بھی شروع سے آخر تک اس میں شریک رہے۔

میں نے کہا کہ جس مشن میں یہ طاقت ہو کہ وہ لوگوں کو مجبور کرے کہ وہ چیف منسٹر کے اپنے صدر مقام پر چیف منسٹر کا پروگرام چھوڑ کر اس کا خطاب سننے کے لئے آئیں، اس کو چلانے کے لئے کسی "دشمن دین" کی مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اپنے زور پر چل سکتا ہے اور قائم ہو سکتا ہے۔ انشاء اللہ العزیز

۱ کچھ عرب نوجوانوں نے قاہرہ میں دار الرسالۃ الربانیۃ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس کا خاص مقصد اسلامی مرکز کے فکر کی عرب دنیا میں اشاعت ہے۔ اس ادارہ نے حال میں "منہج الہدایۃ" کے نام سے ایک عربی کتاب شائع کی ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلامی مرکز کے دینی نقطۂ نظر کا تعارف تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس میں کل پندرہ ابواب ہیں۔ پہلے باب کا عنوان الرسالۃ القرآنیۃ ہے اور آخری باب کا عنوان البدایۃ الصحیحۃ۔

۲ الجزائر کے ایک باشندہ جو فرانس میں مقیم ہیں اور فرانسیسی زبان بخوبی جانتے ہیں، صدر اسلامی مرکز کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: مجھے الجزائر میں الرسالہ انگریزی کا شمارہ نمبر ۴۹ بابت مارچ ۱۹۸۸ ملا۔ میں نے اپنے ایک ساتھی سے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کروایا۔ اس کو پڑھ کر میرے اندر دعوت اسلامی کے کام کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ اجازت دیں تو الرسالہ کو مستقل طور پر فرانسیسی زبان میں منتقل کر کے یہاں سے شائع کیا جائے۔ اس کے علاوہ آپ کی دوسری کتابوں کا بھی فرانسیسی ترجمہ چھاپا جائے۔ میرے مذکورہ ساتھی اس کام کے لئے بخوشی تیار ہیں۔ مکتوب نگار کا نام و پتہ یہ ہے:

Mr. Laib, A.I.F. Quartier, De Le Breadasque,
Route De Berre, Aix-En-Provence 13090, France

۳ دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) آر ایس ایس کے ماتحت ایک بڑا ادارہ ہے۔ اس کا ایک ماہنامہ "منتھن" کے نام سے نکلتا ہے۔ منتھن کے اڈیٹر ڈاکٹر شرما صدر اسلامی مرکز سے ملے تھے اور عید الاضحی کے موضوع پر ایک مضمون کی فرمائش کی تھی۔ ان کو ہندی میں یہ مضمون فراہم کیا گیا جس کو انھوں نے منتھن (جون ۱۹۹۱) میں مکمل طور پر شائع کیا ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو الرسالہ ماہ جولائی میں اسی عنوان سے چھپا ہے۔

۴ محمد ہارون رشید صاحب (مرشد آباد) نے مطلع کیا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ بنگالی خاتون نے الرسالہ انگریزی اور دوسری انگریزی مطبوعات کا مطالعہ کیا۔ ان سے وہ گہرے طور پر متاثر ہوئیں۔ وہ الرسالہ

انگریزی کے منتخب مضامین کا ترجمہ بنگلہ زبان میں کرکے انھیں بنگالی اخباروں میں شائع کرا رہی ہیں۔

۵ ایک صاحب خیر مسلمان نے اپنی طرف سے زر تعاون ادا کرکے نصف درجن مدرسوں اور لائبریریوں کے نام الرسالہ جاری کروایا ہے۔ اسی طرح مختلف حضرات جاری کراتے رہتے ہیں۔ تاہم ابھی اس کام میں بہت زیادہ توسیع اور اضافہ کی ضرورت ہے۔ جو حضرات اس کار خیر میں حصہ لے سکیں وہ دفتر سے خط وکتابت فرمائیں۔

۶ جموں کے علاقہ (پونچھ راجوری) میں الرسالہ مشن سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ اسکول اور مدرسہ قائم کرکے تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ اس سے بیک وقت دو فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ اس طرح وہ قوم کے افراد کو تعلیم یافتہ بنا رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسکول اور مدرسہ کے ذریعہ انھیں ایک بیس (base) مل جاتی ہے جو الرسالہ مشن کے لئے مختلف پہلوؤں سے مددگار ہے۔ یہ نہایت مفید تجربہ ہے۔ دوسرے مقامات کے ساتھیوں کو بھی اسی انداز پر کام کرنا چاہئے۔

۷ آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی سے ۲۳ جون ۱۹۹۱ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ عید اضحیٰ سے متعلق تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ عید اضحیٰ محض قدیم زمانہ کی ایک رسم نہیں، وہ زندگی کا ایک ابدی پیغام ہے۔

۸ مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ (تھنہ منڈی) اور مسلم انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن (راجوری) ان دونوں تعلیمی اداروں نے "اسلامی تعلیمات" کو باقاعدہ طور پر داخل نصاب کر لیا ہے۔ چھٹی کلاس سے اوپر کلاسوں کے طلبہ کو وہ سبق کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔

۹ ایک ادارہ نے الرسالہ مشن کے خلاف ساڑھے تین سو صفحہ کی ایک کتاب چھاپی ہے۔ قارئین الرسالہ کے ایک تعلیم یافتہ حلقہ نے اس کتاب کو خریدا اور اجتماعی طور پر اس کا مکمل مطالعہ کیا۔ مطالعہ کے بعد انھوں نے پایا کہ یہ بالکل لغو کتاب ہے۔ وہ اس کتاب کو لے اسلامی مرکز میں آئے تاکہ اس کو صدر اسلامی مرکز کے سامنے جلائیں۔ صدر اسلامی مرکز نے ان کو منع کیا اور کہا کہ آپ یہ کتاب کسی اور شخص کو دے دیں تاکہ وہ اس کو پڑھ کر اس کی لغویت سے آگاہ ہو سکے۔ کیونکہ یہ کتاب اپنی تردید آپ ہے۔

۱۰ تامل ناڈو کے ایک ادارہ نے "روشن مستقبل" کا ترجمہ تامل زبان میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب چھوٹے سائز پر ہے اور ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ناشر کا پتہ یہ ہے:

Darul Marashid, B-45 Ahmadia Nagar, Pallapatti 639205

۱۱ امریکہ سے ایک صاحب نے مطلع کیا ہے کہ "یہاں ہم نے ایک صاحب کو تیار کیا ہے جو کہ ان شاء اللہ ہر جمعہ اور اتوار کے دن الرسالہ انگلش اور الرسالہ اردو کی ممبر شپ بڑھانے کے لئے کام کریں گے۔ اسی کے ساتھ ان کو مرکز کی چھپی ہوئی سب کتابیں بھی دے دی ہیں۔ ان کو بھی وہ لوگوں کو دکھا کر انھیں لوگوں کے درمیان پھیلائیں گے۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ اس میں ہمیں کامیابی ہوگی"

۱۲ محمد افسر الدین فاروقی صاحب (رتلام) نے اپنے یہاں کی مسجد میں جمعہ کے دن "پیغمبر انقلاب" پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ اس میں ایک سال لگے۔ ایک سال میں پوری کتاب پڑھ کر سنائی۔ اسی طرح بہت سے لوگ جگہ جگہ مختلف کتابیں پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ اس طرح یہ پیغام عمومی سطح پر پہنچ رہا ہے۔

۱۳ متعدد مقامات سے یہ خبریں ملی ہیں کہ وہاں الرسالہ مشن کے لوگ اور تبلیغی جماعت کے لوگ مل کر کام کر رہے ہیں۔ یہ بہت اچھی علامت ہے۔ اس طرح دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت ملے گی اور دینی احیاء کا کام زیادہ موثر طور پر ہو سکے گا۔ ضرورت ہے کہ اسی انداز پر ہر جگہ کام کیا جائے۔

۱۴ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں سائنس کا طالب علم ہوں۔ سائنس نے میرے دل ودماغ سے اسلام کا تصور بالکل نکال دیا تھا۔ مگر کہاں سے وہ زبان لاؤں کہ اس رب جلیل کا شکر ادا کروں جس نے میرے اندر آپ کا لٹریچر پڑھنے کا دھیان پیدا کیا۔ شکر اس پروردگار کا کہ اس کو پڑھنے کے بعد نہ صرف میرے خیالات درست ہو گئے۔ بلکہ اب یہ حال ہے کہ آپ کی کتابیں دوسروں کو پڑھا رہا ہوں (زبیر احمد ختلانی، بارہمولہ)

۱۵ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں آپ کے ماہانہ الرسالہ کا زبردست مداح ہوں۔ الرسالہ نے ہزاروں مسلمانوں کو نیا جوش بخشا ہے تاکہ اسلام کا پھول ہر موسم میں اور ہر ماحول میں کھل سکے۔ یہ مقصد الرسالہ نے کافی آگے بڑھایا ہے (محمد شفیع بٹ، سوپور، کشمیر)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے (ہوائی ڈاک)		(بحری ڈاک)
ایک سال	۶۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ " "	۱۸ " "
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ " "	۲۵ " "
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ " "	۴۰ " "
خصوصی تعاون (سالانہ)	۳۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ "	—

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

دسمبر ۱۹۹۱ ، شمارہ ۱۸۱

نماز کی حقیقت

یہ عصر کی نماز تھی۔ امام نے نماز پوری کر کے سلام پھیرا، تھوڑی دیر بیٹھے اور اس کے بعد دعا کر کے اٹھ گیے۔ ایک مقتدی نے امام صاحب کو روکا۔ اور تضحیک کے انداز میں بولے: "عصر کی نیت کی تھی یا ظہر کی"۔ یہ سن کر تمام نمازی ہنس پڑے جو پہلے ہی سے امام صاحب کو عجیب معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے مذکورہ مقتدی سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "عصر کے وقت تسبیح (فاطمہ) پڑھی جاتی ہے۔ مگر امام صاحب نے تسبیح پڑھے بغیر دعا کر لی اور اٹھ گیے"۔ خیریت یہ ہے کہ امام صاحب نے کسی قسم کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی کے ساتھ اپنے حجرہ میں چلے گیے۔ اگر انھوں نے کوئی تیز جواب دیا ہوتا تو یقیناً بات بڑھتی اور زبانی تنقید باقاعدہ ہاتھا پائی میں تبدیل ہو جاتی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان آج کل نماز کا کیا حال ہے۔ وہ نماز کو صرف اس کے ڈھانچہ کے اعتبار سے جانتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ کچھ لوگ "مسنون" ڈھانچہ کو نماز سمجھے ہوئے ہیں اور کچھ لوگوں نے مبتدعانہ طور پر اس میں کچھ غیر مسنون چیزوں کا اضافہ کر لیا ہے۔

نماز کا بلاشبہ ایک ڈھانچہ ہے۔ مگر نماز کی اصل حقیقت اس کی اندرونی اسپرٹ ہے، اور یہ اندرونی اسپرٹ خشوع ہے۔ حتی کہ اگر کسی کی نماز میں ظاہری ڈھانچہ ہو مگر اس میں خشوع کی کیفیت نہ پائی جائے تو ایسی نماز حدیث کے مطابق نماز ہی نہیں (لا صلوٰۃ لمن لم یتخشع)

ڈھانچہ والی نماز اور خشوع والی نماز کی ایک پہچان یہ ہے کہ جو آدمی ڈھانچہ والی نماز پڑھے، اس کی نظر دوسرے کی نماز پر ہوتی ہے۔ اور جو آدمی خشوع والی نماز پڑھے اس کی نظر اپنی نماز پر۔ پہلی قسم کا آدمی دوسروں کی نماز میں "ٹکنکل" خامی نکال کر ان کے خلاف تقریر کرے گا۔ اور دوسری قسم کا آدمی خود اپنی نماز کی کمیوں کو سوچ کر چپ رہے گا۔ وہ اپنے احتساب میں اتنا زیادہ مشغول ہوگا کہ اس کو یہ فرصت ہی نہ ہوگی کہ وہ دوسروں کی نماز پر تبصرہ کرے۔

نماز اللہ کی یاد کا نام ہے، اور اللہ کی یاد کسی آدمی کے اندر جو کیفیت پیدا کرتی ہے اسی کو خشوع کہا گیا ہے۔

ارکان اسلام

عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بُنی الاسلامُ علی خمس۔ شہادۃِ أن لا الٰہ الا اللہ و أنّ محمداً عبدُہ و رسولُہ واقامِ الصلاۃ وایتاء الزکاۃ والحجِ وصوم رمضان (متفق علیہ)

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

اس حدیث کے مطابق، اسلام میں پانچ چیزیں ستون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح عمارت کچھ ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے، اسی طرح اسلامی زندگی پانچ بنیادی ارکان پر قائم ہوتی ہے۔ یہ پانچ ارکان دراصل پانچ اصول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مومن وہ ہے جو اپنی زندگی کو ان پانچ اصولوں پر قائم کرے۔

کلمۂ شہادت کا مطلب خدا کی خدائی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا اعتراف ہے۔ اس کلمہ کے ذریعہ ایک آدمی خدا کا اس کے تمام صفات کمال کے ساتھ اقرار کرتا ہے۔ وہ محمد عربی کی اس حیثیت کا اقرار کرتا ہے کہ خدا نے ان کو تمام انسانوں کا ابدی رہنما بنایا۔ یہ حقیقت جس کے دل میں اتر جائے وہ اس کی پوری نفسیات میں شامل ہو جاتی ہے۔ ایسے آدمی کا سینہ ہر سچائی کے اعتراف کے لیے کھل جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جس کے لیے کوئی بھی چیز حق کے اعتراف میں رکاوٹ نہ بنے۔

نماز کی اصل تواضع ہے۔ جس آدمی کے اندر نماز کی حقیقت پیدا ہو جائے وہ گھمنڈ اور انانیت جیسی چیزوں سے یکسر خالی ہو جائے گا، اس کا رویہ ہر معاملہ میں تواضع کا رویہ بن جائے گا۔

زکاۃ کی حقیقت خدمت خلق ہے۔ جس آدمی کے اندر فی الواقع زکاۃ کی روح پیدا ہو جائے وہ تمام انسانوں کا خیر خواہ بن جائے گا، وہ ہر ایک کے لیے مفید بن کر زندگی گزارے گا۔

حج کی حقیقت اتحاد ہے۔ جو آدمی سچے جذبہ کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرلے اس کے اندر اختلاف کا مزاج ختم ہو جائے گا۔ وہ اتحاد و اتفاق کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہنے لگے گا۔

روزہ کی حقیقت صبر ہے۔ جو آدمی سچا روزہ دار ہو، وہ اسی کے ساتھ لازماً صبر دار بھی ہوگا۔ اس کے اندر یہ عمومی مزاج پیدا ہو جائے گا کہ وہ ناگواریوں کو برداشت کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان زندگی گزارے۔

عفو و تواضع

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طرح عبادت کے وہ طریقے بتائے جن کو اپنا کر آدمی اللہ کی نظر میں پسندیدہ بن سکتا ہے۔ اسی طرح آپ نے وہ اخلاقی اصول بھی بتائے ہیں جن کو اگر اختیار کر لیا جائے تو انسان دوسرے انسانوں کے درمیان عزت اور سربلندی کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے :

وما زاد اللہُ عبداً بعفوٍ الا عزاً، وما تواضع احدٌ للہ عزوجل الا رفعہُ اللہ تعالیٰ (تفسیر ابن کثیر ۴/ ۱۸۴)

اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کی صرف عزت کو بڑھاتا ہے اور جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے اس کو اللہ تعالیٰ صرف اونچا ہی کرتا ہے۔

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص برائی کرے اور اس سے بدلہ نہ لیا جائے تو وہ دلیر ہو جائے گا اور پہلے سے زیادہ برائی کرے گا۔ مگر حدیث رسولؐ اس کے برعکس یہ بتاتی ہے کہ جو شخص برائی کرنے والے کو معاف کر دے تو اس کے بعد معاف کرنے والے کی عزت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

اسی طرح عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں کبھی جھکنا نہیں چاہیے۔ اگر جھکے تو لوگ اور زیادہ جھکانے کی کوشش کریں گے۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع کا انداز اختیار کرو۔ اگر تم تواضع کا انداز اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی مدد سے تم کو اور زیادہ سربلندی حاصل ہو گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عفو اور تواضع کا طریقہ فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اندر انسان کو مسخر کرنے کی طاقت ہے۔ وہ انسان کو اندر سے زیر کر دینے والا ہے۔ جو شخص عفو اور تواضع کا طریقہ اختیار کرے اس نے گویا اس فطرت کو مخاطب بنایا جو ہر آدمی کے اندر اس کے خالق نے رکھ دی ہے۔ جو عین اپنی سرشت کے مطابق حق کے آگے جھکنے اور صاحب حق کا اعتراف کرنے کا مزاج رکھتی ہے۔

فطرت فریق ثانی کے اندر آپ کا نمائندہ ہے۔ جب آپ عفو اور تواضع کا طریقہ اختیار کرتے ہیں تو اپنے اس نمائندہ کو آپ اپنی حمایت میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ طاقت ور حمایت کیا ہو سکتی ہے کہ خود فریق ثانی کے اندر آپ کا ایک حامی کھڑا ہو جائے۔

اپنے خلاف

غِفار، اسلم، جُھَینہ، مُزینہ، خُزاعہ، قدیم عرب کے قبائل تھے۔ وہ سماجی اور معاشی اعتبار سے کمتر سمجھے جاتے تھے۔ ان کا ذریعہ حیات زیادہ تر جانوروں کو چرانا اور ان کی پرورش کرنا تھا۔ ان قبائل کے کچھ افراد مکی دور میں ایمان لائے تو قریش کے معزز لوگوں نے کہا :

لوکان ما جاء بہ محمد خیراً ماسبقتنا الیہ رعاۃ البَھَم اذ نحن اعز منھم

محمد جو کچھ لائے ہیں، وہ اگر خیر ہوتا تو اس کو قبول کرنے میں جانوروں کو چرانے والے ہم سے آگے نہ رہتے جب کہ ہم ان سے زیادہ باعزت ہیں۔

(الجامع لاحکام القرآن، ۱۶/۱۹۰)

مکہ میں جن لوگوں نے آپ کو مانا اور آپ کے ساتھی بن گیے، ان میں ایک تعداد غلاموں کی تھی۔ مثلاً بلال، عمار، صہیب، خباب، وغیرہ۔ ان کے سلسلہ میں بھی قریش کا کہنا یہی تھا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مکہ کے انکار کرنے والے ایمان لانے والوں کی نسبت کہتے ہیں کہ اگر یہ کوئی اچھی چیز ہوتی تو وہ اس کو قبول کرنے میں ہم پر سبقت نہ لے جاتے (الاحقاف ۱۱)

یہ بات درست ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں میں معمولی حیثیت کے لوگ بھی شامل تھے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ کے ساتھیوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اونچی حیثیت کے مالک تھے۔ مثلاً ابوبکر بن ابی قحافہ، عثمان بن عفان، وغیرہ۔ مگر آپ کے مخالفین یہ کرتے کہ وہ پہلی قسم کے لوگوں کا ذکر کرکے آپ کے کام کی تحقیر کرتے۔ وہ دوسری قسم کے لوگوں کا ذکر نہیں کرتے تھے۔

آدمی کو جب کسی سے ضد ہو جاتی ہے تو وہ یہی طریقہ اپناتا ہے۔ وہ اس کے بارہ میں یک رُخا انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے مزعومہ حریف کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ اس کے صرف ان پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے جس میں اسے اپنے حریف کی تحقیر کا موقع مل رہا ہو۔

جو لوگ یہ طریقہ اختیار کریں، وہ دوسرے کے بارہ میں کچھ ثابت نہیں کرتے۔ البتہ خود اپنے بارہ میں ضرور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ راہِ راست پر نہیں ہیں۔ کیوں کہ جو آدمی راہِ راست پر ہو اس کا طریقہ عدل وانصاف کا طریقہ ہوتا ہے نہ کہ ظلم اور تعصب کا طریقہ۔

آدمی سب سے زیادہ اس وقت پہچانا جاتا ہے جب کہ اس کو کسی سے اختلاف پیدا ہو جائے۔

انعام سے محروم

ایرانی شاعر فردوسی طوس میں ۹۳۵ء میں پیدا ہوا۔ ۱۰۲۶ء میں اس کی وفات ہوئی۔ فردوسی نے ۳۰ سالہ محنت سے وہ منظوم کتاب تیار کی جو شاہنامہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ۶۰ ہزار اشعار ہیں اور اس میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے احوال بتائے گیے ہیں۔ فردوسی نے یہ کتاب سلطان محمود غزنوی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ محمود غزنوی نے خوش ہو کر فردوسی کو ۶۰ ہزار سونے کا سکہ دینے کا حکم دیا۔ مگر فردوسی شیعہ تھا۔ سلطان کے سُنّی وزیر احمد بن حسن میمندی کی ایک سازش کے تحت فردوسی کو سونے کے سکہ کے بجائے چاندی کے ساٹھ ہزار سکے پیش کیے گیے۔ فردوسی کو یہ بات ناپسند ہوئی۔ اس نے انعام کی رقم وہیں لوگوں میں تقسیم کر دی اور خالی ہاتھ گھر واپس چلا آیا۔ اس کے بعد اس نے سلطان محمود غزنوی کی "ہجو" میں ایک نظم لکھی۔

فردوسی کے واپس جانے کے بعد ایاز کے ذریعہ یہ ہجو سلطان کو ملی۔ اس ہجو کے ذریعہ سلطان کو اپنے وزیر کی سازش کا علم ہوا۔ اس نے وزیر کو قید کر دیا اور اپنے خاص آدمی کے ذریعہ دوبارہ ۶۰ ہزار سونے کے سکے فردوسی کے لیے روانہ کیے۔ مگر فردوسی کے لیے اپنے شاہنامہ کا مطلوبہ انعام پانا مقدر نہ تھا۔ انعام کی رقم اس کے وطن اس وقت پہونچی جب کہ فردوسی کا انتقال ہو چکا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوتے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ انعام کی رقم طوس حفاظت کے ساتھ پہونچ گئی مگر اشرفیوں سے لدے ہوئے اونٹ جس وقت شہر کے ایک دروازے سے داخل ہو رہے تھے، فردوسی کا جنازہ دوسرے دروازہ سے قبرستان لے جایا جا رہا تھا:

The indigo reached Tus in safety; but as the camels were entering the town by one gate, Ferdowsi's bier was being carried out through another (7/234).

فردوسی کی یہ کہانی ہر آدمی کی کہانی ہے۔ یہاں ہر آدمی محنت کرتا ہے۔ وہ ساری عمر محنت کرکے ایک کام کرتا ہے۔ مگر جب وہ وقت آتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی اس محنت کا آخری انعام پائے تو موت اس کو موجودہ دنیا سے جدا کر دیتی ہے وہ محنت کے باوجود اپنی محنت کا انعام پانے سے محروم رہتا ہے۔

جو لوگ آخرت کے لیے محنت کریں۔ جو دنیا کو دار العمل سمجھیں اور آخرت کو دار الجزاء۔ ایسے لوگوں کے لیے محرومی یا مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

اختیار اور بے اختیاری

مشہور سائنسداں آئن سٹین نے طبیعیاتی دنیا کے اصول کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا ہے ——
توانائی نہ پیدا کی جاسکتی اور نہ ختم کی جاسکتی :

Energy can neither be created nor destroyed.

یہ واقعہ خالق کی قدرت کاملہ کا ثبوت ہے۔ انسان موجودہ دنیا کو صرف استعمال کر سکتا ہے۔ وہ اس کو بدلنے یا اس کو مٹانے پر قادر نہیں۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ انسان اس دنیا میں مالک کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ صرف تابع کی حیثیت سے ہے۔ اسی صورت حال کو مذہب کی اصطلاح میں امتحان کہا جاتا ہے۔ انسان اس دنیا میں صرف اس لیے آتا ہے تاکہ وہ محدود مدت میں یہاں رہ کر اپنے امتحان کا پرچہ پورا کرے۔ اس کے بعد وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ اس سے زیادہ کسی اور چیز کا اس کو مطلق اختیار نہیں۔

بعض انسان دنیا کے حالات سے مایوس ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے آپ کو ختم یا معدوم کر رہے ہیں، مگر ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جس طرح دنیا کی اُس توانائی کو مٹایا نہیں جاسکتا جو مادہ کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے۔ اسی طرح یہاں اس توانائی کو مٹانا بھی ممکن نہیں جو انسان کی صورت میں متشکل ہوتی ہے۔ انسان کے اختیار میں خودکشی ہے، مگر انسان کے اختیار میں معدومیت نہیں۔ یہ صورت حال علامتی طور پر بتاتی ہے کہ انسان کا معاملہ اس دنیا میں کیا ہے۔

انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حقیقت واقعہ کا انکار کر دے۔ مگر حقیقت واقعہ کو بدلنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ سرکشی کرے مگر سرکشی کے انجام سے اپنے آپ کو بچانا اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کو اختیار ہے کہ وہ اخلاقی پابندی کو قبول نہ کرے مگر اخلاق کی مطلوبیت کو کائنات سے حذف کرنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے مگر اس کو یہ اختیار نہیں کہ اپنے چاہنے ہی کو وہ اُس معیاری اصول کی حیثیت دے دے جس کے مطابق بالآخر تمام انسانوں کا فیصلہ کیا جانے والا ہے۔

انسان اس دنیا میں آزاد ہے، مگر اس کی آزادی محدود ہے نہ کہ لامحدود۔

محنت کے ذریعہ

باپسی سدھوا (Bapsi Sidhwa) ایک پارسی خاتون ہیں۔ وہ پاکستان (لاہور) کی رہنے والی ہیں۔ آج کل وہ ٹکساس (امریکہ) کی یونیورسٹی آف ہاؤسٹن میں استاد ہیں۔ انگریزی زبان میں ان کی لکھی ہوئی کتابیں (ناولیں) انٹرنیشنل سطح کے پبلشنگ اداروں میں چھپتی ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ باپسی سدھوا کی رسمی تعلیم بالکل نہیں ہوئی۔ وہ اپنے وطن لاہور کے ایک اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کررہی تھیں کہ ان کو پولیو کی بیماری ہوگئی۔ ان کے والدین نے ان کے لیے باضابطہ تعلیم کو ناممکن سمجھ کر ان کو اسکول سے اٹھالیا۔ اس کے بعد وہ ٹیوٹر کے ذریعہ اپنے گھر پر پڑھنے لگیں۔ مگر ٹیوٹر کا سلسلہ بھی بہت زیادہ دن تک باقی نہیں رہا۔

اب باپسی سدھوا کا شوق ان کا رہنما تھا۔ وہ خود سے پڑھنے لگیں۔ وہ ہر وقت انگریزی کتابیں پڑھتی رہتیں۔ اپنے الفاظ میں، وہ کبھی سیر نہ ہونے والی قاری (Voracious reader) بن گئیں۔ آخر انھوں نے اپنی محنت سے یہ درجہ حاصل کرلیا کہ وہ انگریزی میں مضامین لکھنے لگیں۔ مگر دو سال تک یہ حال تھا کہ انھیں اپنے بھیجے ہوئے مضمون کے جواب میں صرف انکاری تحریریں (Rejection slips) ملتی تھیں۔ ان کی پہلی کتاب کا مسودہ آٹھ سال تک ان کی الماری میں پڑا ہوا گرد آلود ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ان پر مایوسی کے دورے پڑنے لگے۔

آخر کار حالات بدلے۔ ان کے مضامین باہر کے میگزینوں میں چھپنے لگے۔ اب وہ عالمی سطح پر پڑھی جانے والی انگریزی رائٹر بن چکی ہیں۔ رسمی ڈگری نہ ہونے کے باوجود وہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں تخلیقی تحریر (Creative writing) کا مضمون پڑھارہی ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ فروری ۱۹۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ تمام علوم محنت کی درسگاہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ تمام ترقیاں محنت کی قیمت دے کر حاصل ہوتی ہیں۔ اور محنت وہ چیز ہے جو ہر آدمی کو حاصل رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اس آدمی کو بھی جس کو بیماری نے معذور بنادیا ہو، جو کالج اور یونیورسٹی کی ڈگری لینے میں ناکام ثابت ہوا ہو۔

محنت ایک ایسا سرمایہ ہے جو کبھی کسی کے لیے ختم نہیں ہوتا۔

تخلیقی صلاحیت

یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک تعلیم یافتہ ہونے کی پہچان کیا ہے۔ پروفیسر نے جواب دیا ـــــ وہ شخص جو نہیں سے ہیں کی تخلیق کر سکے:

The person who can create thing out of nothing.

یہ تعریف نہایت صحیح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی آدمی کے تعلیم یافتہ اور باشعور ہونے کی سب سے زیادہ خاص پہچان یہی ہے کہ وہ کوئی نئی چیز دریافت کر سکے۔ بظاہر "نہیں" کے حالات میں وہ "ہے" کا واقعہ ظاہر کر سکے۔

اس خصوصیت کا تعلق زندگی کے ہر میدان سے ہے۔ خواہ علم کا میدان ہو یا تجارت کا۔ سماجی معاملات کی بات ہو یا قومی معاملات کی۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں وہی شخص بڑی ترقی حاصل کر سکتا ہے جو اس انسانی صلاحیت کا ثبوت دے سکے۔

اس دنیا میں آدمی کو خام معلومات سے اعلیٰ معرفت کی دریافت تک پہونچنا ہے۔ اس کو ناموافق حالات میں موافق پہلو کو دریافت کرنا ہے۔ اس کو دشمنوں کے اندر اپنے دوست کا پتہ لگانا ہے۔ اس کو ناکامیوں کے طوفان میں کامیابی کا سفر طے کرنا ہے۔ اس کو یہ ثبوت دینا ہے کہ وہ زندگی کے کھنڈر سے اپنے لیے ایک نیا شاندار محل تعمیر کر سکتا ہے۔

جو لوگ اس تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دیں وہی صحیح معنوں میں انسان کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اور جو لوگ اس تخلیقی صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکیں وہ باعتبار حقیقت حیوان ہیں خواہ بظاہر وہ انسانوں جیسا لباس پہنے ہوئے ہوں۔

یہ تخلیق (creativity) ہی کسی شخص یا قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہی چیز اس کو موجودہ دنیا میں اعلیٰ مقام عطا کرتی ہے۔ جو لوگ تخلیق کی صلاحیت کھو دیں، وہ کسی اور چیز کے ذریعہ یہاں اپنا مقام نہیں پا سکتے۔ خواہ وہ کتنا ہی شور و غل کریں۔ خواہ ان کے فریاد و احتجاج کے الفاظ سے تمام زمین و آسمان گونج اٹھیں۔ وہ لاؤڈ اسپیکروں کا شور تو برپا کر سکتے ہیں، مگر وہ استحکام کا خاموش قلعہ کبھی کھڑا نہیں کر سکتے۔

موت کا سفر

ایک ہوائی جہاز ایک مغربی ملک کے ایرپورٹ پر پہنچا۔ وہاں جو مسافر اترے، ان میں ایک شخص وہ تھا جس کے استقبال کے لیے وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ اسی کے ساتھ ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا، جس کے بارہ میں مقامی پولیس کو پیشگی اطلاع مل چکی تھی کہ وہ ایک مطلوب مجرم ہے، چنانچہ جیسے ہی وہ ہوائی جہاز سے باہر آیا، اس کو وہاں گرفتار کرلیا گیا۔ ایک مسافر ہوائی جہاز سے نکل کر گیسٹ ہاؤس میں پہنچا، اور دوسرا مسافر جیل خانہ میں۔

یہ واقعہ تمثیل کے روپ میں اس زیادہ بڑے واقعہ کو بتا رہا ہے جو موت کے بعد ہر آدمی کے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ ہر آدمی پر یہ وقت آنے والا ہے کہ ایک دن موت کے فرشتے اپنی سواری لے کر اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اس وقت آدمی سے کہا جائے گا اپنے دنیوی گھر کو چھوڑ کر اس میں بیٹھو۔ آدمی مجبور ہوگا کہ وہ اس سواری میں بیٹھے۔ اس کے بعد فرشتے اس سواری کو لے کر روانہ ہوں گے۔ یہ سواری دنیا سے روانہ ہوگی اور آخرت میں پہنچ کر ٹھہر جائے گی۔

جب آدمی اپنی سواری سے نکل کر آخرت کی دنیا میں اترے گا تو کوئی شخص پائے گا کہ وہاں استقبال کے فرشتے پُرشوق انداز میں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور کوئی شخص دیکھے گا کہ گرفتاری کے فرشتے وہاں اس کے منتظر ہیں۔ ایک شخص کو اعزاز کے ساتھ لے جاکر جنّت میں پہنچا دیا جائے گا۔ اور دوسرے شخص کو مجرم کی طرح گرفتار کرلیا جائے گا، اور پھر اس کو جہنم کے عذاب خانہ میں ڈال دیا جائے گا تاکہ وہاں وہ ابدی طور پر پڑا رہے۔

ہر آدمی جو پیدا ہوا اور مرگیا، اس پر ان میں سے کوئی ایک انجام بیت چکا ہے۔ اور ہر آدمی جو زندہ ہے، اس پر ان میں سے کوئی ایک انجام بیتنے والا ہے۔ ہر آدمی دو انتہائی انجام میں سے کسی ایک انجام کے کنارے کھڑا ہوا ہے، اور کسی بھی لمحہ وہ اس سے دوچار ہونے والا ہے۔

یہ بلاشبہہ کسی انسان کا سب سے زیادہ نازک معاملہ ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جو ہر انسان کو آخری حد تک تڑپا دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے کہ آدمی کو اگر واقعی اس کا احساس ہو تو اس کی پوری زندگی بدل جائے۔

براگمان کرنا

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ نے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون اور اس کی آبرو کو حرام کر دیا ہے اور یہ بھی حرام کیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے بارہ میں براگمان کرے (ان اللہ حَرَّمَ من المسلم دمہ وعرضہ وان یظُنّ بہ ظنّ السوء، تفسیر قرطبی)

اس قسم کی ہدایات کا نتیجہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب گمان قائم کرنے کے بارہ میں بے حد حساس تھے۔ وہ اس معاملہ میں آخری حد تک احتیاط برتتے تھے کہ کسی کے بارہ میں غلط گمان اپنے ذہن میں قائم کریں۔ حسن بصری تابعی نے بعد کے لوگوں سے کہا کہ پہلے ہم ایسے زمانہ میں تھے کہ بدگمانی کو حرام سمجھا جاتا تھا۔ اور آج بدگمانی اتنی ہلکی چیز بن گئی ہے کہ تم کسی کے بارہ میں جو غلط رائے چاہو قائم کر لو (کنّا فی زمن الظن بالناس فیہ حرام وانت الیوم فی زمن ظنّ فی الناس ماشئت)

بدگمانی اکثر اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ ایک واقعہ کو غلط رنگ دیدیا جاتا ہے۔ ایک بار حضرت سلمان فارسی اور ان کے دو ساتھیوں کو کھانے کی ضرورت پیش آئی۔ ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ موجود نہ تھا۔ حضرت سلمان فارسی حضرت اسامہ کے پاس گیے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خازن تھے۔ حضرت سلمان نے ان سے کھانا طلب کیا۔ مگر اتفاق سے اس وقت سب کھانا ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ کوئی کھانے کی چیز انھیں نہ دے سکے۔ حضرت سلمان جب اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف لوٹے اور ان کو قصہ بتایا تو دونوں نے کہا کہ اسامہ کے پاس کھانا موجود تھا مگر انھوں نے بخل سے کام لیا (قد کان عندہ لکنہ بخل)

مذکورہ دونوں افراد اگر حضرت اسامہ کے انکاری جواب کو عذر پر محمول کرتے تو وہ بدگمانی میں نہ نہ پڑتے۔ مگر انھوں نے ان کے جواب کو بخل سمجھا اس لیے وہ ایک صالح انسان کے بارہ میں بدگمانی میں پڑ گیے۔ اس طرح کی بدگمانی اسلام میں سراسر حرام ہے۔ آدمی پر لازم ہے کہ اس طرح کے معاملات میں وہ اپنے بھائی کے بارہ میں اچھی رائے قائم کرے ورنہ خاموش رہے۔ اس کے سوا کوئی تیسرا رویہ اس کے لیے درست نہیں۔

تکمیل ایمان

عن ابی امامۃ ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : مَن احبَّ لِلّٰہ و اَبغضَ لِلّٰہ وأعطی لِلّٰہ و منع لِلّٰہ فقد استکملَ الایمان (رواہ ابوداؤد)

ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے دشمنی کی اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

آدمی کلمہ کے الفاظ ادا کرکے ایمان کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا ایمان اللہ کی نظر میں اس وقت مکمل ہوتا ہے جب اس کے اندر مذکورہ خصوصیات پیدا ہو جائیں۔

آدمی کے ایمان کی تکمیل یہ ہے کہ اس کی پوری شخصیت اس ایمان میں ڈھل جائے جس کا اس نے اپنی زبان سے اقرار کیا ہے۔ ایمان کے بعد اس کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کے جذبات کا مرکز ومحور ایک اللہ کی ذات بن جائے۔ وہ کسی کو چاہے تو خدا کے لیے چاہے۔ کسی کو نہ چاہے تو خدا کے لیے نہ چاہے۔ کسی کو کچھ دے تو خدا کے لیے دے اور کسی کو دینے سے رکے تو اس لیے رکے کہ خدا نے اس کو دینے سے منع کیا ہے۔

دنیا میں آدمی کی پوری زندگی انھیں چیزوں کے تحت گزرتی ہے۔ وہ کسی سے محبت کرتا ہے اور کسی سے نفرت، وہ اپنا اثاثہ کسی کو دیتا ہے اور کسی کو دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ یہ محبت اور نفرت اور یہ دینا اور نہ دینا اگر اپنی ذاتی پسند کے تابع ہو تو وہ غیر مومنانہ روش ہے اور اگر وہ خدا کی مرضی کے تابع ہو تو اسی کا نام مومنانہ روش ہے۔

اس معاملہ میں کوئی شخص جتنا زیادہ اپنے رویہ کو خدا کے ماتحت کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ کامل ہوتا چلا جائے گا اور جتنا زیادہ اس معاملہ میں وہ کمی کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ خدا کے نزدیک ناقص قرار دیا جائے گا۔

آدمی اس دنیا میں اپنے تمام معاملات محبت اور نفرت کے جذبہ کے تحت کرتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ اس محبت اور نفرت کا اللہ کی مرضی کے تابع ہونا مومنانہ روش ہے، اور اس محبت اور نفرت کا ذاتی خواہش کے تابع ہونا غیر مومنانہ روش۔

بے خبری

امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶ - ۱۸۶۹) لبنان میں پیدا ہوئے۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھے۔ پہلی بار جب ان کی ملاقات سید جمال الدین افغانی سے ہوئی تو انھوں نے امیر شکیب ارسلان کی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر کہا: انا اھنئ ارض الاسلام التی انبتتك (میں اس اسلامی سرزمین کو مبارکباد دیتا ہوں جس نے تم کو جنم دیا

امیر شکیب ارسلان عربی، ترکی، فرانسیسی، انگریزی وغیرہ زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے یورپ کے ملکوں کا دورہ کیا اور وہاں عرصہ تک مقیم رہے۔ ان کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے بارہ میں لکھتے ہیں کہ مطالعہ سے زیادہ کوئی چیز مجھے اس دنیا میں محبوب نہیں۔ ایک ظریف نے کہا ہے کہ میں انگور کھانے سے کبھی نہیں اکتاتا، خواہ میرے پیٹ میں تکلیف ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اسی طرح میں مطالعہ سے کبھی نہیں اکتاتا، خواہ میری آنکھوں میں جلن کیوں نہ پیدا ہو جائے (ذکری الامیر شکیب ارسلان، صفحہ ۲۴)

امیر شکیب ارسلان کی آخری دریافت یہ تھی کہ مغرب کا سیاسی استعمار عالم اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ وہ ساری عمر مغربی استعمار کے خلاف قلمی جہاد کرتے رہے۔ مجلہ السیاسۃ (بیروت) میں ایک بار ان کے ایک ہمدرد نے انھیں مشورہ دیا کہ زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ استعماری حکومتوں سے مصالحت کا انداز اختیار کرتے ہوئے کام کیا جائے۔ اس پر امیر شکیب ارسلان بگڑ گئے اور السیاسۃ میں سخت تردیدی مضمون شائع کیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امیر شکیب ارسلان کا نشانہ پورا ہوگیا۔ تمام مسلم ممالک مغرب کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہو گئے۔ مگر عملی صورت حال میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ مغرب کی بالادستی اب بھی زیادہ طاقتور انداز میں قائم ہے۔ حتی کہ ہمارے جن بزرگوں نے مغربی استعمار کو سب سے بڑی برائی سمجھ کر ان کے خلاف سیاسی جہاد کیا تھا، ان کی اولاد دوبارہ بھاگ بھاگ کر انھیں مغربی ملکوں میں جارہی ہیں تاکہ اپنی بہترین صلاحیت کو ان "اسلام دشمنوں" کی خدمت کے لیے وقف کرسکیں۔

امیر شکیب ارسلان اور ان کے جیسے لوگ ان حقائق کو سمجھنے سے کیوں عاجز رہے۔ اس کی وجہ ان کی بے خبری تھی۔ انھوں نے ادب جیسی چیزوں کا مطالعہ کیا۔ مگر انھوں نے تاریخ اور سائنسی علوم کا زیادہ گہرا مطالعہ نہیں کیا۔ اس لیے وہ نہ زمانۂ حاضر کو سمجھ سکے اور نہ وقت کے مطابق قوم کو رہنمائی دینے میں کامیاب ہو۔

نصیحت لقمان

قرآن کی سورہ نمبر ۳۱ کا نام لقمان ہے۔ اس سورہ میں لقمان حکیم کا ذکر ہے اور ان کی وہ نصیحت نقل کی گئی ہے جو انھوں نے غالباً اپنی آخر عمر میں اپنے بیٹے کو کی تھی۔ ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے :

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کا شکر کرو۔ اور جو آدمی اللہ کا شکر کرے تو وہ اپنے ہی لئے شکر کرتا ہے۔ اور جو آدمی ناشکری کرے تو اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے۔ اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے بیٹے، اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانا، بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

اور ہم نے انسان کو اس کی ماں اور باپ کے معاملہ میں تاکید کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا، اور دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا، کہ تو میرا شکر کر اور اپنے والدین کا۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جو تجھ کو معلوم نہیں تو تم ان کی بات کو نہ ماننا۔ اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا۔ اور تم اس آدمی کے راستہ کی پیروی کرنا جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے۔ پھر میں تم کو بتا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے۔

لقمان نے کہا کہ اے میرے بیٹے، کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر ہو، پھر وہ کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو، اللہ اس کو حاضر کر دے گا۔ بے شک اللہ باریک بیں ہے، باخبر ہے۔ اے میرے بیٹے، نماز قائم کرو، اچھے کام کی نصیحت کرو اور برائی سے روکو اور جو مصیبت تم کو پہنچے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ اور لوگوں سے بے رخی نہ کر، اور زمین میں اکڑ کر نہ چل بے شک اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو پست کر۔ بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے (لقمان ۱۲ - ۱۹)

حضرت لقمان کی شخصیت کی تاریخی تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ مفسرین کا عام خیال یہ ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے۔ البتہ ایک صالح اور حکیم انسان تھے۔ ایک رائے کے مطابق، وہ سیاہ فام حبشی تھے اور ان کا زمانہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر پر ایمان لائے ہوئے

تھے اور مومن و صادق تھے۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ربانی حکمت بھی عطا فرمائی تھی۔

حُکم یا حکمت سے مراد فہم اور بصیرت ہے۔ ایک ہے دین کی معلومات ہونا، دوسری چیز ہے دین کی معرفت ہونا۔ معلوماتی واقفیت کا تعلق ظاہری الفاظ سے ہوتا ہے۔ اور عارفانہ بصیرت کا تعلق گہری یافت سے۔ قرآن کے مطابق، حضرت لقمان نہ صرف دین کے مسائل اور احکام سے واقف تھے بلکہ وہ دین میں گہری بصیرت رکھتے تھے۔ وہ معرفت کے درجہ میں خدا کے دین کو پائے ہوئے تھے۔ وہ دین خداوندی کو اس کی گہرائیوں کے اعتبار سے جانتے تھے۔

حضرت لقمان کو جو حکمت عطا ہوئی تھی، اس سے انھوں نے جو سب سے پہلا سبق پایا وہ شکر خداوندی تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ لقمان کو ہم نے یہ حکمت دی کہ اللہ کا شکر ادا کرو۔

غیر حکیم آدمی چیزوں کو جیسا دیکھتا ہے ویسا ہی وہ ان کو مان لیتا ہے۔ اس لئے غیر حکیم آدمی کی نظر ہمیشہ چیزوں کے ظاہر پر اور ان کے سطحی پہلوؤں تک محدود رہتی ہے۔ اس کے برعکس حکیم آدمی چیزوں پر غور کرتا ہے۔ اس طرح وہ چیزوں کی گہرائی تک پہنچتا ہے۔ وہ چیزوں کو ان کے اندر کی حقیقت کے اعتبار سے جان لیتا ہے۔

مثلاً اپنی ذات کے اعتبار سے دیکھئے۔ آدمی ایک زندہ وجود کی حیثیت سے زمین پر چلتا پھرتا ہے۔ وہ طرح طرح کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ غیر حکیم آدمی اپنے اس وجود کو دیکھے گا تو اس کے اندر فخر اور ناز کی کیفیت پیدا ہوگی۔ حتی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے گا۔ مگر حکیم کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا۔

حکیم آدمی اپنے وجود کو دیکھ کر یہ سوچے گا کہ میرا یہ وجود کہاں سے آگیا۔ میں خود تو اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتا۔ پھر میں کیسے ایک مکمل انسان کی صورت میں دنیا میں موجود ہو گیا۔ یہ سوچ اس کو اِس حقیقت تک پہنچائے گی کہ اس کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ یہ دریافت اس کو خدا کے آگے جھکا دے گی۔ وہ کہہ اٹھے گا کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے انسان بنا کر پیدا کیا۔ حالاں کہ میں خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

اسی طرح آدمی اپنے آپ کو ایک زمین پر پاتا ہے۔ یہ زمین ایک اتھاہ کائنات کے اندر ایک حیرت انگیز استثنار ہے۔ وسیع کائنات میں یہ واحد معلوم سیارہ ہے جہاں انسان زندہ رہے اور اپنے لئے تمدن

کی تعمیر کرے۔ اس زمین پر ضرورت کی ہر چیز انتہائی موزوں تناسب اور انتہائی صحیح مقدار میں موجود ہے۔ زمین اگر کائنات کے دوسرے اجسام، مثلاً چاند اور مریخ کی مانند ہو تو یہاں انسان کے لئے زندگی گزارنا ناممکن ہو جائے۔

ایک غیر حکیم آدمی اس قیمتی دنیا کو صرف اس حیثیت سے جانے گا کہ وہ اس کے لئے ترقی کا شاندار میدان ہے۔ وہ دنیا کے مواقع کو استعمال کرکے اپنی زندگی کی تعمیر کرے گا اور سمجھے گا کہ یہ سب میری محنتوں کا نتیجہ ہے۔ مگر حکیم آدمی اس سوچ میں پڑ جائے گا کہ اتنی قیمتی دنیا کیسے ظہور میں آئی۔ انسان خود تو اپنے لئے ایسی مفید اور موافق دنیا نہیں بنا سکتا۔ پھر کس نے اس کو بنایا۔

یہ حکیم آدمی کے سوچنے کا طریقہ ہے۔ اور جو آدمی اس طرح سوچے، اس کو اس کی سوچ خالق کی دریافت تک پہنچا دے گی۔ وہ اپنے خالق کو دریافت کرکے اس کا شکر ادا کرے گا۔ وہ کہہ اٹھے گا کہ خدایا، یہ تیرا کیسا عجیب احسان ہے کہ تو نے میرے لئے ایک ایسی دنیا بنائی جہاں میری ضرورت اور ترقی کا ہر سامان انتہائی کامل صورت میں موجود ہے۔

اسی طرح ہر معاملہ میں غیر حکیم کی نگاہ سطحی پہلوؤں میں اٹک کر رہ جاتی ہے، اس لئے وہ ان سے صحیح سبق نہیں لے پاتا۔ مگر حکیم آدمی چیزوں کی گہرائی میں جاتا ہے۔ اس لئے اس کی نگاہ چیزوں کی گہرائی تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ شکر و سپاس کے جذبہ سے لبریز ہو جاتا ہے۔

شکر سے غافل آدمی اپنی اُس جگہ پر نہیں پہنچتا جو اس کی حقیقی جگہ ہے۔ اس کے برعکس شکر کرنے والا آدمی اپنے اصل مقام کو پالیتا ہے۔ شکر کا مزاج آدمی کو اپنے رب کی پہچان بھی کرا دیتا ہے، اور اسی کے ساتھ خود اپنی پہچان بھی۔

" اور لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا جب کہ وہ اس کو وعظ کہہ رہے تھے " ـــــــ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے جو باتیں کہیں، وہ وعظ کے انداز میں کہیں۔ وعظ سے مراد یہ ہے کہ بھلائی کی تلقین ایسے اسلوب میں کی جائے جو دل کو نرم کرنے والا ہو (هو التذكير بالخير فيما يرق له القلب) مفردات امام راغب۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ بات کو کسی نہ کسی طرح بس سنا دیا جائے۔ یہ صرف کہنا ہے، یہ وعظ و نصیحت نہیں ہے۔ وعظ اس کہنے کا نام ہے جس میں سنجیدگی ہو، دردمندی ہو، خیر خواہی ہو، نرم گفتاری

ہو ، دل کی تڑپ ہو ، اصلاح کا سچا جذبہ ہو ، وغیرہ ۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے جو باتیں کہیں اس میں ان کا انداز صرف کہہ دینے کا نہیں تھا ، بلکہ انھوں نے جو کچھ کہا ، خالص وعظ ونصیحت کے انداز میں کہا۔ اس کے لئے انھوں نے از دل خیزد بر دل ریزد کا اسلوب اختیار کیا۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو پہلی نصیحت کی وہ یہ تھی کہ تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ شرک کی برائی تمام دوسری برائیوں کی جڑ ہے۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کا واقعہ اصلاً دل کے اندر ہوتا ہے ، اور پھر اس کی علامتیں اور اس کے مظاہر خارجی زندگی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ شرک بلاشبہ شکر خداوندی کی ضد ہے۔ ایک شخص جس کے اندر اپنے رب کے لئے شکر کی کیفیت پیدا ہو چکی ہو ، وہ کبھی اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کر سکتا۔ شرک سب سے بڑی ناشکری ہے ۔

آدمی کمپیوٹر کی مانند نہیں ہے۔ اس کے اندر شعور ہے ، اس کے اندر جذبات ہیں ۔ ان خصوصیات کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے اندر خوف اور محبت کے جذبات پاتا ہے۔ اس کے اندر تعظیم اور تقدس کا احساس ابھرتا ہے ۔ اس قسم کے جذبات جو انسان کے اندر پائے جاتے ہیں ، ان کا مرکز اگر ایک خدا کو بنایا جائے تو یہی توحید ہے۔ اور اگر ان جذبات کا مرکز خدا کے سوا کوئی اور چیز بن جائے تو اسی کا نام شرک ہے ۔ موحد کی زندگی کا رخ خدا کی طرف ہوتا ہے اور مشرک کی زندگی کا رخ غیر خدا کی طرف ۔

حضرت لقمان نے کہا کہ " شرک سب سے بڑا ظلم ہے"۔ ظلم کا مطلب ہے ـــــــ کسی چیز کو وہاں رکھنا جو اس کی جگہ نہ ہو (وضع الشئ فی غیر موضعہ) انسان کے اندر کسی کو بڑا ماننے ، کسی کو اپنا سب کچھ سمجھنے ، کسی سے امید اور خوف کرنے کے جو لطیف احساسات ہیں ، ان کو ایک خدا کے لئے وقف کیا جائے تو یہ گویا ان احساسات کو اپنے صحیح مقام پر رکھنا ہوگا۔ اور اگر ان احساسات کو کسی اور کے لئے وقف کیا جائے تو یہ گویا ان احساسات کو غلط مقام پر رکھنا ہوگا ، پہلا آدمی موحد ہے ، اور دوسرا آدمی مشرک۔

اللہ نے انسان کو اس کے والدین کے معاملہ میں حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ اللہ کی شکر گزاری کے بعد انسان کے اوپر فرض ہے کہ وہ اپنے ماں اور باپ کے حقوق ادا کرے۔ ماں اور باپ کے حقوق میں بالقصد کوتاہی کسی حال میں جائز نہیں۔ خدا حقیقی معنوں میں انسان کا پالنے والا ہے ۔ اور ماں باپ مجازی معنوں میں انسان کی پرورش کرنے والے۔

خدائی شریعتوں میں ماں باپ کی خدمت کو بہت ضروری بتایا گیا ہے۔ حقوق کی ادائگی کے اعتبار سے

ان کا درجہ خدا کے بعد ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے انسان، تم میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا حق ادا کرو۔ دونوں کو ایک ساتھ بیان فرمایا۔

اللہ کی حیثیت منعم حقیقی کی ہے۔ مگر اللہ کے بعد کسی انسان کے ساتھ سب سے زیادہ احسان کرنے والے اس کے والدین ہوتے ہیں۔ خاص طور پر آدمی کی ماں بچپن میں کئی سال تک اس کو پالنے اور پرورش کرنے کے لئے جو مصیبت اٹھاتی ہے، وہ کسی بھی آدمی کے سلوک سے بہت زیادہ ہے۔ اس لئے باپ اور خاص طور پر ماں کا حق آدمی کے اوپر بہت زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماں باپ کی طرف سے اگر آدمی کو شکایت پیدا ہو تب بھی ان کے حقوق میں کمی کرنے کی اجازت نہیں۔

اس عام حکم میں صرف ایک استثناء ہے، وہ یہ کہ اگر ماں باپ کا حکم خدا کے حکم سے ٹکرا جائے تو اس وقت خدا کے حکم کو لے لینا ہے اور ماں باپ کے حکم کو چھوڑ دینا ہے۔ تاہم اس انتہائی موقع پر بھی صرف متعین معاملہ کی حد تک ماں باپ کی خلاف ورزی کرنے کا حکم ہے۔ عام انسانی برتاؤ اور خدمت کے معاملہ میں بدستور ماں باپ کے ساتھ وہی بہتر سلوک کرنا ہے جس کے وہ ماں باپ ہونے کی حیثیت سے مستحق ہیں۔ دینی فرائض کے معاملہ میں ان کی حکم عدولی کی جا سکتی ہے مگر دنیوی تعلقات کے معاملہ میں ان کے ساتھ معروف طریقہ کے مطابق ہی برتاؤ کیا جائے گا۔

"اور پیروی صرف ان کے طریقہ کی کرو جو میری طرف متوجہ ہیں۔ آخر کار سب کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ پھر میں تم کو آگاہ کر دوں گا جو کچھ تم دنیا میں کر رہے تھے"— یہ پیروی کے سلسلہ میں نہایت اصولی بات ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ باپ دادا یا قوم کے لوگ جو کچھ کرتے ہیں، بس اسی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ آدمی جانچے اور پرکھے بغیر، جو کچھ اپنے بڑوں کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے، اسی کو خود بھی کرنے لگتا ہے۔ یہ گمراہی کا طریقہ ہے۔ مزید یہ کہ یہ گمراہی کوئی سادہ گمراہی نہیں ہے۔ آخرت میں اس پر سخت پکڑ ہونے والی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی سمجھ کو استعمال کرے۔ وہ ان لوگوں کا پیرو بنے جو سچی دلیل پر ہیں۔ وہ ان کی پیروی نہ کرے جو عصبیت کی بنیاد پر ایک راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف بلاتے ہیں۔

آدمی کے سامنے ہمیشہ دو قسم کے نمونے ہوتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جو اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔ جو

اللہ کی طرف رخ کرکے اپنی زندگی کا سفر طے کر رہے ہوں۔ دوسرے وہ لوگ جو اللہ سے منحرف ہوں۔ جو اللہ کی ہدایت سے بے پروا ہو کر خود ساختہ رخ پر چل رہے ہوں۔ پہلا گروہ حق پر ہے اور دوسرا گروہ ناحق پر۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ پہلے گروہ کے راستے پر چلے، خواہ وہ اس کے غیر ہوں۔ وہ دوسرے گروہ کا نمونہ اختیار نہ کرے، خواہ وہ اس کے اپنے لوگ ہوں۔ خدا تقلید حق کو پسند کرتا ہے نہ کہ تقلید رجال کو۔

اس معاملہ میں حق پرستی کا طریقہ کوئی آسان طریقہ نہیں۔ آدمی جب خالص حق کو اپنا رہنما بناتا ہے تو اس کو لوگوں کی طرف سے بہت سی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ تم نے اپنے اکابر کے راستہ کو چھوڑ دیا۔ تم اپنی قوم کے مسلک سے دور ہو گئے۔ مگر آدمی کو اس قسم کی باتوں کی پروا نہیں کرنا چاہئے۔ آخرکار وہ وقت آنے والا ہے جبکہ خدا تمام حقیقتوں کو ظاہر کر دے۔ اس دن حق پرست لوگ سرخرو ہوں گے، اور باطل کلام بولنے والی تمام زبانیں بند ہو جائیں گی۔ اس دن نہ ان کے پاس الفاظ ہوں گے کہ وہ بولیں اور نہ کوئی سننے والا ہوگا جو ان کی بات کو سنے۔

"کوئی عمل اگر رائی کے دانہ کے برابر ہو اور وہ کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں، پھر بھی اللہ اس کو حاضر کرے گا، اللہ باریک بیں ہے، خبردار ہے۔"

موجودہ دنیا میں آدمی مختلف حالات کے درمیان ہوتا ہے۔ کبھی وہ بظاہر ایک چھوٹا عمل کرتا ہے اور کبھی بڑا عمل۔ کبھی وہ چھپے ہوئے مقام پر ہوتا ہے اور کبھی کھلے ہوئے مقام پر۔ کبھی وہ دور ہوتا ہے اور کبھی قریب۔ اس بنا پر آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ خدا کو اتنے مختلف احوال کی خبر نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ آدمی کی بھول ہے۔ خدا کا خدا ہونا ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ ہر چھوٹے اور بڑے اور ہر کھلے اور چھپے عمل کو جانے۔ وہ ہر نوعیت کے عمل سے پوری طرح باخبر ہو۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر آن اپنے آپ کو اللہ کی نگرانی میں سمجھے۔ وہ اس یقین کے ساتھ دنیا میں رہے کہ اللہ اس کو پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ احساس بیٹھ جائے، ان کی پوری زندگی احتیاط اور ذمہ داری کی زندگی بن جائے گی۔ وہ بولیں گے تو اس احساس کے ساتھ بولیں گے کہ خدا ان کی بات کو سن رہا ہے۔ اور کچھ کریں گے تو یہ سوچتے ہوئے کریں گے کہ خدا ان کو ہر جگہ اور ہر لمحہ دیکھ رہا ہے۔

پھر فرمایا کہ نماز قائم کرو ــــــ آدمی کو جب اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس حقیقت کو دریافت کرتا ہے کہ اللہ ہر لمحہ اس کی نگرانی کر رہا ہے اور آخرکار اس کا حساب لینے والا ہے،

تو فوراً اس کے اندر عبدیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے، وہ اللہ کے آگے اعتراف عجز کے طور پر گر پڑتا ہے۔ اسی کا نام نماز ہے۔ نماز کی حقیقت اللہ کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو چھوٹا کر لینا ہے۔ یہ کیفیت آدمی کے دل کے اندر پیدا ہوتی ہے اور نماز اس کیفیت کو خارجی صورت میں متشکل کرتی ہے۔

پھر فرمایا کہ لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انھیں منکر سے روکو، اور جو مصیبت تم کو پہنچے اس پر صبر کرو۔ یہ بے شک ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

معروف سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو پسندیدہ اخلاق کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ کمزوروں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا۔ معاملات میں انصاف کا طریقہ اختیار کرنا، لوگوں کے درمیان بھائی اور خیر خواہ کی طرح رہنا۔ دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو آدمی چاہتا ہے کہ خود اس کے ساتھ کیا جائے۔

منکر سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو اخلاقی اعتبار سے ناپسندیدہ سمجھی جائیں۔ مثلاً دوسروں کا حق ادا نہ کرنا۔ لوگوں کے ساتھ ظلم اور سرکشی کا رویہ اختیار کرنا، عہد پورا نہ کرنا، فخر و غرور یا کینہ و انتقام کی روش پر چلنا، غصب اور خیانت کو اپنے لئے جائز کر لینا۔ وغیرہ

مومن ایک بااصول انسان ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان اصول پسند انسان کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ اسی اصول پسندی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ مصالحت آمیز رویہ اختیار نہیں کر پاتا۔ وہ لوگوں کو بتاتا ہے کہ انھیں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ کسی کو وہ غلط کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو ٹوکتا ہے اور اس کو صحیح کام کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ حق پر عمل کرنے کے ساتھ حق کا اعلان بھی کرتا ہے۔ اس کے لئے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ بھلائی اور برائی کے معاملہ میں غیر جانب دار بن کر رہ سکے۔

اس کام کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے صبر بہت ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مختلف اسباب سے ایسا ہوتا ہے کہ ناصح کو اپنے مخاطب کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی اس کی روک ٹوک کی وجہ سے لوگوں میں غصہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں اگر ناصح ردعمل کا طریقہ اختیار کرے تو اس کے اور مخاطب کے درمیان نزاع کا ماحول قائم ہو جائے گا، اور نزاع کے ماحول میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام موثر طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

دعوت واصلاح کا کام کوئی چیخ پکار کا کام نہیں۔ یہ بے حد سنجیدہ کام ہے۔ اس کو کرنے کے لئے آدمی کو عام اخلاقی سطح سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔ اس کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو نفع ونقصان اور تعریف وتنقید اور موافقت ومخالفت سے بلند ہو کر کام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

"اور لوگوں کے ساتھ بے رخی نہ کر اور زمین میں اکڑ کر نہ چل۔ بے شک اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔"

آدمی کو جب کوئی ایسی چیز مل جائے جس میں بظاہر وہ دوسروں سے زیادہ دکھائی دیتا ہو۔ مثلاً صحت، مال، عہدہ، طاقت، خاندانی شرف، وغیرہ۔ تو ایسے موقع پر اس کے اندر فخر اور اکڑ کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے وہ دوسروں کے ساتھ تکبر کا معاملہ کرنے لگتا ہے۔ ایسی روش بہت بڑا جرم ہے۔ وہ کسی حال میں اللہ کو پسند نہیں۔

آدمی کو کوئی چیز کم ملے یا زیادہ، دونوں ہی اللہ کی طرف سے ہے۔ دونوں ہی امتحان کا پرچہ ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ دونوں حالتوں میں وہ اپنی ساری توجہ اس پر لگائے کہ وہ اللہ کی آزمائش میں پورا اتر سکے، نہ یہ کہ کم ملے تو پست ہمت ہو جائے اور زیادہ ملے تو گھمنڈ اور برتری میں مبتلا ہو جائے۔ جو آدمی زیادہ پاکر فخر اور اکڑ میں مبتلا ہو جائے وہ بندوں کے سامنے بڑا بننے کی کوشش میں خدا کی نظر میں اپنے کو چھوٹا اور حقیر بنا لیتا ہے، اور جو آدمی خدا کی نظر میں حقیر ہو جائے اس کو پھر کوئی بڑائی ملنے والی نہیں۔

"اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست کر۔ بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔"

"اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر" یہاں ظاہری کیفیت کا لفظ بول کر باطنی کیفیت کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ آدمی کو جب کوئی چیز مل جائے۔ مثلاً صحت، طاقت، دولت، عہدہ، اقتدار، وغیرہ تو اس کے مزاج میں بڑائی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر اس کی چال سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ظاہری چیزوں میں اس کو کم حصہ ملے، وہ کسی نقصان سے دوچار ہو جائے تو اس کی چال میں پست ہمتی اور احساس کمتری کا انداز دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ دونوں ہی چیزیں غلط ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اعتدال پر قائم رہے۔ اس کو کچھ ملے تو وہ فخر والی چال نہ چلے، اور اگر اس سے کچھ کھو جائے تو وہ مایوسی کی چال نہ اختیار کرے۔

اسی طرح انسان کو گدھے کی مانند نہیں ہونا چاہئے۔ گدھا صرف ایک قسم کی آواز نکال سکتا ہے۔ وہ جب بھی بولے گا، کرخت اور بھدی آواز ہی بولے گا۔ لیکن انسان دونوں قسم کی آواز اپنے منھ سے نکالنے پر قادر ہے۔ سخت آواز بھی اور نرم آواز بھی۔ اللہ نے انسان کو اختیار دیا ہے تاکہ وہ اس کو آزمائے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ انسان کو یہ خصوصی کریڈٹ دینا چاہتا ہے کہ اس نے خود اپنے آزادانہ فیصلہ کے تحت کڑی آواز کا طریقہ چھوڑ دیا۔ اور صرف نرم آواز اپنے منھ سے نکالی۔ جو لوگ اپنے ملے ہوئے اختیار کا اس طرح صحیح استعمال کریں وہ اللہ کے یہاں بہت بڑا انعام پائیں گے۔

خلاصۂ کلام

قرآن میں حضرت لقمان کا حوالہ جس طرح دیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک، لقمان کی حیثیت ایک مثالی باپ کی ہے۔ ایک باپ کے جذبات اپنے بیٹے کے بارہ میں کیا ہونے چاہئیں، اس کا بہترین نمونہ حضرت لقمان کی زندگی میں ملتا ہے۔

حضرت لقمان اپنے بیٹے سے نہ ذاتی حقوق کی کوئی بات کہتے اور نہ مادی یا دنیوی مفاد کے بارہ میں اس کو کوئی مشورہ دیتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، تمام تر حق وصداقت کے بارہ میں کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے سے ناصحانہ انداز میں کلام کرتے ہوئے اس کو توحید کی وصیت کی۔ انھوں نے اس کو اللہ کے سامنے جوابدہی کی یاد دلائی۔ انھوں نے اس کو اللہ کی عبادت اور عمل خیر کی تلقین کی۔ انھوں نے اس کو تاکید کی کہ دین کی راہ میں خواہ مشکلات ومصائب پیش آئیں، تم کو ہر حال میں صراط مستقیم پر ثابت قدم رہنا چاہئے۔ کسی حال میں اس سے ہٹنا نہیں چاہئے۔

پھر حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو تاکید کی کہ لوگوں کے درمیان وہ اچھے اخلاق کے ساتھ رہے۔ وہ تواضع اور اعتدال کی روش اختیار کرے۔ اس کی روح میں عبدیت اس طرح شامل ہو جائے کہ اس کا اثر اس کے جسم پر اور اس کے اعضاء وجوارح پر ظاہر ہونے لگے۔ وہ دنیا میں انسان بن کر رہے، وہ گدھے کی مانند نہ ہو جائے۔

" گدھے کی طرح نہ بولو، کیوں کہ گدھے کی آواز سب سے بری آواز ہے " ــــــ حضرت لقمان کے اس قول میں بظاہر صرف گدھے کی آواز کا ذکر ہے۔ مگر آواز کا لفظ یہاں حصر کے طور پر نہیں بلکہ علامت کے طور پر ہے۔ اس کا پورا مطلب یہ ہے کہ تم دنیا میں انسان بن کر رہو، تم گدھے بن کر نہ رہو۔ تم کو اوصاف انسانی کا پیکر ہونا چاہئے نہ کہ اوصاف حیوانی کا پیکر۔

بیٹا کسی آدمی کے لئے اللہ کی ایک نعمت ہے۔ بلکہ وہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ کوئی شخص خود سے اپنے لئے ایک بیٹا پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ صرف اللہ ہے جو کسی کو بیٹا جیسی قیمتی چیز عنایت فرماتا ہے۔ کارخانۂ قدرت کے سوا کہیں اور سے ایک بیٹے کی تخلیق ممکن نہیں۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ اس عظیم نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ جب اس کو اولاد ملے تو اس کو تمام تر اللہ کا عطیہ سمجھے۔ اس عطیہ کی شکر گزاری میں وہ ہمہ تن اللہ کا فرماں بردار بندہ بن جائے اور اپنی اولاد کے لئے بھی یہی چاہے کہ وہ اللہ کی اطاعت و فرماں برداری میں زندگی گزارے۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ ایسا باپ بنے جس کی آنکھوں کی ٹھنڈک یہ ہو کہ اس کا بیٹا صحیح معنوں میں اللہ والا بن کر دنیا میں رہے، وہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ وہ پوری طرح اللہ کا عبادت گزار بن جائے۔ وہ لوگوں کا خیر خواہ ہو۔ وہ تمام بڑوں کے ساتھ اپنے بھائی جیسا سلوک کرے اور تمام چھوٹوں سے وہ معاملہ کرے جو وہ اپنی اولاد کے ساتھ کرتا ہے۔

اللہ سے تعلق جب صحیح معنوں میں پیدا ہوتا ہے تو وہ آدمی سے اس کی انا کو چھین لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی سرکشی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے لگتا ہے۔ لوگ اس کو تکلیف پہنچائیں تب بھی وہ لوگوں کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ لوگوں کے منفی رویہ کے باوجود وہ ان کے ساتھ مثبت رویہ کے اصول پر قائم رہتا ہے۔

ایسا آدمی ہر معاملہ میں اللہ کی پسند کو اپنا رہنما بنا لیتا ہے نہ کہ ذاتی پسند کو۔ وہ ہر ایک کے ساتھ خدا کے مقرر کئے ہوئے اصول کے تحت معاملہ کرتا ہے نہ کہ اپنے نفس سے اٹھنے والی خواہشوں کے تحت۔

رہنمائے حیات

جنوری ۱۹۹۲ کا الرسالہ انشاء اللہ خصوصی نمبر ہوگا۔ اس کا نام "رہنمائے حیات" ہوگا۔ اس میں زندگی کی تعمیری رہنمائی سے متعلق باتیں درج ہوں گی۔ اصحاب ایجنسی مزید مطلوبہ تعداد سے فوراً مطلع فرمائیں۔

مسئلہ کا حل

ستمبر ۱۹۸۹ میں میں ایک بیرونی سفر پر تھا۔ اس سفر کے دوران میری ملاقات ایک شیعہ بزرگ محمد عباس کاظمی سے ہوئی۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب میں وہ لاہور چلے گئے اب وہ ایک پاکستانی شہری کی حیثیت سے لاہور میں رہتے ہیں۔

گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے برصغیر ہند کا ۱۹۴۷ سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے، اور ۱۹۴۷ کے بعد کا بھی۔ یہ بتائیے کہ دونوں زمانوں میں آپ نے کیا فرق پایا۔ انھوں نے غم انگیز لہجہ میں جواب دیا ـــــ بس یہ فرق ہے کہ غیر منقسم ہندستان میں ہندو اور مسلمان کے درمیان جھگڑے ہوتے تھے، اب پاکستان میں شیعہ اور سنی کے درمیان وہی جھگڑے ہو رہے ہیں (الرسالہ مارچ ۱۹۹۰، صفحہ ۳۲ - ۳۳)

اسی نوعیت کا ایک شیعہ سنی جھگڑا کراچی میں ۱۴ جولائی ۱۹۹۱ کو ہوا۔ شیعہ فرقہ کا ایک جلوس سنیوں کی مسجد کے سامنے سے گزرا۔ اس پر سنیوں کو اعتراض ہوا۔ انھوں نے مطالبہ کیا

Policemen in Karachi wielding lathis against Sunni Muslims who tried to block a procession by Shia Muslims outside the Karachi Mosque on Sunday. — AP/PTI

کہ جلوس کی روٹ بدلی جائے۔ شیعہ لوگ روٹ بدلنے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس پر دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی جس میں پولیس کو مداخلت کرنی پڑی۔ مقابل کی تصویر (ٹائمس آف انڈیا ۱۶ جولائی ۱۹۹۱) میں پولیس سنی فرقہ کے لوگوں پر لاٹھی چارج کر رہی ہے جو شیعہ جلوس کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پاکستان اس لئے بنوایا گیا تھا کہ غیر منقسم ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے ہوتے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کے لیڈروں نے کہا کہ ہمیں ایک خطہ چاہئے جہاں سب مسلمان ہوں۔ تاکہ وہاں جھگڑے نہ ہوں اور ہم امن وسکون کے ساتھ رہ سکیں۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ مسلم لینڈ میں بھی وہی تمام جھگڑے جاری ہیں جو صرف ہندو لینڈ کی خصوصیت سمجھے جاتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ جھگڑے کا تعلق ہندو لینڈ اور مسلم لینڈ سے نہیں۔ جھگڑے کا تعلق جھگڑا کرنے والوں کے مزاج سے ہے۔ اگر لوگوں کے اندر تحمل کا مزاج ہو تو کہیں جھگڑا نہیں ہوگا۔ اور اگر تحمل کا مزاج نہ ہو تو ہر جگہ جھگڑا ہوگا، خواہ وہ کوئی بھی جگہ کیوں نہ ہو۔

زندگی خلاف مزاج باتوں کو برداشت کرنے کا نام ہے۔ اس برداشت کے بغیر کہیں بھی امن وسکون کا ماحول نہیں بن سکتا۔ خاندان کے اندر بھی اس کی ضرورت ہے۔ بستی کے اندر بھی اور پورے ملک کے اندر بھی۔ ایک فرقہ کے سماج میں بھی اسی سے امن قائم ہو سکتا ہے اور کئی فرقہ کے سماج میں بھی۔

جہاں بھی کچھ انسان مل کر رہیں، خواہ وہ ایک مذہب اور کلچر کے ہوں یا کئی مذہب اور کلچر کے۔ وہ لازماً ایک دوسرے کے درمیان ٹکراؤ کے مواقع پیدا ہوں گے۔ ان مواقع کی پیدائش کو بند نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان کو نقصان کی حد تک جانے سے روکا جا سکتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب ٹکراؤ کی نوبت آئے تو اس کو حسن تدبیر سے دفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اعراض اور صبر کے ذریعہ اس کو اس کے ابتدائی مرحلہ میں ختم کر دیا جائے۔ اس کے سوا جو بھی صورتیں ہیں وہ سب مسئلہ کو بڑھانے کی صورتیں ہیں نہ کہ مسئلہ کو گھٹانے کی صورتیں۔

جو چیز غیر فطری ہو اس کو آپ کوشش کر کے ختم کر سکتے ہیں۔ مگر ایک فطری چیز کو ختم

کسی حال میں ممکن نہیں۔ سماج کے اندر مختلف افراد اور گروہوں کے درمیان اختلاف کا پیش آنا عین فطری ہے، اس لئے اس کو کسی بھی طرح ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ اس کو انگیز کیا جائے۔ اعراض اور صبر کی تدبیروں سے اس کو اپنے لئے بے ضرر بنا دیا جائے۔

تقسیم (۱۹۴۷) سے پہلے کے دور میں جلوس پر جھگڑے کا ایک واقعہ بمبئی میں ہوا۔ ہندوؤں کا ایک جلوس باجا بجاتا ہوا ایک مسجد کے سامنے سے گزرا۔ اس پر مسجد کے مسلمان متولی نے اعتراض کیا۔ بات بڑھی۔ یہاں تک کہ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ متولی نے انگریز عدالت کے سامنے اپنا یہ دعویٰ پیش کیا کہ ہندوؤں کو اس کی مسجد کے سامنے سے جلوس نکالنے سے روک دیا جائے۔ مقدمہ چلا۔ بمبئی کے ایک مشہور مسلم رہنما نے اس کیس کی وکالت کی۔ ان کی وکالت کامیاب رہی۔ انگریز جج نے یہ فیصلہ دیا کہ مذکورہ مسجد کے سامنے عدالتی حکم کے تحت یہ بورڈ لگا دیا جائے کہ اس کے سامنے ہندوؤں کو جلوس نکالنے کی اجازت نہیں۔

مذکورہ مسلم رہنما اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان خوب مقبول ہوئے۔ ان کو مسلمان اپنا عظیم رہنما اور مسلم ملت کا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ مگر یہ صرف ناسمجھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قیادت نہیں تھی۔ بلکہ برعکس رہنمائی تھی۔ مذکورہ رہنما اگر دانش مند ہوتے تو وہ مسلمانوں سے کہتے کہ جلوس کے مسئلہ کا حل اس کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو برداشت کرنا ہے۔ اس قسم کی چیزیں ہر سماج میں جاری رہیں گی۔ حتی کہ خالص مسلم سماج میں بھی۔ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جائے نہ کہ بے فائدہ طور پر ان سے الجھا جائے۔

ایک بچہ نے پھول توڑا۔ اس کا ہاتھ کانٹے سے زخمی ہوگیا۔ وہ روتا ہوا اپنے باپ کے پاس آیا۔ اب یہ باپ کی نادانی ہوگی اگر وہ پھول کے درخت سے کانٹے کا وجود ختم کرنے کی مہم چلائے۔ اس کے برعکس اس کو چاہئے کہ خود اپنے بیٹے سے کہے کہ اس دنیا میں ہر پھول کے ساتھ کانٹا موجود رہے گا۔ اس لئے تم کانٹے کے ساتھ جینا سیکھو نہ یہ کہ کانٹے کا وجود مٹانے کی بے فائدہ کوشش کرو۔

بمبئی کے واقعہ میں مسلم قیادت اگر مسلمانوں کو صحیح رہنمائی دیتی تو آج مسلمانوں کی تاریخ دوسری ہوتی۔ مگر غلط رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سو سال سے جلوس کے جھگڑوں میں مبتلا ہیں، ہندستان میں بھی اور اسی طرح پاکستان میں بھی۔ تعمیر کے بہترین امکانات کے درمیان وہ بے تعمیر حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

الفاظ ختم نہیں ہوتے

غالباً ۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ میں لکھنؤ میں حضرت گنج کے پاس سڑک پر جا رہا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر تھا۔ قریب ہی ایک آدمی سڑک کے کنارے بائیں طرف چل رہا تھا۔ اتنے میں ایک موڑ آیا۔ آدمی موڑ پر تھا کہ عین اسی وقت پیچھے سے ایک سائیکل آگئی۔ ایک نوجوان تیزی سے سائیکل دوڑاتا ہوا موڑ پر پہنچا۔ سائیکل قابو میں نہ آسکی اور راہ گیر سے ٹکرا گئی۔ راہ گیر سڑک پر گر گیا۔ سائیکل بھی رک گئی۔ راہ گیر اٹھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ اس کے بعد راہ گیر اور نوجوان کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی :

گھنٹی کیوں نہیں بجائی ——— راہ گیر نے کہا۔

گھنٹی نہ ہو تو ——— نوجوان نے جواب دیا۔

بریک کیوں نہیں لگایا۔

بریک نہ ہو تو۔

جب تمہارے پاس گھنٹی نہیں ، بریک نہیں ، تو تم سائیکل تیز کیوں دوڑاتے ہو

کیا تم سے پوچھ کر دوڑاؤں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی اگر چپ ہونا نہ چاہے تو کسی بھی دلیل سے اس کو چپ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ہر دلیل کے جواب میں الفاظ کا ایک مجموعہ بولتا رہے گا۔ یہاں تک کہ آپ خود ہی چپ ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دلیل کو ماننے کے لئے سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ غیر سنجیدہ آدمی کو کسی بھی دلیل سے قائل کرنا ممکن نہیں۔

موجودہ دنیا فتنہ کی دنیا ہے۔ اور دنیا کا سب سے بڑا فتنہ الفاظ ہیں۔ اس دنیا میں آدمی ہر بات کے جواب میں الفاظ پالیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی جب تک سنجیدہ نہ ہو اس کو سمجھایا نہیں جاسکتا۔

مثلاً آپ ایک آدمی سے کہیں کہ ٹیپو سلطان کی فوج نے آخر وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ صرف تھوڑے سے آدمی ٹیپو کے ساتھ رہ گئے تھے۔ دوسری طرف انگریز جنرل کے پاس بہت بڑی فوج

تھی۔ ایسی حالت میں جنگ واضح طور پر ہلاکت کے ہم معنی تھی۔ اس کے باوجود ٹیپو نے جنگ کی اور مارے گئے۔ مگر یہ طریقہ صحیح نہیں۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا۔ مگر آپ کی قوم بنی اسرائیل آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے ساتھ رہ گئے۔ اس وقت جہاد کو ملتوی کر دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب دشمن کی طاقت فیصلہ کن حد تک زیادہ ہو تو جنگ نہیں کرنا چاہئے۔ اس کو سن کر وہ آدمی کہے گا کہ آپ موسیٰ اور ٹیپو کا تقابل کر رہے ہیں۔ موسیٰ تو پیغمبر تھے، پھر پیغمبر کا اور ایک عام انسان کا تقابل کیسے کیا جا سکتا ہے۔

آپ جواب دیں گے کہ بھائی، میں نے تقابل کی بات نہیں کہی۔ میں نے پیروی کی بات کہی ہے۔ پیغمبر ہمارے لئے نمونہ ہیں۔ موسیٰ بھی ہمارے لئے نمونہ تھے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ جب کسی معاملہ میں پیغمبر کا نمونہ مل جائے تو ہم اس کی پیروی کریں۔ ہم اس کے خلاف نہ جائیں۔ اب وہ آدمی پر جوش طور پر کہے گا۔ آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں۔ ہم تو پیغمبر آخر الزماں کی امت ہیں۔ ہمیں اپنے پیغمبر کی پیروی کرنی ہے نہ کہ موسیٰ کی۔ کیا آپ نے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں پڑھا کہ لو کان موسیٰ حیا ما وسعہ الا اتباعی۔

آپ جواب دیں گے کہ میرے بھائی،، یہی اسوہ ہمارے رسول کا بھی ہے۔ مکہ میں آپ کے ساتھ تھوڑے لوگ تھے۔ اس وقت آپ نے مکہ والوں سے جنگ نہیں کی۔ انھوں نے تلواریں لے کر آپ کا مکان گھیر لیا۔ تو آپ رات کے وقت خاموشی سے نکل کر مدینہ چلے گئے۔ آپ نے اس وقت جنگ کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اب وہ آدمی کہے گا کہ آپ نے اسلامی تاریخ نہیں پڑھی۔ آپ حضرت ابوبکر کی تاریخ دیکھئے۔ ان کی خلافت کے زمانہ میں جب لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ایک رسی بھی اگر کوئی شخص دینے سے روکے گا تو میں اس سے جہاد کروں گا۔

اب آپ کہیں گے کہ بھائی، تم اقتدار کے زمانہ کی بات کر رہے ہو، اور میں اقتدار سے پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت میں یہ بتا رہا ہوں کہ جب مسلمان اقتدار کی حالت میں نہ ہوں، اس وقت ان کے لئے اسلام میں کیا نمونہ ہے۔ آدمی یہ سن کر پر جوش طور پر کہے گا کہ آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ اسلام تو ایک مکمل نظام ہے۔ خدا نے اسلام کی صورت میں اپنی مکمل شریعت بھیج دی ہے۔ اسلام میں آدھے پونے کی تقسیم نہیں۔ اسلام ایک کامل نظام ہے اور کامل نظام کے طور پر ہی اس کو

لیا جا سکتا ہے۔

اب آپ کہیں گے کہ میرے بھائی، یہ صحیح ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے۔ مگر کوئی بھی نظام پورا کا پورا ایک وقت قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ہر کام آغاز سے چل کر اختتام تک پہنچتا ہے۔ اسی کا نام تدریج ہے۔ اسلام کا کام بھی تدریجی انداز سے ہوگا۔ ہمیں یہ کرنا ہے کہ آج کے حالات میں جو کچھ ممکن ہے وہاں سے اپنے عمل کا آغاز کریں۔ اس طرح ہمارا اسلامی سفر شروع ہو جائے گا۔ وہ منزل بہ منزل جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ انشاء اللہ ہم آخری مرحلہ تک پہنچ جائیں گے۔ اب آپ کا مخاطب اور زیادہ پرجوش ہو جائے گا۔ وہ کہے گا کہ آپ تو مسلمانوں کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے مجاہدانہ عزائم کو ختم کر دیں اور نظام باطل کی دی ہوئی رعایتوں کے تحت کمتر زندگی پر راضی ہو جائیں۔

اسی طرح وہ آدمی آپ کی ہر دلیل کو پرجوش طور پر رد کرتا رہے گا۔ آپ خواہ کتنی ہی مدلل بات کہیں وہ آپ کی ہر بات کے جواب میں کچھ نہ کچھ الفاظ بول دے گا۔ اس طرح گفتگو کبھی ختم نہ ہوگی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا خاص سبب نکتہ بحث کو بدلنا ہے۔ آپ جب ایک دلیل پیش کرتے ہیں تو اس کا تعلق کسی خاص نکتہ بحث سے ہوتا ہے۔ اگر آپ کا مخاطب نکتہ بحث کو بدل دے تو آپ کی دلیل، نئے نکتہ بحث کے اعتبار سے بے وزن معلوم ہونے لگے گی۔

قرآن میں حضرت ابراہیم نے شاہ نمرود کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرتے ہوئے کہا کہ رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ نمرود نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ پھر تو میں بھی رب ہوں، کیوں کہ مجھے بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ جس کو چاہوں زندگی دوں اور جس کو چاہوں مروا دوں۔ نمرود نے یہاں یہی کیا کہ اس نے نکتہ بحث کو بدل دیا۔ حضرت ابراہیم نے برتر اختیار کے معنی میں یحیی ویمیت کہا تھا، نمرود نے اس کو ملکی اختیار کے معنی میں لے کر کہہ دیا کہ انا احیی و امیت (البقرہ ۲۵۸)

حضرت ابراہیم نے داعیانہ حکمت کے تحت اس کو نظر انداز کیا اور فرمایا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم اس کو مغرب سے نکال دو۔ یہ سن کر نمرود مبہوت ہو گیا۔ آجکل کے انسانوں کے برعکس، شاید نمرود کے اندر بھی کچھ حیا تھی۔ ورنہ وہ چاہتا تو دوبارہ نکتہ بحث کو بدل کر یہ کہہ سکتا تھا کہ ابھی تم موت وحیات کی بات کر رہے تھے اور پھر اچانک تم سورج چاند کی بات کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کو خود اپنی بات پر یقین نہیں۔

سمتِ سفر

ایک عربی پرچہ (صوت الامۃ، فروری ۱۹۹۱) میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان جذباتی طور پر یہ تھا: افیقوا من النوم ایھا المسلمون (اے مسلمانو، نیند سے جاگو) اس کو پڑھ کر مجھے ایک عرب شاعر کی نظم یاد آگئی۔ اس نے طنزیہ انداز میں عربوں کو جھنجوڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی نظم کا ایک شعر یہ تھا کہ اے عربو، تم سو جاؤ اور بیدار نہ ہو۔ کیوں کہ سونے والے لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں:

نَامُوا وَلَا تَسْتَيقِظُوا لَا فَازَ إِلَّا النُّوَّمُ

عربوں سے (یا مسلمانوں سے) یہ شکایت میرے نزدیک خلاف واقعہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عرب اور دوسرے مسلمان خوب جاگے۔ انھوں نے بڑی بڑی سرگرمیاں دکھائیں۔ البتہ ان سرگرمیوں کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ نتیجہ کے فقدان کو لوگ عمل کے فقدان پر محمول کر کے ان سے شکایت کر رہے ہیں۔

مثال کے طور پر فلسطین کے مسئلہ کو لیجیے جس کے نام پر خلیج کی جنگ لڑی گئی۔ شیخ حسن البنا نے ۱۹۴۸ میں اس کے لیے بڑے پیمانہ پر جہاد کیا۔ الاخوان المسلمون اپنی تاسیس کے وقت سے لے کر اب تک نہایت بلند بانگ طور پر فلسطین کے مسئلہ پر سرگرم رہے ہیں۔ خود فلسطینی لوگ فلسطین کے اندر اور اس کے باہر پرشور طور پر جاگے ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح ساری دنیا کے مسلمان بھی۔ جمال عبد الناصر نے اسی سوال پر ۱۹۶۷ میں اسرائیل اور فرانس اور برطانیہ سے جنگ کی۔ خلیج کی جنگ ۱۹۹۱ بھی فلسطین کے نام پر تھی۔ حتیٰ کہ بہت سے مسلمانوں نے صدام حسین کے روپ میں صلاح الدین ایوبی کو دوبارہ پیدا کر لیا۔ مگر ساری کوششوں کے باوجود نتیجہ بالکل الٹا نکل رہا ہے۔ اس مدت میں اسرائیل کا رقبہ کئی گنا بڑھ گیا اور اس کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اور فلسطینیوں کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا ہے۔

ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگ سو رہے ہیں، انھیں جگایا جائے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگ بے فائدہ سمتوں میں دوڑ رہے ہیں، اور ضرورت ہے کہ ان کو غلط سمت سے موڑ کر صحیح سمت میں سرگرم سفر کیا جائے۔ مسئلہ غلط رُخ پر عمل کرنا ہے نہ کہ سرے سے عمل نہ کرنا۔

عمل کی صحیح سمت وہ ہے جو نتیجہ خیز ہو، جو عمل نتیجہ خیز نہ ہو وہ صحیح عمل بھی نہیں۔ اس دنیا میں نتیجہ صحیح سمت میں عمل کرنے سے ملتا ہے نہ کہ مجرد عمل کرنے سے۔

توازن، تدریج

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ "توازن" قومی ترقی کے لئے شاہ کلید ہے۔ یعنی متوازن عمل کے ذریعہ ہی ہم قومی ترقی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ قومی ترقی کے عمل کے لئے کلیدی لفظ تدریج ہے۔ نہ کہ توازن۔

توازن بھی ایک اصول ہے اور تدریج بھی ایک اصول۔ مگر ہر ایک کا مقام استعمال الگ ہے۔ شاعر کی زبان میں ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے اور ہر نکتہ کا ایک مقام :

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد

جو لوگ قومی ترقی کے عمل میں توازن کو شاہ کلید بتاتے ہیں وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اصرار کر رہے ہیں کہ ہم کو ہر محاذ پر بیک وقت ہمہ جہتی عمل کرنا ہوگا۔ ذہنی بیداری اور تعلیم جیسے کاموں کے ساتھ عین اسی وقت سیاسی عمل اور حقوق طلبی کی مہم بھی پوری طاقت کے ساتھ جاری کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم زندگی کی دوڑ میں ناقابل عبور حد تک پیچھے ہو جائیں گے۔

حتی کہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ "اگر کوئی قوم صرف تعلیم یا اقتصادیات کے محاذ کو لے کر بیٹھ جائے اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے اور سیاست میں دوسروں کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش نہ کرے تو وہ حقوق سے تو محروم ہی رہے گی، خود تعلیم اور اقتصادیات کو حاصل کرنے کے مواقع بھی اس کو نہیں مل سکتے۔"

اس قسم کے مضامین یہ مان کر لکھے جاتے ہیں کہ ابھی تک ہم کو قومی اور سیاسی حقوق حاصل نہیں ہوئے ہیں۔ ان کو حاصل کرنا ابھی باقی ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ قسم کے قائدین اور دانشوروں کی اپنی اولاد تعلیمی اور اقتصادی میدان میں اعلیٰ ترقیات حاصل کر رہی ہیں۔ اور وہ فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ملت کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لئے تو ضروری ہے کہ پہلے سیاسی حقوق کی منزل طے کی جائے مگر خود ان حضرات کی اپنی اولادیں اس منزل کے طے ہونے سے پہلے ہی تمام ترقیاں حاصل کر رہی ہیں۔

اس قسم کی باتیں کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے بیٹوں کو سمندر پار کے

ملکوں میں تعلیم و ترقی کے لئے بھیج رکھا ہے یا ان کو ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے ہوسٹلوں میں داخل کر رکھا ہے جہاں وہ ملی سیاست کے ماحول سے الگ رہ کر تعلیمی ترقی کے مراحل طے کر رہے ہیں ۔ وہ انھیں قومی حقوق کی سیاست سے پوری طرح دور رکھتے ہیں ۔ اپنے بیٹوں کے لئے ترقی کا راز وہ سیاست سے علیحدگی میں سمجھتے ہیں ۔ اور قوم کے بیٹوں کے لئے ترقی کا راز سیاست کے طوفان میں غوطہ خوری میں ۔

ان حضرات کی یہ دہرا پالیسی بتاتی ہے کہ یا تو انھیں اپنی بات پر یقین نہیں ، یا ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کے معاملہ میں سنجیدہ ہیں اور قوم کے بیٹوں کے معاملہ میں غیر سنجیدہ ۔

اب توازن اور تدریج کے معاملہ کو ایک اصولی مثال کے ذریعہ سمجھئے ۔ ایک شخص دو ہزار روپیہ مہینہ کماتا ہے ۔ اگر وہ ایسا کرے کہ اس میں سے ایک ہزار روپیہ تفریحی مدوں میں خرچ کر دے تو اس سے کہا جائے گا کہ توازن کے ساتھ خرچ کرو ۔ یعنی اپنی آمدنی کے لحاظ سے اپنا بجٹ بناؤ ۔ جو مد زیادہ اہم ہے اس میں زیادہ رقم لگاؤ اور جو مد کم اھم ہے اس میں کم رقم خرچ کرو ۔ آمد اور خرچ میں ہم آہنگی قائم کرنے کا مسئلہ ہو تو اس کے لئے کلیدی لفظ توازن ہو گا ۔

اب دوسری مثال لیجئے ۔ ایک شخص کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے ۔ اب اگر توازن کے اصول کو منطبق کرتے ہوئے باپ ایسا کرے کہ جس طرح وہ بچہ کی غذا اور حفاظت کا انتظام کرتا ہے اسی طرح وہ اول روز سے اس کے کان میں سیاست کے اسباق بھی داخل کرنا شروع کر دے ۔ وہ اس کو جنس کے رموز سمجھانے کے لئے بھی ایک معلم متقرر کر دے ۔ اگر کوئی باپ اس طرح اپنے بچہ کی متوازن تربیت شروع کر دے تو یہ بلاشبہ ایک لغو فعل ہو گا ۔ کیوں کہ یہ زندگی کا معاملہ ہے ۔ اور زندگی کا ارتقاء ہمیشہ تدریج کے اصول پر ہوتا ہے نہ کہ توازن کے اصول پر ۔

توازن بجائے خود ایک اعلیٰ اصول ہے ۔ مگر زندگی کی تعمیر کے معاملہ میں کلیدی لفظ توازن نہیں ہے بلکہ تدریج ہے ۔ تدریج کے اصول پر عمل کر کے ہی ہم ترقی کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں ۔ توازن کے اصول پر عمل کرنے کی صورت میں ہم کہیں نہیں پہنچیں گے ۔ خود ہماری قریبی تاریخ میں اس کی واضح مثال موجود ہے ۔

اورنگ زیب (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) سے لے کر اب تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ برصغیر کے مسلمان سترھویں صدی کے آخر سے لے کر بیسویں صدی کے آخر تک پورے تین سو سال سے

سیاست کے محاذ پر مسلسل زور آزمائی کر رہے ہیں۔ اس طویل مدت میں ایک دن کے لئے بھی انھوں نے یہ "غیر متوازن" طریقہ اختیار نہیں کیا کہ اپنی ساری طاقت صرف ذہنی بیداری کے محاذ پر لگا دیں اور سیاست کے عملی محاذ کو خالی چھوڑ دیں۔ اس تین سو سالہ متوازن عمل کے باوجود ملت کی بربادی میں صرف اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ ملت کا احیاء اب تک کسی بھی درجہ میں واقعہ نہ بن سکا۔ کیا یہ تجربہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ عمر نبوت میں مکمل طور پر تدریجی انداز میں عمل فرمایا۔ چنانچہ ابتدائی ۱۳ سال تک آپ پوری طرح سیاست اور جہاد کے میدان سے دور رہے۔ اس مدت میں آپ کی ساری کوشش اس امر پر مرتکز رہی کہ آپ لوگوں کے اندر ایمان کی اسپرٹ مکمل طور پر بیدار کر دیں۔ گویا نصف سے زیادہ مدت میں آپ نے عملی سیاست سے "صبر" کا طریقہ اختیار فرمایا نہ کہ اس میں داخل ہونے کا۔

موجودہ زمانہ میں جاپان اس طریق کار کی ایک مثال ہے۔ ۱۹۴۵ کے بعد اس نے قومی حقوق کی سیاست کو یکسر ترک کر دیا اور صرف سائنسی تعلیم اور ٹکنکل ریسرچ کے میدان میں اپنی ساری توجہ لگا دی۔ حالات بتاتے ہیں کہ جاپان نے ۳۰ سالہ "غیر متوازن" محنت سے وہ کامیابی حاصل کر لی جو مسلمان ۳۰۰ سالہ "متوازن" محنت کے بعد بھی حاصل نہ کر سکے۔

ہندستان میں عیسائی فرقہ عملی سیاست سے بالکل الگ رہتا ہے۔ مگر تعلیم کے میدان میں وہ تمام فرقوں سے آگے ہے۔ مسلمان تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد مسلسل سیاست کے ہنگاموں میں مشغول رہے۔ اس کے باوجود، ایجوکیشن منسٹری کی رپورٹ کے مطابق، مسلمان سب سے زیادہ تعلیمی پسماندگی میں مبتلا ہیں۔ حتی کہ تعلیم کے میدان میں وہ ہریجنوں سے بھی زیادہ پیچھے جا چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں صحیح طریقہ تدریج کا ہے نہ کہ توازن کا۔ تجربہ اور اصول دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ ساری قوت ابتدائی تعمیر کے محاذ پر لگا دی جائے۔ اس وقت ہم تاریخ کے آغاز میں ہیں، ہم تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ اور جو لوگ تاریخ کے آغاز میں ہوں ان کے لئے عمل کا اصول صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کو الاقدم فالاقدم کہا گیا ہے۔ اسی کا دوسرا نام تدریج ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں بہت عرصہ سے الرسالہ مشن سے وابستہ ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ الرسالہ سے اختلاف کرنے والوں کے پاس الرسالہ کے خلاف کوئی ٹھوس بات نہیں۔ البتہ الرسالہ کی برداشت کی پالیسی پر بہت سے لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہر آدمی اپنے ذاتی مفاد کے معاملہ میں برداشت ہی کو بہتر ین حل کے طور پر اختیار کئے ہوئے ہے۔ مگر ملت کے مسائل کا معاملہ ہو تو وہ برداشت کی پالیسی کو بزدلی کہہ کر رد کر دیتا ہے۔ آخر ذاتی پالیسی اور ملی پالیسی میں اس تضاد کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ذاتی معاملہ میں سنجیدہ ہیں مگر ملت کے معاملہ میں وہ سنجیدہ نہیں۔ اسی سے یہ فرق پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ جب کوئی ذاتی مسئلہ سامنے آتا ہے تو ان کی توجہ مسئلہ کے حل کی طرف چلی جاتی ہے۔ اور جب ملت (مسلمان بمقابلہ ہندو) کا مسئلہ ہو تو وہ فوراً جذباتی ہو جاتے ہیں اور اپنے اور غیر کے مزاج کے تحت سوچنے لگتے ہیں۔ ذاتی معاملہ میں سنجیدہ سوچ ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ مگر ملت کا معاملہ ہو تو اپنی برتری کا احساس ان کا رہنما بن جاتا ہے۔ ذاتی معاملہ میں ان کا مقصود مسئلہ کو حل کرنا ہوتا ہے اور ملت کے معاملہ میں صرف اپنے وقار کو بچانا یا اپنی برتری کو قائم کرنا۔ مسلمان اگر ایسا کریں کہ جس طرح ذاتی معاملہ میں وہ مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں اسی طرح ملت (ہندو مسلم مسئلہ) کے معاملہ میں بھی وہ عملی حل کو اہمیت دینے لگیں تو اس کے بعد ان کی دو عملی یکسر ختم ہو جائے گی۔

میں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ وہ چیز جس کو صنعتی انقلاب کہا جاتا ہے وہ عقیدۂ توحید کی دین ہے جو رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ دنیا کو ملا۔ صنعتی انقلاب فطرت کی تسخیر کا نتیجہ ہے۔ شرک کے عقیدہ کے تحت انسان فطرت کو مقدس سمجھ کر اس کا پرستار بنا ہوا تھا۔ توحید نے فطرت کو پرستاری کے مقام سے ہٹا دیا، اس کے بعد ہی فطرت کو مسخر کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جو آخر کار جدید صنعتی انقلاب تک پہنچا۔ اس کے بارہ میں ایک صاحب نے فرمایا کہ توحید کا عقیدہ تو تمام پیغمبروں نے پیش کیا تھا، پھر صنعتی انقلاب پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں کیوں نہیں آیا، وہ بعد کو کیوں آیا۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں توحید کا عقیدہ صرف فکری تحریک کے مرحلہ میں تھا، وہ عملی انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچا۔ پیغمبر اسلام اور آ

کے اصحاب نے توحید کو فکری دور سے نکال کر عالمی انقلاب کے دور میں پہنچا دیا۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی فکر اسی وقت عمومی تبدیلی لا سکتا ہے جب کہ وہ نظریہ نہ رہے بلکہ انقلاب بن جائے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت مسلم دنیا میں بہت سی اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں آپ اپنے اور ان کے درمیان کیا فرق سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان مختلف تحریکوں کو وسیع تقسیم (broad division) میں دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو اسلام کو دعوت و تبلیغ کے مشن کے طور پر لے کر اٹھی ہیں۔ دوسری وہ جو سیاسی انقلاب کے مقصد کے تحت کام کر رہی ہیں۔ ایک کا نشانہ اگر "دعوتی اسلام" ہے۔ تو دوسرے کا نشانہ "سیاسی اسلام"۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وہی تحریک صحیح اسلامی تحریک ہے جو "دعوتی اسلام" کے لئے اٹھے۔ "سیاسی اسلام" کو لے کر اٹھنے والوں کا کیس صراط مستقیم سے انحراف (deviation) کا کیس ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ اتباع سبل ہے نہ کہ اتباع صراط۔

یہ اس معاملہ کا نظری پہلو ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ دعوتی اسلام کی موجودہ تحریک زیادہ تر "فضائل" کی بنیاد پر چلائی جا رہی ہے، جب کہ سیاسی یا انقلابی اسلام کی تحریک "دلائل" کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دعوتی اسلام کے مشن کی صحت کے باوجود امت کا انٹلکچول طبقہ (intellectual class) ابھی تک اس سے جُڑ نہ سکا۔

یہ طبقہ جس کو خواص کا طبقہ کہا جا سکتا ہے، وہ اپنی ذہنی ساخت کی وجہ سے بات کو دلائل کے اسلوب میں سمجھنا چاہتا ہے۔ مگر دعوتی اسلام کے حاملین کا موجودہ انداز خطاب ان کے دلائل پسند مزاج کو مطمئن نہیں کر پاتا۔ اسی بنا پر آج یہ صورت حال ہے کہ امت کے طبقۂ خواص کا بیشتر حصہ سیاسی اسلام سے قریب اور دعوتی اسلام سے دور ہے۔

الرسالہ مشن کا خاص مقصد "دعوتی اسلام" کو دلائل کی بنیاد پر کھڑا کرنا ہے تاکہ امت کا ذہین اور باشعور طبقہ دعوتی اسلام کی اہمیت کو سمجھے اور اپنے آپ کو اس مہم میں لگائے۔ یہ انتہائی ضروری ہے کیوں کہ امت کا طبقۂ خواص جب تک دعوتی مشن میں نہ لگے، صرف طبقۂ عوام کی بنیاد پر کوئی گہری تحریک برپا نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ کوئی بڑی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

"دعوتی اسلام" کے موجودہ طریقہ کے ذریعہ محدود معنوں میں عوام کے اندر کچھ اصلاح کا کام

کیا جاسکتا ہے۔ مگر اصل مسئلہ اسلام کی از سر نو تاریخ بنانے کا ہے جس کو تجدید دین کہا جاتا ہے۔ اور حقیقی تجدید دین اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وقت کے اہل فکر اور اہل علم کو دعوتی اسلام کا حامی نہ بنایا جائے۔

مقالات اور سوال وجواب کے بعد میری تفصیلی تقریر ہوئی۔ میں نے لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ سمپوزیم گویا میرے خواب کی تعبیر ہے۔ پندرہ سال پہلے الرسالہ کے نام پر سمپوزیم کیا جاتا تو شاید چند آدمی بھی جمع نہ ہوتے۔ کیوں کہ اس وقت الرسالہ ایک غیر معروف لفظ تھا۔ آج الرسالہ اور اس کا مشن ایک معروف عام لفظ بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "الرسالہ سمپوزیم" کو اتنی کامیابی کے ساتھ منعقد کرنا ممکن ہوا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور میں اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

پھر میں نے کہا کہ آج کی ایک خاتون مقالہ نگار انشو مترا چودھری نے اپنے مقالہ میں کہا ہے کہ الرسالہ کا مقصد کرکٹ تھنکنگ (correct thinking) پیدا کرنا ہے۔ یہ الرسالہ کے مشن کی صحیح ترجمانی ہے۔ ہمارا خاص مقصد یہی ہے کہ لوگوں کے اندر صحیح سوچ پیدا ہو۔ وہ مسائل کے بارہ میں صحیح زاویہ سے رائے قائم کریں اور فطرت کے سچے اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کا سفر طے کریں۔

میں نے کہا کہ مثال کے طور پر اس عام مسئلہ کو لیجئے جو تمام لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ۔ بہت سے لوگ اس مسئلہ کو ایک فرقہ کے اوپر دوسرے فرقہ کا تعصب اور زیادتی سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کرکٹ تھنکنگ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تعصب کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کا چیلنج ہے۔ اور یہ چیلنج ہمیشہ باقی رہے گا۔

قرآن اور تاریخ کی تفصیلات دیتے ہوئے میں نے کہا کہ اس دنیا کو بنانے والے نے اس کا نظام مقابلہ اور چیلنج کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ چیلنج ترقی کا زینہ ہے۔ چیلنج سے صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ وہ افراد اور قوموں کو معمولی حالت سے اٹھا کر غیر معمولی حالت کی طرف لے جاتا ہے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم تعصب اور امتیاز کے الفاظ کو اپنی ڈکشنری سے نکال دیں۔ ہم اپنے مسائل کو چیلنج کی حیثیت سے دیکھیں۔ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی اور چوائس نہیں۔ کیوں کہ زندگی کا یہ مقابلاتی نظام خود خالق نے

قائم کیا ہے۔ اور ہم کسی بھی حال میں اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔

غلط سوچ ہو تو آدمی کو زندگی میں صرف مشکلیں ہی مشکلیں دکھائی دیں گی۔ لیکن اگر صحیح سوچ ہو تو آدمی مواقع کو دیکھ لے گا اور ان کو استعمال کر کے آگے بڑھ جائے گا (یہ تقریر ان شاء اللہ مرتب کر کے مقالہ کی صورت میں شائع کر دی جائے گی)

میری تقریر کے بعد کنوینر مسٹر ایم ٹی خان نے چند کلمات کہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے اس اجتماع میں مسلمان بھی ہیں، اور ہندو بھی ہیں، سکھ بھی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الرسالہ مشن کوئی فرقہ وارانہ مشن نہیں ہے۔ وہ مین کائنڈ کے لئے اور پوری انسانی برادری کے لئے ہے۔ وسیع ہال کی تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگوں کو کھڑا ہونا پڑا۔ وہ تقریباً چار گھنٹہ تک کھڑے ہو کر تمام کارروائی سنتے رہے۔ مسٹر خان نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: آپ کی اسٹینڈنگ پوزیشن ہمارے لئے آؤٹ اسٹینڈنگ ریمائنڈر ہے۔ آئندہ ہم ان شاء اللہ اس کا خیال رکھیں گے۔

اس کے بعد صدر جلسہ ڈاکٹر شری نواس کھڑے ہوئے اور اپنی اختتامی تقریر کی۔ انھوں نے اپنی برجستہ تقریر ان الفاظ کے ساتھ شروع کی: آپ بسواس کیجئے۔ میں نے خود الرسالہ پڑھا ہے۔ اتنی بڑھیا کتاب آج ہمارے یہاں کوئی اور اپلبدھ نہیں ہے۔ چاروں طرف جو اندھیارا چھایا ہے اس میں ایک چاند ہی نہیں نکلا بلکہ ایک سورج نکل آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے میری چیلنج والی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ سڑک بالکل شیشہ کی طرح چکنی ہو تو اس پر گاڑی نہیں چلے گی۔ سڑک پر فرکشن (friction) ہونا چاہئے، تبھی گاڑی چل سکتی ہے۔ یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔

آخر میں جناب سید مشہدی صاحب نے ووٹ آف تھینکس (اظہار تشکر) پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج کا یہ اجتماع ایک تعمیری اجتماع تھا۔ مزید اس میں "سوال و جواب" کے وقفہ کے دوران یہ ایک بہت اچھی چیز سامنے آئی کہ ہمارا نوجوان طبقہ اپنے بزرگوں سے سوال کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔ یہ الرسالہ کے ذریعہ بہت اچھی سیکھ ہمارے نوجوانوں کو ملی ہے۔

گورنمنٹ اردو لائبریری کے جس ہال میں یہ اجتماع ہوا، اس کے ذمہ داروں نے الرسالہ سمپوزیم کے سلسلہ میں اپنا مکمل تعاون دیا۔ ادارہ کے صدر ڈاکٹر عبد المئی صاحب نے سمپوزیم کو لائبریری فنکشننگ کا جزء قرار دیا۔ انھوں نے ہدایت جاری کی کہ اس سمپوزیم کو لائبریری کے کولیبریشن میں ہونے والا

اجتماع سمجھا جائے۔ انھوں نے مذکورہ تاریخ کو آدھے دن کے لئے لائبریری بند کر دی تاکہ سمپوزیم کی کارروائی بآسانی جاری رہ سکے۔

لائبریرین ڈاکٹر محمد نظام صاحب اور ان کے اسٹاف کے دوسرے ممبروں کا بھرپور تعاون سمپوزیم کے منتظمین کو حاصل رہا۔ انھوں نے کھلے دل سے اس کے حسن انتظام کا اعتراف کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایسا اجتماع اب تک لائبریری ہال میں کوئی نہیں ہوا تھا۔ یہ سمپوزیم نہ صرف پریزوردی ہے بلکہ وہ ریکارڈ وردی بھی ہے۔

سمپوزیم کے منتظمین نے ہال کو "الرسالہ اورینٹڈ ہال" بنادیا تھا۔ ہال میں چاروں طرف الرسالہ کے صفحہ اول کے اقوال اردو، ہندی اور انگریزی میں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ جلی حرفوں میں لکھ کر دیواروں پر لگائے گئے تھے۔ مثلاً یہ قول کہ ـــــ کوئی آدمی کسی کا چراغ نہیں بجھاتا، چراغ کے اندر تیل کی کمی چراغ کو بجھا دیتی ہے، وغیرہ۔ اس طرح ہال میں ہر طرف الرسالہ کا ماحول قائم ہو گیا تھا۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ سولھویں اور سترھویں صدی میں جب یورپ میں سائنس کا رواج ہوا تو سائنس لوگوں کے درمیان فیشن کی طرح پھیلنے لگی۔ ہر گھر گویا ایک تجربہ گاہ بن گیا جہاں چھوٹے اور بڑے لوگ طرح طرح کے سائنسی تجربات میں مصروف رہتے تھے۔ ہر طرف سائنس کا چرچا پھیل گیا۔ یہاں تک کہ وہ واقعہ پیش آیا جس کو سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ الرسالہ کا مشن بھی اسی طرح گھر گھر اور بستی بستی میں پھیل جائے۔ لوگ اس کے بارہ میں سوچیں، اس کے اوپر مذاکرے کریں، اس کے انداز پر مطالعہ کریں۔ اس کی بنیاد پر اجتماعات کریں۔ الرسالہ کی تحریک ایک لہر کی صورت اختیار کر لے۔ یہ لہر بڑھتی رہے یہاں تک کہ پوری ملت کے اندر ایک مکمل فکری انقلاب آجائے۔

پٹنہ کے ساتھیوں نے یہ طے کیا کہ وہ "الرسالہ لائبریری" قائم کریں گے۔ ماہانہ اجتماع کا سلسلہ شروع کریں گے۔ اسٹڈی سرکل کی صورت میں کام کو آگے بڑھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے۔

۲۹ جولائی کی شام کو دوبارہ مگدھ اکسپریس سے واپسی ہوئی۔ ٹرین میں رات کو سو رہا تھا کہ خواب دیکھا کہ میں کسی مکان کی چھت پر ہوں اور وہاں تیز زلزلہ آگیا ہے۔ دیر تک پورا مکان ہلتا رہا۔ میں

مکان کی چھت پر کھڑا ہوا یہ کہہ رہا ہوں کہ یا اللہ، کیا ہونے والا ہے۔

یہ محض خواب تھا، کوئی حقیقی زلزلہ نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ ایسا کیوں ہوا۔ سمجھ میں آیا کہ اس وقت جب کہ میں سو رہا تھا، ٹرین مسلسل ہل رہی تھی۔ میری آنکھ اور میرا شعور نیند کی وجہ سے معطل تھے۔ مگر میرا لاشعور ٹرین کے ہلنے کو محسوس کر رہا تھا۔ اسی مجہول احساس کو میں نے خواب میں زلزلہ کی صورت میں دیکھا۔

پھر یاد آیا کہ پٹنہ میں جناب مصطفیٰ کمال صدیقی نے کہا تھا کہ الرسالہ مشن کا ساتھ دینے کے لئے اس چیز کی ضرورت ہے جس کو "اللہ اکبر" میں زلزلہ درکار ہے (صفحہ ٦٢) کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ لوگ اپنے اندر زلزلہ لانے کے لئے تیار نہیں، اسی لئے وہ الرسالہ کا ساتھ دینے کے لئے بھی تیار نہیں۔

مجھے کمال صدیقی صاحب کی رائے سے اتفاق ہے۔ الرسالہ نبأ عظیم کا نقیب ہے۔ اس کے قافلہ میں صرف وہ روحیں شریک ہو سکتی ہیں جو قیامت سے پہلے اپنے آپ کو قیامت کے میدان میں کھڑا ہوا دیکھیں۔ جن کی حساسیت کا یہ حال ہو کہ حقیقی بھونچال تو درکنار، پتہ کا کھڑکنا اور سواری کا ہلنا بھی ان کے لئے زلزلۃ الساعہ کی پیشگی خبر بن جائے۔ ایسے ہی لوگ الرسالہ مشن کا ساتھ دیں گے۔ اور امکانی طور پر آج بھی ایسے بے شمار لوگ خدا کی دنیا میں موجود ہیں۔

۳۰ جولائی ۱۹۹۱ کی دوپہر کو میں دہلی واپس پہنچا۔

دہلی واپسی کے بعد پٹنہ سے متعدد خطوط اور پیغامات موصول ہوئے۔ یہاں ان میں سے چند خط کے کچھ حصے نقل کئے جاتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر شری نواس صاحب (تری بھون ہیلتھ سنٹر، پٹنہ) نے الرسالہ انگریزی کو مستقل طور پر اپنے مطالعہ میں شامل کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی کتب بھی انھوں نے مطالعہ کے لئے حاصل کی ہیں۔ ان کے خط مورخہ یکم اگست ۱۹۹۱ کا ایک پیراگراف یہاں ان کے اپنے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے:

I consider it a great privilege to have met such a noble intellectual as yourself. It was indeed a treat to have listened to your fine and brilliant discourse. Your novel approach to our social and communal problems is most welcome. (Dr. Shreenivas)

جناب محمد کمال صدیقی (اورینٹل بینک آف کامرس، پٹنہ) اپنے تفصیلی خط مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۹۱ میں لکھتے ہیں:

"آپ سے ملنے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ جس آدمی سے میری ملاقات تحریری طور پر ہوتی ہے وہ کتنا کامپلکس (complex) ہے، اور اسی آدمی سے جب میری ملاقات براہ راست ہوتی ہے تو وہ کتنا سمپل (simple)۔ بولنے میں آپ جس قدر کم سخن ہیں شاید اسی وجہ سے کہ سوچنے کے اعتبار سے آپ گہرے ہیں۔ دو چیزیں میں آپ سے اپنے اندر منتقل کر رہا ہوں۔ ایک صبر اور دوسرا فکر۔ اور جب بھی کسی معاملہ میں میں صبر سے کام لیتا ہوں تو میرا اعتماد اپنے آپ میں اور خدا میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دراصل میں آپ کی کتابیں پڑھتا ہوں تو اپنی فطرت کو سراسر اس کے مطابق پاتا ہوں۔ اور کچھ وارداتیں بھی میرے ساتھ ایسی گزری ہیں کہ میرا دل آپ کے ذریعہ بتائے گئے دین اسلام کی تصدیق کرتا ہے۔ بھونچال کی شکل میں میں نے اپنی پچھلی زندگی کو خیرباد کہا ہے اور پورے شعور کے ساتھ یہ فیصلہ لیا کہ اگلی زندگی کو دین پر چلانا ہے۔ پہلے میں گالیوں سے یا لوگوں کی اوچھی حرکتوں سے بدظن ہو جایا کرتا تھا اور جواب میں ایسی حرکتیں کر جاتا تھا جو تمام تر ردعمل کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اب یہ سب چیزیں میرے نزدیک مینِنگ لس (meaningless) ہوگئی ہیں۔ ان باتوں پر بے چینی تو اب بھی ہوتی ہے۔ مگر اب وہ لوگ جو اوچھی حرکتیں کرتے ہیں معذور نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ مجھے جو معلوم ہے وہ ان کو معلوم نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ لوگوں کو بڑی حقیقتوں سے باخبر کیا جائے۔ "اللہ اکبر" پڑھ کر میں نے جانا کہ اللہ سے قریب ہونے کی ایک قیمت ہے جس کو ہمیں ادا کرنا ہے ... ویسے جنت کی کنجی تو آپ سونپ گئے ہیں۔ دیکھئے اس کا بوجھ اٹھانے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔"

مسٹر ایم ٹی خان (عدالت گنج، پٹنہ) کا چار صفحہ کا خط موصول ہوا ہے۔ انھوں نے کئی ضروری باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

انھوں نے لکھا ہے کہ پٹنہ کے الرسالہ سمپوزیم میں جن افراد نے فکری اور عملی تعاون دیا تھا، ان سب کے نام اسلامی مرکز کی طرف سے شکریہ کا خط جانا چاہئے تھا جو ان کو نہیں بھیجا گیا۔ یہ واقعی ہمارے لئے کوتاہی کی بات ہے۔ ہم ایسے تمام لوگوں سے گزارش کریں گے کہ وہ ہماری اس

کوتاہی پر درگزر فرمائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کا مخلصانہ تعاون کسی رسمی شکریہ سے بلند ہے۔ تاہم ہمارا یہ اسلامی فرض ہے کہ ہم تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کریں (من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ)

الرسالہ سمپوزیم پٹنہ کے ساتھیوں کی طرف سے بلاشبہ ایک کامیاب اقدام تھا۔ اس کے بعد پٹنہ میں کام کی طرف نئی حرکت شروع ہوئی ہے۔ الرسالہ کا پیغام پہلے سے زیادہ لوگوں کے درمیان زیر بحث آرہا ہے۔ روزنامہ صدائے عام (پٹنہ) نے الرسالہ کا مضمون اپنے کالموں میں شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ سمپوزیم کی خبروں کو اکثر اخبارات شائع کرتے رہے ہیں۔ قارئین الرسالہ کی تعداد مقامی طور پر بڑھ رہی ہے۔ مسٹر ایم ٹی خان نے اپنی رہائش گاہ پر لائبریری قائم کی ہے جس میں الرسالہ مشن کی تمام کتابیں برائے مطالعہ رکھی گئی ہیں۔ وغیرہ

مزید یہ کہ پٹنہ میں باقاعدہ طور پر ماہانہ اجتماع بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ اجتماع پروفیسر سید شہاب الدین دسنوی کی رہائش گاہ پر ہوتا ہے۔ اس کا وقت ہر مہینہ کے سکنڈ سنڈے کو پانچ بجے شام ہے۔ پورا پتہ اور ٹیلیفون نمبر یہ ہے:

Prof. S. Shahabuddin Desnavi, Taj Manzil,
Chajju Bagh, Patna 800 004 (Tel. 224252)

چوں کہ الرسالہ میں پٹنہ سمپوزیم کی خبر مسٹر ایم ٹی خان کے پورے پتہ کے ساتھ پیشگی شائع ہوئی تھی، اس لئے ملک کے اندر اور ملک کے باہر سے اس سلسلہ میں کئی حضرات نے مسٹر ایم ٹی خان سے رجوع کیا اور معلومات دریافت کیں۔ مسٹر خان نے ان لوگوں کو بذریعہ خط اپنا جواب بھیج دیا ہے۔

مسٹر ایم ٹی خان نے مطلع کیا ہے کہ سمپوزیم کے بعد لوگوں نے مختلف سوالات کئے۔ انھوں نے بطور خود ان سوالات کا جواب بھی دیا۔ یہاں کچھ سوالات مع جواب نقل کئے جاتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ جب قرآن ایک الہامی کتاب ہے اور ہمارے پیغمبر نے اس کی تعلیم کو پوری طرح پھیلا دیا ہے اور اس کے پوشیدہ پہلوؤں کو اجاگر بھی کر دیا ہے تو اب آپ ہم کو ایمان ڈسکور کرنے کا مژدہ کیوں دے رہے ہیں۔

جواب : یہاں ڈسکوری کے لفظ سے وہی چیز مراد ہے جس کے لئے قرآن و حدیث میں معرفت کا لفظ آیا ہے۔ قرآن و سنت میں اسلام بلاشبہ موجود ہے۔ مگر ایک انسان جب اپنی ذات کی سطح پر اس کی معرفت حاصل کرتا ہے تو وہ اس کے اپنے لئے ڈسکوری کا ایک واقعہ ہوتا ہے۔ یہ اس کے لئے اسی قسم کا ایک نفسیاتی تجربہ ہوتا ہے جس کو ڈسکوری یا اکتشاف کہا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ صبر و اعراض کی تلقین بظاہر درست ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ صبر و اعراض کب تک۔ آخر اس کی حد (limit) کیا ہوگی۔

جواب : حد کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ صبر و اعراض کو شعوری طور پر اور شرح صدر کے ساتھ اختیار کیا جائے اور اس کا واقعۃً تجربہ کیا جائے۔ ابھی تو لوگوں نے صبر و اعراض کو شعوری طور پر اختیار ہی نہیں کیا اور نہ اس کا واقعی معنوں میں تجربہ کیا۔ ایسی حالت میں حد کا سوال ابھی قبل از وقت ہے۔

مزید یہ کہ حد کا سوال محض ایک فرضی اندیشہ ہے۔ اعراض کا طریقہ اگرچہ ابھی تک عمومی طور پر اختیار نہیں کیا گیا۔ مگر بہت سی انفرادی مثالیں موجود ہیں جب کہ اعراض کا طریقہ اختیار کیا گیا اور فساد کا بم فوراً ڈیفیوز ہو کر رہ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اعراض کا طریقہ مسئلہ کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دیتا ہے۔ پھر حد کا سوال کہاں پیدا ہوگا۔

ایک صاحب نے کہا کہ یہ بات قابل تشویش ہے کہ آپ اکثر آرگنائزر، پانچ جنیہ وغیرہ میں چھپتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں۔

جواب : اس معاملہ میں صحیح اصول یہ ہے کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ کہاں چھپا۔ بلکہ یہ دیکھا جائے کہ کیا چھپا۔ آپ ان پرچوں میں چھپے ہوئے مضامین کو پڑھیں۔ آپ پائیں گے کہ ان میں عین وہی بات کہی گئی ہے جو الرسالہ میں برابر شائع ہوتی رہی ہے۔ پھر اس پر اعتراض کس لئے۔ یہ تو خوش ہونے کی بات ہے کہ الرسالہ کا تعمیری پیغام اس طرح زیادہ وسیع حلقوں میں پھیل رہا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ کا خلیج نمبر شائع کر کے آپ نے صدام حسین کی غلطیوں کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن اب جنگ بند ہونے کے بعد صدام حسین پر طرح طرح کی زیادتیاں کی جارہی ہیں لیکن آپ اس کے بارہ میں چپ ہیں۔ ایسا کیوں۔

جواب: جب ایک شخص کوئی سنگین غلطی کرے تو اس کا انجام غلطی کرنے والے ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ غلطی کوئی شخص کرے اور اس کا برا انجام کوئی دوسرا شخص بھگتے۔ یہ قدرت کے قانون کے خلاف ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ صدام حسین نے جارحیت کی، اور جو شخص جارحیت کرتا ہے اس کو بہرحال اس کا انجام بھگتنا پڑتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ صاحب الرسالہ خدا کو دیکھنے اور چھونے کی بات کرتے ہیں۔ کیا واقعی انھوں نے خدا کو دیکھا ہے اور چھوا ہے۔ اگر جواب ہاں میں ہے تو کیسے۔

جواب: اس قسم کی ہر بات مجازی معنوں میں کہی جاتی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں۔ مثلاً اقبال کی ایک نظم "شکوہ، جواب شکوہ" ہے۔ اس میں اقبال خدا کے ساتھ اپنی تفصیلی گفتگو کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ خدا سے باقاعدہ سوال کرتے ہیں اور خدا ان کے سوالات کا انھیں براہ راست جواب دیتا ہے۔ اس گفتگو کو اگر بالکل لفظی معنی میں لے لیا جائے تو وہ حد درجہ غلط قرار پائے گی۔ کیوں کہ اس قسم کی گفتگو تو خدا اور پیغمبر کے درمیان بھی نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال کی واقعۃً خدا سے بات چیت ہوئی۔ یہ پورا کلام بطور مجازیا استعارہ ہے نہ کہ بطور حقیقت۔

یہ معروف مجازی (metaphorical) اسلوب ہے۔ یعنی ایک احساس کو موثر بنانے لئے اس کو واقعہ کی زبان میں بیان کرنا۔ اس قسم کے مجازی اسلوب کی مثالیں دنیا کی ہر زبان میں پائی جاتی ہیں اور اسلامی ادب میں بھی اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ اس اسلوب کو کبھی قابل اعتراض نہیں سمجھا گیا اور نہ آج کوئی سنجیدہ اور صاحب علم شخص اس کو قابل اعتراض بتا سکتا ہے۔

"شکوہ اور جواب شکوہ" کی نظم کو اگر بیان واقعہ کے طور پر لیں تو یہ نظم سخت قابل اعتراض دکھائی دے گی۔ مگر جب اس نظم کو ایک شعری اسلوب سمجھ کر پڑھیں تو وہ عین درست نظر آتی ہے۔ یہی معاملہ الرسالہ میں چھپنے والے مضمون کا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ اس میں ایک حقیقی واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے تو وہ آپ کی نظر میں قابل اعتراض بن جائے گا۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھ کر اس کو پڑھیں کہ یہ ایک ادبی اسلوب ہے تو وہ آپ کو سراسر درست نظر آئے گا۔

مسٹر ایم ٹی خان مزید اپنے خط مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۹۱ میں لکھتے ہیں کہ سمبھو زیم کی رپورٹ کا ترجمہ

کر کے اس کو انگلش اور ہندی الرسالہ میں بھی شائع کر دیں۔ اس سے وہ بات اچھی طرح نمایاں ہو جائے گی جو آپ نے سمپوزیم کی بابت پٹنہ میں لکھی تھی۔ یعنی : Patna shows the way

۱۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو مجھے پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے "تعمیر و ترقی، سماجی انصاف" کے عنوان پر ۱۰ منٹ بولنے کا وقت دیا گیا تھا۔ میں نے اپنی ٹاک میں الرسالہ کے بنیادی اصولوں کو وہاں اجاگر کیا۔ اگلے دن اسے براڈ کاسٹ کیا گیا۔

کئی لوگوں نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے کہ کنوینر نے صرف سادہ طور پر سمپوزیم کی کارروائی کو چلایا ہی نہیں بلکہ ہر دو تقریر کے بیچ میں لوگوں کی دل چسپی قائم رکھنے کے لیے ہلکی ہلکی خوراک بھی دیتا رہا۔ دوسرے مقامات پر سمپوزیم کا پروگرام ہو تو ان لوگوں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تاکہ لوگوں میں اکتاہٹ پیدا نہ ہونے پائے۔

حقیقت یہ ہے کہ پٹنہ کا الرسالہ سمپوزیم ہر لحاظ سے ایک کامیاب تجربہ تھا۔ اس نے علامتی طور پر الرسالہ مشن کے موجودہ مقام کو بتایا۔ نیز اس نے اس مشن کے لیے کام کرنے کی نئی راہیں کھولیں۔ ضرورت ہے کہ دوسرے مقامات کے لوگ اس سے سبق لیں اور ہر جگہ اپنے حالات کے لحاظ سے اس قسم کے تجربے کریں۔

۱ ۲۰ جولائی ۱۹۹۱ کو نظام الدین (نئی دہلی) میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر "دین کی حقیقت" کے بارہ میں مختصر خطاب کیا۔

۲۔ یوم آزادی (۱۹۹۱) کے پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔ اس کا موضوع "آزادی اور ہماری ذمہ داریاں" تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ آزادی کے ساتھ اگر اخلاقی پابندی کو نہ قبول کیا جائے تو آزادی دوبارہ نئے قسم کی غلامی بن جاتی ہے۔

۳ نیویارک سے جناب کلیم الدین احمد صاحب نے ٹیلی فون پر بتایا کہ میشی گان کے ایک ۲۲ سالہ امریکی نومسلم مسٹر یحییٰ ایمرک (Yahya Emerick) کو انگریزی الرسالہ کے کچھ پرچے ملے۔ اس کو پڑھ کر انھوں نے اتنا پسند کیا کہ اپنے پانچ امریکی دوستوں کے نام اپنی طرف سے انگریزی الرسالہ جاری کرایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی کتابیں، گاڈ ارائزز وغیرہ منگائی ہیں اور بہت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صحیح معنوں میں "دعوہ میٹریل" اسلامی مرکز کے لٹریچر میں ملتا ہے۔

۴ ایم کے۔ کمال الدین صاحب کیرالا کے باشندے ہیں وہ ۱۹۶۳ سے دبئی میں رہتے ہیں اور وہاں نیو انڈین ماڈل اسکول کے چیرمین ہیں۔ وہ اپنے انگریزی خط مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۹۱ میں لکھتے ہیں: "میں پچھلے پانچ برسوں سے الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ اس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس کے اندر ہر کسی کے لئے عمدہ اخلاقی سبق ہوتے ہیں۔ تری وندرم (کیرالا) میں میرا ایک پرنٹنگ پریس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہاں سے ماہانہ الرسالہ کو ملیالم زبان میں شائع کروں امید ہے کہ آپ اس کی اجازت عنایت فرمائیں گے۔" کمال الدین صاحب کو اسلامی مرکز کی طرف سے الرسالہ ملیالم اڈیشن نکالنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

۵ مسٹر پرویز اختر (آرہ) نے بتایا کہ وہ تجارت کے سلسلہ میں اکثر فیروز آباد جاتے رہتے ہیں۔ وہاں ان کی ملاقات ایک ہندو تاجر مسٹر اروند سے ہوئی۔ مسٹر اروند نے بتایا کہ وہ الرسالہ سے اتنا زیادہ متاثر ہیں کہ اس کو اس کی اصل زبان میں پڑھنے کے لئے انھوں نے اردو سیکھی

ہے اور اب وہ الرسالہ اردو کو روانی کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں۔ اس طرح کے اور بھی کئی لوگ ہیں جنھوں نے الرسالہ کو پڑھنے کے لئے اردو سیکھی ہے۔

محمد ہارون صاحب (برہم پور، مرشد آباد) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ وہ الرسالہ کے مضامین کا بنگالی زبان میں ترجمہ کرکے ان کو بنگالی اخبارات و رسائل میں چھپواتے رہتے ہیں۔

۷ حیدر آباد (پاکستان) کے پندرہ روزہ اخبار "تحریر و تصویر" نے اپنے شمارہ ۳۱ جولائی ۱۹۹۱ء میں الرسالہ کے بارہ میں ایک مفصل تائیدی مضمون شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا گیا ہے: ممتاز عالم دین اور مفسر قرآن مولانا وحید الدین خاں کا کلمۂ حق"۔ ہند اور بیرون ہند کے مختلف اخبارات و رسائل میں اس طرح کے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔

۸ اس سے پہلے مسلم مسائل میں صرف احتجاج اور شکایت اور مظلومیت کی زبان بولی جاتی تھی۔ الرسالہ کی پندرہ سالہ متواتر کوشش کا یہ نتیجہ ہے کہ اب تمام لوگوں کی زبانیں بدل رہی ہیں۔ ہر ایک کسی نہ کسی طور پر الرسالہ کا پیٹرن اختیار کر رہا ہے۔ اس کی ایک مثال لکھنؤ کے پندرہ روزہ تعمیر حیات کی ہے۔ اس کے شمارہ ۱۰ اگست ۱۹۹۱ کے اداریہ کا عنوان "روشن مستقبل" ہے اور وہ پورا کا پورا الرسالہ کے نقطۂ نظر کی نقل ہے۔

۹ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں الرسالہ کا برابر ۱۹۸۵ سے قاری ہوں۔ اور بہت ہی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ الرسالہ کا ہر لفظ موتی اور ہیرے کے برابر ہوتا ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر عمل کرے تو یقیناً ہم کو جینے کا طریقہ حاصل ہو جائے۔ خاص کر اعراض کا جو سبق آپ دے رہے ہیں وہ بہت ہی قیمتی سبق ہے۔ مگر نادان لوگ اس کو بزدلی بتاتے ہیں اور برابر خود ہی نقصان بھی اٹھا رہے ہیں۔ یہاں کی مسجد میں تذکیر القرآن بھی موجود ہے۔ وہ واقعی اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب کہ لوگ تبدیل ہوں گے اور الرسالہ کی نصیحت پر عمل کریں گے۔
(مبارک حسین، اعظم گڈھ)

۱۰ ایک خاتون لکھتی ہیں: میں مقامی ایجنسی سے ہر مہینے الرسالہ حاصل کر لیتی ہوں۔ اس کے مضامین بہت جاندار ہوتے ہیں۔ بہت سی نئی نئی باتیں سیکھتی ہوں۔ ملنے جلنے والوں کو الرسالہ پڑھنے کی ترغیب دیتی رہتی ہوں۔ کچھ ہندو صاحبان کو الرسالہ کے نسخے تقسیم کئے۔ کچھ لوگوں کو فوٹو کاپی

کرا کے دیا (آمنہ منظر، کشن گنج)

۱۱ میڈیکل کے ایک طالب علم لکھتے ہیں: میں ۱۹۸۷ سے الرسالہ کا قاری ہوں۔ میں نے پایا کہ الرسالہ نے کئی نوجوانوں کے ذہن کو تعمیری سوچ کی روشنی سے منور کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے مشن کو کامیاب کرے جو مسلمانوں کو ایک بچھڑی ہوئی زندگی اور ناکامی سے بچانے کے لئے جاری ہے۔ ہمارے کالج میں تقریباً ۳۰ مسلم طلبہ ہیں۔ ہم یہاں کئی مشکلوں سے آسانی سے نکل آئے۔ اور اب یہاں ہماری پوزیشن بہت اچھی ہے۔ کیوں کہ ہم نے آپ کے بتانے کے مطابق "حدیبیہ پرنسپل" کو استعمال کیا (محمد انور فہمی، اورنگ آباد)

۱۲ قاری سید مبین صاحب ناندیڑ میں مستان پورہ کی مسجد میں امام ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہر روز نماز فجر کے بعد وہ مسجد میں تذکیر القرآن پڑھ کر سناتے ہیں۔ بیشتر نمازی درس سننے کے لئے ٹھہر جاتے ہیں۔ تقریباً پندرہ منٹ کا وقت لگتا ہے۔ لوگ بہت شوق سے سنتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی مساجد میں تذکیر القرآن کے ذریعہ درس قرآن کا سلسلہ قائم ہے۔

۱۳ ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ نظروں سے گزرا۔ شکر خداوندی ہے کہ اس نے آپ جیسے دینی قناعت پسند شخصیت کے ہاتھوں سے اتنا مدبر رسالہ جاری کروایا ہے۔ واقعی یہ رسالہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ عام و خاص انسانوں کے لئے ایک بہترین عطیہ ہے۔ ایک مشعل راہ ہے (حسین خاں، بنگلور)

۱۴ ۱۵ اگست ۱۹۹۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا موضوع تھا: سماجی اصلاح کا مسئلہ۔

۱۵ عبد الرحمٰن صاحب (پونہ) الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں الرسالہ پڑھنے کے بعد یہ کرتا ہوں کہ اس کے منتخب مضامین کو ہندو لوگوں کو سناتا ہوں۔ وہ لوگ اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ خود پڑھنے کے بعد دوسروں کو پڑھ کر سناتے ہیں۔

۱۶ ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے۔ اس کا نام کاروان ملت ہے۔ اس کا موضوع ملت کا احیاء نو ہے اور وہ ۲۲۴ صفحہ پر مشتمل ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے (ہوائی ڈاک)		(بحری ڈاک)
ایک سال	۹۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ 〃 〃	۱۸ 〃 〃
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ 〃 〃	۲۵ 〃 〃
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ 〃 〃	۴۰ 〃 〃
خصوصی تعاون (سالانہ)	۲۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ 〃	— —